

قواعد ومصطلحات حديث

برائے ایم اے علوم اسلامیہ

(تخصّص فی الحدیث)

کوڈ: 4555

یونٹ: 1 تا 18

www.KitaboSunnat.com

الكفاية في علم الرواية

مقدمة ابن الصلاح

معرفة علوم الحديث

تدريب الراوي

المحدث الفاضل

التقييد والإيضاح كتاب الرسالة

الأحكام في أصول الأحكام



مجمع تدریس وپژوهش
کلیه عربی وعلوم اسلامیہ

جامع النخيل

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

معزز قارئین توجہ فرمائیں

■ کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔

■ مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔

■ دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

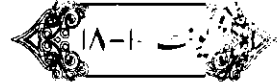
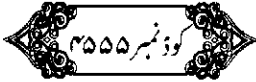
PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

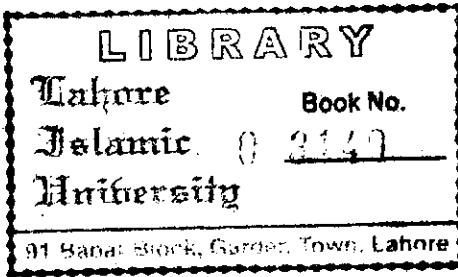
🌐 www.KitaboSunnat.com

قواعد و مصطلحاتِ حدیث

برائے ایم اے علوم اسلامیہ
(تخصص فی الحدیث)



www.kitabosunnat.com



مکتبہ حدیث و سیرت
کلیہ عربی و علوم اسلامیہ
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

241
ج ۲۰ - ۱۰

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

2001ء	ایڈیشن اول
2001ء	اشاعت اول
2005ء	اشاعت دوم
1000	تعداد اشاعت
135 روپے	قیمت
محمود برادرز پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی	طابع
فون نمبر 5539489	
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد	ناشر

کورس ٹیم

چیرمین:

ڈاکٹر علی اصغر چشتی

مؤلفین:

ڈاکٹر علی اصغر چشتی

ڈاکٹر سہیل حسن

محمد شریف شاہ کر

معین الدین ہاشمی

ڈاکٹر تاج الدین الازہری

نظر ثانی:

پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی

ڈاکٹر علی اصغر چشتی

تدوین:

عفت پرویز

کورس رابطہ کار:

ڈاکٹر علی اصغر چشتی

فہرست

صفحہ نمبر	موضوع	یونٹ نمبر
11	حدیث اور علم حدیث	یونٹ نمبر ۱
39	حجیت سنت	یونٹ نمبر ۲
69	مطالعہ حدیث	یونٹ نمبر ۳
105	علم الاسناد کی اہمیت	یونٹ نمبر ۴
137	تحلل حدیث	یونٹ نمبر ۵
181	اقسام حدیث	یونٹ نمبر ۶
205	مصطلحات حدیث	یونٹ نمبر ۷
249	خبر متواتر	یونٹ نمبر ۸
289	خبر واحد کی حجیت	یونٹ نمبر ۹
315	حدیث مرسل	یونٹ نمبر ۱۰
355	روایت الحدیث بالمعنی	یونٹ نمبر ۱۱
391	اقسام کتب حدیث	یونٹ نمبر ۱۲
423	اصول درایۃ	یونٹ نمبر ۱۳
461	ناخ و منسوخ فی الحدیث	یونٹ نمبر ۱۴
489	اختلاف الحدیث و غریب الحدیث	یونٹ نمبر ۱۵
537	علم الجرح والتعدیل	یونٹ نمبر ۱۶
577	علم التخریج اور اس کے اسالیب و مناج	یونٹ نمبر ۱۷
621	قواعد وضع حدیث	یونٹ نمبر ۱۸

کورس کا تعارف

ایم۔ اے (علوم اسلامیہ) کے طلبہ و طالبات کے لئے ”تخصّص فی الحدیث“ کا کورس نمبر ۱ (قواعد و مصطلحات حدیث) پیش کیا جا رہا ہے۔ کسی بھی علم اور فن تک رسائی کیلئے ضروری ہے کہ اس کے بنیادی اصول، قواعد، قوانین اور مصطلحات سے بھرپور اور بڑی حد تک مناسبت اور واقفیت حاصل ہو۔ جو طلبہ اصول و قواعد کا مطالعہ کئے بغیر براہ راست فن کا مطالعہ کرتے ہیں وہ زندگی بھر بھول بھلیوں میں رہتے ہیں اور اس فن میں رسوخ اور وثوق سے عاری رہتے ہیں۔ ان کی معلومات سطحی، اور ہوائی ہوتی ہیں۔ جو کسی بھی وقت ان کے ذہن سے محو ہو سکتی ہیں۔ اصول و قواعد کی مثال فن کیلئے بالکل ایسے ہی ہے جس طرح درخت کے لئے جڑیں ہوتی ہیں۔ جس طرح درخت بغیر جڑوں کے پائیدار نہیں رہ سکتا اسی طرح فنی معلومات، اصولی معلومات کے بغیر قائم نہیں رہ سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء نے اصول و قواعد پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

..... علم حدیث میں قواعد کا آغاز کس دور سے ہوا؟..... اس کے بارے میں مختلف قواعد کے تحت متعلقہ یونینوں میں تفصیل آگئی ہے اور طلبہ ان شاء اللہ اس ضمن میں تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ ہاں یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ حدیث کی روایت و کتابت میں شروع ہی سے احتیاط برتی گئی ہے اور انتہائی احتیاط کے ساتھ یہ سلسلہ چلتا آ رہا ہے۔ خود رسول ﷺ نے صرف ان صحابہ کو کتابت حدیث کی اجازت دی تھی جن کے بارے میں آپ ﷺ کو یقین تھا کہ وہ آیات و روایات میں فرق کر سکتے ہیں۔ اور بغیر کمی بیشی کے کتابت کر سکتے ہیں۔ (اس بارے میں آپ ان شاء اللہ کورس نمبر ۳ میں تفصیل کے ساتھ مطالعہ کریں گے)۔

..... حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیقؓ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے روایت حدیث کے سلسلہ میں رواۃ حدیث کو پرکھا اور کئی مواقع پر روایت کے لئے تائیدی روایات حاصل کرنے کا اہتمام

کیا..... آپؐ کے بعد سیدنا عمر فاروقؓ نے بھی اس روش کو جاری رکھا۔ آپؐ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میں آپؐ کو ناقابل اعتماد نہیں سمجھتا لیکن میری خواہش ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جو آپ ﷺ نے نہ فرمائی ہو اس لئے میں نے آپؐ کی بیان کردہ روایت پر گواہ طلب کئے..... عمر فاروقؓ نے کئی مواقع پر ان صحابہ کرامؓ کی جو احادیث بیان کرتے تھے کہ وہ انتہائی احتیاط سے کام لیں۔ آپؐ نے تھناۃ کو رہنما اصول فراہم کئے اور ان اصولوں میں آیات کے بعد روایات کو بنیاد بنا کر فیصلے کرنے کی ہدایات دیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ روایت اور اخذ حدیث میں ”تثبت“ پر عمل کرنا آپؐ کے نزدیک لازمی تھا۔ سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ کے دور میں بھی شیخین کا طریقہ رائج رہا۔ بعد میں جب سیاسی اور سماجی حالات بدل گئے اور تفریق و تقسیم کے عمل کا آغاز ہو گیا تو سیدنا ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ہم نے ہر قسم کے رواۃ کی روایات کی طرف دھیان دینا چھوڑ دیا اور صرف ان رواۃ کی روایات کو لینا شروع کیا جن کے بارے میں ہم جانتے تھے کہ وہ ثقہ اور قابل اعتماد ہیں۔ جب ہمارے سامنے کوئی حدیث پیش کرتا تو ہم اس سے پوچھتے تھے کہ اس نے حدیث کس سے سنی اور کب سنی ہے۔ سیدنا ابن عباسؓ کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی صدی کے وسط ہی میں علماء نے اخذ روایت کے سلسلہ میں بنیادی قواعد پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا..... امام ابن سیرین، امام ابن شہاب زہری اور سفیان ثوری کے دور کی جو روایات بعد کے مصادر میں منتقل ہوئی ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اخبار اور تحدیث سے متعلق اصطلاحات کا استعمال ہوتا تھا۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے دور میں تو باقاعدہ تنقید و تنقیح اور تہذیب روایات کا کام شروع ہو گیا تھا۔ امام علی بن المدینی، امام یحییٰ بن معین اور امام عبد اللہ بن المبارک وہ اعیان و اساطین ہیں جن کے اقوال و مواقف کی بنیاد پر متاخرین نے نت نئے فنون وضع کیے..... اصول و قواعد کے سلسلے میں اس وقت جس مصدر کو اولین اور بنیادی حیثیت حاصل ہے وہ امام شافعیؒ کی کتاب ”الرسالۃ“ ہے..... امام شافعیؒ نے متقدمین کے اصولوں کو موضوع بحث بنایا ان کے اقوال جمع کئے ان کے مواقف کو مرتب کیا اور اس طرح پہلی صدی ہجری سے لے کر دوسری صدی ہجری تک قواعد و قوانین پر جو کام ہوا تھا اسے بہت خوبصورت شکل میں مرتب و مدون کر دیا۔ تیسری صدی ہجری میں قواعد و مصطلحات حدیث نے مستقل فن کی شکل اختیار کر لی۔ اس بارے میں علماء حدیث نے جو خدمات انجام دیں۔ ان کے بارے میں طلبہ

یونٹ نمبر ۷ میں قدرے تفصیل کے ساتھ مطالعہ کریں گے۔

قواعد و مصطلحاتِ حدیث کورس کی تخطيط اور ترتيب و تدوین میں کوشش کی گئی ہے کہ جتنے بھی اہم اور بنیادی موضوعات ہیں انہیں اس کورس میں شامل کیا جائے تاکہ ”حدیث“ میں تخصص کرنے والے طلبہ جب آئندہ کورسز کا مطالعہ کریں تو انہیں کسی پہلو سے بھی دقت اور مشکل محسوس نہ ہو۔۔۔۔۔

اس کورس کی تخطيط اور ترتيب میں استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی، ڈین فیکلٹی آف عربی و علوم اسلامیہ کی مسلسل رہنمائی ہمیں حاصل رہی۔ کورس کی ڈیزائننگ کیلئے آپ نے رہنما اصول فراہم کیے اور اس کے بعد قدم قدم پر کورس کی تیاری کے لئے مہمیز دیتے رہے۔۔۔۔۔ اپنی تمام تر اور گونا گوں مصروفیات کے باوجود آپ نے مسودات کو پڑھا اور ان پر نظر ثانی کی۔ اگر آپ کی عنایات، توجیہات اور التفات نہ ہوتی تو یہ کورس اس شکل میں کبھی بھی مرتب اور مدون نہ ہو سکتا تھا۔ اللہ جل شانہ آپ کو اجرِ جزیل عطا فرمائے اور علم و عمل اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔

کورس کی تیاری کے دوران شعبہ حدیث و سیرت کے رفیق محترم معین الدین ہاشمی صاحب کا تعاون میرے ساتھ رہا آپ نے دیگر امور کے علاوہ اس کورس کے لئے دو یونٹ بھی تحریر کئے۔ اس کورس کیلئے جن جن سکارلز نے یونٹ تحریر کئے ہیں اور ہمارے ساتھ علمی تعاون کیا ہے اللہ جل شانہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور انہیں بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے۔۔۔۔۔ اس کورس میں جو بھی خوبی اور بھلائی ہے وہ اللہ جل شانہ کے فضل و کرم اور تائید سے ہے۔۔۔۔۔ اور جو بھی خامی اور کمی بیشی ہے وہ میری کم علمی اور کم مائیگی کا نتیجہ ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ انہیں اس کورس میں جو بھی خامی نظر آئے وہ راقم الحروف کو اس سے آگاہ کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازالہ ہو سکے۔

والسلام!

علی اصغر چشتی

چیرمین شعبہ حدیث و سیرت

کورس کے مقاصد

اس کورس کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ◆ حدیث اور علم حدیث کے بارے میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔
- ◆ حجیت سنت کے بارے میں علماء کے اقوال اور دلائل پیش کر سکیں۔
- ◆ مطالعہ حدیث کی ضرورت اور علم الاسناد کی اہمیت پر روشنی ڈال سکیں۔
- ◆ تحمل حدیث کے اقسام کا جائزہ لے سکیں۔
- ◆ اقسام حدیث باعتبار صحت کے بارے میں بتا سکیں۔
- ◆ حدیث کی اہم اور بنیادی اصطلاحات کی تعریف کر سکیں۔
- ◆ خبر متواتر اور خبر واحد کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کر سکیں۔
- ◆ حدیث مرسل کی حجیت اور حیثیت پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔
- ◆ روایت الحدیث بالمعنی کے جواز و عدم جواز کے بارے میں علماء کے اقوال اور دلائل کا جائزہ لے سکیں۔
- ◆ اقسام کتب حدیث کے ضمن میں اہم مصادر حدیث کی نشاندہی کر سکیں۔
- ◆ ”اصول درایۃ“ اور ”ناسخ و منسوخ فی الحدیث“ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کر سکیں۔
- ◆ اختلاف الحدیث اور علم الجرح والتعديل پر تفصیل کے ساتھ بحث کر سکیں۔
- ◆ علم التخریج کے اسالیب بتا سکیں اور وضع حدیث کے اسباب کا جائزہ لے سکیں۔



یونٹ نمبر ①

حدیث اور علم حدیث

تحریر: ڈاکٹر علی اصغر چشتی
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی



فہرست عنوانات

15	یونٹ کا تعارف
16	یونٹ کے مقاصد
	① حدیث و علم حدیث
17	1.1 حدیث کا لفظی مفہوم
17	1.2 حدیث کا اصطلاحی مفہوم
	② علم حدیث
20	2.1 علم حدیث کے اقسام
22	2.2 خود آزمائی نمبر 1
23	③ علوم الحدیث
23	3.1 علم جرح و تعدیل
25	3.2 مختلف الحدیث
26	3.3 علل الحدیث
27	3.4 غریب الحدیث
28	3.5 ناسخ و منسوخ
30	④ مصطلح الحدیث
30	4.1 المحدث الفاصل بین الراوی والواعی
30	4.2 معرفۃ علوم الحدیث
31	4.3 الکفایۃ فی علم الروایۃ

- 31 4.4 الجامع الاخلاق الراوی وآداب اسامع
- 32 4.5 الانماع إلى معرفة اصول الرواية وتقييد السماع
- 32 4.6 مقدمه ابن الصلاح
- 32 4.7 التقييد والايضاح
- 33 4.8 التكملة على ابن الصلاح
- 33 4.9 ارشاد طلاب الحقائق إلى معرفة سنن خير الخلائق
- 33 4.10 المنهل الراوی فی الحدیث النبوی
- 33 4.11 اختصار علوم الحدیث
- 34 4.12 الخلاصة فی معرفة اصول الحدیث
- 34 4.13 فتح المغیث فی شرح الفیہ الحدیث
- 34 4.14 الاءقتراح فی بیان الاصطلاح
- 35 4.15 المختصر لمعرفة علوم الحدیث
- 35 4.16 تنقیح الا نظار فی علوم الآثار
- 35 4.17 نخبة الفكر
- 36 4.18 قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث
- 36 4.19 توجيه النظر إلى علم الآثار
- 37 خود آزمائی

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

زیر مطالعہ یونٹ کا تعلق ”حدیث اور علم حدیث“ سے ہے۔ یہ چونکہ قواعد و مصطلحات سے تعلق رکھنے والے کورس کا پہلا یونٹ ہے اس لئے اس میں پہلے ”حدیث“ کی اصطلاح پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ”حدیث“ کا لفظی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے۔ اس کے بعد علم حدیث کا اصطلاحی مفہوم واضح کیا گیا ہے اور علم حدیث کے اقسام پر گفتگو کی گئی ہے۔ علوم الحدیث میں جو اہم اور بنیادی فنون ہیں ان کی تعریف اور ان سے متعلق مشہور اور مفید مصادر کی نشاندہی بھی کی گئی اور بتایا گیا ہے کہ کس کتاب کو زیادہ بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔ آخر میں قواعد و مصطلحات پر لکھی گئی کتابوں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔

آپ اس یونٹ کا بہت غور اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں۔ اس لئے کہ اس کورس میں آگے جن یونٹوں کا آپ مطالعہ کریں گے ان میں جن کتب حدیث اور مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے ان کا تعارف آپ کے ذہن میں محفوظ ہونا چاہئے۔ حدیث، علم حدیث اور علم حدیث کے اقسام و انواع کا تصور جتنا آپ کے ذہن میں واضح ہوگا اتنا ہی آپ اس کورس سے زیادہ مستفید ہو سکیں گے۔

اس یونٹ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جو مواد آپ کو دیا جائے وہ عام فہم اور سلیس زبان میں ہو۔ اسلوب سادہ ہو اور عربی نصوص کا مفہوم سہل انداز میں پیش ہو..... آپ اس یونٹ کے علاوہ علوم الحدیث پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی بھی کوشش کریں..... جب آپ اس یونٹ کو پڑھیں گے تو اس کے بعد امید ہے کہ آپ کو اس موضوع کے ساتھ ایک حد تک مناسبت ہو جائے گی اور اس موضوع سے متعلقہ مواد کو سمجھنے میں آپ زیادہ وقت محسوس نہیں کریں گے۔

یونٹ کے اغراض و مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ◆ حدیث اور علم حدیث کی تعریف بیان کر سکیں۔
- ◆ علم حدیث کی اقسام پر گفتگو کر سکیں۔
- ◆ علم جرح و تعدیل کے بنیادی مصادر کی نشاندہی کر سکیں۔
- ◆ مختلف الحدیث کے بارے میں تبصرہ کر سکیں۔
- ◆ علل الحدیث کے بارے میں علماء حدیث کی خدمات پر بات کر سکیں۔
- ◆ غریب الحدیث کے مآخذ پر روشنی ڈال سکیں۔
- ◆ ناسخ و منسوخ کی تعریف کر سکیں۔
- ◆ مصطلح الحدیث کے بارے میں بنیادی اور مفید مصادر کا تعارف کروا سکیں۔

① حدیث اور علم حدیث

1.1 حدیث کا لفظی مفہوم:

لفظی اعتبار سے حدیث کے معنی ”گفتگو“ اور نئی چیز“ کے ہیں..... قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد ”کلام“ ہے۔ مثلاً:

﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ.....﴾ (الطور: ۳۴)

﴿مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى.....﴾

﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ.....﴾ (المرسلات: ۵۰)

﴿فَلَعَلَّكَ بَاقِعُ نَفْسِكَ عَلَى آثَارِهِمْ، إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ

أَسْفًا.....﴾ (الكهف: ۶)

علامہ جوہری نے ”صحاح“ میں حدیث کی تعریف یوں کی ہے:

(الحديث: الكلام قليله و كثيره، و جمعه‘ احاديث)

”حدیث کے معنی کلام کے ہیں خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ..... اس کی جمع احادیث ہے“

لفظی لحاظ سے ”حدیث“ کے دوسرے معنی جدید یعنی نئی چیز کے ہیں۔ حدیث، قدیم کی ضد ہے۔ قدیم کے معنی پرانی چیز اور حدیث کے معنی نئی چیز کے ہیں۔ ”حدیث السن“ نوخیز اور نو عمر کیلئے استعمال ہوتا ہے..... نئے دور کے لئے ”العصر الحدیث“ اور نو وارد کیلئے ”حدیث العبد“ استعمال کیا جاتا ہے۔

1.2 اصطلاحی مفہوم:

علماء حدیث کی اصطلاح میں ”حدیث“ سے مراد رسول اکرم ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال

ہیں۔ اس اصطلاح کو پیش نظر رکھ کر ہم قول رسول ﷺ کو حدیث کہتے ہیں، فعل رسول ﷺ کو حدیث کہتے ہیں اور مفت رسول کو بھی حدیث کہتے ہیں..... مصادر حدیث سے مراد وہ بنیادی اور اساسی کتب ہیں جن میں علمائے حدیث نے رسول اکرم ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال کو جمع کیا ہے..... حافظ ابن حجر اس ضمن میں لکھتے ہیں: (المراد بالحدیث فی الشرع ما اُضيف الى النبی ﷺ کانه اُريد به مقابلة القرآن لانه قدیم)..... (تدریب الراوی: ج ۱، ص ۲۳) ”عرف شرع میں حدیث سے مراد وہ (قول و فعل) ہے جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہو گویا اس سے مراد وہ کلام ہے جو قرآن مجید کے مقابل ہے۔ اس لئے کہ قرآن قدیم ہے۔“

کلام رسول ﷺ کے لئے حدیث کی اصطلاح کب رائج ہوئی اور کیوں رائج ہوئی؟..... اس بارے میں علماء حدیث نے مختلف اور متعدد توجیہات پیش کی ہیں..... لیکن سب سے بہتر اور عمدہ توجیہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے خود اپنی زبان مبارک سے اپنے ارشادات کے لئے لفظ حدیث کا استعمال فرمایا۔ مثلاً حضرت سرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((من حدث عني بحديث يرى انه كذب فهو من الكاذبين))..... (مشکوٰۃ المصابیح - کتاب العلم)

اور عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اتقوا الحديث عني إلا ما علمتم فمن كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار))..... (مشکوٰۃ المصابیح - کتاب العلم)

صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے اقوال و افعال کے لئے حدیث کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ مثلاً:

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: (ان عبد الله بن عمرو اعتاد ان يدون الأحاديث ولكن لم يفعل ذلك)..... (ارشاد الساری ج ۱ - ص ۲۰۶) عبد اللہ بن عمرو بن العاص احادیث کی تدوین و ترتیب کے عادی تھے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔

(۲) حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ: ((انه يمنعني ان احذركم حديثاً كثيراً لقول النبي

عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَنْ تَعَمَّدَ عَلَى كَذِبٍ فَلْيَسُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)..... (اصحح للامام البخاری۔ کتاب العلم)

مجھے زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد روکتا ہے کہ ”جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کی اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنایا“

② علم حدیث

علم حدیث سے مراد وہ فن ہے جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب اقوال، افعال اور احوال کی نعمت اور سقم کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ حافظ سخاوی نے فتح المغیث میں علم حدیث کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کی ہے: ((معرفة ما أضيف إلى النبي ﷺ قولاً له أو فعلاً أو تقريراً أو صفة))
 ”علم حدیث سے مراد اس قول، فعل، تقریر اور صفت کی معرفت اور پہچان ہے جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی گئی ہو۔

علامہ بدرالدین عینی عمدة القاری میں علم حدیث کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ (علم يعرف به اقوال رسول الله ﷺ و أفعاله و أحواله) ”وہ علم جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

2.1 علم حدیث کے اقسام:

علماء حدیث نے ابتداً علم حدیث کو دو شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) علم روایۃ الحدیث

(۲) علم درایۃ الحدیث

علم روایۃ الحدیث:

روایۃ الحدیث کی تعریف علماء حدیث نے ان الفاظ کے ساتھ کی ہے۔ (هو علم بنقل أقوال النبي ﷺ و أفعاله و أحواله بالسماع المتصل، و ضبطها و تحريرها.....)

اس علم کا تعلق سماع متصل کے ساتھ اخذ حدیث، ضبط حدیث اور کتابت حدیث سے ہے مطلب یہ

ہے کہ جن علما کا تعلق علم حدیث کی اس شاخ سے ہوتا ہے وہ بنیادی طور پر ان تین چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

دریۃ الحدیث:

ممد راہد کی تعریف علماء حدیث نے ان الفاظ کے ساتھ کی ہے ((هو علم يتعرف به اصناف الرواية، واحكامها، وشروط الرواة، واصناف المرويات واستخراج معانيها)) اس علم کا تعلق روایۃ کے اقسام و احکام، رواۃ حدیث کی شرائط، متون کے اصناف اور استنباط مطالب سے ہے۔

ابھی اس حدیث کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ فلاں کتاب میں، فلاں سند سے، فلاں الفاظ کے ساتھ منقول ہے یہ علم روایۃ الحدیث ہے..... اور اس حدیث کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ خبر متواتر ہے یا خبر واحد ہے۔ صحیح یا ضعیف ہے..... معضل ہے یا منقطع ہے..... اس کے رواۃ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ۔ نیز اس حدیث سے کیا کیا احکام مستنبط ہوتے ہیں اور کوئی تعارض تو نہیں ہے اگر تعارض ہے تو کیونکر رفع کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب باتیں علم روایۃ الحدیث سے متعلق ہیں..... متقدمین حضرات نے ”روایۃ الحدیث“ اور علم اصول الحدیث کو مترادف قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ان دونوں علوم کا دائرہ ایک ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ روایۃ الحدیث اور اصول الحدیث میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ اصول الحدیث میں متن حدیث کا لغوی، اصطلاحی اور استنباط کے پہلو سے تحلیل و تجزیہ نہیں کیا جاتا جبکہ روایۃ الحدیث میں متن حدیث کا ہر پہلو سے تجزیہ کیا جاتا ہے..... حدیث نبوی ﷺ کے متن و عبارت کا درس و مطالعہ اور کتب روایۃ کا مطالعہ و احکام اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پہلو بہ پہلو روایت حدیث پر غور و فکر نہ کیا جائے۔ روایت حدیث ہی وہ فن ہے جس میں رسول اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کا تاریخی و عقلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

روایۃ الحدیث کا حدیث نبوی کی عبارت سے وہی تعلق ہے جو علم تفسیر کا قرآن کریم کے متن سے ہے۔ یا احکام کا واقعات کے ساتھ ہے۔ حدیث کے ابتدائی دور میں روایۃ الحدیث سے متعلق مباحث جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ موضوع، غرض و غایت اور طرز و انداز کے لحاظ سے یہ بالکل الگ تھلک تھے۔

جب تدوین حدیث اور ترتیب و تالیف کا دور آیا تو علم حدیث کے کئی گوشے نمایاں ہو گئے اور اس طرح درایت حدیث سے متعلق علوم کئی قسموں میں بٹ گئے۔ مگر علوم الحدیث کا نام ان سب اقسام کو حاوی ہے۔

خود آزمائی ①

- ۱- حدیث کا لفظی مفہوم بیان کیجئے۔
- ۲- حدیث کے اصطلاحی مفہوم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔
- ۳- علم حدیث کی تعریف کے بارے میں مختلف اقوال بیان کیجئے۔
- ۴- روایۃ الحدیث سے کیا مراد ہے؟ تعریف کیجئے۔
- ۵- ”روایۃ الحدیث“ کی تعریف میں علماء نے کن کن نکات کو مد نظر رکھا ہے۔
- ۶- علماء حدیث نے علم حدیث کو بنیادی طور پر کس طرح تقسیم کیا ہے؟

③ علوم الحدیث

علم حدیث کے بہت سارے فروع ہیں۔ امام حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب ”معرفة علوم الحدیث“ میں ان کی تعداد ساٹھ سے زیادہ بتائی ہے۔ یہاں ان میں سے چند کا تذکرہ اعمال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

3.1 علم جرح و تعدیل:

جرح و تعدیل وہ علم جو خاص الفاظ کے ذریعہ روایت حدیث کی عدالت و ثقاہت یا ان کے عیب و نقص سے بحث کرتا ہے..... جرح و تعدیل کا علم درایت حدیث کے فن کا ثمرہ اور اس کی بہت بڑی سیڑھی ہے..... بہت سے علماء اس فن میں عصرِ صحابہ سے لے کر متاخرین کے دور تک تالیف و ترتیب کا کام کرتے چلے آئے ہیں..... ترتیب ادوار کے مطابق ان کے نام درج ذیل ہیں۔

- ۱- طبقہ صحابہ میں سے عبداللہ بن عباسؓ (م ۹۶ھ) اور حضرت انس بن مالک (م ۹۳ھ)
- ۲- طبقہ تابعین میں سے امام شعبی (م ۱۰۴ھ) اور امام ابن سیرین (م ۱۱۰ھ)
- ۳- طبقہ تابعین (آخرہ) میں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام اعظم (م ۱۴۸ھ) اور امام مالک (م ۱۷۹ھ)
- ۴- طبقہ رابعہ میں سے عبداللہ بن المبارک (م ۱۸۱ھ)، امام سفیان بن عیینہ (م ۱۹۷ھ)، امام عبدالرحمن بن مہدی (م ۱۹۸ھ)
- ۵- امام یحییٰ بن معین (م ۲۳۳ھ)، امام احمد بن محمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، امام علی بن المدینی (م ۲۴۳ھ)۔

جرح و تعدیل کے فن میں ابن سعد زہری بصری (م ۲۴۰ھ) کی طبقات ابن سعد نہایت جامع کتاب ہے۔ یہ پندرہ جلدوں میں ہے۔ (مجموع جکی ہے اور عام دستیاب ہے)۔

امام بخاری نے جرح و تعدیل کے فن میں تین تاریخیں مرتب کیں۔ ان تینوں کتابوں میں آپ نے رواد حدیث کے بارے میں علماء کے اقوال جمع کئے اور اس طرح ان کی حیثیت پر دونوں پہلوؤں سے کلام کیا۔ امام علی بن المدینی نے دس اجزا میں ایک تاریخ لکھی۔ اس تاریخ کا تعلق بھی براہ راست رواد حدیث ہے۔ حافظ ابن حبان (م ۳۵۴ھ) نے ایک کتاب ”فی اوہام أصحاب التواریخ“ کے موضوع پر دس اجزا میں لکھی۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر (م ۷۷۷ھ) نے ایک کتاب ”التکمیل فی معرفة الثقات، والمضیعاء والمجاهیل“ مرتب کی۔

بعض علماء نے جرح و تعدیل کے ایک خاص دائرہ میں محدود رہ کر کتابیں تالیف کیں۔ مثلاً العجلی (م ۳۶۱ھ) اور امام زین الدین قاسم (م ۳۸۹ھ) نے صرف ثقہ راویوں پر کتابیں لکھیں۔

امام بخاری، امام نسائی اور حافظ ابن الجوزی نے ضعفاء اور متروک راویوں پر کتابیں مرتب کیں۔ حسین بن علی کرامتی صاحب الشافعی نے سب سے پہلے بدلسین پر کتاب لکھی۔ پھر امام نسائی، امام دارارقطنی اور علامہ سیوطی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

اس سلسلہ میں جن دو کتابوں کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ حافظ ابن عدی کی ”الکامل“ اور امام عقیلی کی ”الموضوعات“ ہے۔ ان دونوں حضرات نے اپنی تالیفات میں جہاں رواد حدیث پر بحث کی ہے وہاں ان کی ان روایات کی بھی نشان دہی کی ہے جن میں نقص اور قسم ہے۔ حافظ عقیلی علماء حدیث کے ہاں تشدد کہلاتے ہیں اس لئے کہ رواد حدیث کے بارے میں بعض مرتبہ ان کا رویہ معتدل نہیں ہوتا۔ حافظ ابن عدی علماء حدیث کے ہاں ”معتدل“ کہلاتے ہیں۔ ان کی کتاب ”الکامل“ اسم باسکی ہے اور اس موضوع پر بہت عمدہ اور مفید تالیف ہے..... بعد میں محمد بن طاہر مقدسی نے صحیحین کے رواد کے بارے میں ایک کتاب ترتیب دی۔ حافظ ذہبی نے صحاح ستہ کے رواد پر کام کیا اور اپنی کتاب کا نام ”الکاشف“ رکھا۔

3.2 علم مختلف الحدیث:

اس علم میں ان روایات سے بحث کی جاتی ہے جن میں بہ ظاہر تناقض نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ اس فن کے ذریعہ اس قسم کی روایات کے مابین جمع و تطبیق دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جمع و تطبیق کا طریقہ یہ ہے کہ مطلق احادیث کو مقید اور عام کی تخصیص کر دی جائے یا انکو تعدد و واقعہ پر محمول کیا جائے۔ اس کو تطبیق حدیث کا علم بھی کہا جاتا ہے۔ (توضیح الافکار: ص ۴۲۳)

امام نووی اپنی مشہور کتاب ”العقرب“ میں لکھتے ہیں: ”یہ حدیث کا ایک نہایت اہم فن ہے۔ سب علماء کو اس کے جاننے کی ضرورت ہے۔ اس فن کا مقصد یہ ہے کہ دو بظاہر متضاد المعنی روایات میں جمع و تطبیق اور توفیق کی کوشش کی جائے۔ یا ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دیا جائے۔ اس فن میں وہ علماء دسترس اور مہارت رکھتے ہیں جو حدیث و فقہ کے جامع ہوں یا ماہر اصول ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث کے معانی و مطالب میں مہارت رکھتے ہوں۔ امام شافعی نے اس فن پر ابتدائی کام کیا۔ آپ اس پہلو سے جو کام کرنا چاہتے تھے اسے مکمل نہ کر سکے۔۔۔۔۔ (التدریب: ص ۱۹۷)

مثلاً ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ((لا عدوی)) ”بیماری متعدی نہیں ہوتی“ دوسری حدیث میں فرمایا: ”کوڑھنی سے یوں بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو“۔ ان دونوں روایات کے درمیان جمع و تطبیق کا طریقہ یہ ہے کہ بیماریاں بذات خود متعدی نہیں ہوتیں البتہ مریض کے تندرست کے ساتھ ملنے کو اللہ تعالیٰ نے اس کی بیماری کے متعدی ہونے کا سبب اور ذریعہ بنایا ہے۔ بعض اوقات تندرست لوگ بیمار سے ملتے ہیں اس کی تیمارداری کرتے ہیں اور خدمت کرتے ہیں اور بیمار نہیں ہوتے۔ جس طرح دوسرے اسباب میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ (تدریب الراوی: ص ۱۹۸)

مختلف الحدیث کے موضوع پر ابتدائی کام امام شافعی نے کیا۔ امام ابو جعفر طحاوی نے اپنی کتب میں روایات پر جمع و تطبیق کے حوالہ سے بحث کی ”معانی الآثار“ اس سلسلہ کی بہت عمدہ اور خوبصورت کتاب ہے۔ اس کتاب میں امام طحاوی نے ایک ہی موضوع پر دستیاب روایات کو ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے پھر روایات

کو روپ میں تقسیم کر کے ان پر بحث کی ہے..... امام ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۱ھ) کی کتاب ”تاویل مختلف الحدیث“ اس فن میں بنیادی اور اساسی حیثیت کی حامل ہے۔ اپنی اس تالیف میں امام ابن قتیبہ نے روایات پر بالکل اچھوتے انداز میں بحث کی ہے۔ آپ کا تعلق جس دور سے ہے اس دور میں روایات حدیث پر کلام کا سلسلہ زور و شور سے جاری تھا۔ امام ابن قتیبہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں ان احوال و اوضاع کا تذکرہ کیا ہے اور علمائے حدیث کی خدمات، کدو کاوش اور پر خلوص مساعی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بعد میں امام ابویحییٰ زکریا بن یحییٰ ساجی (م ۳۰۷ھ) اور حافظ ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) نے بھی مختلف الحدیث کے موضوع پر کتابیں مرتب کیں۔

3.3 علل الحدیث:

اس علم میں ان پوشیدہ، مخفی اور دقیق علل و اسباب سے بحث کی جاتی ہے جن کی بنا پر روایت کی صحت میں نقص اور عیب وارد ہوتا ہے۔ وہ مخفی عیب جو حدیث کی حیثیت کو متاثر کرتا ہے۔ اصطلاح میں ”علت قاذۃ“ کہلاتا ہے..... مثلاً حدیث منقطع کا موصول ہونا، موقوف کا مرفوع ہونا اور ایک حدیث کا دوسری حدیث میں ادراج کرنا وغیرہ وغیرہ۔

حدیث کی علت معلوم کرنے کیلئے وسعت علم، قوت حافظہ اور فہم دقیق کی ضرورت ہے اس لئے کہ علت ایک مخفی چیز ہے جس کا پتہ بسا اوقات علوم حدیث میں مہارت رکھنے والوں کو بھی نہیں چلتا حافظ ابن حجر لکھتے ہیں ”یہ حدیث کے نہایت دقیق اور مشکل علوم میں سے ہے۔ علت کی پہچان میں صرف وہی شخص مہارت حاصل کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے روشن دماغ، قوت حافظہ اور مراتب رواۃ کی پہچان اور اسانید و متون میں مہارت تامہ سے نوازا ہو۔ (شرح نخبة الفکر۔ ص ۲۱)

امام عبدالرحمن بن مہدی سے کہا گیا ”آپ کسی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں اور کسی کو ضعیف ٹھہراتے ہیں۔ اس کی کیا دلیل ہے؟ فرمایا اگر تم کسی صراف کو اپنے درہم دکھاؤ اور وہ کہے کہ یہ کھرے ہیں اور وہ کھونے ہیں تو آیا تم اس کی بات کو تسلیم کرو گے یا اس کی دلیل طلب کرو گے.....؟ سائل نے کہا: میں اس کی

بات مان لوں گا..... عبدالرحمن بن مہدی نے فرمایا: حدیث کا معاملہ بھی اسی طرز کا ہے کیونکہ اس میں طویل صحبت، مناظرہ اور مہارت کی ضرورت ہے۔ (تذریب الراوی: ص ۸۹)

خطیب بغدادی لکھتے ہیں ”علم حدیث کے طالب کو صراف کی طرح کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرنے والا ہونا چاہئے جس طرح درہم کھوٹے بھی ہوتے ہیں اور کھرے بھی۔ حدیث کی بھی یہی حالت ہے“ (الجامع - ج ۱ ص ۱۷۷)

چونکہ علل حدیث کا فن نہایت دقیق اور لطیف ہے اور اس میں بڑی طویل مہارت اور مشق کی ضرورت ہے اس لئے اس پر بہت کم کتابیں لکھی گئیں..... اس ضمن میں سب سے زیادہ کامل قدر کتاب امام بخاری کے شیخ اور معروف و مشہور امام علی بن المدینی نے ”کتاب العلل“ کے نام سے تحریر کی..... اس فن پر ایک کتاب امام احمد بن محمد بن ہرون بغدادی خلال اور دوسری امام ابن ابی حاتم البستی نے تحریر کی۔ ابن ابی حاتم کی کتاب مصر میں دو جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک اہم اور بنیادی کاوش امام ترمذی کی کتاب العلل ہے۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے اسکی بہت مفید اور جامع شرح لکھی ہے۔ امام احمد بن حنبل نے بھی ایک کتاب ”العلل“ کے موضوع پر لکھی تھی..... امام ابوالحسن دارقطنی نے اس موضوع پر اس قدر جامع کتاب تحریر کی ہے کہ اس سے بہتر کتاب لکھنا اگر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ البتہ اس کی تدوین کا فریضہ ان کے شاگرد حافظ ابو بکر البرقانی نے ادا کیا..... اسی طرح امام بخاری، امام یعقوب بن ابی شیبہ، امام ابو یحییٰ زکریا بن یحییٰ (م ۳۰۷ھ)، حافظ ابن الجوزی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس موضوع پر کتابیں مرتب کی ہیں..... حافظ ابن الجوزی کی کتاب ”العلل المعنویۃ فی الاحادیث الواحیۃ“ طلبہ اور علماء کے ہاں مقبول اور متداول ہے۔ حافظ ابن حجر کی کتاب کا نام ”الزہر المظلول فی الغیر المعلوم“ ہے۔

3.4 غریب الحدیث:

اس علم میں ان روایات سے بحث کی جاتی ہے جن میں لغت کے لحاظ سے مشکل، دقیق اور قدیم الفاظ و کلمات وارد ہوتے ہوں..... ”غریب“ سے مراد وہ کلمات ہیں جو عام طور پر محاورہ میں استعمال نہ ہوتے

ہوں اور ان کے سمجھنے میں طلبہ کو دقت محسوس ہوتی ہو۔ غریب الحدیث کے مصادر دراصل حدیث کی دشمنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ فن اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں مہارت کے بغیر متون حدیث کے معانی اور مطالب تک رسائی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس علم میں سب سے پہلے ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ بصری (م ۲۱۰ھ) نے ایک رسالہ تالیف کیا۔ پھر ابو الحسن نصر بن شعیب مازنی (م ۲۰۳ھ) نے ایک معقول کتاب مرتب کی۔ اس کے بعد امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام (م ۲۲۳ھ) نے ایک ایسی کتاب لکھی جو طلبہ اور علماء حدیث کے ہاں بہت زیادہ مقبول رہی۔ امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام اس فن میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ بڑے محدثین حدیث کے غریب کلمات کی وضاحت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

امام ابن قتیبہ دینوری (م ۳۷۶ھ) اور امام زہری (م ۵۳۸ھ) نے بھی غریب الحدیث کے موضوع پر کام کیا۔ امام زہری کی کتاب ”الفسائق فی غریب الحدیث“ کو طلبہ اور علماء نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ علامہ زہری کو چونکہ عربی ادب کے ہر پہلو پر عبور تھا اس لئے ان کی کتاب کو استناد اور اعتماد کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد مجدالدین ابن الاثیر الجزری (م ۶۰۶ھ) نے ”النہایہ فی غریب الحدیث والاثار“ کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی۔ یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے۔ امام ابن الاثیر نے اپنے پیشرو مؤلفین کی مبالغہات کو مد نظر رکھ کر بہت جامع اور عمدہ کام کیا۔ اس کتاب کی تالیف کے بعد علمی حلقوں میں اس کو مرجع اور مصدق کی حیثیت حاصل ہوئی۔ جب تک علامہ محمد طاہر عفیٰ کی کتاب ”مجمع بحار الانوار“ منظر عام پر نہیں آئی تھی تب تک ”النہایہ“ کو ”النہایہ“ کی حیثیت حاصل تھی لیکن اب مجمع بحار الانوار نے اس کی جگہ لے لی ہے۔

3.5 ناسخ و منسوخ:

یہ علم ان احادیث متعارضہ سے بحث کرتا ہے جن میں جمع و تطبیق کا امکان نہ ہو اور بعض احادیث کو ناسخ اور بعض کو منسوخ قرار دیا جائے۔ (توضیح الافکار۔ ج ۲۔ ص ۴۱۲) حدیث ناسخ کے بارے میں آپ ﷺ نے بعض مقامات پر خود صراحت فرمائی ہے مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا اب ان کی زیارت کیجئے۔“

اور فرمایا ”میں تمہیں قربانی کے گوشت کا تین دن سے زیادہ ذخیرہ کرنے سے منع کیا کرتا تھا۔ اب تمہیں اجازت ہے کہ جب تک چاہو کھاؤ“..... یہ حدیث امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت بریدؓ کی سند سے نقل کی ہے۔

ناخ روایت کا پتہ علم سیرت اور تاریخ سے بھی چلتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”پچھنے لگوانے والے اور لگانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا“..... یہ حدیث آپ نے فتح مکہ سے پہلے جعفر بن ابی طالب کے حق میں فرمائی..... دوسری حدیث کے راوی حضرت ابن عباس ہیں کہ آپ ﷺ نے بحالت روزہ و احرام پچھنے لگوائے..... حضرت ابن عباس اپنے والد عباس بن عبدالمطلب کے ساتھ فتح مکہ کے موقع پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے..... اس سے معلوم ہوا کہ جعفر بن ابوطالب کے حق میں جو ارشاد آپ نے فرمایا تھا وہ پہلے کا ہے اور ابن عباس نے جو روایت نقل کی ہے وہ بعد کی ہے.....

ناخ و منسوخ پر کئی علماء نے تالیفی کام کیا۔ لیکن اس موضوع پر جس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ امام محمد بن موسیٰ الحازمی (م ۵۸۴ھ) کی ہے۔ اس کتاب کا نام ”الاعتبار فی بیان الناسخ و المنسوخ من الآثار“ ہے۔

یہ کتاب مصر، حلب اور حیدرآباد میں چھپ چکی ہے۔ شروع سے متداول اور مقبول ہے۔..... امام حازمی کے علاوہ امام احمد بن اسحاق دیناری (م ۳۱۸ھ)..... امام محمد بن بحر اصبہانی (م ۳۲۲ھ)..... امام ربیعہ اللہ بن سلامہ (م ۴۱۰ھ) اور حافظ ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) نے بھی رسائل اور کتابیں مرتب کیں۔

④ مصطلح الحدیث

اس علم میں ان اصطلاحات اور قواعد کی تعریف اور وضاحت سے بحث کی جاتی ہے جو علوم حدیث کے مصادر میں رائج اور متداول ہیں۔ حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے لئے اس فن کا جاننا از حد ضروری ہے اس لئے کہ اس کے بغیر وہ مصادر حدیث سے استفادہ نہیں کر سکتے اور ائمہ محدثین کی کاوشوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کو رس کا تعلق چونکہ ”قواعد و مصطلحات“ سے ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں علماء حدیث نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اجمالی جائزہ لیا جائے اور ان تالیفات کا تذکرہ کیا جائے جو حدیث کے طلبہ کے لئے اہم اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

4.1 المحدثات الفاصل بین الراوی والواعی:

اس کتاب کے مؤلف قاضی ابو محمد، حسن بن عبدالرحمن بن خالد المرمری (م ۳۶۵ھ) ہیں۔ مصطلح الحدیث پر یہ اولین کتاب شمار ہوتی ہے..... حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ یہ بہت ہی دقیق تالیف ہے۔

علماء حدیث کے ہاں شروع سے متداول اور رائج رہی..... حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس سے استفادہ کیا..... یہ کتاب بیروت سے 1971ء میں ڈاکٹر عجاج الخطیب کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

4.2 معرفة علوم الحدیث:

اس کتاب کے مؤلف امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ) ہیں۔ امام حاکم نیشاپوری ان حفاظ حدیث میں سے ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی علم حدیث کی ترویج اور خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس کتاب میں امام حاکم نے علم حدیث کی مختلف اقسام کا تذکرہ کیا ہے اور بنیادی و اساسی اصطلاحات و قواعد پر بحث کی ہے..... امام حاکم نے جن مباحث کو اس میں درج کیا ہے وہ حدیث کے طلبہ

کیلئے بہت مفید اور کارآمد ہیں یہی وجہ ہے کہ شروع سے لے کر آج تک اس کی افادیت برقرار ہے۔۔۔۔۔ یہ کتاب ڈھاکہ سے تعلق رکھنے والے پروفیسر سید معظم حسین کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ 1937ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ بعد میں بیروت سے بھی طبع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ جو ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

4.3 الکفایۃ فی علم الروایۃ:

امام احمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی (م ۴۶۳ھ) کی تالیف ہے۔ خطیب بغدادی بہت بڑے محدث، مؤرخ اور ادیب کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ نے حدیث کے مختلف پہلوؤں پر کام کیا۔ ”الکفایۃ“ آپ کی وہ تالیف ہے جس کی وجہ سے حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے حلقوں میں آپ کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہے۔۔۔۔۔ مصطلح الحدیث پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے مؤلفین نے الکفایۃ کو بنیاد بنایا ہے اور اس کے مباحث پر اعتماد کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ کتاب حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی اس وقت جو نسخہ متداول ہے اس پر تحقیق اور تعلیق کی ضرورت ہے۔

4.4 الجامع لأخلاق الراوی و آداب السامع:

یہ خطیب بغدادی کی دوسری تالیف ہے جس کا تعلق مصطلح الحدیث سے ہے۔ خطیب بغدادی کے بارے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: خطیب بغدادی نے قوانین روایت میں ”کتاب الکفایۃ“ اور آداب میں ”الجامع لأخلاق الراوی و آداب السامع“ لکھی ان دونوں کتابوں میں جامعیت بھی ہے اور افادیت بھی۔

ابو بکر بن نقطہ (م ۶۲۹ھ) کہتے ہیں: ”خطیب بغدادی کے بعد جتنے محدث گزرے ہیں سب ان کی کتابوں کے محتاج رہے“ (زہبہ: ص ۳۴) ”الجامع لأخلاق الراوی و آداب السامع“ ڈاکٹر محمود الطحان کی تحقیق کے ساتھ ریاض سے 1983ء میں شائع ہوئی ہے اور عام دستیاب ہے۔

4.5 الالماع إلى معرفة اصول الرواية وتقعيد السماع:

قاضی عیاض بن موسیٰ بن عیاض البیہقی الأندلسی الماکی (م ۵۴۴ھ) کی تالیف ہے یہ کتاب استاذ سید احمد صقر کی تحقیق کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہوئی ہے مفید اور عمدہ تالیف ہے۔

4.6 مقدمة ابن الصلاح:

اس کتاب کا اصل نام ”کتاب علوم الحدیث“ ہے اس کے مؤلف ابو عمرو عثمان بن الصلاح الشہر زوری (م ۶۶۱ھ) ہیں۔ حافظ ابن الصلاح جب دمشق تشریف لائے اور وہاں تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو طلبہ کی سہولت کیلئے ان متفرق مباحث کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جو آپ نے خطیب بغدادی اور دیگر ائمہ حدیث کی تالیفات سے اخذ کئے تھے۔ اس طرح یہ ایک مفید اور وسیع مجموعہ بن گیا۔ اس کتاب کو اتنی شہرت، مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہو گئی کہ خطیب بغدادی اور قاضی عیاض کا کام اوجھل ہو گیا۔ بعد کے جتنے محدثین آئے انہوں نے مقدمہ ابن الصلاح کو بنیاد بنا کر اس میدان میں مزید تالیفی کام کیا۔ یہ کتاب شروع سے متداول اور رائج رہی۔ مطبوع ہے اور عام دستیاب ہے۔

4.7 التقیید والایضاح:

اس کتاب کے مؤلف حافظ زین الدین عبد الرحیم بن الحسین العراقی (م ۸۵۲ھ) ہیں۔ یہ مقدمہ ابن الصلاح کی سب سے زیادہ خوبصورت اور عمدہ شرح ہے۔ مؤلف نے بعض مقامات پر استدراک بھی کیا ہے۔ مقدمہ ابن الصلاح کو پوری طرح سمجھنے کیلئے اس شرح کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ مقدمہ میں چونکہ اجمال اور اختصار ہے اس لئے اسے وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کا اس موضوع سے گہرا تعلق اور وسیع مطالعہ ہو۔ حافظ عراقی بذات خود بہت بڑے محدث اور شیخ ہیں۔ انہوں نے مقدمہ کی شرح اس انداز سے کی ہے کہ مشکل مقامات بڑی سہولت کے ساتھ سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

4.8 النکت علی ابن الصلاح:

یہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی تالیف ہے۔ مؤلف نے حافظ ابن الصلاح پر بعض مباحث میں استدراک بھی کیا ہے۔ مقدمہ ابن الصلاح کو سمجھنے کیلئے اس تالیف کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر بسیم بن ہادی عمیر کی تحقیق کے ساتھ دو جلدوں میں مدینہ منورہ سے 1984 میں شائع ہوئی۔

4.9 ارشاد طلاب الحقائق إلی معرفة سنن خیر الخلائق:

یہ کتاب امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی (م ۶۷۶ھ) کی تالیف ہے۔ مؤلف نے مصطلحات حدیث پر بہت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ خاص طور پر اقسام روایت کو بہت کھول کر بیان کیا ہے۔ بعد کے محدثین نے اس کتاب سے خوب استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر نور الدین عتر نے اس کتاب پر تحقیق و تعلیق کا کام کیا ہے۔ اور انتہائی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اس کے بعض مباحث پر حواشی میں عمدہ اور مفید بحث کی ہے۔ یہ کتاب دمشق سے 1988 میں چھپ چکی ہے۔

4.10 المنہل الروی فی الحدیث النبوی:

شیخ محمد بن ابراہیم بن جماعہ بدر الدین الکنانی الشافعی (م ۷۳۳ھ) کی تالیف ہے۔ یہ دراصل مقدمہ ابن الصلاح کا اختصار ہے لیکن ساتھ ساتھ مؤلف نے کچھ اضافے بھی کئے ہیں۔ بہت مفید اور مقبول کتاب ہے۔ ڈاکٹر محی الدین رضوانی کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ دمشق سے چھپ چکی ہے۔ اور عام دستیاب ہے۔

4.11 اختصار علوم الحدیث:

حافظ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، عماد الدین القرشی (م ۷۷۴ھ) کی تالیف ہے۔ یہ حافظ ابن الصلاح کے مقدمہ کا اختصار ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس میں اضافے بھی کئے ہیں۔ شیخ احمد محمد شاہ نے اس کی شرح ”الباعث الحثیث“ کے نام سے لکھی۔ یہ شرح بہت مفید اور وسیع ہے۔ اس کی وجہ سے کتاب کی افادیت

میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ طلبہ ”الباعث الحثیت“ کو اصل کتاب سمجھتے ہیں۔

4.12 خلاصۃ فی معرفۃ اصول الحدیث:

امام حسین بن محمد شرف الدین الطیبی (م ۷۴۳ھ) کی تالیف ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن جامع اور مفید ہے۔ شیخ صحیحی سامرائی نے اس پر تحقیق کی ہے جس کی وجہ سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ بغداد سے شائع ہوئی۔

4.13 فتح المغیث فی شرح الفیۃ الحدیث:

یہ کتاب مشہور مفسر، محدث، مورخ اور ادیب حافظ محمد بن عبدالرحمان السخاوی (م ۹۰۲ھ) کی تالیف ہے۔ مؤلف نے ”الفیۃ الحدیث“ جو حافظ عراقی کی منظوم کتاب ہے اس کی شرح کی ہے اس الفیۃ کی اور بھی بہت سی شروح ہیں لیکن جو مقبولیت اور پذیرائی حافظ سخاوی کی شرح کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کی شرح کو حاصل نہیں ہو سکی۔ حافظ سخاوی نے اس کتاب کی تالیف، ترتیب اور تبویب میں بہت عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ بعد کے محدثین نے اس کتاب سے خوب استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب پہلے ہندوستان میں چھپی تھی۔ بعد میں مکتبہ السلفیہ کے زیر اہتمام مصر میں چھپی..... اب الحمد للہ یہ عام دستیاب ہے۔ حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کیلئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

4.14 الإقتراح فی بیان الاصطلاح:

مشہور و معروف محدث اور فقیہ ابن دقیق العید، محمد بن علی بن وہب القشیری (م ۷۰۲ھ) کی تالیف ہے..... کتاب اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن جملہ مباحث پر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مکتبۃ الارشاد بغداد سے چھپ گئی ہے۔

4.15 المختصر لمعرفة علوم الحديث:

شیخ علی بن محمد بن علی، المعروف الشریف الجرجانی (م ۸۱۶ھ) کی تالیف ہے۔ مؤلف نے اس کی بنیاد ”الخلاصہ فی معرفۃ اصول الحدیث“ پر رکھی ہے۔ اس کتاب کو حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے ہاں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ علامہ عبدالحی لکھنوی نے ”ظفر الامانی“ کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ جس کی وجہ سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان سے کئی بار چھپ چکی ہے۔

4.16 تنقیح الأنظار فی علوم الآثار:

شیخ محمد بن ابراہیم بن علی المعروف بابن الوزیر (م ۸۴۰ھ) کی تالیف ہے۔ اس کتاب کی شرح محمد بن اسماعیل بن صلاح المعروف بالأمیر الصنعانی (م ۱۱۸۲ھ) نے لکھی۔ جس کا نام ”توضیح الأفكار“ ہے۔ یہ شرح بہت ہی مفید اور معلومات سے پُر ہے۔ امیر صنعانی کا انداز بیان چونکہ بہت عمدہ اور خوبصورت ہے۔ اس لئے دقیق مباحث کو بہت شستہ اور شگفتہ لہجے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے ہاں بہت پذیرائی حاصل ہے۔ یہ کتاب مصر سے کئی بار چھپ چکی ہے۔

4.17 نخبة الفکر:

حافظ ابن حجر عسقلانی کی تالیف ہے۔ یہ کتاب اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن جامع اور مفید ہے۔ نخبة الفکر سے پہلے حدیث کے طلبہ مقدمہ ابن الصلاح کو یاد کرتے تھے اور اسے اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن بسبب حافظ ابن حجر کی نخبة الفکر سامنے آئی تو طلبہ مقدمہ ابن الصلاح کو بھول گئے۔ اور ”نخبة الفکر“ کی طرف آئے۔ یہ کتاب بہت عمدہ اور سارے بنیادی مباحث کو شامل ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے خود نخبة الفکر کی شرح ”نزہة النظر“ کے نام سے لکھی۔ بعد کے علماء نے ”نخبة الفکر“ کی کئی شروح لکھیں اور ساری مقبول ہوئیں۔ ان میں ملا علی القاری کی شرح ”مصلحات اہل الأثر“ کے نام سے بہت مفید تصور کی جاتی رہی ہے۔

4.18 قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث:

اس کے مؤلف علامہ جمال الدین بن محمد بن قاسم (م ۳۲۲ھ) ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب بہت عمدہ اور اسلوب بہت خوبصورت ہے۔ اقسام روایت پر بہت تفصیلی معلومات جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب مصر سے کئی بار چھپ چکی ہے۔ اور عام دستیاب ہے۔

4.19 توجیہ النظر إلی علم الأثر:

شیخ طاہر بن صالح الجزاری (م ۱۳۳۸ھ) کی تالیف ہے۔ اس وقت علوم الحدیث پر جتنی کتابیں تالیف ہوئی ہیں۔ ان میں سے اگر کسی کتاب کو سب سے زیادہ مفید قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ ”توجیہ النظر“ ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کی تالیف میں انتہائی محنت سے کام لیا ہے اور بنیادی و اساسی معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اس پر تحقیق و تعلیق کا کام کیا ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں بہت ہی اضافہ ہو گیا ہے۔ کتاب بہت عمدہ ہے حدیث کے طلبہ اور اساتذہ اس کے مطالعہ سے مستغنی نہیں رہ سکتے۔

ان کتابوں کے علاوہ اب بہت ساری کتابیں رائج اور متداول ہیں اس لئے حدیث کے طلبہ کو چاہیے کہ پہلے مصادر اصلہ کا مطالعہ کریں۔ پھر مصادر ثانویہ کی طرف آئیں۔ اب جو کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں ان کا اسلوب عمدہ، دلچسپ اور دلکش ہے۔ مثلاً ڈاکٹر نور الدین عتر کی کتاب ”منهج النقد فی علوم الحديث“ بہت ہی دلکش اور دلچسپ ہے۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی ”لمحات من تاریخ السنة و علوم الحديث“ بہت ہی خوبصورت ہے۔ محمد السماحی کی ”المنهج الحديث فی علوم الحديث“ بھی بہت مفید اور دلچسپ ہے..... لیکن ان کتابوں کے مطالعہ سے وہ رسوخ اور وثوق حاصل نہیں ہوتا جو خطیب بغدادی، امام حاکم، حافظ عراقی، حافظ سخاوی اور حافظ ابن حجر کی کتابوں کے مطالعہ سے ملتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید لٹریچر کے ساتھ ساتھ مصادر اصلہ کا بھی مطالعہ کیا جائے اور قدیم و جدید دونوں اسالیب سے استفادہ کی کوشش کی جائے۔

خود آزمائی ②

- ۱- علم جرح و تعدیل سے کیا مراد ہے؟ بیان کیجئے۔
- ۲- مختلف الحدیث کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔
- ۳- ”علل الحدیث“ سے کون سا علم مراد ہے۔ اختصار کے ساتھ نشاندہی کیجئے۔
- ۴- ”غریب الحدیث“ کی اہمیت اور اس ضمن میں اہم مصادر کا تذکرہ کیجئے۔
- ۵- ”ناح و منسوخ“ سے کیا مراد ہے اس فن کی سب سے اہم اور بنیادی کتاب کا نام بتائیے۔
- ۶- ”مصطلح الحدیث“ کی تعریف کرتے ہوئے اہم اور بنیادی مصادر کی نشاندہی کیجئے۔



یونٹ نمبر ②

حجیتِ سنت

تحریر : ڈاکٹر علی اصغر چشتی
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی



فہرست عنوانات

43	یونٹ کا تعارف
44	یونٹ کے اغراض و مقاصد
45	① حجیت سنت
52	② تعلیم حکمت
55	خود آزمائی ①
56	③ اسوۂ رسول ﷺ
57	④ رسول اکرم ﷺ کا صحیح مقام
63	⑤ صحابہ کرامؓ اور سنت رسول ﷺ سے استدلال
68	خود آزمائی ②

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

اس وقت جو یونٹ آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کا تعلق ”حجیت سنت“ سے ہے..... شریعت کے دو مصادر ایسے ہیں جو بنیادی اور اساسی کہلاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا مصدر کتاب اللہ (قرآن مجید) اور دوسرا مصدر سنت رسول ﷺ ہے۔ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں اپنی امت کے افراد کو جہاں اور بہت سی ہدایات دیں وہاں یہ وصیت بھی فرمائی کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھیں اور فرمایا کہ جب تک لوگ ان دو بنیادوں کے ساتھ جوئے رہیں گے گمراہ نہیں ہوں گے۔ اور جب ان دونوں سے دور ہو جائیں گمراہ ہو جائیں گے..... یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کے علماء نے شروع سے لے کر آخر تک ان دونوں مصادر کی اہمیت اور حیثیت و حجیت کو اجاگر کرنے کیلئے اپنی جملہ صلاحیتوں کو استعمال کیا..... اور وسیع و عریض لٹریچر تخلیق کیا۔ پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی ہجری میں جب کچھ حضرات نے سنت کی حجیت کو موضوع بحث بنایا تو علماء نے اس موضوع پر باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ امام شافعی نے ”کتاب الرسالہ“ میں سنت کی حجیت پر بہت عمدہ بحث کی ہے۔ ان کے بعد آنے والے علماء نے حدیث، فقہ اور اصول پر جتنی کتابیں مرتب کیں ان میں حجیت سنت کا مستقل باب قائم کیا۔ اس یونٹ میں جو مواد جمع کیا گیا ہے اس میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں موضوع کو آسان اور عام فہم زبان میں واضح کیا جائے۔ جو آیات پیش کی گئی ہیں ان کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے اور مفہوم بھی پیش کیا گیا ہے..... آپ اس یونٹ کا توجہ اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کریں۔ امید ہے آپ اسے مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

یونٹ کے اغراض و مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇨ قرآن کی تشریح و تبیین میں رسول اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کی حیثیت پر گفتگو کر سکیں۔
- ⇨ رسول اکرم ﷺ کے اسلوب تعلیم پر بحث کر سکیں۔
- ⇨ رسول اکرم ﷺ نے قرآنی آیات کی قوی تشریح جس طرح فرمائی ہے اس کی مثالیں پیش کر سکیں۔
- ⇨ ”حکمت“ کے بارے میں محدثین کے اقوال بیان کر سکیں۔
- ⇨ اسوۂ رسول اور قرآن کریم کی تفسیر کے تعلق پر بحث کر سکیں۔
- ⇨ رسول اکرم ﷺ کے مقام و مرتبہ پر گفتگو کر سکیں۔
- ⇨ صحابہ کرامؓ اور سنت رسول ﷺ سے استدلال کے موضوع پر بات کر سکیں۔

① حجیت سنت

قرآن پاک دین و شریعت کی اصل و اساس ہے اور ازلہ شرع میں وہی سب سے مقدم اور سب سے محکم ہے مگر اس کا کام صرف اصول بتانا ہے۔ تفصیل، توضیح اور تشریح حدیث و سنت کا وظیفہ ہے..... قرآن کریم امت کو بلا واسطہ رسول نہیں دیا گیا تھا کہ لو تم بہ ذات خود یا دوسرے لوگوں کی مدد سے پڑھو اور سمجھو اور اس پر عمل کرو بلکہ اس کے نزول سے پہلے ایک برگزیدہ رسول کو دنیا میں بھیج کر ان پر قرآن نازل کیا گیا اور یہ صرف اس لئے کیا گیا تاکہ لوگ اپنے اپنے طور پر نہیں بلکہ صرف رسول کے بیان اور تشریح کی روشنی میں اللہ جل شانہ کی اس کتاب کو سمجھیں۔ اس بارے میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾..... (النحل)

”اور ہم نے یہ کتاب آپ کو عطا کی تاکہ آپ ان احکام کو پوری وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے بیان کریں جن کی راہنمائی کے لئے ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے۔ تاکہ وہ ان احکام کو اچھی طرح سمجھیں اور ان پر عمل کریں“

قرآن ہی کے ذریعہ رسول کے فرائض اور ان کے منصب سے دنیا والوں کو آگاہ کیا گیا اور بار بار اعلان کیا گیا کہ یہی تم کو قرآن کے کلمات و حروف سنائیں اور یاد کرائیں گے اور یہی تم کو اس کے معانی و مطالب اور رموز و حکم بھی سنائیں گے۔ اس ضمن میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ

الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾..... (البقرہ-۱۸۳)

”جس طرح کہ ہم نے تمہاری میں سے تمہارے پاس ایک رسول بھیجا جو تمہارے

سامنے ہماری آیتیں تلاوت کرتا ہے تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے“
دوسری جگہ فرمایا۔

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (آل عمران: ۱۷۳)

”اللہ جل شانہ نے اہل ایمان پر احسان فرمایا کہ انہی میں سے ان کے پاس ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے آیات تلاوت کرتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ اس سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے اور صحیح راستہ پر چلنا نہیں جانتے تھے“
ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾..... (الجمعة - ۱)

”اللہ جل شانہ وہ ذات ہے جس نے ایسے لوگوں کے پاس اپنا رسول بھیجا جو پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ یہ رسول ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ اس سے پہلے صحیح راستے سے ناواقف تھے۔

ان تینوں آیتوں میں دو چیزیں الگ الگ ذکر کی گئی ہیں:

(i) تلاوت آیات..... اور..... (ii) تعلیم کتاب

پہلی چیز یعنی تلاوت آیات کا مطلب تو ظاہر ہے۔ ہاں تعلیم کتاب کی بابت غور کرنا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد بھی قرآن کے مربوط و مرتب کلمات کو پڑھ کر سنانا اور یاد کرانا ہی ہے تو یہ تلاوت آیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہ اس سے الگ ذکر کی گئی ہے۔ پس یقیناً اس سے مراد آیات کی تشریح اس کے معانی و مطالب کی توضیح اور آیات کے حکم اور احکام کا بیان ہے۔

جب قرآن ہی سے یہ معلوم ہو چکا کہ رسول اللہ ﷺ کے فرائض رسالت میں جس طرح الفاظ و کلمات قرآن کی تلاوت و تبلیغ ہے۔ اسی طرح اس کے معانی و مطالب کا بیان بھی فرائض رسالت میں داخل ہے۔ اب لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس طرح متن قرآن حجت ہے اسی طرح اس کی نبوی تشریحات بھی حجت اور واجب القبول ہیں۔ ورنہ آپ ﷺ کو تعلیم کتاب کا مکلف بنانا اور تعلیم کتاب کو آپ کا منصبی وظیفہ بنانا بالکل بے معنی ہوگا۔

الغرض ان قرآنی نصوص کی رو سے رسول اللہ ﷺ جل شانہ کے پیغام رساں ہونے کے ساتھ اس پیغام کے معلم اور مبین بھی ہیں..... اور جب قرآنی نصوص سے آپ کا معلم و مبین قرآن ہونا ثابت ہو چکا تو جو شخص آپ کی رسالت و نبوت پر ایمان رکھتا ہے جس طرح اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ آپ تے متن قرآن کی تلاوت و تبلیغ فرمائی اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ آپ نے اس کی تعلیم و تبیین فرمائی اور چونکہ قرآن کریم اللہ جل شانہ کی آخری کتاب ہے اور رسول اللہ ﷺ آخری نبی ہیں اور اب کوئی نئی کتاب اور کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں ہے اس لئے آخری کتاب کا اس کے نزول کے وقت سے رہتی دنیا تک ہر دور میں محفوظ اور باقی رہنا ضروری ہے اور جب اس کی بقا ضروری ہے تو اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کیلئے رسول اللہ ﷺ کی قولی و عملی تشریحات و توضیحات کا بھی ہر دور میں منقول و متداول اور موجود رہنا ضروری ہے.....

مندرجہ بالا گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ:

- (i) قرآنی نصوص کی رو سے رسول اللہ ﷺ قرآن کے معلم، شارح اور مبین ہیں۔
 - (ii) آپ ﷺ نے جس طرح متن قرآن کی تبلیغ کی اسی طرح اس کی شرح و تبیین بھی فرمائی۔
 - (iii) آپ ﷺ کی تشریحات قرآنی کا قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہنا ضروری ہے۔
- رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی تعلیم دو طرح دی ہے۔

آپ ﷺ نے اپنے عمل سے بھی اس پر عمل کرنے کی صورت سکھائی اور اس کا مفہوم سمجھایا ہے..... اور اس کی قوی تشریح بھی فرمائی ہے۔..... عملی تشریح کی صورت یہ تھی کہ قرآن میں ایک حکم نازل ہوا۔ آپ ﷺ نے اس حکم پر عمل کر کے لوگوں کو دکھا دیا جس کی وجہ سے الفاظ قرآن کا مفہوم بھی متعین ہو گیا اور جس بات کا حکم ہوا ہے اس کا عملی نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے آ گیا..... مثلاً قرآن میں اقامتِ صلاۃ کا حکم نازل ہوا اور اس کے ارکان اور بعض اجزائے ترکیبی (مثلاً قیام، رکوع، سجود، قرأت وغیرہ) کا ذکر بھی قرآن میں کیا گیا۔ مگر ان اجزاء کو کسی خاص ترکیب کے ساتھ ادا کرنے کا بیان اور نماز کی پوری ترکیب اس میں کہیں ذکر نہیں کی گئی..... پس ان اجزاء کو خاص ترکیب کے ساتھ باہم مربوط کر کے نماز قائم کرنے کی ایک خاص شکل رسول اللہ ﷺ کے عمل سے متعین ہوئی۔

قرآن میں ﴿اقیموا الصلاۃ﴾ کا حکم دیکھ کر ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ضروری ہے کہ اس حکم پر عمل کس طرح کیا جائے۔ اور اقامتِ صلوٰۃ کا کیا طریقہ ہے؟ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ”صلُّوا کما رأیتُمونی اُصلی“ گویا اسی سوال کا جواب ہے۔

نیز حکم ”اقیموا الصلاۃ“ کی اس عملی تشریح کے علاوہ کبھی کبھی آپ نے اقامتِ صلاۃ کی ترکیب زبانی بھی ارشاد فرمائی۔

اسی طرح مثلاً قرآن میں حج کو فرض قرار دیا گیا مگر حج کا طریقہ اور ترتیب وار اس کے ارکان و

مناسک نہیں بیان کئے گئے تو رسول اللہ نے حج کہہ کے دکھا دیا کہ اس طرح اس فریضہ کی بجا آوری ہونی چاہیے اور اسی لئے قرآن کی تشریح و تبیین صرف آپ ہی کے قول یا عمل سے ہو سکتی ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں جہاں سارے حجاج تھے اعلان فرمایا:

((خذوا عني مناسككم، لعلي لا أراكم بعد عام هذا))

”لوگو! تم سب حج کے مناسک مجھ سے سیکھ لو۔ شاید اس سال کے بعد میں تمہیں نہ دیکھوں“

پھر قوی تشریح کی بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی کسی آیت کا ذکر یا اس کی طرف اشارہ کر کے اس کی تفسیر یا اس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے اس کو بیان فرماتے تھے..... اور دوسری صورت یہ تھی کہ اپنے وہی علم اور فہم مخصوص کی بنا پر جو استنباط و استفادہ آپ نے قرآن کریم سے کیا اس کو آیت کا حوالہ دیئے اور اس کی طرف اشارہ کئے بغیر بیان کر دیتے تھے۔ پہلی صورت کی ان گنت مثالوں میں سے یہاں صرف تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱..... رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ کو حق تعالیٰ پکارے گا۔ وہ کہیں گے (لَبَّيْكَ يَا رَبِّ) اللہ تعالیٰ پوچھے گا: تم نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ جواب دیں گے ہاں..... اس کے بعد ان کی امت سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس نوح نے ہمارا پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ تب اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ سے مخاطب ہوگا کہ تمہارے حق میں کون گواہی دے گا؟ وہ عرض کریں گے کہ محمد ﷺ اور ان کی امت۔ اس کے بعد امت محمدیہ ﷺ گواہی دے گی کہ حضرت نوحؑ نے پیغام پہنچا دیا تھا اور امت کی گواہی کی تصدیق رسول کرے گا (یعنی میں کروں گا)۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمانے کے بعد فرمایا کہ حق تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَجَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ میں یہی بیان ہے۔ (اصحح

للامام البخاری۔ کتاب التفسیر۔ عن ابی سعید الخدری)

۲..... حضرت عدی بن حاتم نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا ((الخیط الأبيض)) اور ((الخیط الأسود)) سے دو دھاگے مراد ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ((لا بل هو سواد اللیل و بیاض النهار)) ”نہیں بلکہ رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔“ (اصحح للامام البخاری۔ کتاب التفسیر)

۳..... حدیبیہ کے سفر میں حضرت کعب بن عجرہؓ کے سر میں بے انتہا جوئیں پڑ گئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا ”میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی تکلیف اور مشقت میں مبتلا ہو گئے ہو“ کیا تمہارے پاس ایک بکری ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا اچھا سر کے بال منڈواؤ اور تین روزے رکھ لو یا چھ مسکینوں کو فی مسکین ایک صاع کے حساب سے صدقہ دے دو۔ (اصحح للامام البخاری۔ کتاب التفسیر)

اس واقعہ میں بظاہر آیت کا حوالہ یا اشارہ نہیں ہے مگر ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ کا نزول چونکہ اسی واقعہ میں ہوا ہے اس لئے اس مثال کو اس ضمن میں ذکر کیا گیا۔

قرآن مجید کی قولی تشریح کی دوسری صورت میں احادیث نبویہ کا اکثر حصہ یا ان کی بہت بڑی تعداد داخل ہے یہ دوسری بات ہے کہ ایسی روایات کا قرآنی مآخذ اپنے علم و عقل کی کوتاہی اور قصور فہم کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن ایسی حدیثوں کی تعداد کم نہیں ہے جن کا قرآنی مآخذ تھوڑی سی توجہ اور تامل سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یہاں دو مثالیں اس ضمن میں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ)) تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ساری خواہشات میری ہدایات کے مطابق نہ ہوں..... اس کی نسبت بہت آسانی سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ارشاد قرآن مجید کی حسب ذیل آیات سے مستفاد ہے۔

(i) ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ
أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء: ۹۶)

”تیرے رب کی قسم! یہ لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک تجھے اپنے ہر قسم کے جھگڑے میں حکم تسلیم نہ
کر لیں۔ اور جب آپ حکم کی حیثیت سے ان کے درمیان فیصلہ کر لیں تو یہ اس فیصلہ کی وجہ سے کسی قسم کی تنگی
اور تکلیف محسوس نہ کریں اور آپ کا ہر فیصلہ خوشی سے قبول کریں۔

(۱)..... ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ
أَمْرِهِمْ﴾ (الاحزاب: ۵۴)

”کسی مؤمن مرد اور خاتون کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کیے گئے فیصلے میں
اپنے اختیار کے استعمال کے بارے میں تصور کریں۔

(۲)..... رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((من ملك زاداً أو راحلةً تبلغه ألى بيت الله ولم
يحج فلا عليه ان يموت يهودياً أو نصرانياً)) (رواه الترمذی عن علی والدارمی عن ابی
امامة)۔

”جس شخص کے پاس زادراہ اور ایسی سواری ہو جس کے ذریعہ وہ بیت اللہ تک سفر کر سکے۔ اس کے
باوجود وہ حج نہیں کرتا تو اب کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ یہودی ہو کر مرتا ہے یا نصرانی ہو کر مرتا ہے“

اس روایت کے بارے میں خود جامع ترمذی کی روایت میں اشارہ موجود ہے کہ یہ قرآن مجید کی
آیت ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ سے مستفاد ہے۔ مگر روایت میں چونکہ پوری آیت مذکور نہیں ہے۔
اس لئے بہت سے لوگوں کو وجہ استنباط سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ پوری آیت سامنے ہو تو اس کے آخری
حصہ سے صاف صاف وہ تہدید و تنبیہ مفہوم ہوتی ہے۔ جو حدیث میں مذکور ہے۔ آیت کے آخری حصہ میں
ہے ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾۔

اس گفتگو کا مدعا یہ ہے کہ احادیث نبویہ کا اکثر حصہ قرآن مجید کی تشریح یا تفصیل یا اس سے استنباط ہے جو ﴿يَعْلَمُهُمُ الْكِتَابُ﴾ اور ﴿لَتَبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ جیسے نصوص کے بموجب رسول اللہ ﷺ کے فرائض رسالت میں داخل ہے اور یہی قرآنی نصوص ہم کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ تشریحات اور استنباطات بھی واجب القبول اور واجب الاتباع ہیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کی بیان کی ہوئی ایک اور حقیقت پر غور کیجئے۔

تعلیم حکمت:

قرآن حکیم نے تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت بھی رسول اللہ ﷺ کا ایک فریضہ بتایا ہے۔ یہ حکمت کیا چیز ہے؟ اس کو سمجھنے کیلئے فکر صحیح اور فہم سلیم کی ضرورت ہے۔ حکمت کی مراد معلوم کرنے کیلئے سب سے پہلے خود قرآن مجید کی طرف رجوع کیجئے تو اس میں آپ کو ایسی متعدد آیات ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کو اللہ جل شانہ نے اتارا اور نازل کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (النساء: ۱۷۴)

”اور اللہ جل شانہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جس کا آپ کو علم نہیں تھا۔“

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ لِيُعْظَمَ بِهِ﴾ (البقرہ: ۲۹۴)

”اور اللہ جل شانہ کی نعمت کو یاد رکھو اور اس کتاب و حکمت کو بھی جو تمہارے اوپر نازل کی گئی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔“

سورۃ احزاب کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات کی طرح حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاوت ازواج مطہرات کے ہاں ہوتی تھی۔ ارشاد ہے۔

﴿وَأذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُنَّ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ﴾

(احزاب : ۴۳)

”اور اللہ جل شانہ کی کتاب کی آیات جو تمہارے سامنے تمہارے گھروں میں

تلاوت کی جاتی ہیں انہیں یاد کرو اور حکمت کو بھی یاد کرو“

سوال یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں قرآن کریم کی آیات کے علاوہ دوسری کیا چیز پڑھی جاتی تھی؟ اور رسول اللہ ﷺ ان کو قرآن کریم کے علاوہ کیا سناتے تھے؟..... اس سوال کا صرف یہی جواب ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی حدیث اور آپ کی سنت تھی لیکن آپ کے عام دینی نصائح اور دینی افادات وارشادات..... اور چونکہ اس آیت میں حکمت کے ذکر کا یعنی اس کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا حکم ہے اس لئے اس آیت سے حدیث و سنت کے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا وجوب بھی معلوم ہو گیا اور یہ بات بھی تقریباً بدیہی اور مسلم ہے کہ علم و ذکر اور حفظ مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ عمل کے لئے مقصود ہیں۔ اس لئے اسی آیت سے حدیث و سنت پر عمل کا واجب اور مامور بہ ہونا بھی معلوم ہو گیا.....

اور جب سنت ہی کا دوسرا نام حکمت ہے تو اس سے پہلی آیات سے (جن سے کتاب کی طرح حکمت کو بھی منزل من اللہ فرمایا گیا) ثابت ہوا کہ سنت بھی منزل من اللہ اور وحی خداوندی ہے۔

قرآن کے بعد جب ہم معلم قرآن ﷺ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو جس طرح قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے علاوہ ایک اور چیز بھی (جس کا نام حکمت ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر اتاری ہے اسی طرح معلم قرآن ﷺ کی تعلیمات بھی ہم کو یہی بتاتی ہیں۔

((ألا انى أوتيت القرآن و مثله معه)) (رواہ، ابی داؤد و ابن ماجہ و الدارمی عن المقدام بن

معدی کرب) ”مجھے قرآن عطا کیا گیا ہے اور اس جیسی ایک چیز اور بھی عطا کی گئی ہے۔“

کتاب و سنت کے انہی نصوص کی بنا پر تمام ائمہ کرام و علمائے سلف اس بات میں متفق ہیں کہ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اور اس طرح کی دوسری آیات میں جو حکمت کا لفظ وارد ہوا ہے اس سے مراد سنت ہی ہے۔ اور سنت بھی وحی الہی کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

(ان الله سبحانه و تعالى انزل على رسوله وحيين ووجب على عباده الايمان بهما والعمل بما فيهما وهم الكتاب والحكمة وقال تعالى: وانزل الله عليك الكتاب والحكمة“ وقال تعالى: هو الذي بعث في الاميين رسولا منهم يتلوا عليهم آياته وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وقال تعالى: واذكرن مايتلى عليكم في بُيُوتِكُنَّ من آيات الله و الحكمة والكتاب هو القرآن، والحكمة هي السنة باتفاق السلف وما أخبر الرسول عن الله فهو في وجوب تصديقه والايمان به كما أخبر به الرب تعالى على لسان رسوله، هذا أصل متفق عليه بين أهل الاسلام ، لاينكره الا من ليس منهم، وقد قال النبي ﷺ : انى أوتيئ الكتاب و مثله معه) (كتاب الروح: ص ۹۲)

”اللہ جل شانہ نے اپنے رسول پر دو قسم کی وحی نازل کی اور دونوں پر ایمان لانا اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس پر عمل کرنا واجب قرار دیا اور وہ دونوں قرآن اور حکمت ہیں (اس کے بعد علامہ ابن قیم نے اس دعویٰ کے ثبوت میں قرآنی آیات درج کی ہیں جو اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ جن میں کتاب و حکمت کی تزییل و تعلیم کا ذکر اور ان کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا حکم ہے ان آیات کو درج کرنے کے بعد امام ابن قیم لکھتے ہیں) کتاب تو قرآن ہے اور ”حکمت“ سے باجماع سلف سنت مراد ہے۔“

رسول اللہ نے اللہ تعالیٰ سے پا کر جو خبر دی اور اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے جو خبر دی دونوں واجب التصدیق ہونے میں یکساں ہیں۔ یہ اہل اسلام کا بنیادی اور متفق علیہ مسئلہ ہے اس کا انکار وہی کرے گا جو ان میں سے نہیں ہے خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور چیز بھی دی گئی ہے، یعنی سنت.....

خود آزمائی ①

- ۱۔ قرآنی آیات کی تشریح و تبیین میں رسول اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کی کیا حیثیت ہے؟
- ۲۔ رسول اکرم ﷺ کے اسلوب تعلیم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
- ۳۔ رسول اللہ ﷺ نے قرآنی آیات کی تشریح اپنے اقوال کے ذریعہ کس طرح فرمائی ہے؟
- ۴۔ ”حکمت“ سے کیا مراد ہے اس کے بارے میں محدثین کے اقوال بیان کیجئے۔

اسوۂ رسول ﷺ

رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کی جو تشریح و تبیین فرمائی اور وہ حکمت جو آپ پر نازل کی گئی ہر مومن کیلئے ان دونوں کا واجب القبول ہونے کے بارے میں بات واضح ہو گئی۔ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری چیز جس کی پیروی ہر مومن پر قرآن کریم نے لازمی قرار دی ہے وہ ہے پوری اسلامی و مذہبی زندگی کا وہ نمونہ جو رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس میں جلوہ گر تھا..... سورۃ احزاب میں ارشاد ہے

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ
الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾ (الاحزاب: ۳۴)

”درحقیقت تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے اس شخص
کیلئے جو اللہ جل شانہ کی رضا چاہتا ہے آخرت میں کامیابی چاہتا ہے اور اللہ جل
شانہ کو ہر وقت یاد کرتا ہے“

اس آیت میں اللہ جل شانہ نے زندگی کے ہر مرحلہ میں رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلنے کا حکم ہم کو
دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف جنگ کی حالت میں اور پریشانی کے موقع پر آپ کے صبر و ضبط کی مثال سامنے
رکھنے اور فقط اس کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہو جیسا کہ اس آیت سے متعلق آج کل کے بعض حضرات کو
غلط فہمی ہوئی ہے اس لئے اس کی تو کوئی کمزور سے کمزور وجہ نہیں ہو سکتی کہ جنگ کے موقع پر تو آپ کا طرز عمل
واجب الاتباع ہے مگر امن و صلح کے موقع پر آپ کا طرز عمل لازم الاتباع نہیں ہے یا باب جہاد میں تو آپ کی
ذات میں ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے مگر اقامت صلوٰۃ و ادائے حج کے باب میں آپ کی ذات میں ہمارے
لئے کوئی قابل تقلید نمونہ نہیں..... یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ پر اس شخص کو جو اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ
کرتا ہو رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا حکم بالکل عموم و اطلاق کے ساتھ کیا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (آل عمران: ۳۳)

یہاں اللہ جل شانہ کی محبت کا معیار مطلقاً نبی کا اتباع قرار دیا گیا اگر رسول کی ذات اسوہ عمل نہیں ہے اور قرآن کے ماننے والے اس کی پیروی کے پابند نہیں ہیں تو بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے اپنی پیروی کرانے کو کیوں کہا؟..... یہ کہنا تو عقل و فہم کے نقص کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ”میری پیروی کرو“ کا مطلب صرف اتنا ہے کہ میں جو قرآن سناتا ہوں اس کو سن لو اس لئے کہ اتباع یا پیروی یا پیچھے چلنے کا یہ مطلب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوتا۔ ان الفاظ کے معنی تو کسی کے طرز عمل کی تقلید اور کسی کے طور طریقہ پر کاربند ہونے ہی کے آتے ہیں.....

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن پر ایمان رکھنے والوں کو محض قرآن کے ماننے اور اپنے اپنے طور پر اس کو سمجھنے اور اپنے اپنے فہم کے مطابق اس پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ قرآن کریم کے ساتھ حکمت کو بھی ماننے اور قبول کرنے اور اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو اسوہ عمل قرار دینے کے بھی وہ مامور ہیں نیز قرآن پاک کو رسول سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ انہی تعلیم، تمہین اور تشریح کی روشنی میں سمجھنے کے وہ مکلف ہیں۔

رسول اللہ نے قرآن کریم کی جو تمہین فرمائی اور تعلیم دی اور وہ حکمت جو آپ پر اتاری گئی، نیز آپ کی پوری زندگی جس کا مکمل نقشہ ان حضرات نے ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ جنہوں نے اس زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔ انہی تینوں چیزوں کا نام ”حدیث و سنت“ ہے اور نصوص کتاب اللہ کی رو سے ان تینوں کے واجب القبول ہونے کا مطلب بالفاظ دیگر یہ ہے کہ قرآن، حدیث و سنت کو واجب القبول اور واجب الاتباع کے قرار دیتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا صحیح مقام:

حدیث و سنت کی حجیت کے بارے میں جن حضرات کو شک و شبہ ہے ان کی بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ انہوں نے رسول کی حیثیت اور اس کے صحیح مقام کو نہیں سمجھا ہے۔ اگر یہ حضرات مقام نبوت کو سمجھنے اور نبی و

رسول کی معرفت حاصل کرنے کیلئے صرف قرآنی آیات میں غور و فکر کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی حیثیت صرف ایک پیغامبر اور پیغام رسان ہی کی نہیں ہے بلکہ آپ مطاع، متبوع، امام، ہادی، قاضی، حاکم اور حکم وغیرہ بھی ہیں۔ اور قرآن ہی نے آپ کی ان حیثیتوں کو بیان کیا ہے.....

(۱)..... رسول مطاع ہے اور اسکی اطاعت اہل ایمان پر فرض ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے ﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ ”اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو“ اس حکم میں ”أَطِيعُوا الرَّسُولَ“ کو ”أَطِيعُوا اللَّهَ“ سے الگ مستقل جملہ کی شکل میں قرآن مجید میں جس طرح مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے اس سے ہر وہ شخص جس کو عربی زبان کا کچھ بھی ذوق ہو یہی سمجھے گا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح اہل ایمان پر رسول کی اطاعت بھی مستقل فرض ہے۔ یعنی اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتاب رسول لائے ہیں اس کو مانا جائے اور اس کے حکموں پر چلا جائے کیونکہ اگر صرف اتنی ہی بات کہنی ہوتی تو یہ ”اطیعوا اللہ“ میں کہی جا چکی تھی۔ پھر امر اطاعت کے مستقل اعادہ کے ساتھ ”اطیعوا الرسول“ کے اضافہ کی کیا ضرورت تھی.....

علاوہ ازیں خود قرآن مجید کی بعض دوسری آیات سے یہ بات اور زیادہ صاف اور واضح ہو جاتی ہے..... سورہ نساء کے پانچویں رکوع کے آخر میں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دینے کے بعد ان منافقین کی مذمت کی گئی ہے جو اپنی غرض پرستی اور منافقت کی وجہ سے اللہ و رسول کی اطاعت میں کوتاہی کرتے تھے۔ اسی سلسلہ بیان میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا﴾ (النساء ۶۳)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی طرف آؤ جو اللہ جل شانہ نے نازل فرمایا ہے اور رسول ﷺ کی طرف آؤ تو آپ دیکھیں گے کہ منافقین آپ سے روگردانی اور اعراض کرتے ہیں۔

اس آیت میں ”مَا أَنْزَلَ اللَّهُ“ (یعنی کتاب اللہ) کی طرف بلانے کے ساتھ ”رسول“ کی طرف بلانے کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے وہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں اطاعت رسول کا جو حکم دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کی طرف سے اس پر نازل ہونے والی کتاب کی اطاعت کرو بلکہ رسول کی اطاعت اس سے الگ اور مستقل چیز ہے۔ اور بھی سورۃ کے اسی رکوع میں دو ہی آیتوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ہر رسول کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (نساء - ۶۴) اور ہم نے جو بھی ”رسول“ بھیجا ہے وہ اس مقصد کیلئے بھیجا ہے کہ لوگ اس کی اطاعت اللہ جل شانہ کے حکم کے مطابق کریں.....

۲..... رسول من جانب اللہ ہادی اور امام ہوتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا﴾ (الانبیاء - ۵۴)

”اور ہم نے ان انبیاء کو امام اور پیشوا کی حیثیت عطا کی۔ یہ ہمارے حکم کے مطابق اپنی اپنی قوم کے افراد کی رہنمائی کرتے تھے“

۳..... رسول اللہ ﷺ منجانب اللہ حاکم اور ”حکم“ بھی قرار دیئے گئے تھے۔ اور ہر اختلاف و نزاع میں آپ کو حکم بنانا اور آپ کا فیصلہ دل و جان سے ماننا تمام اہل ایمان کیلئے فرض بلکہ شرط ایمان قرار دیا گیا۔ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا

فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء - ۹۴)

اور دوسری جگہ ان الفاظ کے ساتھ فرمایا

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ

الْخِيفَةُ مِنْ أَمْرِهُمُ﴾ (الاحزاب - ۳۵)

اور سورۃ النور میں فرمایا:

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ، أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾

اہل ایمان کو جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان کسی معاملہ میں فیصلہ دیں۔ تو ان کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ ”سمعنا واطعنا“ ہم نے سن لیا۔ ہم نے مان لیا۔ مختصر یہ کہ یہ سب آیتیں اس باب میں نص صریح ہیں کہ مسلمانوں کے جس معاملہ میں رسول جو فیصلہ کریں وہ واجب التسلیم ہے اور کسی مسلمان کو اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔

۵..... کسی شخص کی کامیابی اور فوز و فلاح کے لئے جس طرح اللہ جل شانہ کی اطاعت ضروری ہے اسی طرح رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے..... اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی گمراہی اور بد بختی ہے اسی طرح رسول کی نافرمانی بھی موجب ضلالت و شقاوت ہے۔ ارشاد ہے:

﴿مَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾ (الاحزاب : ۸۰)
 ”جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہر قسم کی کامیابی حاصل کی“
 ﴿وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا﴾ (الاحزاب : ۵۴)
 ”اور جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو وہ بڑی کھلی گمراہی میں جا پڑا“

قرآن بتاتا ہے کہ کفار دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر کف افسوس ملیں گے اسی طرح رسول کی نافرمانی پر بھی افسوس کریں گے.....

﴿وَيَوْمَ تَقْلُبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَلَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ﴾ (الاحزاب : ۸۰)
 ”جس دن آگ میں ان کے منہ او بندھے ڈالے جائیں گے اس دن کہیں گے: کاش

ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا کہا مانا ہوتا۔“
دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يُؤَذُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصُوا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّى بِهِمُ الْأَرْضُ﴾
(النساء: ۶۴)

”اس دن وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں رہتے ہوئے کفر کی راہ اختیار کی اور رسول کی نافرمانی کی آرزو کریں گے کہ زمین کے برابر کر دیئے جائیں۔ یعنی خاک ہو کر زمین کا جزو بن جائیں اور عذاب سے بچ جائیں۔“
مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ رسول کی نافرمانی کی کوئی بات بھی آپس میں نہ کریں.....

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَّخِجُوا بِالْأَنفِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُولِ﴾ (المجادلة: ۲۴)

”اے ایمان والو! جب تم آپس میں بیٹھ کر چپکے چپکے باتیں کرو تو گناہ، ظلم و زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی کوئی بات نہ کرو۔“

۵..... رسول اللہ ﷺ جو دیں اس کو قبول کرنا اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جانا واجب ہے۔

﴿مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (الحشر: ۱۰۴)

”رسول تم کو جو دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔“

مقصد یہ کہ رسول تمہیں جو ہدایت اور حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس کام کے کرنے سے تمہیں روکیں اس سے رک جاؤ۔

۶..... ایک مؤمن کا اپنی جان پر جتنا حق ہے اس سے زیادہ اس کی جان پر نبی کا حق ہے۔

﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾ (الاحزاب: ۱۰۴)

۷..... اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے رسول کو بھی راضی کرنا ضروری اور شرط ایمان ہے۔

﴿وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (التوبہ: ۱۸.۴)

”اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو راضی رکھنا اہل ایمان کے لئے بہت ضروری ہے“

۸..... اللہ تعالیٰ کی طرح اس کے رسول کو بھی دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب رکھنا ضروری ہے

جو لوگ ایسا نہ کریں وہ فاسق اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے محروم رہنے والے ہیں۔

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاءُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا، وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا، أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ (التوبہ: ۳۴)

”اے پیغمبر! مسلمانوں کو بتا دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور تمہارا کمایا ہوا مال اور تمہاری تجارت، جس کے بند ہو جانے سے تم ڈرتے ہو اور تمہارے رہنے کے مکانات، جن کو تم بہت پسند کرتے ہو۔ اگر یہ ساری چیزیں تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جدوجہد کرنے سے۔ تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ فرمادے اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

۹..... اللہ کے رسول جب کسی کام کیلئے دعوت دیں اور پکاریں تو اس پر لبیک کہنا مؤمن پر فرض ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ﴾

(الانفال: ۳۴)

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو جب وہ تمہیں اس کام کی طرف

بلائیں جس میں تمہاری حیات ہے۔

۱۰..... رسول اللہ ﷺ جب کسی کام کے لئے لوگوں کو بلائیں تو بلا اجازت اٹھ کر چلا جانا کسی مومن کے لئے جائز نہیں اور جوابیا کریں گے ان کے لئے عذاب الیم کا اندیشہ ہے۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْ يَكُونُوا مَعَهُ عَلَى أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتَّى يَسْتَأْذِنُوهُ﴾ (النور : ۵۴)

”اہل ایمان وہ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کو مانا ہے اور جن کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کسی اجتماعی کام میں اس کے رسول کے ساتھ ہوتے ہیں تو کہیں نہیں جاتے تا وقتیکہ اس سے اجازت نہ لے لیں“

اسی سلسلہ میں ان لوگوں کے بارے میں جو بلا اجازت چپکے سے سرک جاتے تھے فرمایا گیا ہے۔

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (النور : ۹۰)

”ان لوگوں کو آزمائش اور فتنہ میں مبتلا ہونے سے ڈرنا چاہیے جو رسولؐ کے حکم اور ہدایات کے خلاف چلتے ہیں۔ انہیں اس عذاب سے بھی ڈرنا چاہیے جو بہت دردناک اور سخت ہے“

رسول کے مقام و منصب کا بیان ایک مستقل موضوع ہے اگر اس کا تفصیلی مطالعہ قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا جائے تو سینکڑوں آیات اور احادیث بآسانی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ یہاں اختصار کے ساتھ چند آیات پیش کی گئی ہیں۔ آپ ان آیات کی تفسیر اور تفصیل کے لئے اگر مختلف تفاسیر کا مطالعہ کریں تو اسے بہت مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

صحابہ کرامؓ اور سنت رسول ﷺ سے استدلال:

صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے بلا تردد اور بلا چون و چرا استدلال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سارے واقعات منقول ہیں۔ یہاں اجمال کے ساتھ چند واقعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے..... سیدنا

ابو بکر صدیقؓ کے پاس جب کوئی قضیہ آتا تھا تو پہلے وہ کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے اگر کتاب اللہ میں ان کو فیصلہ مل جاتا تو وہی فیصلہ صادر فرماتے اس میں ناکامی کی صورت میں اگر رسول اللہ ﷺ کی کوئی سنت اس باب میں انہیں معلوم ہوتی تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اگر خود ان کو اس باب میں کسی سنت کا علم حاصل نہ ہوتا تو باہر نکل کر دوسرے صحابہ سے دریافت فرماتے کہ ایک اس طرح کا معاملہ میرے پاس آیا ہے۔ اگر تم میں سے کسی کو معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے معاملہ میں کیا فیصلہ کیا ہے تو بتاؤ۔ پھر ایسا ہوتا تھا کہ بعض اوقات کئی کئی آدمی اکٹھا ہو کر بتاتے تھے کہ ہاں اس صورت میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ کیا تھا اس وقت ابو بکر صدیقؓ فرماتے۔ ((الحمد لله الذي جعل فينا من يحفظ عن نبينا)) ”اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں ہمارے نبی کی باتیں یاد ہیں اور وہ ان باتوں کو یاد رکھتے ہیں“..... (تاریخ الخلفاء ص ۲۹)

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد سب سے پہلا اور سب سے مشکل مسئلہ یہ سامنے آیا کہ آپ کا جانشین کس کو مقرر کیا جائے۔ اس مسئلہ کا حل صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کی سنت میں تلاش کیا..... طبقات ابن سعد میں حضرت علیؓ کا قول منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد ہم نے مسئلہ جانشینی میں غور و فکر کیا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر صدیقؓ کو اپنی زندگی میں نیاز کے لئے آگے بڑھایا (یعنی امام مقرر کیا) تو جس کو آپؐ نے ہمارے دین کے لئے پسند کیا تھا ہم نے اس کو اپنی دنیا کے لئے بھی پسند کر لیا۔ اور ابو بکرؓ کو آگے بڑھایا (خليفة رسول منتخب کر لیا)۔

وصال نبوی ﷺ کے بعد ایک مسئلہ آپ ﷺ کے دفن کا تھا اس میں اختلاف رائے تھا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے۔ اس کا فیصلہ بھی حدیث نبویؐ سے ہوا..... ابن اثیر الجزری لکھتے ہیں کہ جب یہ اختلاف رائے ہوا تو ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”ہر نبی اپنی اسی خوابگاہ کے نیچے مدفون ہوتا ہے جہاں اس کی روح قبض کی گئی ہو“..... یہ سنت ہی سارا اختلاف ختم ہو گیا اور باتفاق رائے رسول اللہ ﷺ اسی مقدس سرزمین میں جہاں آپ کی روح پاک قبض کی گئی تھی سپرد خاک کئے

گئے۔ (الکامل: ج ۳- ص ۲۲۵)

تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم واقعہ جمع قرآن کا واقعہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو جب یہ مشورہ دیا کہ قرآنی آیات کو یکجا کر دیا جائے اور ابتدا سے انتہاء تک یکجا لکھ کر ایک مصحف کی شکل میں مدون کر دیا جائے تو ابو بکر صدیقؓ ابتدا بار بار یہی فرماتے تھے۔

(کیف افعّل شیئاً لم یفعله رسول اللہ ﷺ) ”میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا“..... پھر ابو بکر صدیقؓ کو شرح صدر ہو گیا اور انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو بلا کر جمع آیات کی اہم خدمت ان کے سپرد کرنا چاہی تو ابتدا میں انکو بھی تامل ہوا اور وہ بھی یہ کہتے تھے۔ (کیف تفعلان شیئاً لم یفعله رسول اللہ ﷺ)..... لیکن بعد میں اللہ جل شانہ نے ان کے سینہ کو بھی کھول دیا اور شیخین کی رائے کا حق ہونا ظاہر کر دیا تو وہ اس خدمت کی انجام دہی پر کمر بستہ ہو گئے..... اس واقعہ کے نقل کرنے کے سے یہ مقصد ہے کہ اس سے نمایاں طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ہر کام پر اقدام کرنے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی سنت کی تلاش و جستجو ہوتی تھی۔ یہی ان کی روش اور ان کا راستہ تھا۔

پاریسیوں کا علاقہ اسلامی مقبوضات میں داخل ہونے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کو فکر لاحق تھی کہ پاریسیوں سے جزیہ لیا جائے یا نہیں (اس لئے کہ قرآن مجید میں صرف اہل کتاب سے جزیہ لینے کا ذکر ہے اور قرآن کی زبان میں اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ مراد ہوتے ہیں) تا آنکہ عبدالرحمن بن عوف نے شہادت دی کہ رسول اللہ ﷺ نے خمر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے۔ تب عمر فاروقؓ نے پاریسیوں سے جزیہ لیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ ایک عورت نے اپنے شوہر کی وفات کے صرف چالیس دن بعد بچہ جنا تو اس کی عدت پوری ہوگئی یا نہیں؟..... حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ وضع حمل اور چار ماہ دس دن پورے ہونے میں سے جو بعد میں واقع ہوگا اس سے عدت پوری ہوگی۔ اس مجلس میں ابوسلمہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ بھی موجود تھے۔ ابن عباسؓ کا جواب سن کر ابوسلمہؓ نے کہا۔ قرآن میں ہے: ﴿وَأُولَٰئِ الْأَحْمَالُ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ ”حمل والی عورتوں کی عدت وضع

حمل ہے۔..... ابوسلمہ کا مطلب یہ تھا کہ صورت مسکولہ میں عدت پوری ہو گئی یہ سن کر حضرت ابو ہریرہؓ بولے کہ میں بھی اپنے بھتیجے ابوسلمہ سے اتفاق کرتا ہوں تب ابن عباس نے اپنے غلام کرب کو حضرت ام سلمہ کے پاس بھیجا۔ (انہوں نے سوال سن کر) فرمایا۔ سبیعہ اسمیہ حاملہ تھیں کہ اسی حالت میں ان کے شوہر شہید کر دئے گئے۔ واقعہ شہادت کے چالیس دن بعد سبیعہ کے بچہ پیدا ہوا اور نکاح کے پیغام آنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا نکاح کرادیا۔..... حافظ ابن حجر اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن عباس کے شاگرد اور تابعین کا قول جمہور کے موافق ہے۔

سنان ابو داؤد اور جامع ترمذی میں ہے کہ رومی سلطنت اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ایک معاہدہ کی رو سے ایک خاص مدت تک جنگ بند تھی۔ جب وہ مدت قریب ہوئی تو حضرت معاویہؓ نے اپنی فوج کے ساتھ دشمن کے ملک کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مدت کے اندر جنگ تو شروع نہیں کریں گے لیکن ان کے قریب پہنچ جائیں گے اور جب مدت ختم ہو جائے گی تو اچانک یکبارگی دھاوا بول دیں گے۔ ایک دن حضرت معاویہؓ گودور سے ایک سوار آتا دکھائی دیا جو بلند آواز سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا: اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ عہد کو پورا کرنا ہے توڑنا نہیں ہے۔

لوگوں نے بغور دیکھا تو وہ سوار حضرت عمرو بن عبسہؓ صحابی تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ان سے پوچھا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جس شخص کا کسی قوم سے کوئی معاہدہ ہو تو اس عہد میں کوئی رد و بدل نہ کرے۔ جب تک کہ اسکی مدت گزر نہ جائے یا اس قوم کو مطلع نہ کر دے۔ حضرت معاویہؓ یہ سن کر اپنی فوج کے ساتھ دارالاسلام کو واپس ہو گئے۔

تاریخ کامل اور دیگر کتب تاریخ میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوف اور تمام صحابہ نے حضرت عثمان کو خلیفہ منتخب کرنے کے بعد ان الفاظ کے ساتھ بیعت کی تھی۔ ((نبایعک علی کتاب اللہ و سنتہ رسولہ و سنتہ الخلیفتین بعدہ))

”ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت اس شرط پر کرتے ہیں کہ آپ کتاب اللہ، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور دونوں سابق خلفاء کی روش پر عمل کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ جب تک اس دنیا میں رونق افروز رہے امت نے آپ کی اور آپ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کو حجت کی حیثیت دی اور آپ کے ارشادات کو بلا واسطہ سننے والے اور آپ کے افعال و اعمال کو چشم خود دیکھنے والے صحابہ کرام نے علم و ہدایت کے اس پورے خزانہ کی غیر معمولی اہتمام اور شغف کے ساتھ حفاظت کی اور پوری امانت و دیانت کے ساتھ بعد والوں کو پہنچایا۔ پھر بعد کی صدیوں میں اللہ جل شانہ نے آپ کی امت کے بہترین افراد کو احادیث و سنن کے اس بے پایاں دفتر کی تدوین و ترتیب، تحقیق و تنقید، تعلیم و تعلم، حفظ و اشاعت اور اس سے متعلق بہت سے مستقل علوم و فنون کی ایجاد اور پھر ہر فن میں بہتر سے بہتر تالیف و تصنیف وغیرہ وغیرہ سینکڑوں قسم کی خدمات کی ایسی توفیق دی جو کبھی کسی قوم اور کسی امت کو نہیں ملی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ خاتم الانبیاء ﷺ کو اس دنیا سے گئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن آپ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کی روشنی ہر راہ کیلئے آج بھی ایسی ہی موجود ہے جیسی کہ قرن اول میں تھی..... اور حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ نبوت ختم کر دئے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاتم النبیین ﷺ کی ہدایات و تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی حفاظت کا یہ انتظام ہونا ضروری بھی تھا جبکہ آپ کے بعد کوئی نیا پیغمبر اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے۔ اور آپ ہی اس دنیا کی آخری نسل تک کیلئے جب نبی ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کی تعلیمات و ہدایات اور آپ کا اسوۂ حسنہ اس دنیا کے آخری دن تک محفوظ رہے تاکہ ہر زمانے کے طالبان ہدایت اس سے وہ روشنی اور وہ نور حاصل کر سکیں جو آپ کے زمانہ میں آپ پر ایمان لانے والے خوش نصیب آپ کی مقدس اور منور ہستی سے حاصل کیا کرتے تھے..... آج کوئی دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ گزشتہ چودہ صدیوں میں اللہ جل شانہ کی طرف سے مسلسل یہ انتظام رہا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ آئندہ بھی یہ خداوندی انتظام یوں ہی رہے گا اور اس موقع کیلئے جب جس خدمت کی ضرورت ہوئی اللہ جل شانہ کی طرف سے کچھ بندوں کو اس کی توفیق ملتی رہے گی۔

خود آزمائی ②

- ۱- ”اسوہ حسنہ“ سے کیا مراد ہے اس ضمن میں محدثین کا نقطہ نظر بیان کیجئے۔
- ۲- کیا اسوہ رسول کو مد نظر رکھ کر قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح کی جاسکتی ہے۔
- ۳- رسول اکرم ﷺ کی اطاعت اور اتباع میں کیا فرق ہے۔ صحابہ کرام کا اس بارے میں کیا رویہ تھا۔ بیان کیجئے۔
- ۴- کیا صحابہ کرامؓ سنت رسول اللہ ﷺ سے استدلال کرتے تھے۔ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو اس کی مثالیں پیش کیجئے۔



پونٹ نمبر ③

مطالعہ حدیث کی اہمیت

تحریر : ڈاکٹر محمد ادریس زبیر
نظر ثانی : ڈاکٹر علی اصغر چشتی



فہرست مضامین

73	یونٹ کا تعارف
74	یونٹ کے اغراض و مقاصد
75	① حدیث کا مطالعہ ضروری کیوں ہے؟
78	1.1 قرآن فہمی حدیث کے بغیر ممکن نہیں۔
85	② مضامین کے اعتبار سے احادیث کی تقسیم
85	2.1 قسم اول
86	2.2 قسم دوم
87	2.3 قسم سوم
90	③ اجتہاد و استنباط کے لئے حدیث کی ضرورت
94	④ سیرت اور حدیث کا باہمی تعلق
98	⑤ ترویجِ علم حدیث کیلئے علماء کی خدمات
103	خود آزمائی

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات! اس وقت آپ جس یونٹ کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کا تعلق ”مطالعہ حدیث کی اہمیت“ سے ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پہلی صدی سے لے کر آج تک مسلمان علماء نے جتنی خدمت حدیث کی ترویج اور تطویر کے لئے کی اتنی خدمت کسی اور علم اور فن کی تدوین و ترویج کیلئے نہیں کی۔ علماء نے حدیث کی طرف اتنی زیادہ توجہ کیوں دی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے بہت سے جوابات ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں جو بنیادی نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ حدیث کا مطالعہ کیے بغیر ہم قرآن کو نہیں سمجھ سکتے۔ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست قرآن سیکھا اور آیات کے معانی و مطالب اخذ کئے۔ ان کے بعد تابعین نے صحابہ کرام سے استفادہ کیا۔ قرآن مجید میں چونکہ اجمال ہے اس لئے اس کی تفصیل جاننے کیلئے ہمیں حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ”صلاۃ“ کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن ”صلاۃ“ کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ہم حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی حال زکوٰۃ، صوم اور حج وغیرہ کا ہے۔

حدیث کے مطالعہ کا دوسرا پہلو عقیدت و ارادت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ ہم حدیث کا مطالعہ محض معلومات میں اضافہ کے لئے نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنا تعلق بڑھانے کیلئے کرتے ہیں۔ جو لوگ عقیدت، محبت اور اخلاص کے ساتھ حدیث کی خدمت کرتے ہیں انہیں دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ((نَضَّرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاَهَا وَ حَفِظَهَا وَ اَدَاَهَا.....)) اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرم رکھے جس نے میری بات سن لی اس کو اپنے پاس محفوظ کیا اور پھر اسے دوسروں تک پہنچایا۔

..... آپ ان شاء اللہ مختلف یونٹوں میں علم حدیث اور علماء حدیث کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔ اس یونٹ میں اختصار کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ آپ اس کا دلجمعی اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کریں امید ہے اسے مفید پائیں گے۔

یونٹ کے اغراض مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇐ حدیث کا مطالعہ اور اس کی ضرورت و اہمیت پر گفتگو کر سکیں۔
- ⇐ قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے حدیث کے ساتھ تعلق کی اہمیت بیان کر سکیں۔
- ⇐ احادیث کے مضامین اور ان کی تقسیم پر بات کر سکیں۔
- ⇐ اجتہاد اور استنباط احکام میں حدیث کی حیثیت پر بحث کر سکیں۔
- ⇐ حدیث اور سیرت کے باہمی تعلق کے بارے میں اہم نکات پیش کر سکیں۔
- ⇐ علم حدیث کی ترویج کے لئے علماء حدیث کی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔

① حدیث کا مطالعہ

حدیث رسول دراصل ﴿مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ﴾، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ کا صحیح معنی ہے اور جسے محدثین کی زبان میں سنت بھی کہتے ہیں۔ جو شریعت اسلامیہ میں قرآن مجید کے بعد دوسرا اہم مقام رکھتی ہے۔ اسلامی قانون سازی میں بھی قرآن مجید کے بعد اس کا اہم مقام ہے۔ اسلام کے عام نظریات، خاص طور پر اقتصادیات، سیاسیات، تجارت، معیشت، معاشرت، تعلیم، قانون اور قانون سازی کا وافر ذخیرہ، حدیث رسول سے ہی ملتا ہے۔ ہر دور کے مسلمانوں نے بے شمار اصولی و شرعی مسائل کا حل اسی سے اخذ کیا۔ ائمہ امت نے استنباط مسائل میں اور اجتہاد کی کوشش میں اس کی اہمیت کو لمحہ بھر کے لئے نظر انداز نہیں کیا۔

امت مسلمہ جس طرح قرآن مجید کو ایمانی اعتبار سے ”وحی“ شمار کرتی ہے اسی طرح حدیث رسول اللہ ﷺ کو بھی ”وحی“ سمجھتی ہے دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور یہ وحی غیر متلو۔ حدیث کو یہ بلند و ارفع مقام دینے کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی گئی کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ صرف رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کی تاکید قرآن میں کر دی گئی جبکہ دوسروں کی اطاعت کو انہی کی اطاعت کے ساتھ مشروط کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی اطاعت کے لئے قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کیلئے حدیث رسول ہی ہمارے پاس واضح ذریعہ و ماخذ ہیں۔ یہ اطاعت مستقل بھی ہے اور دائمی بھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾..... (الانعام: ۱۵۸)

”اے بنی نوع انسان! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں“

نیز فرمایا ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾..... (الانعام: ۳۴)۔

”ہم نے آپ کو تمام انسانوں کیلئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا“

جب آپ تمام انسانوں کیلئے رسول بن کر آئے ہیں تو ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رِسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (النساء: ۶۴) ”اور ہم نے ہر رسول اسلئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے“ کے مطابق آپ کی اطاعت بھی تمام انسانوں پر فرض ہے۔ لہذا قیامت تک کیلئے جو بھی انسان ہوگا اسے آپ کی رسالت پر ایمان بھی لانا ہوگا اور آپ کی اطاعت بھی کرنا ہوگی۔

قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کے اسوہء حسنہ کو ہمارے لئے ایک مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ مگر یہ مثالی نمونہ کہاں ہے؟ ظاہر ہے یہ سب کچھ حدیث میں ہی ملے گا۔ اس لئے آپ کی ذات اقدس سے پھوٹنے والا ہر عمل اور ہر قول اسوہء حسنہ ہے جس کی اطاعت فرائض کے درجے میں آتی ہے یہی وجہ ہے کہ ابو بکر و عمر، عثمان و علی و دیگر صحابہ کرام اور ائمہ آپ ہی کے اسوہء حسنہ کو اپنا کرامت میں ایک عالی مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ بصورت دیگر شاید کسی کو بھی کسی اعتبار سے کوئی اہمیت نہ ملتی۔

زبان و نسل اور علاقے سے بالاتر ہو کر سنت رسول نے جو اہم کردار ادا کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ سنت مسلمانوں میں ایک عام تعلق پیدا کرنے کا بنیادی سبب ہے۔ اس کے اثرات مسلمانوں کے ذہنوں پر نقش ہو گئے ہیں مثلاً ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت سلام کرنا یا چھینک مارتے وقت الحمد للہ کہنا۔ نماز سنت رسول ﷺ کے مطابق ادا کرنا، شادی و سوگ میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو مد نظر رکھنا یہ سب کچھ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ساتھ گہری وابستگی کا نتیجہ ہے اور یہ عمل مشرق و مغرب کے مسلمان خواہ زبان میں ایک دوسرے سے مختلف ہی کیوں نہ ہوں مگر آپس میں ملتے وقت بھی بجالاتے ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمان قرآن مجید کے ساتھ ساتھ حدیث رسول کے ساتھ تعلق رکھنے پر مجبور ہیں تاکہ اپنے مستقبل کو اسلامی تشخص دے سکیں۔

حدیث رسول کا مطالعہ اس اعتبار سے بھی بہت مفید ہے کہ ماقبل اسلام اور شروع اسلام کی تاریخی

معلومات کا ایک دافر ذخیرہ اس میں موجود ہے جو انتہائی قابل اعتماد ذرائع سے ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اسی طرح بہت سی سیاسی اور ثقافتی تحریکوں کا علم بھی ہوتا ہے اور ان کے مزعومہ عقائد سے واقفیت بھی۔

بحث و تحقیق کے اصول و ضوابط کیا ہیں؟ فن حدیث ہی ہمیں بہت کچھ مہیا کرتا ہے اور محدثین کی نفسیات پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے کہ حدیث کی روایت اور اسکی درایت میں محدثین کے ہاں کیا کیا معیارات تھے۔ موضوعات کی درجہ بندی اور پھر تبویب کے ذریعے استنباط مسائل اس کے اصول اخذ حدیث اور ادائے حدیث میں ممکنہ حد تک احتیاطی تدابیر اور دیگر رجحانات سب ایک قاری کیلئے علمی و تحقیقی دلچسپی و جستجو سے خالی از فائدہ نہیں ہیں۔

عربی ادب نے ارتقاء حاصل کیا اس میں حدیث رسول کا بھی خاطر خواہ حصہ ہے۔ آپ قریشی تھے بنو سعد میں دودھ پیا، عربوں کے لہجات پر وسیع معلومات رکھنے والے اور نئے نئے اسالیب کو اپنانے میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ آپ ﷺ دینی و فقیہی مطالب کیلئے نئے نئے الفاظ وضع فرما لیتے تھے۔ کلام کا بلیغ انداز جس میں معانی و مطالب پھونٹتے ہوں حدیث کی راہیں اور اسوۂ رسول ﷺ وہ دو بنیادی چیزیں ہیں جس نے عربی ادب پر گہرے اثرات ڈالے تشبیہ و تمثیل، حکیمانہ کلام، غریب الفاظ کا استعمال، حسن جواب اور غیر معمولی بلاغت و فصاحت جو احادیث میں نظر آتی ہے یہی تو عربی ادب کی جان ہے۔

مسلمانوں نے آپ کی حیات طیبہ کے وقت ہی سے اور مستشرقین نے تقریباً تین سو سال قبل حدیث، حدیث لٹریچر اور اس کے تنقیدی معیارات سے گہری دلچسپی ظاہر کی ہے ہر دور میں بے پناہ علمی مواد لکھا گیا، جمع کیا گیا اور یوں زمانہ حال تک بیشمار کاوشیں اس سلسلہ میں بروئے کار لائی جا چکی ہیں۔

اس اعتبار سے حدیث رسولؐ معاصر مسلم مفکرین اور اہل علم سے اپنی علمی، تحقیقی اور دینی حیثیت سے توجہ کا مطالبہ کرتی ہے کیونکہ عموماً یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہماری علمی، فکری، معاشی اور اجتماعی زندگی میں سنت سے پہلو تہی ایک عام روایت بنتی جا رہی ہے۔ یہ روایت ہمیں رسولؐ سے چھڑوا تو رہی ہے ہیں مگر عطا کیا کر

رہی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ عطا رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مقابلہ میں کیا خوبی اور برتری رکھتی ہے؟

1.1 قرآن فہمی حدیث کے بغیر ممکن نہیں

یہ عنوان محض کہنے کی بات نہیں بلکہ حقیقت بھی یہی ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید سمجھنے کیلئے سب سے زیادہ سیدھی راہ یہی ہے آپ کا کام صرف قرآن مجید کو امت تک پہنچانا نہیں تھا بلکہ اسکی ایک ایک آیت کی وضاحت بھی کرنا آپ کے فرائض میں شامل تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾

”ہم نے آپ کی طرف قرآن مجید اس لئے اتارا ہے کہ آپ لوگوں کو واضح کر دیں کہ ان کی طرف کیا اتارا گیا ہے“

یہ قرآن مجید کا بھی حق ہے کہ جس پر قرآن مجید نازل ہوا وہی اس کے معنی و مفہوم کی وضاحت کرے۔ یہ حق آپ ﷺ سے چھین کر کسی اور کو از روئے قرآن نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ظلم ہوگا کہ جس پر قرآن اترے اس سے تو اس کی وضاحت کا حق چھین لیا جائے اور جس پر نہیں اتر اسے یہ حق دیدیا جائے۔ آخر یہ راہ کس نیت سے اختیار کی جا رہی ہے۔

آپ ﷺ از روئے قرآن معلّم کتاب ہیں اور حکم بھی، ہادی ہیں اور مطاع بھی، مقنن ہیں اور شارع بھی۔ اس لئے آپ صحابہ کرامؓ کے لئے قرآنی احکام کی تفسیر بیان فرماتے۔ مشکلات کی توضیح کرتے، ان کے تنازعات کے بارے میں فیصلہ فرماتے۔ حضرات صحابہؓ آپ کے اوامر و نواہی کی پابندی کرتے، عبادات و معاملات اور اعمال و اخلاق میں ان کی پیروی کرتے۔ یہ سب کچھ حکم الہی سمجھ کر قبول کیا گیا تھا۔ ہاں کچھ کام ایسے بھی تھے جو آپ کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص تھے۔ جن کی پابندی آپ نے نہیں کروائی۔ یہی وہ

قرآن ہے جو صحابہ کرام کی اطاعت اور وفا شعاری کے سبب ان کی ایمانی کامیابی پر آج بھی ہمیں ہمارے ایمان کے بارے میں یوں تعلیم دے رہا ہے:

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا﴾

”اگر لوگ ویسے ایمان لائیں جیسے کہ صحابہ تم ایمان لائے ہو تو پھر وہ ہدایت پر ہیں“

آپ کے ارشادات و اعمال جس طرح اس زمانے میں قابل قبول تھے اور ایمان کا حصہ تھے وہ آج بھی وہی حیثیت رکھتے ہیں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قرآن کی طرح احادیث عصری تقاضوں اور انفرادی مصالح سے متصادم ہوں۔

آپ کا ارشاد گرامی ہے:

((أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ. أَلَا يَوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانٌ عَلَى أَرِيكَتِهِ يَقُولُ عَلَيْكُمْ هَذَا الْقُرْآنُ. فَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَلَالٍ فَأَحْلَوْهُ وَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرَّمُوهُ. وَإِنْ مَا حَرَّمَ رَسُولٌ كَمَا حَرَّمَ اللَّهُ أَلَا لَا يَحِلُّ لَكُمْ الْحِمَارُ أَلَا هَلَى وَلَا كُلُّ ذِي نَابٍ مِنَ السَّبَاعِ، وَلَا لِقِطَّةٍ مَعَاهِدٍ إِلَّا أَنْ يَسْتَغْنَى عَنْهَا صَاحِبُهَا وَمَنْ نَزَلَ بِقَوْمٍ فَاعْلَيْهِمْ أَنْ يَقْرُوهُ فَإِنْ لَمْ يَقْرُوهُ فَلَهُ أَنْ يَعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قَرَاهِ)) (رواہ ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد عن المقدم بن معدیکرب)

ترجمہ ”آپ کا ارشاد ہے ”لوگو! سنو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسکے ساتھ اسکے مثل بھی۔ سنو! ممکن ہے کہ ایک سیر شدہ، آسودہ شخص اپنی مسہری میں بیٹھا لوگوں سے یہ کہے کہ قرآن مجید کو صرف اختیار کرو جو اس میں حلال ہو اسے حلال جانو اور جو حرام پاؤ اسے حرام کہو۔ لوگو! سنو (میں کہتا ہوں) پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ درندے حلال ہیں۔ اور نہ ہی جس سے معاہدہ ہو اس کی گری چیز اٹھانی جائز ہے ہاں یہ کہ اس

کا مالک اس چیز سے بے نیاز ہو۔ اگر کوئی شخص کسی بستی میں بطور مسافر قیام کرے تو اہل بستی کا فرض ہے کہ اس کی میزبانی کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو مسافران کی اس کوتاہی کا تاوان لے سکتا ہے۔“

اس حدیث پاک میں ایسے افراد کی حالت اور مقام دونوں کے بارے میں آپ ﷺ نے جو تصویر کشی کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کیا خدا نخواستہ ایسے افراد کی شکل مسخ تو نہیں کرنا چاہتے۔ اس عبارت کا مطلب تو صاف یہی نظر آتا ہے کہ رسول کو رسالت کے مقام سے گرا کر امتی کے درجہ میں رکھ دیا جائے اور خود مقام عالی کے منصب پر فائز ہو جائیں۔

اس حدیث میں سنت کو قرآن کا مثل بھی آپ نے قرار دیا۔ امام خطابیؒ نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں۔

۱- جس طرح آپ کو وحی عطا ہوئی اس طرح وحی غیر متلو سے بھی آپ کو نوازا گیا۔

۲- آپ کو ”القرآن“ بطور وحی دیا گیا اس طرح اس کے مثل بیان و شرح پر مشتمل وحی آپ کو مرحمت ہوئی۔ یعنی آپ کو اجازت عام دی گئی کہ آپ قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام قرار دیں اور قرآن سے زائد احکام بیان فرمائیں اور جن امور کی وضاحت قرآن مجید میں نہیں آپ انہیں قانونی شکل دے کر امت پر نافذ کر دیں۔

سنت کی قرآن کے ساتھ یہ مماثلت کسی بھی حکم کے واجب ہونے اور عمل کے فرض ہونے کی وجہ سے ہے مراد یہ ہے کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ احکام، مواعظ اور امثال بھی دیئے گئے ہیں۔ جن کا قبول کرنا قرآن مجید ہی کی طرح ضروری ہے۔ (معالم السنن ج ۷ ص: ۸)

امام خطابیؒ مزید فرماتے ہیں۔ (وفی الحدیث دلیل علی أنه لا حاجة أن يعرض علی الكتاب و أنه مهما ثبت عن رسول الله ﷺ كان حجة بنفسه. وأما ما رواه بعضهم أنه

قال: إذا جاء أحدكم الحديث فاعرضوه على كتاب الله فإن وافقه فخذوه وإن خالفه فلا تأخذوه فإنه حديث باطل لا أصل له. عن يحيى بن معين أنه قال هذا حديث وضعته الزنادقة (ص: ٦)

ترجمہ: حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کو قرآن پر پیش کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ جب کوئی حدیث آنحضرت ﷺ سے بسند صحیح ثابت ہو جائے تو فی نفسہ وہ حجت و دلیل ہے جہاں تک بعض لوگوں کی اس روایت کا تعلق ہے کہ جب تمہیں کوئی حدیث ملے تو اسے قرآن پر پیش کر دو (یعنی قرآن سے اس کا موازنہ کرو) اگر اس کے موافق ہو تو قبول کر لو اور خلاف ہو تو اسے چھوڑ دو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث سراسر باطل اور بے بنیاد ہے مشہور امام جرح و تعدیل یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ یہ حدیث ملحد لوگوں نے گھڑی ہے۔

ایسا مفروضہ دراصل اپنی عقل کو حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں حکم ٹھہراتا ہے حالانکہ علم اور یقین حاصل کرنے کے تین ذرائع ہیں۔

..... خبر صادق۔ سمع

..... تجربہ و مشاہدہ۔ بصر

..... عقلی فیصلہ۔ نواذ

قرآن میں ہے ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ . إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ ”جس چیز کا تجھے یقین نہیں اس کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ بے شک کان، آنکھ اور دل کے بارے میں پوچھا جائے گا“

اس معجزانہ آیت میں ان تینوں عناصر کو بالترتیب جمع کر دیا گیا ہے۔ صرف عقلی فیصلہ پر فوراً حکم صادر کر دینا اور خبر صادق و تجربہ و مشاہدہ کو نظر انداز کرنا علمی روش نہیں۔

امام بیہقیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اس حدیث کا مضمون ہی اس کے بطلان کی شہادت دے رہا ہے۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ حدیث کو قرآن کے معیار پر پرکھ کر جانچو۔ (مفتاح الجنۃ: ص ۶)

اور اگر حدیث کے متن سے یہ مراد ہے کہ جو حدیث قرآن کریم اور سنت صحیحہ کے خلاف ہو وہ موضوع ہوتی ہے۔ تو یہ ایک ایسا اصول ہے جس پر علماء و امت کا اتفاق ہے امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

سرور کائنات نے لوگوں کو اپنے احکام کے رد کرنے سے منع فرمایا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر آپ کی پیروی کو فرض قرار دیا ہے۔ بہر حال جو مسلمان اللہ کے دین کو جانتا ہے اور شرعی احکام کو پہچانتا ہے وہ نہ تو حدیث نبویؐ کے حجت ہونے سے انکار کر سکتا ہے اور نہ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اسلام صرف قرآن کا نام ہے۔ یہ بات یوں بھی خلاف واقعہ ہے اس لئے اکثر احکام شرعیہ حدیث سے ثابت ہوتے ہیں قرآن میں جو احکام موجود ہیں وہ یا تو مجمل ہیں اور یا قواعد کلیہ ہیں۔ ورنہ بقول امام ابن حزم مندرجہ ذیل مسائل قرآن میں کہاں مذکور ہیں؟

- ۱۔ نمازوں کی تعداد، ان کی رکعات کی تعداد۔
- ۲۔ رکوع و سجدہ کی کیفیت اور تسبیحات۔
- ۳۔ مفسدات صوم۔
- ۴۔ چاندی، سونا بکری، گائے اور اونٹ وغیرہ کی زکوٰۃ کا نصاب اور تفصیل۔
- ۵۔ احکام وارکان حج مثلاً وقوف عرفہ، مزدلفہ میں نماز پڑھنے کا طریقہ، رمی جمار، احرام
- ۶۔ صادق
- ۷۔ کس رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔
- ۸۔ حلال و حرام غذائیں۔

۹- ذبائح اور قربانی کے جانور

۱۰- حدود شرعیہ

۱۱- اقسام طلاق، احکام بیوع، ربا، مختلف فیصلہ جات، قسم کے احکام، قضا و امارت وغیرہ کے احکام۔

قرآن کریم میں احکام اجمالاً ذکر کئے گئے ہیں اگر ان احکام کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے (ان کو حدیث نبوی ﷺ کی تصریحات کی روشنی میں نہ دیکھا جائے) تو ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ ان پر کیسے عمل کیا جائے۔ اس لئے محملات قرآن کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں حدیث نبوی کی جانب مراجعت از بس ضروری ہے۔

آپ کے ارشادات کی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ منزل من اللہ ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے اقوال و افعال وغیرہ، وحی غیر مقلو کے زمرے میں آتے ہیں۔ قرآن پاک اس کی شہادت بے شمار مقامات پر دیتا ہے۔ مثلاً

☆ تحویل قبلہ سے قبل بیت المقدس کو آپ نے قبلہ ٹھہرایا۔ جس کی تائید قرآن مجید نے کی مگر اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں اس کے باوجود ان نمازوں کی قبولیت کی ضمانت قرآن میں دے دی گئی۔ ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ ”اللہ تمہارے ایمان (یعنی نمازوں کو) ضائع نہیں کرے گا۔“

☆ اسی طرح قرآن نے آپ کے ارشادات و اعمال کو وحی قرار دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ . إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم) ”رسول خواہش نفس کی بنیاد پر نہیں بولا کرتا۔ جو کہتا ہے وہ وحی ہوتی ہے“

☆ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے کسی آدمی کی بیوی کے ساتھ زنا کیا۔ زانی کے والد نے اس شخص کو چند بکریاں اور غلام دے کر اس سے صلح کر لی۔ جب نبی اکرم ﷺ اس واقعہ سے

آگاہ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں تمہارے درمیان خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ بکریاں اور غلام تجھے واپس کر دیئے جائیں اور اس کی بیوی اگر اعتراف جرم کرے تو اس کو سنگسار کر دیا جائے۔“

اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ جس چیز کو حلال یا حرام ٹھہراتے ہیں وہ جلتے اور حرمت اللہ جل شانہ کی مرضی اور مشیت کے مطابق ہوتی ہے۔

② مضامین کے اعتبار سے احادیث کی تقسیم

مضامین کے لحاظ سے احادیث کا اگر تجزیہ کر لیا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ قرآنی مطالب کو سامنے رکھتے ہوئے احادیث کی چند اقسام ہیں۔

2.1 قسم اول:

کچھ ایسی احادیث ہیں جو قرآنی آیات سے ملنے ملتے مضامین پر مشتمل ہیں۔ مثلاً عقائد و اخلاق۔ یہ احادیث قرآن مجید سے صرف الفاظ میں مختلف ہیں مگر معنوی اعتبار سے دونوں میں پوری مطابقت و یکسانیت ہوتی ہے۔ مثلاً

حضرت ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ:

”ایک شخص نے آپ ﷺ سے عرض کی۔ اللہ کے ہاں سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ۔ اس نے عرض کی پھر کونسا گناہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ تم اپنی اولاد کو اس اندیشے سے قتل کر دو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگی۔ اس نے سوا ل کیا۔ پھر کونسا گناہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے بڑوسی کی بیوی کے ساتھ طوط ہو جاؤ“

ان ارشادات کی تصدیق و تائید میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاری ہیں۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ، وَلَا

يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ.....﴾

”رحمان کے بندے وہ ہیں..... جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود نہیں پکارتے اور نہ

ہی اس جان کو قتل کرتے ہیں جسے اللہ نے حرمت والا ٹھہرایا ہے ہاں اگر کسی حق کی

بناء پر اس کا قتل جائز ہو اور نہ ہی بدکاری کرتے ہیں“

کتب احادیث میں کتاب الایمان، کتاب التوحید، کتاب الکبائر وغیرہ میں اس نوع کی بے شمار احادیث ہیں۔ جن کے مندرجات قرآن مجید کے موافق ہیں۔ ایسی احادیث سے استدلال کرنا فرض ہے۔

2.2 قسم دوم

یہ ایسی احادیث ہیں جن میں قرآن مجید سے زائد مضمون ملتا ہے اس کی چند شکلیں ہیں:

(الف)..... اجمال کی تفصیل و وضاحت: مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

﴿اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ﴾ ”نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو“

اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی وضاحت و تشریح حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا﴾ ”بے شک نماز کی ادائیگی اہل ایمان پر وقت کے مطابق فرض کی گئی ہے“

اس آیت سے مترشح ہوتا ہے کہ نمازوں کے جعین اوقات ہیں اور اپنی اوقات میں نماز ادا کرنا فرض ہے۔ مگر اس کی وضاحت اور حد بندی احادیث میں ملتی ہے۔

(ب)..... قرآنی آیت کے معنی و مقصود کی وضاحت بعض احادیث میں ملتی ہے مثلاً (فَبَانَ طَلْقُهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ) ”پھر اگر میاں اپنی بیوی کو طلاق دے تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوگی حتیٰ کہ وہ ایک اور خاوند سے نکاح کرے“

یہاں نکاح کا معنی۔ ایجاب و قبول نہیں بلکہ اس سے مراد جنسی تعلق قائم کرنا ہے۔ یہ معنی و مقصود آپ نے اسی قسم کے واقعہ میں ایک عورت سے فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا؟ ((حتیٰ تذوقی عسیلتہ و یذوق عسیلتک)) (مشکوٰۃ المصابیح باب المطلقہ ثلاثاً) ”یعنی نکاح محض ایجاب و قبول کا نام نہیں بلکہ تعلق سے

عہدہ برآ ہونا بھی ضروری ہے۔

2.3 قسم سوم:

حدیثی سرمایہ کی یہ وہ قسم ہے جو قرآن سے زائد ہے۔ (اور قرآن اس بارے میں بظاہر خاموش ہے۔ سنت سے ثابت شدہ اس طرح کے احکام کے بارے میں یہ کہنا اپنی جگہ درست ہوگا کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل قرآن میں ضرور پائی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس کا علم نہ ہو سکے۔ بلکہ سنت سے ثابت بعض احکام ایسے ملتے ہیں جو قرآن کے ظاہری الفاظ کے مخالف ہوتے ہیں لیکن امت کا مسلسل عمل بتاتا ہے کہ کسی قابل ذکر گروہ یا فرقے نے ان سے اختلاف نہیں کیا مثلاً:

﴿وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ﴾ - النساء ۲۳

”دو بہنوں کا بہ یک وقت نکاح میں رکھنا تمہارے لئے حرام کر دیا گیا ہے“

لیکن حدیث اس پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کو بھی بہ یک وقت نکاح میں رکھنے سے روکتی ہے۔ بظاہر اس اضافے کی کوئی بنیاد قرآن میں نہیں ملتی۔

لیکن اگر ﴿وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ﴾ کی علت پر ہم غور کریں تو قرآن ہی سے حضور ﷺ کے فرمان کی اصل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی دو بہنوں کو سوکنوں کی شکل میں رکھنا ان کے رشتہ اخوت کو قطع کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہی علت خالہ بھانجی، پھوپھی بھتیجی کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنے کی ممانعت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی وضاحت آپ ﷺ نے یوں فرمادی۔ (وَإِذَا فَعَلْتُمْ ذَلِكَ فَطَعْنُوا أَرْحَامَكُمْ) (نیل الأوطار کتاب النکاح) ”اور جب تم یہ کام کرو گے تو اپنی قرابتیں کاٹ ڈالو گے“ (شاطبی: الموائقات ۱۹۲/۳)

اسی طرح قرآن نے خمر کو حرام ٹھہرایا ہے لفظ خمر سے بظاہر شراب کی اتنی ہی مقدار کی حرمت ثابت ہوتی ہے جو نشہ آور ہو لیکن حدیث نے مزید بتا دیا ((مَا اسْكُرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ)) (مشکوٰۃ باب

بیان الخمر) کہ جس مشروب کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔

قرآن مجید کی چند آیات ایسی بھی ہیں کہ اجماع امت کی بنا پر ان کا ظاہری مفہوم ترک کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً:

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمْ
الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (النساء ۱۰۱)
”اگر تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں اختصار
کرو“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے خوف کی حالت ہی میں نماز قصر کی جاسکتی ہے لیکن حدیث
سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف کی حالت ہو یا امن کی دونوں صورتوں میں بحالت سفر قصر کی جاسکتی ہے بلکہ بعض
ائمہ کرام کے نزدیک قصر واجب ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ. الْحُرُّ بِالْحُرِّ
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ﴾ (البقرہ : ۱۷۱)
”اے ایمان والو! تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام
کے بدلے اور عورت، عورت کے بدلے“

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو وہ مرد
قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح کوئی عورت کسی مرد کو قتل کر ڈالے تو وہ عورت قصاص کے بدلے
میں قتل نہیں کی جائے گی۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں تمام مسلمان یکساں ہیں۔ اس لئے
عورت کے بدلے میں مرد یا مرد کے بدلے میں عورت قتل کی جائے گی۔ (ابن کثیر ۲۱۰/۱)

خلاصہء کلام یہ ہے کہ مطالب و مضامین کے اعتبار سے احادیث تین حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں۔

- ۱- قرآن کے ہم معنی۔
 - ۲- قرآن سے زائد یعنی اس کے اجمال کی تفصیل یا عموم کی تخصیص وغیرہ۔
 - ۳- ایک الگ حکم کا اثبات جس سے بظاہر قرآن خاموش ہے بلکہ بعض مواقع پر قرآن کا ظاہری مفہوم حدیث سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔
- یہ تقسیم باور کراتی ہے کہ قرآن فہمی کے لئے حدیث کتنی اہم ہے۔ ان میں کسی تقسیم کو امت نے رد نہیں کیا۔ بلکہ اس پر متفقہ تعامل نظر آتا ہے جو قرآن کی زبان میں سبیل المؤمنین ہے۔

③ اجتہاد و استنباط کے لئے حدیث کی ضرورت

حدیث جو شریعت اسلامی کا مصدر ثانی ہے۔ اس کی ضرورت، اس پر عمل اس پر اعتماد اور اس سے احکام کا استنباط۔ ان سب باتوں کے بارے میں قرآن مجید میں بکثرت نصوص موجود ہیں۔ ان تمام آیات میں یہ تکرار اطاعت رسول کا عمومی حکم دیا گیا ہے۔ آپ کا یہ حکم خواہ وہ جو قرآن مجید میں ہے یا وہ جو قرآن میں نہیں۔ تب بھی وہ سنت اور اتباع کے زمرہ میں آئے گا۔ ”آپ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت بتایا گیا ہے“ (النساء: ۸۰) یہ بھی حکم ہے کہ کسی مسئلہ میں خاص طور پر اجتہادی اختلاف ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کریں (النساء: ۵۹) (یہ نصوص واضح طور پر باور کراتی ہیں کہ اگر کسی شخص کا دوسرے کے ساتھ اختلاف ہو اور وہ رسول اللہ کو اس میں حکم نہ بنائے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے (النساء: ۶۵) قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ آپ ﷺ جب کسی مسئلہ میں فیصلہ فرمادیں تو مسلمان کو اس کے مانے بغیر کوئی چارہ نہیں اس کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ آپ ﷺ کے اس فیصلہ کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ (احزاب: ۳۶)

اس لئے تمام علماء کا ہر دور میں اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ سنت نبوی ﷺ سے احکام ثابت ہیں اور شرعی احکام کو جاننے اور ان کے تقاضے کے مطابق عمل کرنے کیلئے سنت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ صحابہ کرامؓ اور بعد کے ائمہ و علماء اس حکم میں جو قرآن میں آیا ہے اور اس میں جو سنت سے ثابت ہے کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ شرعی حکم معلوم کرنا ہو یا احکام کا استخراج و استنباط دونوں صورتوں میں بالترتیب قرآن و سنت کی طرف رجوع کرتے۔

خلفاء راشدین کسی بھی مقدمہ میں فیصلہ کے لئے بالترتیب قرآن و سنت کو سامنے رکھتے ورنہ ممتاز صحابہؓ کو جمع کر کے ان سے مشورہ لیتے۔ خلیفہ راشد عمر بن خطابؓ نے قاضی شریع سے فرمایا پہلے اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کرو اگر کتاب اللہ میں تمہیں مسئلہ کا حل نہ ملے تو سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں

فیصلہ کیا کرو۔

فقہاء امت نے بھی اجتہاد و استنباط کیلئے قرآن مجید کی نصوص سے حدیث کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے اس لئے کہ رسول کریم کا قول، عمل اور تقریر ہر اعتبار سے قابل اطاعت ہے اور نمونہ بھی۔ اس لئے حدیث و سنت کے ہوتے ہوئے کسی قسم کا اجتہاد و استنباط لایعنی ہے اور تکلف بھی۔ دراصل اجتہاد و استنباط کسی شوق آزمائی کا نام نہیں بلکہ وقت کی ضرورت ہے اگر یہ ضرورت قرآن و سنت سے پوری ہوتی ہے تو فہم اور نہ اجتہاد ایک فرض ہے۔

حدیث رسول ﷺ سے استنباط و اجتہاد کس طرح ہر دور میں مسلمانوں کی ایک اہم ضرورت رہی اور انتشار کے پر خطر امکانات میں حدیث رسول نے کس طرح مسلمانوں کی راہنمائی فرمائی۔

رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ میں یہ نزاع پیدا ہوا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے۔ اس بارے میں صحابہ کرامؓ کا رجحان مختلف مقامات کی طرف تھا۔ اس موقع پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حدیث نبویؐ سنا کر اس نزاع کا خاتمہ کر دیا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے۔

(ماقبض اللہ نبیاً الا فی الموضع الذی حب ان یدفن فیہ) (ترمذی کتاب الجنائز:

۱۴۹/۲) ”اللہ تعالیٰ نبی کی روح کو وہیں قبض فرماتے ہیں جہاں نبی دفن ہونا پسند کرتے ہیں“

حضرت ابو بکرؓ سے جب دادی کے حق کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ اپنے پوتے کی میراث میں کتنا حصہ پائے گی۔ خلیفہ رسول نے اس موقع پر اصحاب رسول سے دریافت کیا۔ محمد بن مسلمہ اور مغیرہ بن شعبہ دونوں نے بتایا کہ اللہ کے رسول نے دادی کو چھٹا حصہ دلوا یا ہے تو خلیفہ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا (موطا امام مالک: باب میراث الحبدۃ)

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ شام کے سفر پہ جب نکلے تو مقام سرح میں آپ کو اطلاع دی گئی کہ شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ کیا اب مزید سفر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اس پر صحابہ مختلف الرائے جمع ہو گئے۔ کافی

۰۰۳۱۴۹

بحث و گفتگو کے باوجود کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس موقع پر عبدالرحمن بن عوفؓ نے یہ حدیث پیش کی کہ آپ نے فرمایا ہے کہ جہاں وبا پھوٹ پڑی ہو اس جگہ نہیں جانا چاہیے۔

بے بنیاد قسم کا اجتہاد من مانی تاویلات پر ہی خلیفہ دوم فرماتے ہیں۔ (ایسا کم واصحاب الراۃ فانہم اعداء السنن، اعینہم الا حادیث ان یحفظوها فلقالوا بالراۃ لفضلوا واضلوا) (الاعتصام۔ از شاطبی: ۱/۱۲۴) ”لوگو! رائے اور من گھڑت قیاس آرائی کرنے والوں سے بچو۔ اس لئے کہ یہ لوگ سنت کے دشمن ہیں احادیث کے حفظ کرنے سے یہ لوگ عاجز ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے قیاس آرائی کا سہارا لیا نتیجہ یہ نکلا کہ خود گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کر ڈالا“

ایران کے فتح ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کے سامنے سوال آیا کہ اہل فارس سے جزیہ لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ قرآن میں اس بارے میں کوئی واضح حکم نہیں ہے۔ آپ نے صحابہ کرام سے دریافت فرمایا۔ اس موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے فرمایا:

”آپ ﷺ نے حمر کے نجدوں سے جزیہ لیا ہے۔ چنانچہ خلیفہ نے اس وضاحت کے بعد اہل فارس سے بھی جزیہ لینا شروع کر دیا“ (ابوداؤد مع معجم المعبود ۳/۱۳۴ کتاب الخراج)

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔

(اذا قلت لولا یمخالف کتاب اللہ و حدیث الرسول لاترکوا قولی) ”جب میں کوئی ایسی بات بیان کروں جو کتاب اللہ اور حدیث رسول کے خلاف ہو تو مہری بات چھوڑ دو“ (حاشیہ ابن مابدین: ۱/۵۰)

ابن خفاف فرماتے ہیں میں نے ایک غلام خریدا جس کی محنت مزدوری سے میں نے فائدہ اٹھایا پھر میں نے اس میں کچھ نقص پایا میں نے داد دے کیلئے یہ مقدمہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی عدالت میں پیش کر دیا آپ نے فیصلہ دیا کہ غلام فروخت کنندہ کو واپس کر دیا جائے اور جو فائدہ آپ نے حاصل کیا ہے وہ بھی لوٹا

دیں۔ میں نے عروہ کو اس فیصلے سے آگاہ کیا عروہ نے کہا کہ میں آج شام عمر بن عبدالعزیز کے پاس حاضر ہو کر انہیں بتا دوں گا کہ مجھے حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث سنائی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ کہ فائدہ وہی اٹھائے گا جو نقصان کا ذمہ دار ہو۔

ابن خفاف کہتے ہیں کہ میں نے اسی وقت جا کر عمر بن عبدالعزیز کو حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے آگاہ کیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا۔

اللہ گواہ ہے کہ میں نے حق کا ارادہ کیا تھا اب مجھے رسول کریم ﷺ کی حدیث مل گئی ہے لہذا میں اپنا فیصلہ واپس لیتا ہوں اور آپ کا حکم نافذ کرتا ہوں۔ پھر عروہ عمر بن عبدالعزیز کے یہاں گئے تو فرمایا، ابن خفاف سے کہیں کہ فروخت کنندہ سے غلام کی کمائی ہوئی رقم واپس لے لے۔ (الرسالۃ ص: ۳۲۵)

امام مالک فرماتے ہیں۔

(انما انا بشرُ اخطی وأُصیب . فانظرُوا فی رأی ، فکل ما وافق الکتاب و السنۃ فخذوه و کل ما لم یوافق الکتاب و السنۃ فاتروکوہ) (جامع بیان العلم ۳۲/۲) ”میں ایک انسان ہوں غلط اور صحیح دونوں قسم کے فتوے دے سکتا ہوں۔ میری رائے میں غور کر لیا کرو اگر وہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے قبول کر لو ورنہ رد کر دو“

④ سیرت و حدیث کا باہمی تعلق

حدیث و سیرت دونوں کا موضوع ذات رسول کے احوال و واقعات ہیں، جن میں آپؐ کے اقوال، اعمال، اخلاق، شمائل اور حیات طیبہ کے تمام غزوات شامل ہیں۔ محدثین اور سیرت نگاروں نے آپؐ کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحہ کو جس طرح محفوظ کیا ہے دنیا میں کسی اور شخصیت کے بارے میں یہ اہتمام نہیں پایا جاتا۔

سیرت و حدیث کا باہمی تعلق سے کیا مراد ہے کتاب سیرت فن حدیث کی کوئی خاص قسم ہے یا سیرت و حدیث کا اطلاق کس کس چیز پر ہوتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی کتاب سیرت النبی جلد اول ص: ۸ کے حاشیہ میں رقمطراز ہیں:

۱- اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے جو آج کل کی قلت علم اور نا آشنائی فن نے پیدا کر دی ہے۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فن حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے یعنی احادیث میں وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے جو آنحضرت کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں۔ وہی سیرت بن گئی اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں مثلاً صحیح بخاری و مسلم تو یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ”سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی“ اس بحث کے ذہن نشین کرنے کیلئے امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہیے۔

۲- پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے۔ محدثین اور ارباب رجال کی اصلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت کے خاص غزوات کے مغازی اور سیرت کہتے تھے۔ چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی۔ حافظ ابن حجر فتح الباری باب المغازی میں یہ دونوں نام ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ فقہاء کی بھی یہی اصطلاح ہے فقہ میں جو بات کتاب الجہاد و

السیر باندھتے ہیں اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا چنانچہ تیسری صدی تک جو کتا میں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیر ابن ہشام، سیر ابن اسحاق وغیرہ ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں۔ البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بناء پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فن حدیث سے ایک الگ چیز ہے یہاں تک کہ بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں۔ بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام ارباب سیر ایک طرف ہوتے ہیں اور امام بخاری و مسلم ایک طرف میں ہیں ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہے۔ لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے ہم اس موقع پر ایک دو واقعے مثال کے طور پر لکھتے ہیں۔

غزوات میں ایک غزوہ ذوقرد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے۔ (لایختلف اهل السیران غزوة ذی قرد كانت قبل الحديبية فيكون ما وقع في حديث سلمة من وهم بعض الرواة) ”اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوہ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے وہ کسی راوی کا وہم ہوگا“

حافظ ابن حجر فتح الباری ذکر غزوہ ذی قرد میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں۔

(فعلى هذا ما فى الصحيح من التاخير لغزوة ذى قردا صح مما ذكره اهل السیر)

”تو اس بنا پر صحیح مسلم میں غزوہ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے“

دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں انہوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے۔ اس میں انہوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے اس لئے نہ کر سکے۔

حافظ ابن حجر خود دمیاطی کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

(ودل هذا على انه كان يعتقد الرجوع عن كثير مما وافق فيه اهل السير و خالف الاحاديث الصحيحة وان ذلك كان به قبل تضلعه منها ولخروج نسخ كتابه و انتشاره لم يتمكن من تغييره) (زرقاتی بر مواہب جلد سوم) ”اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انہوں نے ارباب سیر سے اتفاق کر کے احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے ان سے رجوع کریں گے۔ اور یہ کہ یہ امر ان سے مہارت فن کے قبل صادر ہوا لیکن چونکہ کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے اس لئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے۔

ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی نسبت اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر سے قبل واقع ہوا تھا۔ لیکن امام بخاری نے تفریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا۔ اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں۔

(واما الدمیاطی فادعی غلط الحدیث الصحیح وان جمیع اهل السير على خلافه) (فتح الباری جز ہفتم) اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہ فن حدیث نہیں ہے اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط محفوظ نہیں رکھی جاتی جو فن صحاح

ستہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں اس لئے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے۔ اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔ سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا۔ آج بیسیوں کتابیں قدماء سے لے کر متاخرین تک موجود ہیں مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت ومیاطی، حلب، مواہب لدنیہ کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیل مذکورہ بالا سے ظاہر ہوگا کہ ہماری اس عبارت کا کہ ”سیرت میں آج تک کوئی کتاب سنت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی۔ اسکا کیا مطلب ہے اور کہاں تک صحیح ہے۔

۱..... ان کتابوں کا ذکر استیعاب کے دیباچہ میں ہے۔

۲..... یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہو سکتی۔ ان کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے حدیث کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

⑤ ترویجِ علم حدیث کیلئے علماء کی خدمات

نبی اکرم ﷺ نے علم حدیث کی حفاظت اور اس کی ترویج کیلئے جو اقدامات فرمائے ان کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

قرآن حکیم کے احکام کی تعمیل جیسے آپ ﷺ کرتے صحابہ کرام بھی اسی طرح آپ کی اتباع کرتے مثلاً آپ یا صحابہ کرام جہاں کہیں بھی جاتے پہلے مسجد کا اہتمام فرماتے۔ اسلام کے ارکان بجالاتے لوگوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلے فرماتے۔ یہ اقدام قرآن و حدیث کی حفاظت کے درمیان مشترک تھا اللہ کے احکام و فرامین کی تعمیل ہی کا نام سنت ہے۔ یا امت کا تعامل ہے۔

ترویجِ حدیث کا دوسرا طریقہ سننا اسے یاد رکھنا اور دوسروں تک پہنچانا تھا۔ آپ نے اس طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ صحابہ کرام کو ابھارا۔ دعائیں دیں اور حکم دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام میں ترویجِ حدیث کا شوق پیدا ہوا اسے یاد کیا۔ اس کی خاطر سفر کئے۔ اس کی تعلیم دی اور پوری دلجمعی کے ساتھ اس کی ترویج میں عملی طور پر مشغول ہو گئے۔

ترویجِ حدیث کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ اس کی کتابت کی جائے۔ چنانچہ تقریباً پچاس صحابہ کرام کے تذکرے میں یہ بات ملتی ہے کہ انہوں نے احادیثِ رسول کو جو انہیں یاد تھیں۔ اپنی اپنی بیاض میں لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

یہی دور تدوینِ حدیث کا پہلا دور کہلاتا ہے۔ جس میں احادیث کا بہت سا تحریری سرمایہ وجود میں آ گیا تھا۔ ۱۱۰ ہجری تک جس میں آخری صحابی ابو الطفیل عامر بن واہلہ انتقال فرماتے ہیں۔ بیشتر کتب احادیثِ امت کے پاس موجود تھیں۔

دوسرے دور میں ان تمام صحابہ کرام کے بکھرے ہوئے علوم نبوی کو اکٹھا کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ صحابہ کرام سے حاصل ہونے والی تمام معلومات کو ایک جگہ جمع کیا جائے چنانچہ جس طرح اس اندیشے پر کہ حفاظ کے کم ہو جانے کی وجہ سے کہیں قرآن کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے لہذا قرآن کو ایک جگہ تحریری شکل میں جمع کر لینا چاہیے۔ بالکل اسی طرح ۹۹ ہجری میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دیکھا کہ صحابہ کرام دنیا سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔ اور کبار تابعین بھی کہیں علم حدیث بھی ان کے ساتھ ہی نہ جاتا رہے۔ چنانچہ انہوں نے مملکت اسلامیہ کے تمام صوبوں کے حکام کو یہ حکم بھیجا کہ جہاں کہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث پاؤ لکھ بھیجو کیونکہ مجھے اہل علم اور علم کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔

اس حکم کے نتیجے میں اصحاب علم و فضل کی کوشش سے احادیث کے دفتر کے دفتر دار الخلافہ دمشق میں پہنچ گئے۔ خلیفہ راشد نے ان کی نقلیں مملکت کے کونے کونے میں پہنچادیں۔

اس دور میں امام زہریؒ کے علاوہ مختلف علاقوں کے اہل علم حضرات نے احادیث نبویہ کی ترویج و تالیف میں اہم کردار ادا کیا ان میں۔

ابن جریج اور ابن اسحاق مکہ میں
سعید بن ابی عروبہ، ربیع بن صلیح اور امام مالک مدینہ میں
حماد بن سلمان اور سفیان ثوری کوفہ میں
ہشیم واسط میں
عبداللہ بن المبارک خراسان میں

معتبر..... یمن میں اور جریر بن عبداللہ رے میں، تالیفات حدیث کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔ اسی طرح سفیان بن عیینہ، لیث بن سعد اور شعبہ بن الحجاج نے بھی ترویج حدیث میں سرگرم حصہ لیا۔

ان کا انداز کیسا تھا حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

”اس دور کے جامعین حدیث مختلف ابواب کو یکجا کر دیا کرتے تھے۔ جہاں تک ایک ہی باب میں مسائل اور احادیث درج کرنے کا تعلق ہے تو اس کام میں سبقت کرنے والے امام شععی ہیں۔ (توجیہ النظر) دوسری صدی کے شروع سے لیکر ۱۵۰ ہجری تک درج ذیل مجموعے مرتب ہوئے۔

- ۱- موطأ امام مالک
- ۲- جامع سفیان ثوری
- ۳- جامع اوزاعی
- ۴- جامع ابن المبارک
- ۵- جامع ابن جریج
- ۶- کتاب الخراج۔ از قاضی ابو یوسف
- ۷- کتاب الآثار از امام محمدؒ

ترویج حدیث میں دوسری صدی ہجری کے نصف آخر سے چوتھی صدی کے خاتمہ تک پھیلا ہوا دور بھی ہے۔ اس دور میں حدیث کی زیادہ جامع کتابیں مرتب کرنا پہلے سے آسان ہو گیا کیونکہ ایک آدمی کئی کئی اساتذہ سے احادیث منکر جمع کر لیتا تھا اس طرح اس کے پاس بہت سے لوگوں کا علم جمع ہو جاتا۔

ان تمام ادوار میں جہاں احادیث کی ترویج، تصنیفات کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ جن سے محدثین کرام کے علمی و عملی اقدامات ان کے مختلف اذواق کی بنا پر بھی سامنے آئے۔ ایک بات اصولی طور پر کھل کر سامنے آئی کہ فقہاء و محدثین نے اپنے اپنے اجتہادات اور اپنی اپنی روایات کو ایک خاص منہج کے تحت آگے پھیلایا۔ محدثین نے چند قواعد و اصول وضع کئے جن سے صحیح ضعیف و موضوع احادیث کی پہچان آسان تر ہو گئی۔

مسند نویسی: اسی زمانے میں مسند نویسی کا آغاز ہوا۔ مسند حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں

ایک ہی صحابی کی تمام روایات کو ایک ہی باب میں اختلاف موضوع کے باوجود جمع کر دیا جائے۔ چند مسانید جو دوسری صدی ہجری کے اختتام سے قبل مرتب ہو چکی تھیں ان کے نام ملاحظہ کیجئے۔

۱- مسند ابی ہریرہؓ (م ۵۸ھ) اس کتاب کو انہوں نے عہد نبوی کے بعد تحریر کر لیا تھا۔ صحیفہ ہمام بن منبہ بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں مسند احمد بن حنبل میں پوری کی پوری ضم کر دی گئیں۔

۲- مسند امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) یہ مسند بھی دوسری صدی کے آخر میں مرتب ہو گئی تھی۔

۳- مسند بزار، حماد بن سلمہ بن دینار بصری (م ۱۹۷ھ) نے تحریر کی تھی۔

۴- مسند امام موسیٰ بن جعفرؒ (م ۱۸۳ھ)

۵- مسند ابی سفیان و کعب بن الجراح (م ۱۹۷ھ) یہ امام شافعی کے استاد تھے۔

۶- مسند امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ) یہ مسند الشامیین کے نام سے مشہور ہوئی۔

یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ ان میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ کی مسانید قابل ذکر ہیں۔ کتب مسانید میں محدثین کرام صحیح اور ضعیف روایات کو بلا امتیاز یکجا ذکر کرتے تھے جس سے طالب حدیث کو خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ صحیح اور ضعیف کی پہچان تو جلیل القدر نقاد حدیث کا کام تھا ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں تھی۔ علاوہ ازیں وضع حدیث کا عمل بھی وجود میں آچکا تھا۔ لہذا بعد کے آنے والے محدثین نے صحیح ترین احادیث کو جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا ان میں سے حدیث کی چھ کتب مشہور ہیں۔

۱- ”صحیح بخاری“ جس کا اصل نام ”الجامع الصحیح من امور رسول ﷺ و سنتہ و

ایامہ“ از امام محمد بن اسماعیل البخاری (م ۲۵۱ھ)

۲- الجامع الصحیح - از امام مسلم (م ۲۶۱ھ)

۳- سنن نسائی از امام احمد بن شعیب النسائی (م ۲۰۳ھ)

۴- سنن ابی داؤد (م ۲۷۵ھ)

۵- سنن الترمذی (م ۲۷۵ھ)

۶- سنن ابن ماجہ (م ۲۷۲ھ)

عرف عام میں ان تمام کتب کو صحیح کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان تمام کتب کی تمام احادیث صحیح ہیں۔ بخاری و مسلم کے علاوہ باقی چار کتب میں صحیح احادیث کے ساتھ ساتھ غیر صحیح احادیث بھی ہیں۔ ان کو صحیح کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کتب میں زیادہ تر اہتمام صحیح احادیث کو جمع کرنے کا کیا گیا ہے۔

پانچویں صدی سے اب تک کا دور چوتھا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں ترویج حدیث کیلئے حدیث کی اہم کتابوں کی شروح اور حواشی لکھے گئے۔ نیز دوسری زبانوں میں ترجمے کر کے تمام لوگوں کی علم حدیث تک رسائی آسان بنا دی گئی۔ اس طرح احادیث کی تخریج کر کے عمل اور اجتہاد کی علمی حیثیت کو بھی واضح کر دیا گیا۔

محدثین نے اس دور میں یہ کام کیا کہ تیسرے دور کی تالیفات سے احادیث کو منتخب کر کے مشکوٰۃ المصابیح اور ریاض الصالحین جیسی مفید کتب لکھیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث کی شمع روشن کی ان کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور انکی اولاد و تلامذہ کی کوششوں سے یہ سرزمین بھی نور سنت سے جگمگا اٹھی۔

ان ادوار کا مختصر مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ سے لیکر آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں حدیث کے لکھنے، روایت کرنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہو بلکہ اس علم کی راتیں بھی دنوں کی طرح روشن اور تابناک ہیں۔

خود آزمائی ①

- ۱- حدیث کا مطالعہ کیوں ضروری ہے اس سلسلے میں مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیکر اس کی اہمیت کو واضح کیجئے۔
- ۲- کیا قرآن مجید کو حدیث رسول ﷺ کے بغیر سمجھا جاسکتا ہے۔ دلائل دیجئے۔
- ۳- مضامین کے اعتبار سے احادیث کی کتنی اقسام ہیں۔ ہر ایک پر مفصل بحث کیجئے۔
- ۴- فقہاء و مجتہدین کو نئے نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد استنباط کے لئے حدیث کی ضرورت ہے کیوں؟
- ۵- ماضی میں مختلف فتنے اٹھے۔ احادیث سے اعراض برتا گیا۔ ان کے ازالہ کے لئے ترویجِ علم حدیث میں علماء کی جو خدمات ہیں۔ ان پر سیر حاصل روشنی ڈالئے۔



یونٹ نمبر ④

علم الاسناد کی اہمیت

تحریر : ڈاکٹر محمد ادریس زبیر
نظر ثانی : ڈاکٹر علی اصغر چشتی



فہرست عنوانات

109	پونٹ کا تعارف
110	پونٹ کے مقاصد
111	① اہمیت اسناد
114	1.1 علم الاسناد کی اہمیت
116	1.2 سند کی اہمیت سنت کی روشنی میں
116	1.3 آثار صحابہؓ میں سند کی اہمیت
118	② اسناد کی ابتداء
123	③ اسناد اور مستشرقین
132	④ اسناد کی دو قسمیں ہیں
135	خود آزمائی

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

اس وقت آپ جس یونٹ کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کا تعلق ایک بہت ہی بنیادی موضوع ”علم الاسناد کی اہمیت“ سے ہے۔ اسناد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ علم حدیث کو اصطلاح میں ”علم الاسناد“ کہا جاتا ہے۔ امام عبداللہ بن المبارک کا قول ہے۔ (الاسناد من الدین ولو لا الاسناد لقال من شاء ماشاء) علمائے حدیث نے حدیث کی روایات کو زیادہ تر اسناد کی بنیاد پر پرکھا۔ اور ان کی حیثیت متعین کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ شروع میں ہم رواۃ حدیث پر اعتماد کرتے تھے وہ جو بھی روایت بیان کرتے ہم اسے سنتے اور تسلیم کرتے تھے لیکن جب حالات بدل گئے اور ”رواۃ وہ نہیں رہے تو ہم نے اسناد کا سہارا لیا۔ ہمارے سامنے جو بھی روایت بیان کرتا ہم اس سے پوچھتے کہ روایت کہاں سے آئی ہے۔ علمائے حدیث نے اسناد کو پرکھنے کیلئے مختلف فنون وضع کئے اور رواۃ حدیث کے لئے شرائط اور خصوصیات مقرر کیں۔ ہر ایک راوی کو شرائط صحت کی کسوٹی میں رکھا اور پرکھا۔ حدیث کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ”علم الاسناد“ کے بارے میں پوری طرح آگاہی رکھتا ہوتا کہ مصادر حدیث اور خاص کر اسناد کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے دقت محسوس نہ ہو۔ اس یونٹ میں موضوع سے متعلق بنیادی نکات اسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ اس یونٹ کا پوری توجہ اور انتہاک کے ساتھ مطالعہ کریں۔ امید ہے آپ اسے مفید پائیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

⇨ علم الاسناد کی تعریف کر سکیں۔

⇨ علم الاسناد کی اہمیت اور افادیت پر گفتگو کر سکیں۔

⇨ اسناد کی ابتداء اور اس کے اسباب و عوامل پر بحث کر سکیں۔

⇨ مستشرقین کے ان اعتراضات پر بات کر سکیں جو انہوں نے اسناد کے حوالے سے اٹھائے

ہیں۔

⇨ اسناد کی اہم اقسام پیش کر سکیں۔

① اہمیت اسناد

..... ((حدثنا الحمیدی قال: حدثنا سفیان عن یحیی بن سعید الانصاری قال، اخبرنی محمد بن ابراہیم أنه سمع علقمہ بن وقاص الليثی يقول: سمعت عمر بن الخطاب علی المنبر قال: سمعت رسول اللہ ﷺ يقول: إنما الأعمال بالنیات الخ))

مندرجہ بالا حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں حدیث بیان کرنے کے لئے راویوں کے ناموں کا ایک تسلسل ہے جو قول رسول (یعنی متن) تک پہنچنے کا ایک ذریعہ اور راستہ ہے یعنی (الطریق إلی المتن) اس حصے کو محدثین کی اصطلاح میں سند یا اسناد کہتے ہیں۔ ویسے سند کا لغوی معنی معتمد کے ہیں کہا جاتا ہے فلان سند۔ یعنی فلاں آدمی قابل اعتماد ہے۔ سند کو سند اس لئے کہا جاتا ہے کہ محدثین ہر حدیث کی صحت یا ضعف کا دار و مدار سند کے مطابق کرتے ہیں۔ گویا راویان حدیث کے سلسلے کو سند کہا جاتا ہے اور حدیث کا دوسرا حصہ جو نبی اکرم ﷺ کے فرمودات یا معمولات پر مشتمل ہوتا ہے اسے متن کہتے ہیں۔

تدریب الراوی میں امام سیوطیؒ نے متن کی تعریف یوں کی ہے۔

”متن سے مراد حدیث کے وہ الفاظ جن سے معانی کا وجود اور قوام حاصل ہو اور لغت میں سخت اور بلند زمین کو ”متن“ کہا جاتا ہے“

سند کا استدلال قرآن مجید سے

۱۔ مشرکین سے کہا رہا ہے۔

﴿إيتوني بكتاب من قبل أو أثر من علم إن كنتم صادقين﴾

(الاحقاف: ۴)

”اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب میرے پاس لاؤ یا علم (انبیاء کرام) سے کوئی روایت پیش کرو“

لفظ اثرۃ کی وضاحت قاموس (ص: ۱/۳۶۲) میں یوں کی گئی ہے۔

یعنی اثرۃ سے مراد وہ خوبی ہے جو آباؤ اجداد سے اولاد کی طرف منتقل ہوتی چلی آتی ہے اور اس بقیہ علم کو بھی کہتے ہیں جو منقول ہوتا چلا آتا ہے۔ جیسا کہ اثرۃ و آثار کا مفہوم ہے مطلب یہ ہے کہ لفظ آثارہ روایت کے مفہوم میں ہے۔

امام قاضی شوکانیؒ نے لفظ ”اثرۃ“ کی شرح اپنی تفسیر فتح القدیر میں یوں بیان کی ہے۔

(أصل الكلمة من الأثر وهي الرواية : يقال : أثرت الحديث و أثره اثره و آثاره الخ) یعنی یہ لفظ اثر کے مادہ سے ہے جب کسی دوسرے سے کوئی بات نقل کی جائے اس موقع پر یہ کلمہ بولا جاتا ہے مشہور تابعی حضرت عطاء بن ابی رباح ”او اثره من علم“ کی تفسیر یوں فرماتے ہیں۔

(اوشی تأثر و نه عن نبی كان قبل محمد ﷺ) یا کوئی ایسی چیز پیش کرو جس کو تم محمد ﷺ سے پہلے کسی نبی سے روایت کرتے ہو۔

مفسر مقاتلؒ بھی تقریباً یہی معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

(او رواية من علم الانبياء) یا علم انبیاء میں سے کوئی روایت پیش کرو (فتح القدیر۔

الاحقاف: ۴)

مذکورہ بالا آیت میں مشرکین سے ان کے شرک کے ثبوت میں دو چیزیں طلب کی گئی ہیں۔

۱- کسی سابق کتاب سے اس کی دلیل لاؤ

۲- یا کوئی ایسی روایت پیش کرو جس کی بنیاد علم پر ہو۔

ظاہر ہے کوئی بھی روایت راوی کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی اس لئے سند کا اہتمام بہت ضروری ہے اس کے بغیر کلام کی صحت یا ضعف واضح نہیں ہو سکتا۔

”امام مطر الوڑاق نے فرمان باری تعالیٰ ”أو أثاره من علم“ کے بارے میں فرمایا:

”اسناد الحدیث و سنة باللغة مؤکدة“ اس سے مراد سند حدیث اور ثابت شدہ سنت ہے۔

۲..... ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا النخ ﴾

(الحجرات: ۶)

”اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو“

اس آیت کی روشنی میں محدثین کرام نے راویوں کی جانچ پرکھ کے لئے جرح و تعدیل جیسے اہم علم کی بنیاد رکھی اور حقیقت حال جاننے کے بعد بات کو قبول کرنے اور آگے پہنچانے کا اہم ضابطہ متعارف کرایا۔

اس لئے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ((كفى بالمرء كذباً أن يحدث بكل ما سمع)) ”آدمی کے جھوٹا ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو بیان کرنے لگے۔ (سنن ابی داؤد ص: ۲۰۲)

ابن حبان فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں آدمی کو تنبیہ کی گئی ہے کہ کوئی بات سنے تو اسے اس وقت تک دوسروں سے بیان نہ کرے جب تک کہ اسے اس کی صحت کا یقین نہ ہو جائے (ابن حبان ص: ۱/۷)

..... (قال سننظر أصدقت أم كنت من الكاذبين) (۲۷: ۲) ”سلیمانؑ نے کہا اب ہم دیکھیں گے تم نے سچ کہا یا جھوٹ“

تحقیق حال کے بعد ہد ہدی بات (سند) قبول کرنے کو سلیمانؑ بھی فرما رہے ہیں۔

۴..... ﴿وَأَشْهَدُ ذَوٰی عَدْلِ مِّنْكُمْ.....﴾ الطلاق: ۲ ”اور اپنے میں سے دو افراد کو گواہ بنالو“

راوی بھی ایک اعتبار سے گواہی دے رہا ہوتا ہے اور اس کی عدالت یعنی اسکی سیرت میں پاکیزگی اس کی بنیادی صفت شمار کی جاتی ہے۔

علم الاسناد کی اہمیت

عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے ”آفة الاخبار روايتها“ یعنی خبروں کی بے اعتباری ان کے بیان کر نیوالوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کسی بھی مذہب کے پیروکار ہوں یا کسی بھی ثقافت کے حامل ہوں وہ جھوٹے کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے اور اسکی باتوں پر ہمیشہ غیر مطمئن رہتے ہیں۔ خواہ وہ کبھی کبھی سچا بھی ہو۔ مگر اس کے بعد برعکس ایک سچا انسان ہر بات اور خبر میں قابل قبول ہوتا ہے البتہ اس کی روایات کی تصدیق بھی کرائی جاتی ہے وہ اس لئے کہ سچ بولنے والا کبھی کبھی خطا کر جاتا ہے خواہ وہ وہم کی شکل میں ہو یا جھوٹ کی۔

کسی بھی خبر یا حدیث میں وہم، غلطی یا جھوٹ در آئے تو اس کا اصل سبب راوی ہوتا ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی خبر یا روایت جھوٹی اور غلط ہو اور اس کے راوی کا اس میں دخل نہ ہو۔ یہی وہ اصل چیز ہے جس نے محدثین کرام کو مطالعہ حدیث کا مبنی بر صواب طریقہ سمجھایا۔ انہوں نے مطالعہ متن کے ساتھ مطالعہ سند پر بھی توجہ دی اس لئے کہ کوئی بھی حدیث صحیح تب ہوتی ہے جب اس کا راوی صادق ہو۔ اس لئے راوی کے احوال کی تحقیق و تفتیش بہت ضروری ہے۔

محدثین کرام نے اسناد کے مطالعہ کو دین و شریعت کے تقاضوں میں سے قرار دیا ہے۔ علمائے امت کا عمل اس نظریے کو پختہ تر کر دیتا ہے۔ امام قسبنی (م ۲۲۰ ہجری) علم الاسناد کی اہمیت کو یوں واضح کرتے ہیں۔

ترجمہ ”اگر کوئی روایت، راویوں سے صحیح اور واضح طریق پر مروی نہ ہو تو ایسی روایت پر دھیان نہ دو اور اسے ترک کر دو۔ اے میرے دوست! یہ میری تمہارے لئے ایک نصیحت ہے حدیث سے راویوں کا سا قطف کر دینا مجھ پر سگے بھائیوں کی موت سے زیادہ گراں گزرتا ہے۔ روئے زمین پر اس حدیث سے بہتر

کوئی چیز نہیں جو کسی مضبوط سند سے منور ہو۔“

مطالعہ اسناد کی اہمیت اور اس کی جانب بھر پور توجہ امام سخاویؒ کے اس قول سے مزید واضح ہوتی ہے۔ اس فن کا دین میں اہم مقام ہے اور مسلمان اس کی اہمیت ابتداء ہی سے سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس سے بے اعتنائی نہیں برتی جاسکتی۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اس سے مقصود راویوں کی تحقیق اور ان کے ماضی حال اور مستقل کے حالات کی کیفیت ہو۔ اس لئے کہ اعتقادی احکام اور فقہی مسائل آنحضرت ﷺ کے ارشادات عالیہ سے ماخوذ ہیں ان کو نقل کرنیوالے ہمارے اور آپ کے درمیان واسطہ ہیں اسلئے ان کا تعارف ضروری ہے اور ان کے احوال زندگی سے واقفیت ناگزیر ہے۔ ان اسباب کی بناء پر علما امت نے ہر دور میں اس علم میں دلچسپی لی ہے۔ (فتح المغیث: ۳/۲۸۱)

محدثین نے لکھا ہے کہ اسناد حدیث کا ایک بہت اہم جزء ہے۔ اس کے بغیر کسی بھی حدیث کے متن کو حدیث نبوی کے طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ سند کو حدیث کا جز بنانے کا مقصد یہ ہے کہ سلسلہ اسناد باقی رہے۔ یہ اس امت کی خصوصیات میں سے ہے کہ بغیر سند کے وہ کوئی بات نہیں کرتی۔ چنانچہ ابوعلی الفسائی فرماتے ہیں ”اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو تین ایسی چیزوں سے ممتاز کیا ہے جو اس سے پہلے کسی امت میں نہیں پائی جاتیں اور وہ یہ ہیں: اسناد، انساب، اور اعراب۔“

امام ابن حزمؒ نے سند کے بارے میں گفتگو کی ہے وہ لکھتے ہیں: ایک ثقہ راوی کا دوسرے ثقہ راوی سے کسی چیز کا یوں منقول کرنا کہ ثقاہت کا یہ سلسلہ حضور اکرم ﷺ تک جا پہنچے۔ یہ ریت اور خصوصیت تمام اقوام میں صرف مسلمانوں کو حاصل ہے۔ باقی منقطع روایات کا سلسلہ تو یہود کی کتب میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہود اس سب کچھ کے باوجود حضرت موسیٰؑ تک اتنا قریب نہیں پہنچ پاتے جتنا ہم محمد ﷺ کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ یہود کے سلسلہ اسناد میں نسلوں کا سقوط نظر آتا ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ شمعون تک پہنچ پاتے ہیں۔ رہے نصاریٰ اولاً تو ان کے ہاں کوئی ایسی بات ہی نہیں ملتی جو مسند نام کی ہو۔ زیادہ سے زیادہ حرمت طلاق کے بارے میں ان کے پاس مسند موجود ہے۔

1.2 سند کی اہمیت سنت کی روشنی میں

۱..... نبی کریم ﷺ نے حج کے موقع پر قربانی کے دن خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(لِيلِغ الشَّاهِدِ الْغَائِبِ. فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسَى أَنْ يَبْلُغَ مَنْ هُوَ أَوْعَى لَهُ مِنْهُ) (صحیح بخاری کتاب العلم)

جو حاضرین ہیں وہ میری باتیں ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ ایسا ممکن ہے کہ حاضر کی نسبت غائب زیادہ قوت حافظہ کا مالک ہو۔ یہاں غائب سے مراد..... ۱۔ وہ لوگ بھی تھے جو وہاں موجود نہ تھے۔

۲..... غائب سے مراد بعد میں آنے والی نسلیں بھی ہیں اس لئے صحابہ کرام نے آپ ﷺ کے اقوال و افعال کو تابعین تک پہنچایا اور تابعین نے سنت کا یہ ذخیرہ اپنے شاگردوں (تابع تابعین) کو منتقل کیا اس طرح احادیث مبارکہ سینہ بسینہ اور کتابی شکل میں ہم تک پہنچ گئیں۔

1.3 آثار صحابہ میں سند کی اہمیت:

(۱) عن عبد الله بن مسعود قال: إن الشيطان يتمثل في صورة الانسان، فيأتي القوم فيحدثهم بالحديث من الكذب، فيتفرقون. فيقول الرجل منهم: سمعت رجلا أعرف وجهه لا أدري ما اسمه يحدث (مقدمہ صحیح مسلم ج ۱ ص: ۷۸) ”ابن مسعود فرماتے ہیں شیطان انسانی بھیس میں لوگوں کے پاس آتا ہے اور انہیں جھوٹ سچ سناتا ہے پھر لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک کہتا ہے میں نے کسی سے یہ بات تو سنی ہے اسکی صورت بھی پہچانتا ہوں مگر اس کا نام یاد نہیں“

ابن مسعودؓ کے اس ارشاد کا مطلب بالکل واضح ہے کہ کسی کی بات پر یقین و اعتماد کرنے کیلئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی پوری شخصیت سے اچھی طرح واقفیت ہو۔ محض صورت شناسی کافی نہیں ہوتی۔ یہ تاکید اگر عام بات چیت کے سلسلے میں عبد اللہ بن مسعودؓ فرما رہے ہیں تو حدیث نبوی میں اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس قدر احتیاط کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی جرات و ہمت بھی دیکھئے۔ کہ وہ احادیث کو آگے منتقل کرتے رہے چاہے اس عمل میں ان کی جان جانے کا خطرہ بھی درپیش ہوتا حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں۔

”اگر تم یہاں تلوار کھ دو (اور اپنی گردن کے طرف اشارہ کیا) اور مجھے اندازہ ہو کہ تمہاری تلوار چلانے سے پہلے ایک کلمہ بھی زبان پر لاسکتا ہوں جس کو میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے تو میں ضرور اسے سنا کر رہوں گا“ (صحیح بخاری۔ کتاب العلم)

خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”الرحلة فی الحدیث“ میں صحابہ کرام اور تابعین کے واقعات و ارشادات کو ذکر فرمایا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اگر صحابہ کرام کے نزدیک سند کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو صرف ایک حدیث کی خاطر لمبے، دشوار گزار سفر کبھی اختیار نہ کرتے۔

② اسناد کی ابتداء

قبل از اسلام کی شعر و شاعری کی روایت میں سند کا استعمال کسی حد تک پایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ شاذ و نادر مگر مبہم ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے درمیان جب حدیث رسول ﷺ عام ہوئی اور حفظ و کتابت کے اہتمام کے ساتھ روایت میں بھی خاص احتیاط سے کام لیا گیا تو اس کا اثر تاریخ نگاروں، ادیبوں، شاعروں، قضاة اور سیرت نگاروں پر بھی پڑا۔ انہوں نے بھی اپنے اپنے فنون کی روایات میں اسانید بالکل اسی طرح کرنا شروع کر دیں جو محدثین کا طرہ امتیاز بن چکا تھا۔

مسلمانوں میں اسناد کی ابتداء کیسے ہوئی اور کب ہوئی اس بارے میں علماء نے بہت سی ذہنی اشکالات کا جواب دیدیا ہے۔

مصطفیٰ اعظمی کا کہنا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرام جب آپس میں ملاقات کرتے تو ایک دوسرے سے حدیث نبوی کا ذکر کرتے۔ بلکہ باری باری آپ کی مجالس میں بیٹھ کر استفادہ سننے یا دیکھنے کی صورت میں کرتے۔

ظاہر ہے جب وہ ایک دوسرے کو ذات رسول ﷺ کے حوالے سے بات سناتے ہوں گے وہ ضرور اس قسم کے لفظ کا استعمال کرتے ہوں گے کہ میں نے آپ ﷺ سے سنایا میں نے آپ ﷺ کو دیکھا۔ یا آپ ﷺ نے یہ فرمایا یا آپ ﷺ نے ایسا ایسا عمل کیا۔ اسی طرح دوسرا شخص جب تیسرے کو حدیث نبوی بیان کرتا ہوگا تو اس (حدیث) کے حصول کا ٹھیک ٹھیک حوالہ دیتا ہوگا۔

مثال کے طور پر ضَمَام بن ثعلبہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے۔

اللہ کے رسول! آپ کا نمائندہ ہمارے پاس آیا اور اس نے ہمیں یہ بتایا۔

آپ کی سنت و حدیث دوسرے غیر موجود لوگوں تک ابتداء اس طریق سے پہنچائی گئی۔ تفہیم کے ان مختلف طریقوں نے اسناد کو جنم دیا اور یہ اس کا ابتدائی مرحلہ تھا۔

یہ بات تو واضح ہے کہ مسلمان شروع اسلام سے لے کر فتنہ عثمانؓ تک آنحضرت ﷺ کی حدیث کے بارے میں قطعاً جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ شہادت عثمانؓ کا ہونا تھا کہ مختلف فرقے اور گروہ وجود میں آ گئے۔ وہاں سے نبی ﷺ کی احادیث کے بارے میں دروغ بیانی کا آغاز ہوا۔ صحابہ و تابعین نے وضع حدیث (حدیث گھڑنے) کے ان رجحانات کا نہایت اہتمام سے سد باب کیا حدیث کے راویوں سے سند طلب کرنے میں سختی اختیار کی اور حدیث بیان کرنے کے لئے صحیح سند کو لازم و ملزوم ٹھہرایا چنانچہ امام محمد بن سیرینؒ لکھتے ہیں کہ: لم یكونوا يسألون عن الاسناد، فلما وقعت الفتنة قالوا: سَمَوْنَا رِجَالَكُمْ فَيَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ، وَيَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ الْبِدْعِ فَلَا يُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ ”لوگ سند کے بارے میں نہیں پوچھا کرتے تھے۔ مگر جب فتنہ ظاہر ہوا تو انہوں (علما) نے (روایت کرنیوالوں سے) کہا: ان لوگوں کا نام ہمیں بتاؤ جن سے تم نے یہ حدیث سنی ہے۔ اس طرح جو سنت کا حامل ہوتا تو اس کی حدیث لے لی جاتی اور جو بدعتی ہوتا اس کی حدیث چھوڑ دی جاتی تھی“ (صحیح مسلم مع شرح نووی ص: ۸۴/۱)

اس قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فتنہ عثمانؓ سے قبل صحابہ و تابعین حدیث روایت کرنے میں سند کا استعمال نہیں کیا کرتے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس سے قبل کبھی سند بیان کرتے اور کبھی ترک کر دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ اس زمانہ میں صدق، امانت اور اخلاص کے حامل اور اسی کے پروردہ تھے۔ ورنہ بیشتر مثالیں ایسی مل جاتی ہیں جن سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادت عثمانؓ سے قبل بھی صحابہ کرام سند حدیث بیان کرتے تھے مثال کے طور پر حضرت علیؓ ایک صحابی براء بن عازبؓ کو فرماتے ہیں کہ فاطمہؓ نے مجھے بتایا تھا۔

(أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَهَا أَنْ تَحُلَّ مَخْلُفٌ وَ نَضَحَتْ الْبَيْتَ بِنُضُوحٍ)۔ (الجامع للاخلاق الروای ص: ۲۶۹/۱) ”کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ احرام کھول دیں چنانچہ انہوں نے

احرام کھول دیا اور گھر کو صاف ستھرا کیا۔ اس طرح حضرت ابویوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اور انہوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ..... البدایہ والنہایہ ۲/۱۰۹، سیر اعلام النبلاء ۲/۴۳۶۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اسناد صحابہ کرام کیلئے کوئی اچانک وارد ہونیوالی چیز نہ تھی اور نہ ہی اہل عرب کے لئے اسلام کے آنے پر جدید چیز تھی۔ بلکہ مسلمان اسلام سے قبل بھی اس سے واقف تھے۔ واقعات و قصص کے بیان کرنے میں یا اشعار پیش کرنے میں اہل عرب دور جاہلیت میں بھی اسناد استعمال کرتے تھے۔

سند کے بارے میں یہ شدت محض حدیث کو پایہ ثبوت فراہم کرنے کیلئے تھی اور وہ بھی شہادت عثمانؓ کے بعد صغار اور کبار تابعین میں یہ شدت آئی امام مسلمؒ سند متصل کے ساتھ امام مجاہدؒ سے بیان کرتے تھے کہ بشیر بن کعب عدوی، ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حدیث بیان کرنا شروع کی۔ کہنے لگے (قال رسول اللہ ﷺ قال رسول اللہ ﷺ) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس کی طرف کوئی کان نہ دھرے اور نہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ بشیر عدی کہنے لگے: میں آپؐ کو رسول اللہ ﷺ کی احادیث سن رہا ہوں اور آپؐ اعراض کر رہے ہیں

ابن عباسؓ نے انہیں سمجھاتے ہوئے فرمایا: ایک زمانہ ہم پر بھی یوں گزرا ہے کہ کوئی شخص جب یہ کہتا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: تو ہماری نگاہیں فوراً بے ساختہ ہو جاتی تھیں اور اپنے کانوں کو اسی کی طرف جھکا دیتے تھے (باقی رہا میرا یہ انداز) تو وجہ یہ ہے۔ ”ہم آپ ﷺ کی احادیث بیان کیا کرتے تھے۔ مگر اس وقت آپؐ کی طرف حدیثوں کو گھر کے جھوٹ بولنے کا رواج نہیں تھا۔ مگر اب لوگوں میں جھوٹ اور سچ کی تمیز جاتی رہی تو ہم نے حدیث بیان کرنا ترک کر دیا“

تابعین بھی سند کے بارے میں دریافت فرمایا کرتے تھے اور اس کا خود بھی التزام کرتے ابن عبد البر نے لکھا ہے۔ امام شافعیؒ سے رنج نے کہا کہ جو ”لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ“ لہ، الملک ولہ، الحمد یحییٰ و یمیت وهو علی کل شئی قدید“ دس بار کہے گا اسے ایک غلام کے آزاد کرنے

کے برابر ثواب ملے گا۔ شععی کہتے ہیں، میں نے ربیع بن خثیم سے عرض کی۔ آپ کو یہ حدیث کس نے بیان کی؟ کہنے لگے: عمرو بن میمون ازدی نے میں عمرو بن میمون ازدی سے ملا ان سے پوچھا یہ حدیث آپ کو کس نے بیان کی؟ انہوں نے کہا عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ نے۔ میں ابن ابی لیلیٰ سے ملا۔ ان سے دریافت کیا کہ یہ حدیث آپ کو کس نے بیان کی۔ انہوں نے کہا صحابی رسول ابو ایوب الانصاری نے“ (مقدمہ التہدید ص: ۱۳/۱)

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں ((وہذا اول من فتنش عن الاسناد)) (المحدث الفاصل ص: ۲۰)۔

یعنی امام شععی پہلے فرد ہیں جنہوں نے اسناد کے بارے میں تحقیق و جستجو کی (باقاعدہ) بنیاد ڈالی۔

ابوالعالیہ الریاحی کہتے ہیں ہم بصرہ میں صحابہ کرام کے حوالے سے احادیث سنا کرتے تھے مگر ہم اس پر مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ ہم خود سوار ہو کر مدینہ آتے خود ان سے سنتے پھر تسلی ہوتی تھی۔ (مقدمہ التہدید ص: ۱۵)

تابعین و تبع اسناد کی طلب کے لئے ایک دوسرے کو نصیحت بھی کیا کرتے۔ ہشام بن عروہ کہتے ہیں جب تمہیں کوئی حدیث بیان کرے تو اس سے پوچھا کرو کہ یہ کس سے بیان کر رہے ہو (الجرح والتعديل ص: ۳۴/۱) امام زہری جب کبھی حدیث بیان فرماتے تو سند کو ضرور ذکر کرتے اور فرماتے: ”چھت پر بغیر سیرھی کے چڑھنا مناسب نہیں“۔ (الجرح والتعديل ص: ۱۶/۱) امام اوزاعی فرماتے ہیں: ما ذهب العلم الا بذهاب الاسناد ”سند گئی تو علم گیا“۔ (مقدمہ التہدید ص: ۱۵) سفیان ثوری کہا کرتے: ”سند مؤمن کا ہتھیار اگر اس کے پاس یہ ہتھیار نہ ہو تو وہ کس چیز سے لڑے گا“۔ (شرف اصحاب الحدیث ص: ۸۰) امام عبداللہ بن المبارک فرمایا کرتے: الاسناد من الدين، ولو لا الاسناد لقال من شاء ما شاء (صحیح مسلم مع شرح ص: ۸۷/۱) ”اسناد دین کا جزء ہے اگر اس کا خیال نہ رکھا جاتا تو جس کے جی میں جو آتا کہہ دیتا۔“

تابعین عظام نے اسناد کے بارے میں پختگی کا مظاہرہ کیا اور اس میں وہ ایسے نمایاں رہے جیسے علوم الحدیث میں نمایاں تھے۔

آہستہ آہستہ اسناد کی تحقیق عام و خاص کی ضرورت بن گئی۔ کسی بھی بات کی صحت جاننے کے لئے علما ہی نہیں بلکہ عام فرد بھی سند دریافت کرتا تھا۔ امام اصمعی کہتے ہیں کہ میں ابن عیینہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتنے میں ایک بدو آیا اس نے حال پوچھتے ہوئے کہا شیخ نے صبح کیسے کی۔ یعنی رات کیسی گزری۔ جواب میں ابن عیینہ نے کہا الحمد للہ بہت اچھی گزری۔ اعرابی کہنے لگا۔ جناب یہ بتائیے کہ ایک عورت مناسک حج ادا کر رہی ہے طواف بیت اللہ سے قبل اسے حیض آ گیا ہے تو وہ کیا کرے؟ سفیان نے کہا: عائشہ ام المؤمنین کو طواف سے قبل حیض آ گیا تھا تو نبی ﷺ نے انہیں فرمایا تھا کہ طواف کے علاوہ باقی سارے مناسک حج ادا کرو۔ اعرابی کہنے لگا کیا آپ تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہے؟ سفیان نے فرمایا جی ہاں۔ ”حدثنی عبد الرحمن بن القاسم عن ابیہ عن عائشہ بذلک“ مجھے یہ حدیث عبد الرحمن بن قاسم انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضرت عائشہ سے بیان کی ہے۔ اعرابی نے کہا: ”آپ نے بہت اچھی مثال پیش کی اور روایت بخوبی لائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مزید راہنمائی کرے“ (الکفایہ ص: ۴۰۴)

③ اسناد اور مستشرقین

ان میں جیمز روبسن، کانیانی، ہور ووتر، شاخت، سپرنگر اور گولڈزیر بھی تنقید کے ساتھ ساتھ اسناد کے بارے میں مختلف خیال ہیں۔ مگر مسلمانوں کے مطالعہ اسناد کے اس اہتمام پر اور تحقیق و ریسرچ کے ان بنیادی اصولوں سے آگاہ کرنے پر بہت سے اہل علم نے امت مسلمہ کا یہ ایک قابل فخر کارنامہ اور امتیازی خصوصیت قرار دیا ہے۔

مستشرقین میں اس کا اعتراف سپرنگر کو ہے جس کا کہنا ہے:

Orientalists and Isnad.

Among the orientalist there have been differences of opinion about the beginning of isnad. According to Caetani, 'Urwah (d. 94), the oldest systematic collector of traditions, as quoted by Tabari, used no isnads and quoted no authority but the Qur'an. Caetani, therefore, holds that in the time of 'Abd al-Malik (c. 70-80), more than sixty years after the Prophet's death, the practice of giving isnad did not exist. So, he concludes that the beginning of the isnad system may be placed in the period between 'Urwah and Ibn Ishaq (d. 151). In his opinion the greater part of the isnad was put together and created by traditionists belonging to the end of the second century, and perhaps also by those belonging to the third'.

Sprenger has also pointed out that the writing of 'Urwah to 'Abd al-Malik does not contain isnad and it was only later that he was credited with it²۔

The quotations from the writing of 'Urwah to 'Abd al-Malik are preserved not only in Tabari but in many classical collections of Hadith as well³ which are earlier than Tabari. In one of the quotations,, through the same isnad which is utilized by Tabari, we find 'Urwah quoting his authority 'A'ishah⁴. The main difficulty which arises in searching for the sources of 'Urwah is

the lack of original work existing in a separate form. The available material is only in the form of quotations. It was left to later scholars to quote certain lines from the work as they were wanted. 'Urwah had personal contact with most of the Companions so his authority must have been a single name or the very person who was present at the incident. Hence, the isnad consisted of a single name. And it is easy to omit or overlook a single man's name in quoting. The other versions of his work, especially the one transmitted by Zuhri, have isnads. 'Urwah even uses composite isnads⁵ in the writing, as well as the single one.

Horovitz, who has studied the problem of isnad, has answered the arguments of Caetani and other scholars thoroughly in his article *Alter und Ursprung des Isnad*⁶. He points out that those who denied the use of isnad by 'Urwah did not notice all his isnads. Furthermore he argues that there is a difference between what one writes when one is asked questions and what one does within learned circles. His conclusion is that the first entry of the isnad into the literature of tradition was in the last third of the first century¹. But as 'Urwah also uses composite isnads, the use of single isnad in writing must have been earlier than this period and the use of the single isnad in oral transmission of traditions much earlier than that.

A Scottish scholar, J. Robson, who has studied the subject at some length, says, "It is during the middle years of the first century of Islam that one would first expect anything like an isnad. By then many of the Companions were dead, and people who had not seen the Prophet would be telling stories about him. It might therefore naturally occur to some to ask these men for their authority. The growth of a hard and fast system must have been very gradual"². He concludes, "We know that Ibn Ishaq, in the first half of the second century, could give much of his information without an isnad, and much of the remainder without a perfect one. His predecessors would almost certainly be even less particular than he in documenting their information. But we are not justified in assuming that the isnad is a development of Zuhri's period and was unknown to 'Urwah, While the developed system had a slow growth, some element of isnad would be

present from as early a period as people could demand it"3.

Professor Schacht and Isnad.

Recently Schacht has dealt with the legal traditions and their development. In his opinions isnads are the most arbitrary part of traditions. They were developed within certain groups who traced back their doctrines to early authorities4. Commenting on Schacht's criticism, Professor Robson says, "The criticism levelled at the isnads is very thoroughgoing, and some strong arguments are brought forward to suggest that the use of isnads is a late development: but one hesitates to accept it to the full extent... Schacht is dealing primarily with legal traditions, a sphere where his argument may apply more closely than elsewhere, as changing conditions and the development of legal thought must have demanded new regulations; but one wonders whether the argument is not too sweeping"5.

Schacht's approach to the subject and its weakness will be discussed later on. At the moment only one of his statements requires immediate attention. He says, "It is stated on the authority of the Successor Ibn Sirin that the demand for and the interest in isnds started from the civil war (Fitna), when people could no longer be presumed to be reliable without scrutiny; we shall see later that the civil war which began with the killing of the Umai-yad Caliph Walid b. Yazid (A. H. 126), towards the end of the Umayyad dynasty, was a conventional date for the end of the good old time during which the Sunna of the Prophet was still prevailing; as the usual date for the death of Ibn Sirin is A. H. 110, we must conclude that the attribution of this statement to him is spurious. In any case, there is no reason to suppose that the regular practice of using isnds is older than the beginning of the second century A.H." But his whole argument is based on his arbitrary interpretation of the word *Fitnah*. The assassination date of Walid b. Yazid has never been a conventional date in Islamic history and was never reckoned as the end of the "good old time". This title is given only to the Period of four righteous Caliphs.

Furthermore, there were many Fitnahs before this date. There was the civil war between Ibn al-Zubair and 'Abd al-Malik b. Marwan

about 70 A.H. But the biggest of all was the civil war between 'Ali and Mu'awiyah, which produced a breach among Muslims which exists to the present day. Taha Husain has described it rightly as the most fierce quarrel known in Islamic History².

So, on what grounds does the word Fitnah need to be interpreted in the sense of the civil war after the killing of Walid b. Yazid? To take the word arbitrarily in this sense is equal to interpreting it as the Fitnah of Tartar and Halaku. Schacht takes this word in the sense which suits him, without any historical justification, to prove his own theory. This, of course, is logically absurd. "

Professor Robson inclines to take the word in the sense of the Fitnah of Ibn al-Zubair, considering the birth date of Ibn Suzin, as well as the occurrence of the word Fitnah, in the text of Muwatta' Malik which refers to this period³. The present research indicates that it should be taken back to the first and the most dangerous civil war in the history of Islam. For this suggestion, there are the following reasons:

1. Professor Robson has pointed out that at the middle of the first century, when many of the Companions were dead and people who had not seen the Prophet would be telling the story of the Prophet, someone would naturally ask them to name the authority. If we accept the status of the Prophet as it is shown in Robson's statement - which is quite unfair - this is possibly what might have occurred.

Yet before reaching this stage, there was a great upheaval in the fourth decade. Most likely, 'the first fabrication of traditions began in the political sphere, crediting and discrediting the parties concerned; In the well-known work of al-Shaukani, concerning spurious and similar traditions we find:

42 spurious traditions about the Prophet 38 spurious traditions about the first three Caliphs 96 spurious traditions about 'Ali and his wife Fatimah 14 spurious traditions about Mu'awiyah¹

Therefore, it looks as if the spurious traditions began to originate

for political purposes at and about the period of the war between 'Ali and Mu'awiyah, and continued later on as a counterattack on the Umayyad dynasty. The traditionists and other scholars found it necessary from that time onwards to be more cautious in selecting their authorities.

2. The second reason for this assumption is the statement of Ibn Sirin itself. There is no reason whatsoever to discredit it and challenge its authenticity. Ibn Sirin's wording suggests that he relates a practice earlier than his own period. He uses the words "They did not ask", "they said 'Name to us your men', "were accepted", etc. He does not use the first person of the personal pronoun in a period when its usage was common. So it seems that he points to a practice in very early days. Furthermore, he says 'they did not ask', which implies that the practice of isnad was in existence, but people did not usually inquire, and it was left to the transmitter whether or not to disclose his sources.

Material for the study of Isnad.

Perhaps a lot of confusion in the study of isnad is due to the selection of the material for research of this kind. Professor Robson says: "Horovitz has reminded us that there are three sources for the sayings and doings of the Prophet, viz. Hadith (Tradition), Sira (Biography of the Prophet), and Tafsir (Qyr'an commentary), the ground-element in all being a pronouncement introduced by a chain of witness; and Lammens has rightly insisted the Sira and Hadith are not distinct sources, as did Horovitz"1. So, Professor Robson inclines to accept the view of Lammens, while Horovitz wants to draw a line between Sirah and Hadith. Horovitz's approach seems to be much more natural in this context. There is a difference in the very nature of Sirah (Biography) and the documentation of Hadith.

In Hadith any single statement can be put together with any other statement of quite a different subject without causing much perplexity. But Sirah, being a biography, requires a flow and continuance of episode. Therefore compilers of biography put together their different sources to knit a complete story2, while the same authors and the same authorities, when transmitting traditions of other than biographical nature, do not put into

practice the biographical method. Therefore, from this angle, there is a difference between Hadith and Sirah literature, and so Sirah is not a proper subject for the study of the system of isnad. Until now most of the research on isnad has been carried out in the biographical literature.

Schacht and the study of Isnad in legal literature.

Schacht has studied the Muwatta' of Malik, Al-Umm of al-Shafi'i, Muwatta' of al-Shaibam, etc., works which belong to legal science. He has imposed the results of his study on the entire Hadith literature, as if the Hadith literature does not exist at all and as if it does not have an independent footing of its own.

It seems quite clear that he has not paid much attention to the nature of a legal work. A lawyer, a judge or a Mufti, whenever he gave his verdict, was not bound to give the full documents to support his verdict. When a scholar writes to a certain scholar, he may make only slight allusions to his references, so his colleague can recall the necessary items to his mind.

These were the methods used by the prominent lawyers of the early centuries of Islam. Though most of the writings of that period are not available in separate form, yet we still have a few legal books which belong to the second century A.H. A glance at their methods of quoting traditions would reveal this very fact. Shafi has utilized the material from Muwatta' of Malik, and Abu Yusuf has utilized the work of Ibn Ishaq and others. Here are a few examples which show their method in quoting traditions.

Methods of quoting traditions by early lawyers*.

1. A.Y.- 1.1..... U.S.1
1.1 ... A.H. ... S.M. ... M ... A.U. ... U.S.2
2. A.Y.- 1.1 the Prophet3
1.1. S.Y. A.J. the Prophet*
3. A.Y.. the Prophet5
A.Y. ... Q.R. ... M.A. ... I.A. ... A.H. ... A.D.
... the Prophet6
4. A Y. ... -M.... S+2 7... U ...S.A.W.
AY... MS . U.....S.A.W.

source Muwatta' Malik:

Malik - Yahya - 'Umar b. Kathir - Abu Muhammad - Abu Qatadah - The Prophet².

Malik - Yahya - 'Amr - Abu Muhammad - Abu

Qatadah - The Prophet³.

10. Shafi'i says, "And Ibn 'Umar transmitted Salat al-Khauf from the Prophet" without mentioning any isnad⁴. But we find a complete isnad in al-Umm and his immediate authority the Muwatta'. Ibn 'Umar - the Prophet⁵ Nafi' - Ibn 'Umar - the Prophet⁶.. Malik - Nafi' Malik

11. He mentions in the. Risalah the Tawaf performance of 'Umar after the morning prayer and some other ritual activities without giving any isnad, saying only. وقد ذهب بعض أصحابنا إلى ع ان مر بن الخطاب طاف بعد الصبح But in his immediate authority Malik there is a complete isnad: Malik - Ibn Shihab - Humaid - 'Abd al-Rahman, who performed Tawaf accompanying 'Umar⁸.

12. In another place, Shafi'i says explicitly, "Every Hadith I have copied out (meaning in his books) with Munqati' isnad, I have heard it with complete isnad or transmitted by well-known authorities relating from well-known authorities. But I disliked quoting a Hadith which I did not memorize well. I lost some of my books but have verified what I have remembered from what is known to scholars; I have made it brief, being afraid of its volume, and have given only what will be sufficient, without exhausting all that can be known about the subject"⁹

The above evidence and its implications.

In the writings of early Scholars, mostly in non-tradition literature, the following features are very common:

The cutting of isnads and their confining to the least possible quotations to serve the purpose, as the complete isnad and ample

references would make the work bulky

The omission of the complete isnad and quotation direct from the highest authority².

The use of isnad by Abu Yusuf reveals that he uses the complete isnad, cuts it off, puts the anonymous word, while he himself has mentioned the exact name a few pages earlier³.

The use of the word Al-Sunnah and other words derived from it to mention the practice of the Prophet, without giving the text or isnad, as the Hadith in question was well-known to the scholars⁴.

The conclusion.

Summing up the argument, the literature of legal science or the Sirah work is inadequate for the study of the traditions and isnads and their 'growth'.

Hadith is a complete subject by itself with a good many subsidiary branches. It is totally wrong, even unscientific, to study Hadith as a subject in the legal books. Therefore, any conclusion about the traditions, their transmission, or the isnad system, etc., based on the study of legal literature would be faulty and unreliable.

④ اسناد کی دو قسمیں ہیں

۱- اسناد عالی: ایسی سند جس کے راوی کم عدد ہونے کی وجہ سے نبی ﷺ کے قریب ترین ہو جائیں۔ یعنی سند میں راویوں کی تعداد کم سے کم ہو۔

۲- اسناد نازل: ایسی سند جو اسناد عالی کے مقابل یا اس کے برعکس ہو۔

سند میں علو مختلف وجوہات کی بناء پر حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کو تقدم سماع حاصل ہو اس کی سند دوسرے کے مقابلے میں اعلیٰ ہوگی جس نے بعد میں اسی شیخ سے سنا جیسے دو شاگردوں نے ایک ہی استاد سے استفادہ کیا ہو ایک کو استفادہ کئے ہوئے ساٹھ برس ہو گئے ہوں اور دوسرے کو چالیس تو اس صورت میں پہلا دوسرے سے اعلیٰ ہوگا سند عالی کو نازل کے مقابلے میں جو عظمت و فضیلت حاصل ہے وہ ہر وقت اور ہر جگہ مطلقاً نہیں ہے بخلاف ازیں جب سند نازل میں کوئی خرابی پائی جاتی ہو تو وہ عالی سے بڑھ جاتی ہے مثلاً جب سند نازل کے راوی زیادہ حافظ، ثقہ اور فقیہ ہوں یا اس کے اخذ و روایت کی صورت اقرب الی السماع ہو۔

وکج اپنے تلامذہ و اصحاب سے فرمایا کرتے تھے۔ بتائیے ان دو سندوں میں سے تمہیں کون سی پسند ہے۔ آیا (اعمش از ابی و ائل از ابن مسعود یا)

(۲) (سفیان از ابراہیم از ابن مسعود)

پہلی سند میں سب شیوخ ہیں اور دوسری سند فقہاء پر مشتمل ہے اور فقہاء کی سند شیوخ کی سند سے عزیز تر ہوتی ہے۔ (اختصار علوم الحدیث ص: ۱۸۵)

حافظ ابو طاهر السلفی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حدیث میں وجہ فضیلت صرف یہ ہے کہ وہ علما سے مروی و منقول ہو۔ اس لئے جو سند علما پر مشتمل ہو وہ نازل ہو تو بھی عام رواۃ کی سند عالی سے بہتر ہے۔ محققین کا یہی نکتہ نظر ہے اس صورت میں سند نازل نظر و تحقیق کی بنا پر عالی کہلانے کی مستحق ہو جائے گی۔ (التدریب

ص: ۱/۱۸۸) ہم دیکھتے ہیں کہ ائمہ عظامؒ کا ہمیشہ یہ شعار رہا ہے کہ ایسے محدثین کی روایت کو ترجیح دی جائے جن کی سند عالی ہو اور سرور کائنات ﷺ کے قریب تر ہو۔ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اسناد قرب تقرب الی اللہ کا باعث ہے۔ (الجامع ص ۱/۱۳)

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔

(الاسناد العالی سنة عمن سلف) ”اسناد عالی کا حصول اسلاف کا شعار رہا ہے“

(طلب علو الاسناد من الدین) ”علو اسناد کی طلب دراصل دین ہے“

امام یحییٰ بن معین سے ان کی مرض الموت میں دریافت کیا گیا کہ آپ اس موقع پر کیا خواہشمند ہیں۔ فرمانے لگے۔ بیت خال واسناد عال۔

چنانچہ اسناد عالی کی یہ طلب انہیں دور دراز کے کھن سفر سے نہ روک سکی اسکی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اسناد عالی خطا اور علت دونوں سے بہت حد تک بچی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ سند کے ہر راوی کے بارے میں یہ ممکن ہے کہ ہو یا عہد اُکسی بھی خطا کا مرتکب ہو۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

علو اسناد کا اشتیاق اس وجہ سے تھا کہ یہ اقرب الی الصحۃ ہوتی ہے۔ قلت خطا بھی اس میں ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی راوی حدیث سے خطا کا امکان ہے تو جب بھی راویوں کی کثرت ہوگی سند اتنی لمبی ہوگی اور خطا کے امکانات بھی اتنے زیادہ ہوں گے۔ اور جب سند میں راویوں کی قلت ہوگی تو خطا کے امکانات اتنے کم ہوں گے۔ (شرح النخبة: ۳۱)

علو سند، اس کا شوق۔ اسکی اجازت وغیرہ کے بارے میں علمائے حدیث نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ جس میں ضمام بن ثعلبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں۔ (یا محمد! اتانا رسولک فرعم انک تزعم ان الله ارسلک قال اصدق)

امام حاکمؒ فرماتے تھے: ”یہ انداز دراصل ایک دلیل ہے کہ آدمی علو اسناد کی طلب کر سکتا ہے اور سند نازل کو چھوڑ سکتا ہے خواہ اس کا سماع کسی ثقہ سے ہی کیوں نہ ہو۔ اس اعرابی کے پاس جب آپ کا قاصد پہنچا اور اس نے آپ کی تعلیم و ارشادات انہیں بتائے تو ضمام بن ثعلبہ نے اسے ناکافی سمجھا اور بنفس نفیس خود سفر کر کے خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ سے وہی بات سن لی جو آپ کے قاصد نے اس تک پہنچائی تھی۔ اگر طلب علو اسناد غیر مستحب چیز ہوتی تو آپ ﷺ ضمام کے اس سوال پر سخت ناراض ہوتے کہ میرے قاصد پر یقین نہیں آیا اور تم اب مجھ پر یقین کرنے آئے ہو۔“ ابو طاہر السلفی کہتے ہیں کہ اسناد عالی کے حصول کیلئے ہمت و دما مروتیں میں نے دو مرتبہ خون کا پیشاب کیا۔

⑤ خود آزمائی

- ۱۔ اسناد اور علم کی تعریف مثالوں کے ساتھ لکھئے۔
- ۲۔ قرآنی آیات کی روشنی میں اسناد کی اہمیت پر روشنی ڈالئے۔
- ۳۔ احادیث رسول اسنادی حیثیت پر گفتگو کرتی ہیں۔
- ۴۔ آثار صحابہ کرام بھی کیا اسنادی سسٹم کی شہادت دیتے تھے۔
- ۵۔ اسناد کی ابتداء کب ہوئی اور اس کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔

6. Write a shortnote about "orientalists and isnad"
7. Professor schacht has given his option .about isnad, write a detail account of it.
8. The word "Fitnah" is meant by the Muslim Schllar and orientalists hsan their paint of views in detail.
9. In legal literature schacht has criticied the isnad, give a brief account of it.
10. What were the methods of qouting traditions by the early lawyer. Give a condession of it.

۱۱۔ اسناد کی اہم اقسام پر ایک شذرہ لکھئے۔



پونٹ نمبر ⑤

تخل حدیث کی اقسام

تحریر: عبدالحمید خان عباسی
نظر ثانی: ڈاکٹر علی اصغر چشتی



فہرست عنوانات

141	پونٹ کا تعارف
142	پونٹ کے مقاصد
143	① تخل حدیث کے طرق اور صیغ اداء
143	② تخل حدیث کے طرق
144	2.1 السماع من لفظ الشیخ (شیخ کے الفاظ میں سنتا)
144	2.1.1 اس طریقہ کا رتبہ
145	2.1.2 ادائے حدیث کے صیغے
146	2.1.3 صیغوں کے استعمال کے مواقع
147	2.1.4 صیغوں کے درجات
149	2.2 القراءة علی الشیخ (شیخ یعنی استاد کے سامنے پڑھنا)
149	2.2.1 اس طریقہ کی روایت کا حکم
150	2.2.2 اس طریقہ کا درجہ
151	2.2.3 صیغ اداء اور ان کے استعمال کے مواقع
151	2.2.4 اعلیٰ درجہ کے الفاظ
153	2.3 الإجازة (اجازت دینا)
155	2.4 المناوالتہ (مناولت)
155	2.4.1 مناوت کی اقسام
159	2.4.2 اس صورت کا درجہ اور اس میں روایت کا حکم

- 159 2.4.3 ادائے حدیث کے صیغ والفاظ
- 160 2.5 الکتبۃ (کتاب یعنی لکھنا)
- 160 2.5.1 کتاب کی اقسام
- 162 2.5.2 ادائے حدیث کے صیغ والفاظ
- 162 2.6 الإغلام
- 163 2.6.1 اس صورت کا حکم
- 164 2.6.2 عمل کا حکم
- 165 2.6.3 ادائے حدیث کے الفاظ
- 165 2.7 الوصیۃ (وصیت کرنا)
- 165 2.7.1 صورت میں روایت کا حکم
- 167 2.7.2 ادائے حدیث کے الفاظ
- 167 2.8 الوجادۃ (پالینا)
- 167 2.8.1 وجادہ کی صورت
- 169 2.8.2 وجادہ کی اہمیت
- 172 2.8.3 ادائے حدیث کے بعض صیغوں کی کتابت و قرأت کا طریقہ
- 174 2.8.4 سند میں لفظ ”عن“ کا کردار
- 176 2.8.4 تحویل سند
- 178 خود آزمائی
- 179 کتابیات
- 180 حواشی

پونٹ کا تعارف

تَحْمِلِ کے لحاظ سے حدیث کے جو آٹھ طرق ہیں یہی حقیقت میں اداء کے لحاظ سے حدیث کے طرق کے احوال کی منظر کشی کر سکتے ہیں کیونکہ ایک شخص ایک ہی وقت میں مُوَدّی (اداء کرنے والا) بھی ہو سکتا ہے اور مُتَحَمِّل (حاصل کرنے والا) بھی یعنی بیک وقت استاد بھی ہو سکتا ہے اور شاگرد بھی۔ وہ اس طرح کہ اگر ادائے حدیث کا اعتبار کیا جائے تو مُتَحَمِّل (شاگرد) مُوَدّی (استاد، شیخ) کہلائے گا اور اگر تَحْمِلِ یعنی حصول حدیث کا اعتبار کیا جائے تو یہی مُوَدّی ”مُتَحَمِّل“ کہلائے گا مثلاً امام مسلم اگر امام بخاری سے احادیث حاصل کریں تو اس صورت میں امام مسلم مُتَحَمِّل (شاگرد) ہوں گے اور امام بخاری مُوَدّی (استاد) اگر امام مسلم یہی حاصل (اخذ) شدہ مرویات (احادیث) امام ترمذی کو سنائیں تو اس صورت میں امام مسلم مُوَدّی (شیخ) کہلائیں گے اور امام ترمذی مُتَحَمِّل (تلمیذ) اس سے ثابت ہوا کہ امام مسلم ایک اعتبار سے شاگرد ہوئے اور دوسرے اعتبار سے استاد یعنی مُتَحَمِّل بھی ہوئے اور مُوَدّی بھی۔

انتقال حدیث یعنی اسے آگے پہنچانے کے عمل میں محدثین (اساتذہ) اور ان کے تلامذہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان دونوں کرداروں کی جانب اصول حدیث کے علماء نے خصوصی توجہ مبذول فرمائی اور نہایت محنت اور دقت نظر سے تَحْمِلِ حدیث کے طرق اور ان کے مراتب و درجات پر ادائے حدیث کے طرق متعین فرمادیئے۔

علماء اصول حدیث نے یہ اہتمام رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی اہمیت کے پیش نظر کیا تاکہ ایک شخص سے دوسرے تک انتقال حدیث کا عمل نہایت حفاظت و احتیاط کے ساتھ ہو سکے اور ہر مسلمان کو اس طریقہ پر پورا اطمینان ہو جس سے ہو کر حدیث اس تک پہنچی ہے اور اسے یقین ہو جائے کہ یہ طریقہ انتہائی محفوظ اور شک و شبہ سے بالا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇨ تحمل حدیث کا مفہوم بیان کر سکیں۔
- ⇨ تحمل حدیث کے اقسام پر بحث کر سکیں۔
- ⇨ تحمل حدیث کے ضمن میں بنیادی اور اہم صیغوں کی پہچان بتا سکیں۔
- ⇨ تحمل حدیث کے بعض صیغوں کی کتابت و قرآت کے اسلوب پر بات کر سکیں۔
- ⇨ تحویل سند کی صورتوں کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔

① تحمل حدیث کے طرق اور صیغ اداء

تحمل کا مفہوم:

تحمل کے معنی ہیں حاصل کرنا اور لینا۔ محدثین حضرات کی اصطلاح میں اس کے معنی ہیں حدیث کے طلباء کا اپنے شیوخ (اساتذہ) سے مخصوص انداز و طرق سے حدیث حاصل کرنا اور اخذ کرنا۔

اداء کا مفہوم:

اداء کے معنی ہیں بیان کرنا، دے دینا اور پہنچانا۔ اصول حدیث کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے محدثین حضرات کا اپنے شاگردوں کے سامنے مخصوص صیغ والفاظ کے ذریعے حدیث بیان کرنا۔

② تحمل حدیث کے طرق

اصول حدیث کی کتب میں تحمل حدیث کے درج ذیل آٹھ طرق بیان ہوئے ہیں۔

۱. السماع من لفظ الشيخ
۲. القراءة على الشيخ
۳. الإجازة
۴. المناولة
۵. الكتابة (المكاتبة أو المراسلة)
۶. الإعلام
۷. الوصية
۸. الوجدادة

اب ان طرق میں سے ہر ایک طریقہ کو ضروری تفصیلات اور صیغ اداء کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

2.1 السماع من لفظ الشيخ (شیخ کے الفاظ میں سننا)

محدثین کی اصطلاح میں اس طریقہ (اسلوب، منہج) کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا استاذ کتاب سے یا اپنے حافظ کے بھروسہ پر زبانی طور پر احادیث سنائے، لکھائے یا نہ لکھائے اور شاگرد و مشافہہ (زبانی طور پر) استاد سے سن کر لکھتا جائے یا نہ لکھے بلکہ صرف حافظ میں محفوظ کرتا جائے۔

2.1.1 اس طریقہ کا رتبہ

جمہور محدثین کے نزدیک اخذ (تحمل) حدیث کے باقی طریقوں (اسالیب) میں سے رتبہ کے لحاظ سے "سماع" سب سے اعلیٰ و ارفع طریقہ ہے۔ سماع کے بارے میں حضرت محمد ﷺ وسلم نے فرمایا:

((نَصَرَ اللَّهُ أَمْرًا سَمِعَ مِنْهُ حَدِيثًا فَحَفِظَهُ، حَتَّى يُبَلِّغَهُ، غَيْرَهُ))

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاداب فرمائے جو میری حدیث سنتا ہے پھر اسے زبانی یاد کر لیتا ہے حتیٰ کہ وہ اسے دوسرے (شخص) تک پہنچا دیتا ہے۔ (جامع الترمذی، ابواب العلم)

آپ ﷺ نے فرمایا:

((تَسْمَعُونَ وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ وَيَسْمَعُ مِمَّنْ يُسْمَعُ مِنْكُمْ))

"تم علمی باتیں مجھ سے سنتے ہو اور تم سے بھی سنی جائیں گی اور ان دُلوں سے بھی سنی جائیں گی جو تم سے سنی گئے" (سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب فضل نشر العلم)

سماع کے متعلق امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ (كان هذا العلم شيئاً شريفاً اذا كان من افواه الرجال يتلافونه، ويتذاكرونه.....) "علم حدیث اس وقت بڑا قیمتی اور باعث شرف علم تھا جب لوگوں کے منہ سے (سماع کے ذریعے) حاصل کیا جاتا تھا، لوگ آپس میں ملتے جلتے اس کا باہمی مذاکرہ کرتے رہتے

تھے) (جامع بیان العلم و فضلہ از امام ابن عبدالبرؒ (۴۶۳ھ) ج ۱ ص ۶۸)

گویا سلف کے دور میں احادیث کے طلبہ علم حدیث کو براہ راست اساتذہ سے سن کر سیکھتے تھے اور چٹنگی کے لئے اعادہ کرتے تھے تو اس وقت یہ علم بڑا قیمتی اور قدر و منزلت والا تھا۔

2.1.2 ادائے حدیث کے صیغے:

تحل حدیث کے اس طریقہ کے ذریعہ حاصل شدہ احادیث کو اداء یعنی آگے منتقل کرنے کیلئے علماء اصول حدیث نے جن صیغوں یا الفاظ کو وضع کیا ہے ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

۱..... تحل (اخذ) حدیث کے طریقوں میں سے ہر ایک طریقہ کے الگ الگ اداء کے صیغوں کی تخصیص کے رائج ہونے سے قبل طالب حدیث کے لئے جائز تھا کہ وہ اپنے شیخ (استاذ) سے سنی ہوئی احادیث کو آگے منتقل کرتے وقت یوں کہے۔

((سَمِعْتُ، أَوْ حَدَّثَنِي، أَوْ أَخْبَرَنِي، أَوْ أَنْبَأَنِي، أَوْ قَالَ لِي، أَوْ ذَكَرَ لِي)) ”میں نے سنا، یا شیخ نے مجھ سے بیان کیا، یا شیخ نے مجھے خبر دی، یا شیخ نے مجھ سے کہا، یا شیخ نے مجھ سے ذکر کیا“

۲..... جبکہ تحل حدیث کے طرق میں سے ہر ایک طریقہ کے لئے الگ الگ صیغہ اداء کی تخصیص کے رائج ہو جانے کے بعد شاگرد کے لئے اپنے استاذ کے الفاظ کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لئے علماء اصول حدیث نے درج ذیل صیغہ ادا متعین فرمادیئے۔

الف سَمَاعٌ كَيْلَى: سَمِعْتُ أَوْ حَدَّثَنِي (میں نے سنا، یا شیخ نے مجھ سے بیان فرمایا)

ب قُرْآتُ كَيْلَى: أَخْبَرَنِي (شیخ نے مجھے خبر دی)

ج سَمَاعٌ مَذَاكِرُهُ كَيْلَى: مَذَاكِرُهُ سَمِعْتُ كَيْلَى: (میں نے سنا، یا شیخ نے مجھ سے ذکر فرمایا)

فَقَالَ لِي أَوْ ذَكَرَ لِي (شیخ نے مجھے فرمایا، یا شیخ نے مجھ سے ذکر فرمایا)

واضح رہے کہ سماع مذاکرہ اور سماع تحدیث میں فرق ہے وہ اس طرح کہ سماع تحدیث میں استاذ اور شاگرد دونوں مجلس تحدیث میں حاضر ہونے سے پہلے بیان ہونے والی احادیث کی ترتیب و ضبط کے سلسلے میں پوری طرح تیاری کرتے ہیں۔ جبکہ سماع مذاکرہ میں اس قسم کی کوئی تیاری نہیں ہوتی۔

2.1.3 صیغوں کے استعمال کے مواقع:

حدیث کے راوی تعداد کے لحاظ سے اداء کے صیغوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اگر راوی ایک ہو تو اس موقع پر واحد کا صیغہ اور اگر زیادہ ہوں تو جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ ہر ایک حالت کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱..... جب راوی نے شیخ (استاذ) سے اکیلے حدیث سنی ہو تو ”سَمِعْتُ“ یا ”حَدَّثَنِي“ اور جب دوسرے رفقا (ساتھیوں) کی موجودگی میں سنی ہو تو ”سَمِعْنَا“ یا ”حَدَّثْنَا“ کہے گا۔

۲..... جب راوی اکیلا استاذ کو حدیث پڑھ کر سنائے تو ”أَخْبَرَنِي“ اور جب اس (راوی) کے دوسرے رفقاء میں سے کوئی شیخ الحدیث (استاذ) کو پڑھ کر سنائے تو اس صورت میں ”أَخْبَرْنَا“ کہے گا۔ ان صورتوں کی مزید وضاحت امام مالکؒ (۱۷۹ھ) کے شاگرد عبد اللہ ابن وہبؒ (م ۱۹۷ھ) کے حسب ذیل قول سے ہو جاتی ہے وہ فرماتے ہیں:

- (i)..... جب میں استاذ سے اکیلا حدیث سنوں تو اس صورت میں ”حَدَّثَنِي“ کہوں گا۔
 (ii)..... جب دوسرے ساتھیوں کی موجودگی میں استاذ سے حدیث سنوں تو اس صورت میں ”حَدَّثْنَا“ کہوں گا۔

(iii)..... جب میں اکیلا استاذ کو حدیث پڑھ کر سناؤں تو اس حالت میں ”أَخْبَرَنِي“ کہوں گا۔

(iv)..... مگر جب میرا کوئی رفیق (ساتھی) استاذ کو پڑھ کر سنائے اور میں سنوں تو اس صورت میں ”أَخْبَرْنَا“ کہوں گا۔ (الکفایۃ فی علم الروایۃ از خطیب بغدادی ص ۲۹۴)

2.1.4. صیغوں کے درجات:

تحمل حدیث کے اس طریقہ یعنی ((السماع من لفظ الشیخ)) پر حاصل ہونے والی مرویات کو ادائیگی (یعنی روایت) کے وقت جن جن صیغوں (الفاظ) کو استعمال کیا جاتا ہے علماء اصول حدیث نے ان کے مختلف درجات و مراتب متعین کر رکھے ہیں۔

ذیل میں انہیں مراتب کی ترتیب کے لحاظ سے بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ اکثر محدثین (جیسے اہل سنت و جماعت میں سے خطیب بغدادیؒ و ابن حجرؒ وغیرہ اور شیعہ میں سے زین الدین العالمیؒ) ”سمعت“ کے صیغہ کو باقی تمام صیغوں کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں کیونکہ مؤدی (راوی) ”سَمِعْتُ“ صرف اسی صورت میں بولے گا جب اس نے خود شیخ سے براہ راست حدیث سنی ہو سند کے دوران جب بھی ”سَمِعْتُ“ کا لفظ آجائے تو یہ واضح طور پر استاذ اور شاگرد کے درمیان کسی واسطے کے نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے نیز اس لفظ میں ضبط و تحفظ بھی خوب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درجہ کے لحاظ سے ”سَمِعْتُ“ باقی تمام صیغوں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

علامہ ابن الصلاح اور بعض شیعہ حضرات کے نزدیک ”حدثنا“ و ”اخبرنا“ کا درجہ ”سَمِعْتُ“ سے اعلیٰ ہے کیونکہ ان دونوں صیغوں میں اس بات کی دلالت ہے کہ شیخ نے شاگرد کے سامنے حدیث روایت کی اور اس سے مخاطب ہوا جبکہ ”سَمِعْتُ“ اس بات پر دلالت نہیں کرتا۔ لیکن بعض اہل علم حضرات ”حدثنا“ کو اجازت کے طریقہ میں استعمال کرتے تھے۔ حضرت حسن بصریؒ (۱۱۶ھ) سے روایت ہے کہ وہ کہا کرتے تھے ”حدثنا“ ابو ہریرہؓ..... ابن الصلاح نے یہ جو ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے حسن بصریؒ کا ابو ہریرہ سے سماع ثابت کیا ہے تو حافظ العراقی نے اس سماع کی تضعیف کی ہے۔

۲۔ پھر ”سَمِعْتُ“ کے بعد ”حدثنا و حدثنی“ کا درجہ ہے کیونکہ ”حدثنی“ کا لفظ کبھی براہ راست سماع کے بجائے ایسی اجازت پر بھی بولا جاسکتا ہے جس میں تدلیس (۱) ہضم (پوشیدہ) ہو۔

۳۔ اس کے بعد ”أخبرنا و أخبرنی“ کا درجہ ہے۔

۴۔ پھر ”أنبأنا و نبأنا“ اور ”أنبأنی و نبأنی“ کا درجہ ہے یہ الفاظ ”حدثنا و أخبرنا“ کے قریب قریب ہیں مگر پہلے دونوں الفاظ (یعنی أنبأنا و نبأنا) قلیل الاستعمال ہیں اور ”أخبرنا“ کثیر الاستعمال۔

۵۔ اس کے بعد ”قَالَ لَنَا فُلَانٌ وَ ذَكَرَ لِي فُلَانٌ“ کے الفاظ کا رتبہ ہے ان الفاظ میں سے آخری دونوں لفظوں (یعنی ذکرنا لنا فلان و ذکر لی فلان) کا استعمال اس وقت زیادہ بہتر ہوگا جب حدیث کا سماع تدریس کی حالت میں نہ ہو بلکہ مذاکرہ کی حالت میں ہو۔

اگر کوئی راوی ان الفاظ میں سے لفظ ”لنا و لی“ کو حذف کر کے صرف ”قَالَ فُلَانٌ يٰ ذَكَرَ فُلَانٌ“ کہہ دے تو ماقبل الفاظ یعنی (قَالَ لَنَا فُلَانٌ وَ ذَكَرَ لَنَا فُلَانٌ) کے مقابلہ میں ان کا درجہ کم ہو جائے گا کیونکہ ان الفاظ میں تدریس کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ حماد اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”جب میں نے ایوب سختیانی سے کوئی حدیث نہ سنی ہو تو میں یہ کہنا پسند نہیں کرتا کہ ”قَالَ اَيُّوبُ كَذَا وَ كَذَا“ اس لئے کہ لوگ یہ سمجھیں گے کہ میں نے ان سے بذات خود سنا ہے“

یہ تمام الفاظ اہل لغت کے نزدیک حدیث سننے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور اصل میں یہ (الفاظ، صیغ) ”سَمِعْتُ فُلَانًا قَالَ: سَمِعْتُ فُلَانًا“ کی طرح ہیں (یعنی استعمال کے لحاظ سے ان میں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے) نقاد حدیث کے نزدیک ان میں جو فرق ہے وہ صرف عرف و عادت کے طور پر ہے۔ لیکن نقاد حدیث ایسے صیغوں کو ترجیح دیتے ہیں جن میں ابہام و التباس کا شائبہ نہ ہو۔ اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ راوی کو یہ بیان کر دینا چاہیے کہ اس نے اپنے استاد سے حدیث کا سماع کیسے کیا، چنانچہ محدث (شیخ، استاد) کے الفاظ میں شاگرد (راوی) نے حدیث سنی ہو تو اسے ”حدثنا“ کہنا چاہیے اور جب شاگرد محدث کو پڑھ کر سنائے تو شاگرد ”قُرأت“ کا لفظ بولے اور جب شاگرد کا کوئی اور ساتھی استاد کو پڑھ کر سنارہا

ہو تو ایسی صورت میں ”قرئ علیہ و أنا اسمع“ کہے (یعنی شیخ کے سامنے پڑھا جا رہا تھا تو میں سن رہا تھا)

2.2 القرأۃ علی الشیخ (شیخ یعنی استاذ کے سامنے پڑھنا)

تخل حدیث کے پہلے اسلوب میں استاذ پڑھتا ہے اور طالب علم سنتا ہے جبکہ اس طریقہ (اسلوب) میں طالب علم (راوی) استاذ (شیخ الحدیث) کی کتاب سے یا اپنے حافظہ کی مدد سے اس کی مرویات کو پڑھتا ہے یا طالب علم کے دیگر رفقاء میں کوئی ان مرویات کو استاذ کی کتاب سے یا حافظہ سے پڑھتا ہے اور استاذ اپنی مرویات کو سنتا ہے۔ استاذ اپنی کتاب کو سامنے رکھ کر بھی اور کتاب کے بغیر حافظہ کی مدد سے زبانی طور پر بھی سن سکتا ہے اور اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ اصل کتاب کسی ثقہ (قابل اعتماد) شخص کے پاس ہو جو اس کو کھولے رکھے اور استاذ سنتا چلا جائے۔

طالب علم کے لئے اپنے شیخ (استاذ) کی کتاب سے پڑھ کر سنانا افضل ہے کیونکہ حافظہ سے سنانے کی نسبت یہ زیادہ قابل اعتماد اور مأمون عن الخطاء ہے اسی لئے حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا ہے کہ امساک کو تمام حالتوں میں حفظ پر ترجیح حاصل ہے اور امساک سے مراد یہ ہے کہ شاگرد کے پاس کتاب موجود ہو اور وہ اس میں سے پڑھ کر سنائے۔

2.2.1 اس طریقہ کی روایت کا حکم

جمہور محدثین کے نزدیک شاگرد کا استاذ کو کتاب پڑھ کر سنانا ایک معقول طریقہ ہے مگر بعض اہل عراق مثلاً ابو عاصم النبیل (۲۱۲ھ) نے اس طریقہ کا انکار کرتے ہوئے اسے استاذ سے حدیث حاصل (اغذ) کرنے میں معتبر نہیں مانا ہے۔ امام مالک (۱۷۹ھ) اور دیگر اہل مدینہ حضرات نے عراقیوں کے اس خیال کا شدید رد کرتے ہوئے ”القرأۃ علی الشیخ“ کو تخل حدیث کا طریقہ مانا ہے۔ اس اسلوب کی روایت کے حکم کے متعلق ڈاکٹر محمود طحان نے لکھا یہ کہ:

”شیخ کے سامنے پڑھنے کے ذریعہ جو روایت ہوگی تمام مذکورہ (بالا) حالتوں (یعنی شاگرد کا استاذ

کے سامنے پڑھنا اور استاد کا سننا وغیرہ) میں بغیر کسی اختلاف کے (یعنی متفقہ طور پر) روایت ہوگی.....“
ترتیسرے مصطلح الحدیث ص: ۱۵۹)

2.2.2 اس طریقہ کا درجہ

اس طریقہ (اور اس کے ذریعہ روایت کی جانے والی حدیث) کے درجہ کے بارے میں اصول حدیث کی کتب میں علماء کے درج ذیل تین اقوال مذکور ہیں۔

الف..... امام مالکؒ، اصحاب مالکؒ، امام بخاریؒ (۲۵۶ھ)، اکثر علماء حجاز و کوفہ اور تمام علماء مدینہ کے نزدیک دونوں طریقوں (سماع و قرأت) اور ان کی مرویات درجہ کے لحاظ سے مساوی ہیں نیز امام شافعیؒ (۲۰۴ھ) بھی اس کے قائل ہیں۔ ان علماء کرام کے نزدیک جس شاگرد نے استاد کو پڑھا کر سنایا ہو تو کسی اور کو حدیث سناتے وقت مطلقاً ”سَمِعْتُ“ (میں نے سنا) کہہ سکتا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں نے استاد کو پڑھا کر سنایا۔

ب..... جمہور اہل مشرق کے نزدیک پہلا طریقہ (یعنی سماع اور اس کی روایت) درجہ کے اعتبار سے اعلیٰ ہے اور دوسرا (یعنی قرأت) کم یعنی یہ دوسرے درجہ پر ہے۔ یہی موقف جمہور محدثین کے ہاں صحیح ہے علامہ ابن الصلاحؒ نے بھی اسی موقف کو ترجیح دی ہے۔

ان کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ و سلم کی امت میں شیخ کی حیثیت آپ ﷺ کے ایک خلیفہ اور ایک سفیر کی ہوتی ہے اس لئے شیخ سے حدیث اخذ کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ سے اخذ (یعنی حاصل) کرنا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ شیخ قرأت کرتے وقت احتیاط سے کام لیتا ہے۔ اس سے بھول جانے کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا بہ نسبت اس کے کہ شیخ نے اور کوئی طالب علم پڑھے۔ اس صورت میں شیخ بھول بھی سکتا ہے اور اس پر غفلت بھی طاری ہو سکتی ہے۔

ان علماء کے علاوہ جمہور شیعہ کی بھی یہی رائے ہے کہ پہلے طریقہ کا درجہ دوسرے سے اعلیٰ ہے۔

ج..... امام ابو حنیفہ (۱۵۰ھ) ابن ابی ذئب (۱۵۸ھ) وبعض دیگر محدثین اور ایک روایت کے مطابق امام مالکؒ کے نزدیک اس طریقہ (اور اس کی روایت) کا درجہ پہلے اسلوب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آپ کا استاد کو پڑھ کر سنانا اس سے بہتر ہے کہ استاد آپ کو پڑھ کر سنائے، کیونکہ اس صورت میں احتیاط اور ثبوت زیادہ ہے۔ اس لئے کہ اگر شاگرد کوئی غلطی کرے تو استاد اس کی اصلاح کر سکتا ہے۔ بعض شیعہ حضرات نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

قول فیصل:

حافظ سخاویؒ نے قول فیصل یہ بیان کیا کہ اصل چیز خطا کے امکان سے بچنا ہے اور یہ چیز جس طریقہ میں زیادہ حاصل ہو وہ افضل ہے اور حالات کے اختلاف سے کہیں یہ بات سماع میں حاصل ہوتی ہے اور کہیں قرأت میں (توضیح الأفكار ج ۲ ص ۲۰۴)

2.2.3 صیغ اداء اور ان کے استعمال کے مواقع:

قرأت کے طریقہ پر جو روایت ہوگی اسے شاگرد (راوی) روایت کرتے وقت جن صیغوں کو استعمال کر سکتا ہے، ائمہ محدثین نے موقع و محل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے حسب ذیل درجات بیان فرمائے ہیں۔

2.2.4 (۱)..... اعلیٰ درجہ کے الفاظ:

جب شاگرد بذات خود حدیث پڑھے اور استاذ (محدث) نے تو اس صورت میں حدیث بیان کرتے وقت کہے:

(قرأت علی فلان) ”میں نے فلاں شیخ کے سامنے پڑھا“

اور جب راوی خود نہ پڑھے بلکہ اس کا کوئی ساتھی استاذ کے سامنے پڑھے اور یہ راوی نے اس صورت میں حدیث روایت کرتے وقت کہے:

(قُرئَ عَلٰی فُلَانٍ وَأَنَا أَسْمَعُ فَاقْرَأُ) ”فلان شیخ کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور میں سن رہا تھا پھر شیخ نے اس کی توثیق فرمادی“

۲..... پھر مذکورہ الفاظ کے قریب قریب درجہ ان الفاظ کا ہے:

الف..... ((حَدَّثَنَا فُلَانٌ بِقِرَآئَتِي عَلَيْهِ أَوْ قِرَآءَةً عَلَيْهِ وَأَنَا أَسْمَعُ))
”ہم سے فلاں شیخ نے حدیث بیان کی جبکہ میں قرأت کر رہا تھا یا فلاں کے سامنے قرأت کی جاری تھی اور میں سن رہا تھا“

ب..... ((أَخْبَرَنَا فُلَانٌ بِقِرَآئَتِي أَوْ قِرَآءَةً عَلَيْهِ وَأَنَا أَسْمَعُ))
”ہم کو فلاں نے خبر دی جبکہ میں پڑھ رہا تھا یا اس کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور میں سن رہا تھا“

ج..... ((أُبَيِّنَا أَوْ نَبِّئَا فُلَانًا بِقِرَآئَتِي أَوْ قِرَآءَةً عَلَيْهِ وَأَنَا أَسْمَعُ))
”ہم کو فلاں نے مطلع کیا اس صورت میں کہ پڑھ رہا تھا یا اس کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور میں سن رہا تھا“

د..... ((قَالَ لَنَا فُلَانٌ قِرَآءَةً عَلَيْهِ))
”فلاں شیخ نے اس وقت فرمایا جب اس کے سامنے حدیث پڑھی جا رہی تھی“
اکثر محدثین اس کو جائز قرار دیتے ہیں کہ شاگرد حدیث بیان کرتے وقت یوں کہے:

(حَدَّثَنَا الشَّيْخُ قِرَآءَةً عَلَيْهِ) یا یوں کہے ”أَخْبَرَنَا قِرَآءَةً عَلَيْهِ“ مگر ”قِرَآءَةً عَلَيْهِ“ کی قید ضروری ہے کیونکہ ان الفاظ کے ذکر نہ کرنے سے یہ سمجھا جائے گا کہ شاید استاذ نے شاگرد کو پڑھ کر سنایا۔ اس صورت کو ”سماع“ کہتے ہیں اور یہ تحل حدیث کی صورتوں میں سے اعلیٰ صورت ہے۔

..... ”القرأة علی الشیخ“ کے اسلوب پر حاصل شدہ حدیث کو (اپنی یا غیر کی قرأت کی تفصیل کئے بغیر) صرف ”حدثنا“ و ”أخبرنا“ کے صیغوں کے ذریعہ اداء یعنی روایت کرنے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے جسے ذیل میں مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

۱..... بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ ”قرأت“ کی تفصیل کے بغیر ان دونوں صیغوں کو روایت کے وقت استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

۲..... اور بعض فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز ہے یعنی تفصیل ”قرأت“ کے بغیر ہی صرف ”حدثنا“ و ”أخبرنا“ کو بوقت اداء حدیث استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۳..... جبکہ بعض علماء حدیث اداء حدیث کے ان دونوں لفظوں (حدثنا و أخبرنا) کے استعمال میں قرأت کی تقید کے لحاظ سے فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

(الف) - ”أخبرنا“ کا استعمال تقید قرأت کے بغیر جائز ہے۔

(ب) - لیکن ”حدثنا“ کا استعمال بغیر اس تقید کے جائز نہیں ہے۔ گویا اول الذکر صیغہ کو لفظ ”قرأة علیہ“ کے بغیر اداء حدیث کے وقت استعمال کیا جاسکتا ہے اور ثانی الذکر صیغہ کو لفظ ”قرأت“ کے بغیر روایت حدیث کے وقت استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

2.3 الإجازة (اجازت دینا)

اساتذہ (محدثین) سے اخذ و تخل حدیث کے طریقوں میں سے اجازت بھی ایک طریقہ ہے اجازت سے مراد یہ ہے کہ استاد کسی بھی راوی کو اپنی مرویات روایت کرنے کی اجازت زبانی یا تحریری طور پر دے دے۔ اگر اجازت زبانی طور پر دی جائے تو متقدمین اسے ”اجازت ملفوظ“ اور متاخرین اسے مجازاً ”اجازت بالمشافہة“ کہتے ہیں۔ حقیقی ”اجازت بالمشافہة“ یہ ہے کہ حدیث کو سنا کے یا پڑھوا کے اجازت دی جائے یعنی مشافہت میں حدیث پڑھائی بھی جاتی ہے اور روایت کرنے کی اجازت بھی دی جاتی ہے۔ اور اگر اجازت تحریری طور پر دی جائے تو متقدمین اسے ”اجازت مکتوب“ اور متاخرین مجازاً

”اجازت بالمکاتبة“ کہتے ہیں ”اجازت مکتوب“ اور متأخرین مجازاً ”اجازت بالمکاتبة“ کہتے ہیں۔ اجازت مکتوب میں حدیث لکھ کر بھی دی جاتی ہے اور عام طور پر اس اجازت میں روایت کرنے کی اجازت بھی شامل ہوتی ہے اور بعض دفعہ حدیث تو لکھ کر دی جاتی ہے لیکن روایت کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

اجازت کا حکم:

اجازت قرأت کی نسبت درجہ کے لحاظ سے فروتر ہے یعنی تحمل حدیث کے طرق (اسالیب) میں اس کا تیسرا درجہ ہے۔ تحمل حدیث کے اس تیسرے طریقہ (یعنی اجازت جو مناوالت سے خالی ہو) کو ڈاکٹر محمود طحان نے کمزور قرار دیتے ہوئے اس میں تساہل سے کام لینے سے منع کیا ہے لکھتے ہیں۔

”بہر حال تحمل و روایت حدیث کا یہ طریقہ (یعنی اجازت) بہت کمزور ہے اس میں ہرگز تساہل سے کام نہیں لینا چاہیے“ (تیسرے مصطلح الحدیث ص ۱۶۰)

ادائے حدیث کے صیغے والفاظ:

تحمل حدیث کے طریقہ اجازت سے حاصل ہونے والی حدیث کو راوی اداء (یعنی روایت) کرتے وقت جن صیغوں کو استعمال کرتا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

۱..... (اجازَ لی فلان) ”مجھے فلاں شیخ نے اجازت دے دی“ راوی حدیث کے لئے یہ الفاظ درجہ کے لحاظ سے سب سے بہتر ہیں

۲..... جو الفاظ تحمل حدیث کے پہلے دو طریقوں (سماع و قرأت) پر دلالت کرنے والے ہوں انہیں لفظ ”اجازت“ کے ساتھ مقید کر دیا جائے، مثلاً راوی ادائے حدیث کے وقت یوں کہے۔

(حَدَّثَنَا إِجَازَةً أَوْ اخْبَرَنَا إِجَازَةً) ”شیخ نے ہم سے طریقہ اجازت کی صورت میں خبر دی“

محدثین حضرات نے طریقہ اجازت میں ادائے حدیث کے ان الفاظ کو جواز کے الفاظ کہا ہے۔

۳..... ”أنبأنا“ (ہمیں خبر دی) یہ متأخرین علماء کرام میں سے ایک جماعت کی اصطلاح ہے۔ اسے کتاب ”الوجازة فی تجویز الإجازة“ کے مؤلف أبو العباس الولید بن بکر المعمری نے اختیار کیا ہے۔ اور لوگوں کے نزدیک یہ معمول بہ ہے۔ اور متقدمین علماء کے ہاں معروف ہے کہ ”أنبأنا“ کا صیغہ ”أخبرنا“ کے قاصم مقام ہے۔ قاضی عیاضؒ نے شعبہ سے بیان کیا ہے کہ اس نے اجازت میں ایک بار ”أنبأنا“ اور ایک بار ”أخبرنا“ کے صیغہ کو استعمال کیا۔

مختصر یہ کہ اجازت کے طریقہ سے حاصل ہونے والی روایت کو راوی ان الفاظ کے ذریعہ ادا کر سکتا ہے ((أجازنی أو أجازنا فلان)) (حدثنا فلان إجازة)، (أخبرنی أو أخبرنا فلان إجازة) یہ ایسے الفاظ ہیں جو کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تخل حدیث کے طریقہ اجازت کے ذریعہ روایت حاصل ہوئی ہے یہ افادیت لفظ ”اجازت“ بڑھادینے میں مضمر (مخفی) ہے۔

2.4 المناولة (مناولت):

تخل حدیث کے طریقوں میں سے ایک اسلوب ”مناولت“ بھی ہے مناولت کے لغوی معنی ہیں دینا، مگر اصطلاحی اعتبار سے اس کا مطلب ہے استاد شاگرد کو کوئی کتاب یا لکھی ہوئی حدیث دے کر کہے کہ اس کو میری طرف سے روایت کیجئے۔

2.4.1 مناولت کی اقسام:

مناولت کی دو اقسام ہیں:

پہلی قسم: المناولة المجردة، یعنی ایسی مناولت جس کے ساتھ روایت کرنے کی اجازت کی تصریح نہ ہو اسے ”مناولة مجردة عن الإجازة“ یا ”المناولة من غير إجازة“ (اجازت سے خالی یا اجازت کے بغیر مناولت) بھی کہتے ہیں۔

اس قسم کی صورت:

مناولت کی اس پہلی قسم کی صورت یہ ہے کہ محدث طالب علم کو اپنی اصل کتاب دیتے ہوئے صرف یہ کہے ”ہذا سماعی“ أو ”من حدیثی“ (یہ ہے میرا سماع یعنی اس کتاب میں جتنی بھی احادیث ہیں ان کو میں نے اپنے شیخ سے سنا ہے) یا (یہ کتاب میری احادیث میں سے ہے) اور یہ نہ کہے ”أروہ عنی، أو أجزت لك روايته عنی“ (اس کتاب کو مجھ سے روایت کرو) یا (میں نے تم کو اجازت دی کہ اس کتاب کو مجھ سے روایت کرو) (یعنی روایت کی اجازت کے بارے میں کچھ بھی نہ کہے۔

اس صورت میں روایت کا حکم:

جمہور محدثین نے اجازت سے خالی مناولت کو معتبر قرار نہیں دیا ہے۔ اور جہاں تک اجازت سے خالی مناولت کی مذکورہ بالا صورت میں حدیث کو آگے روایت کرنے کا تعلق ہے تو علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے۔

دوسری قسم: المناولة المقرونة بالإجازة، یعنی ایسی مناولت جس کے ساتھ حدیث کو روایت کرنے کی اجازت کی تصریح ہو اسے ”مناولة مع الإجازة“ بھی کہتے ہیں۔

اس کا درجہ:

مناولت مع اجازت کو علماء نے اجازت کی تمام اقسام سے درجہ کے لحاظ سے اعلیٰ قسم تصور کیا ہے۔

مناولة مع اجازت کی صورتیں:

اس نوعیت کی مناولت کی علماء نے درج ذیل صورتیں بیان فرمائیں ہیں۔

پہلی صورت:

یہ ہے کہ شیخ (محدث) اپنی مسوعات (جن کو شیخ نے اپنے شیخ سے سنا ہو) کی اصل کتاب یا اس کی

نقل جس کا اصل سے مقابلہ کر لیا گیا ہو طالب علم (راوی) کو دیتے ہوئے فرمائے:

((هذا سماعي أو روايتي عن فلان فاروه، أو اجزت لك روايته عني))

”یہ میرا سماع ہے یا فلاں شیخ سے میری روایت ہے اب تم مجھ سے اس کو روایت

کرتے رہو یا اس کو روایت کرنے کی میں نے تم کو اجازت دی)

اس کے بعد شیخ اصل کتاب یا اس کی نقل کا اپنے شاگرد کو مالک بنادے یا مستعار طور پر دیتے ہوئے کہے کہ اس کا دوسرا نسخہ تیار کر لو اور پھر مقابلہ کر کے اصل (کتاب) مجھے واپس دے دینا۔ اگر محدث کتاب کو طالب علم سے فوراً واپس لے لے تو مناولۃ مع اجازت کی فوقیت برقرار نہیں رہے گی مگر اجازت معینہ (خاصہ) سے پھر بھی بہتر ہوگی۔

اس صورت میں روایت کا حکم:

مناولت کی مذکورہ صورت میں محدثین نے روایت حدیث کو جائز قرار دیا ہے۔

بالحاظ قوت اس صورت کا حکم:

مناولت مع اجازت کی مذکورہ صورت کے حکم کے متعلق علماء نے اختلاف کیا ہے۔

الف..... بعض علماء نے اسے سماع اور قرأت کے درجہ سے ادنیٰ قرار دیا ہے۔

ب..... بعض علماء نے اسے سماع کے درجہ سے بھی بلند تصور کیا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اس صورت میں استاد اپنی کتاب شاگرد کے سپرد کر کے ساتھ روایت کی اجازت دے دیتا ہے (یعنی کتاب اجازت کے ساتھ مقرون ہو جاتی ہے) لہذا اس میں وہم کا اندیشہ نہیں پایا جاتا جبکہ سماع میں سامع اور مسموع کے درمیان وہم کا امکان موجود ہوتا ہے۔

دوسری صورت:

یہ ہے کہ شاگرد استاد کے پاس اس کی مرویات پر مشتمل اصل کتاب یا اس کی نقل لے کر آئے تو استاد اس کو خوب پہچان کر غور و فکر کے بعد واپس کرتے ہوئے شاگرد سے کہے کہ میں نے اس کا مطالعہ کر لیا ہے یہ فلاں شخص سے روایت کردہ میری مرویات ہیں، تم ان کو مجھ سے روایت کر سکتے ہو یا یوں کہے کہ میں نے تم کو ان (مرویات) پر روایت کرنے کی اجازت دے دی۔

بلحاظ قوت اس صورت کا حکم:

مناولۃ بالعرض کی مذکورہ صورت کی قوت کے حکم کے بارے میں علماء مختلف الخیال ہیں۔

الف..... بعض علماء کے نزدیک مناولۃ بالعرض قوت اور درجہ کے لحاظ سے تخل حدیث کے پہلے اسلوب (طریقہ) ”السماع من لفظ الشیخ“ کے مساوی ہے۔

ب..... لیکن اس کے مقابلہ میں علماء کی ایک جماعت نے اسے قوت درجہ کے اعتبار سے سماع اور قرأت دونوں سے ادنیٰ قرار دیا ہے۔

تیسری صورت:

تیسری صورت یہ ہے کہ استاد طالب علم کو اپنی (مسموعات پر مبنی) اصل کتاب دے اور اسے آگے روایت کرنے کی اجازت بھی دے۔ پھر کتاب کو طالب علم کے پاس نہ رہنے دے بلکہ خود لے لے۔ یہ صورت ”مناولۃ مع الإجازة“ سے ملتی جلتی ہے کہ استاد شاگرد سے کہے ”یہ کتاب لو اور اس کو نقل کر کے مجھے واپس دے دو“

اس صورت کا درجہ اور اس میں روایت کا حکم:

مناولت کی دوسری صورت ”مناولۃ بالعرض سے اس صورت کا درجہ کم ہے۔ اس صورت میں روایت

کرنے کا حکم یہ ہے کہ جب طالب علم کو اصل کتاب یا اس کی نقل (جس کا مقابلہ کیے جانے پر مکمل اعتماد ہو) حاصل ہو جائے تو اس میں پائی جانے والی احادیث کو وہ (طالب علم) روایت کر سکتا ہے۔

چوتھی صورت:

مناولت مع اجازت کی صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ شاگرد استاد کے پاس کتاب یا کوئی خبر لائے اور کہے یہ آپ کی روایات ہیں مجھے آپ ان کو روایت کرنے کی اجازت دے دیں تو استاد کتاب کو دیکھے بغیر اور اس میں پائی جانے والی روایتوں کی تحقیق کئے بغیر اس کو منظور کرتے ہوئے روایت کی اجازت دے دے۔

2.4.2 اس صورت کا درجہ اور اس میں روایت کا حکم:

مناولت کی اس صورت کو علماء نے مذکورہ تینوں صورتوں سے درجہ کے لحاظ سے ادنیٰ قرار دیا ہے اور اس کے تحت دی جانے والی اجازت کو باطل تصور کیا ہے۔ ہاں اگر استاد کو شاگرد پر اعتماد ہے اور استاد کی نظر میں وہ صاحب معرفت ہے تو پھر اجازت اور مناولت درست ہو جائے گی۔ اس صورت میں زیادہ اچھا ہوگا اگر شیخ فرمادے کہ اس کتاب میں جو میری مسموعات (مرویات) ہیں تم ان کو روایت کرو، لیکن ان میں غلطی اور وہم سے میں بری الذمہ ہوں (یعنی میں ذمہ دار نہیں ہوں)

2.4.3 ادائے حدیث کے صیغ و الفاظ:

اغذ حدیث کے طریقہء مناولت کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی حدیث کو اداء یعنی آگے منتقل کرتے وقت راوی جن صیغ و الفاظ کو استعمال کر سکتا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

..... ناوَلْنِی: (اس شیخ نے مجھے دیا) اور جب مناولت کے ساتھ استاد نے شاگرد کو روایت کی اجازت بھی دی ہو تو وہ اس طرح کہے گا۔ ”ناوَلْنِی وَأَجَازْلِی“ (اس نے مجھے کتاب دی اور اسے روایت کرنے کی مجھے اجازت بھی دی) محدثین حضرات نے ان الفاظ کو سب سے بہتر قرار دیا ہے۔

۲..... بعض محدثین حضرات نے مناولت کے طریقہ سے حاصل کی ہوئی حدیث روایت کرتے وقت ”حَدَّثَنَا و أَخْبَرَنَا“ کے صیغوں کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن جمہور محدثین کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ ان دونوں صیغوں یا لفظوں کے ساتھ ”مناولہ“ کے لفظ کا اضافہ کیا جائے تاکہ پتہ چل سکے کہ حدیث کو مناولت کے اسلوب پر روایت کیا جا رہا ہے مثلاً یوں کہے:

”حَدَّثَنَا مَنَاوَلَةٌ“ او ”أَخْبَرَنَا مَنَاوَلَةٌ و اجازة“ (شیخ نے ہمیں مناولت کی صورت میں حدیث بیان کی) یا (شیخ نے ہمیں مناولت مع اجازت کی صورت میں خبر دی)

اس اسلوب سے ملی ہوئی روایت کو اداء (روایت) کرنے کیلئے جہاں تک صرف ”حَدَّثَنَا و أَخْبَرَنَا“ کے صیغوں کے استعمال کا تعلق ہے تو علماء اس بارے میں مختلف انخیال ہیں۔

۱..... بعض کہتے ہیں کہ ان کا استعمال لفظ ”مناولت“ کے بغیر جائز ہے۔

۲..... لیکن جمہور محدثین کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ لفظ ”مناولت“ کو ضرور لگایا جائے تاکہ کیفیت کا پتہ چل جائے کہ فلاں حدیث کو مناولت کے اسلوب (طریقہ) پر روایت کیا جا رہا ہے۔

2.5 الکتابۃ (کتابت یعنی لکھنا)

بعض علماء نے اسے ”الکتابۃ“ اور المرسلۃ کے نام سے بھی موسوم کیا ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ استاد اپنی مسوعات (مرویات) کو خود ہی تحریر فرما کر یا کسی دوسرے (ثقہ و دیندار) کاتب سے لکھوا کر کسی حاضر (موجود) یا غائب (غیر موجود) شاگرد کو بھیج دے۔

2.5.1 کتابت کی اقسام

علماء حدیث نے تخل حدیث کے اس طریقہ کی بھی دو قسمیں بیان کیں ہیں۔

۱- الکتابۃ مع الإجازة (کتابت مع اجازت)

اس کی صورت یہ ہے کہ استاد حدیث کی کتابت کے ساتھ ہی اس کی روایت کی اجازت بھی تحریر فرما دے مثلاً یہ لکھ دے کہ ”میں نے تحریری طور پر (احادیث میں سے) جو کچھ تم کو دیا ہے یا تمہاری جانب بھیجا ہے تم کو اسے روایت کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔“

اس صورت کا حکم و درجہ:

جن احادیث کی کتابت کے ساتھ روایت کی اجازت بھی ہو محدثین کے نزدیک شاگرد کیلئے ان کو روایت کرنا صحیح ہے اور صحت و قوت کے اعتبار سے یہ صورت ’مناولۃ مع اجازت‘ کی طرح ہے۔

۲- الکتابۃ من غیر اجازة (کتابت بغیر اجازت)

اس کی صورت یہ ہے کہ محدث حدیث کی کتاب کے ساتھ اس کو روایت کرنے کی اجازت شاگرد کے حق میں تحریر نہ فرمائے۔

اس صورت کا حکم:

بغیر اجازت کے کتابت کی مذکورہ صورت میں شاگرد کے لئے احادیث کی روایت کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔

الف..... بعض علماء (مثلاً قاضی ابوالحسن ماوردیؒ (۴۵۰ھ)، علامہ آدمیؒ اور ابن قطان وغیرہ) کے نزدیک جب تک شیخ کی طرف سے روایت کی اجازت صراحت کے ساتھ نہ ہو تو شاگرد کے لئے روایت کرنا جائز نہیں ہے۔

ب..... جبکہ بہت سارے متقدمین اور متاخرین علماء (جیسے ایوب سختیانیؒ (۱۸۱ھ) اور لیث بن سعدؒ (۱۷۵ھ) وغیرہ نے اجازت کی تصریح کے بغیر شاگرد کے لئے شیخ کی تحریر کردہ مرویات کی روایت کو

جائز قرار دیا ہے۔ محدثین کے نزدیک یہی رائے زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس سے اجازت کا مفہوم خود بخود ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ علماء نے کتابت کے ذریعے روایت میں شیخ کی تحریر کے لئے شہادت کو ضروری قرار نہیں دیا ہے بلکہ اتنا کافی ہے کہ مکتوب الیہ (شاگرد) کاتب (استاد یا کوئی اور آدمی) کو پہچانتا ہو کیونکہ عام طور پر دو کاتبوں کی لکھائی میں فرق ہوتا ہے۔

2.5.2 ادائے حدیث کے صیغے والفاظ:

اغذ حدیث کے اس طریقہ (یعنی کتابت) سے راوی جس حدیث کو حاصل کرے اسے ادا یعنی روایت کرتے وقت درج ذیل صیغ والفاظ کو استعمال کرے۔

الف ”كُتِبَ إِلَيَّ فُلَانٌ“ (فلاں شیخ یا کاتب نے میری طرف لکھا) اس طرح بولنے سے کتابت کی صراحت ہو جائے گیلا

ب ”حَدَّثَنِي فُلَانٌ أَوْ أَخْبَرَنِي فُلَانٌ“ اور اسی طرح ”حَدَّثَنَا فُلَانٌ أَوْ أَخْبَرَنَا فُلَانٌ“ اور اخبرنا فُلَانٌ کو لفظ ”کتابت“ یا ”مکاتب“ کے ساتھ مقید کرتے ہوئے استعمال کیا جائے تاکہ صرف سماعت و قرأت کے طریقوں پر دلالت نہ ہونے پائے مثلاً یوں کہے: ”حَدَّثَنِي فُلَانٌ كِتَابَةً أَوْ مَكَاتِبَةً“ (مجھ سے فلاں نے تحریری طور پر حدیث بیان کی) یا ”أَخْبَرَنِي فُلَانٌ كِتَابَةً“ (فلاں نے مجھے تحریری صورت میں خبر دی) باقی صیغوں کے ساتھ بھی اسی طرح لفظ ”کتابت“ کا اضافہ کیا جائے۔

2.6 الإعلام:

إعلام کے معنی ہیں مطلع کرنا، آگاہ کرنا، بتانا، محدثین کی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ استاد اپنے شاگرد کو صراحۃً روایت کی اجازت دیئے بغیر بتائے (مطلع کرے) کہ ان احادیث کو اس نے فلاں شیخ سے سنا ہے یا اس (حدیث کی) کتاب کو اس نے فلاں شیخ سے روایت کیا ہے۔

2.6.1 اس صورت کا حکم

محدثین نے اعلام کی مذکورہ صورت میں حاصل شدہ حدیث کو روایت کرنے کے جواز میں اختلاف کیا

ہے۔

الف..... بہت سارے محدثین و فقہاء اور اصحاب اصول (جیسے علامہ محمد بن خلاد رامہرمزی، فخر الدین الرازی اور ابونصر بن صباح وغیرہ) نے اعلام میں صراحۃً اجازت کے بغیر ہی شاگرد کیلئے روایت کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ:

شیخ کو لوگوں میں جو اعتماد حاصل ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ شاگرد کو غلط بات نہیں بتا سکتا۔ گویا وہ شاگرد کو اپنی مسوعات (شیخ سے سنی ہوئی احادیث) کی اطلاع دے کہ یہ اشارہ کرتا ہے کہ وہ ان کو مجھ سے حاصل بھی کر سکتا ہے اور آگے بیان بھی کر سکتا ہے۔ اس طرح شیخ صراحت کے طور پر شاگرد کو روایت حدیث کی اجازت تو نہیں دیتا مگر ضمنی طور پر اس کی اجازت صاف سمجھ میں آتی ہے۔

ب..... جن محدثین کے نزدیک اعلام میں صراحۃً روایت کا اذن شرط ہے انہوں نے مذکورہ صورت میں روایت کو جائز قرار نہیں دیا۔

ج..... محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک اعلام کی مذکورہ صورت میں شاگرد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ حدیث کو روایت کرے کیونکہ شیخ نے اسے صریح طور پر روایت کی اجازت نہیں دی ہوتی۔ صراحت کے ساتھ اجازت نہ دینے کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ بعض اوقات اس طرح بھی ہوتا ہے کہ شیخ نے حدیث کو اپنے شیخ سے سنا ہوتا ہے مگر حدیث میں کبھی نقص یا خرابی، جس کا علم صرف شیخ ہی کو ہوتا ہے کی وجہ سے مناسب نہیں سمجھتا کہ یہ حدیث آگے روایت کی جائے۔ اس لئے وہ اجازت کے بغیر ہی اپنے شاگرد کو اپنی روایت سے آگاہ کر دیتا ہے۔

2.6.2 عمل کا حکم:

شیخ نے اپنے شیخ سے جس روایت کو سنا ہو اور اپنے شاگرد کو اس کی روایت کرنے سے منع کیا ہو، اگر اس روایت کی سند صحیح ہو تو اس پر عمل کرنا واجب ہوگا۔

اگر استاد اپنے شاگرد کو حدیث کی اطلاع کے ساتھ روایت کی اجازت بھی دے دے تو اس کے لئے آگے روایت کرنا صحیح ہو جائے گا

صراحتہ ممانعت کی صورت میں روایت کا حکم:

اعلام کے بعد اگر استاد شاگرد کو روایت حدیث سے اس طرح منع کر دے کہ ”یہ میری مسوعات یا مرویات ہیں مگر میں آپ کو ان کی روایت سے منع کرتا ہوں یا ان کو مباح نہیں کرتا یا ان کی اجازت نہیں دیتا یا ان کو دوسروں تک نہ پہنچائے“ تو کیا صرف اعلام کی بناء پر شاگرد روایت حدیث کر سکتا ہے یا کہ نہیں؟ اس بارے میں بھی علماء نے اختلاف کیا ہے۔

الف..... بعض محدثین کے نزدیک ممانعت کی مذکورہ تمام صورتوں میں شاگرد شیخ کی مرویات کو روایت نہیں کر سکتا کیونکہ یہ شہادت پر شہادت دینے کے مترادف ہے۔ شاہد ثانی کی شہادت (گواہی) اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے کہ جب شاہد اول اس کو صراحت کے ساتھ اجازت دے دے یعنی پہلا گواہ دوسرے کو کہے کہ تم میری گواہی پر گواہی دے سکتے ہو۔

ب..... قاضی عیاض (۵۴۴ھ) کے نزدیک یہ قیاس درست نہیں ہے۔ یعنی مذکورہ دلیل کو انہوں نے تسلیم نہیں کیا ہے کیونکہ ”شہادت پر شہاوت“ اجازت کے بغیر کسی بھی حال میں جائز نہیں ہوتی اور جو حدیث سماع و قرأت کے بعد بیان کی جائے اس کو روایت کرنے کیلئے (شیخ سے) اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ان کے خیال میں اعلام اور شہادت پر شہادت کے درمیان سرے سے کوئی مماثلت نہیں ہے اور اسی طرح شہادت اور روایت میں بہت ساری وجوہات سے فرق ہوتا ہے (دونوں میں فرق کیلئے دیکھئے

تذریب الراوی ج ۱ ص ۲۳۱ و ما بعد ہا)

قاضی عیاضؒ کے نزدیک اگر اعلام کے بعد شیخ نے طالب علم کو روایت سے صراحتہ منع فرما دیا ہو تو صرف اعلام (اطلاع) کی بناء پر اس کے لئے روایت کرنا جائز ہے۔

ج..... بعض اہل ظاہر^(۲) کہتے ہیں کہ جب شیخ طالب علم کو کسی حدیث کی اطلاع دے دینے کے بعد اس کی روایت سے منع فرما دے تو یہ اسی طرح ہے جیسے طالب علم اپنے استاد سے براہ راست کوئی حدیث سنے اور استاد شاگرد کو حدیث روایت کرنے سے منع کر دے یعنی جس طرح مسموع حدیث کی روایت سے روکنے کے بعد شاگرد روایت کرنے کا مجاز نہیں ہے اسی طرح اعلام کی صورت میں منع کرنے کے بعد اسے حدیث کی روایت کرنا درست نہیں ہے۔

2.6.3 ادائے حدیث کے الفاظ:

تحمل حدیث کے طریقہء اعلام کی صورت میں حاصل ہونے والی احادیث کو ادا کرتے وقت مؤدی (اداء کرنیوالا یعنی راوی) یوں کہے گا: ”اعلمنی شیخی بكذا“ (میرے شیخ نے یہ حدیث مجھے اس طرح بتائی ہے) یا ”اخبرنی شیخی اعلاماً“ (میرے شیخ نے مجھے اعلام کے طور پر خبر دی ہے) یا ”حدثنی شیخی بالاعلام“ (میرے شیخ نے اعلام کے طور پر مجھ سے حدیث بیان فرمائی)

2.7 أَلَوْصِيَّة: (وصیت کرنا)

تحمل حدیث کے اس طریقہ کی صورت یہ ہے کہ شیخ اپنی موت یا سفر کے وقت اپنے شاگرد کو ایک ایسی کتاب کے متعلق وصیت کر جائے جسے اس (شیخ) نے خود روایت کیا ہو۔

2.7.1 اس صورت میں روایت کا حکم:

وصیت کی مذکورہ صورت میں حاصل شدہ احادیث کی روایت کے حکم میں محدثین نے اختلاف کیا ہے۔

الف..... بعض علمائے سلف کے قول کے مطابق جس کی وصیت کی گئی ہو (موصی لہ) اس کے لئے وصیت کرنے والا (موصی) کی کتاب یا کتب سے صرف وصیت کی بنا پر احادیث کو روایت کرنا جائز ہے۔ ان کے نزدیک وصیت میں ایک طرح کی ”اعلام“ اور ”مناولت“ کی قسم موجود ہوتی ہے گویا شیخ نے وصیت کر کے شاگرد کو ایک خاص چیز دے دی اور اسے بتا دیا کہ یہ اس کی مرویات میں سے ہے البتہ صراحت کے طور پر ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتا جن سے یہ مفہوم ظاہر ہو یعنی واضح طور پر روایت کی اجازت نہیں دیتا۔

جن علماء نے محض وصیت کی مذکورہ صورت میں روایت کو جائز قرار دیا ہے وہ اس بات کے معترف ہیں کہ تحل حدیث کا یہ طریقہ (یعنی وصیت بالکتاب) دوسرے تمام طریقوں سے زیادہ کمزور ہے۔ ان کے نزدیک وصیت کا درجہ مناولت اور اعلام سے کم ہے لیکن بعض وجوہات سے وصیت ان دونوں طریقوں کی مانند ہے۔

علامہ ابن الصلاحؒ کے نزدیک وصیت اور مناولت و اعلام میں مماثلت و مشابہت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ انہوں نے مماثلت کے قائلین پر شدید رد کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

”بعض لوگوں نے وصیت کو اعلام اور مناولت کے مماثل قرار دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے جو لوگ اعلام اور مناولت کی بناء پر روایت کو جائز قرار دیتے ہیں ان کے دلائل ہم بیان کر چکے ہیں مگر وصیت میں ان باتوں میں سے کوئی بھی نہیں پائی جاتی“ (مقدمہ ابن الصلاحؒ ص ۸۵)

ب..... جمہور محدثین کے نزدیک وصیت کی مذکورہ بالا صورت میں روایت کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر وصیت کرنے والا صراحت کے ساتھ شاگرد کو روایت کی اجازت دے جائے تو پھر وہ اسکی کتب سے احادیث کو روایت کر سکتا ہے۔

2.7.2 ادائے حدیث کے الفاظ:

جو احادیث بصورت وصیت شاگرد کو ملی ہوں انہیں اداء یعنی روایت و بیان کرتے وقت وہ ان الفاظ کو استعمال کرے گا۔

(أوصی إلى فلان بكذا أو حدثنی فلان وصیة أو أخبرنی فلان وصیة) ”فلاں شیخ نے مجھے یہ وصیت فرمائی یا فلاں شیخ نے مجھ سے وصیت کے طور پر یہ حدیث بیان فرمائی یا فلاں شیخ نے وصیت کی صورت میں مجھے خبر دی“

2.8 الوجادة (پالینا)

وجادہ بکسر الواو فعل وجَدَ ، یجد کا مصدر ہے۔ یہ ایک جدید الاستعمال مصدر ہے جیسے ”مصدر مولد“ کہا گیا ہے یعنی یہ عربی زبان کے قواعد سے ہٹ کر بنایا گیا ہے۔ عربوں کی زبان سے نہیں سنا گیا ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں وجادہ کے معنی ہیں سماع، اجازت اور مناولت کے بغیر کسی صحیفہ (کتاب) سے علم حاصل کرنا۔

2.8.1 وجادہ کی صورت:

اس کی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو کس محدث، استاذ یا کسی معروف شخصیت کا (احادیث پر مشتمل) کوئی خط، یا کتاب، یا مسودہ، یا کوئی دستاویز تحریری شکل میں مل جائے اور سابقہ ملاقات کی بنا پر اس کا انداز تحریر پہچان لے یا اس سے ملاقات نہ ہوئی ہو تاہم اسے یقین ہو جائے کہ فی الحقیقت یہ تحریر یا خط اسی فلاں محدث ہی کا ہے۔

وجادہ کی صورت میں روایت کا حکم:

وجادہ کی مذکورہ صورت میں روایت کی ہوئی احادیث کو علماء نے منقطع (۳) احادیث کے درجہ میں شامل

کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر طالب علم (راوی) کو مکمل طور پر یقین ہو کہ احادیث شیخ (مروی عنہ) ہی کے خط میں لکھی ہوئی ہیں تو اس صورت میں حدیث میں اتصال کی بو پیدا ہو جائے گی۔ نتیجہ کے طور پر اس کا درجہ منقطع حدیث کے درجہ سے کچھ بڑھ جائے گا۔ اتصال کا پہلو صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب راوی روایت کرتے وقت یوں کہے ((وحدث بحفظ فلان)) ”میں نے اس حدیث کو فلان محدث کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کی صورت میں پایا)

وجاہہ پر عمل کرنے کا حکم:

جہاں تک وجاہہ کے اسلوب پر حاصل شدہ مرویات پر عمل کرنے کا تعلق ہے تو اس ضمن میں علماء مختلف الحیال ہیں۔

الف..... کبار محدثین، مالکی فقہاء اور بعض شیعہ حضرات کے نزدیک وجاہہ کی صورت میں حاصل شدہ مرویات (احادیث) پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔

ب..... امام شافعی اور ان کے اصحاب سے وجاہہ پر عمل کا جواز منقول ہے۔

ج..... جبکہ بعض علماء (مثلاً حافظ محمد بن کثیرؒ (۷۷۴ھ) وغیرہ نے وجاہہ کے طریقہ کے حاصل شدہ مرویات کو واجب العمل قرار دیا ہے۔ اور درج ذیل صحیح حدیث سے استدلال کیا ہے۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا: یہ بتاؤ کہ کون سی مخلوق ایمان کے اعتبار سے زیادہ عجیب ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کی فرشتے۔ حضورؐ نے فرمایا وہ کیسے ایمان نہ لائیں جبکہ وہ اپنے رب کے پاس رہتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے کہا: انبیاء حضور ﷺ نے فرمایا وہ کیسے ایمان نہ لائیں جبکہ ان کے پاس وحی آتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے فرمایا: ہم حضور ﷺ نے فرمایا تم کیسے ایمان نہ لاؤ جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کی حضور آپ ہی بتادیں حضور ﷺ نے فرمایا: عجیب ایمان والی ایک قوم ہے جو تمہارے بعد آئے گی وہ کچھ صحیفے پائے گی اور جو کچھ ان میں مندرج ہے سب پر ایمان لے آئے گی۔ (التدریب: ص ۶۴)

اس حدیث سے ان لوگوں کی مدح مستطب ہوتی ہے جو صرف وجادہ کے طریقہ پر ملنے والی کتب پر عمل کرتے ہیں۔ امام بلقینیؒ (۹۲۴ھ) نے اس استنباط کو سراہا ہے۔ لیکن اس استدلال کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وجادہ پر عمل کا واجب ہونا اس حدیث پر موقوف نہیں وجادہ پر وجوب عمل کا دار و مدار احادیث کو حاصل کرنے والے کے اس اعتماد و بھروسہ پر ہے جو احادیث وجادہ کی صورت میں اس کو ملی ہیں ان کی نسبت حضور ﷺ کی طرف صحیح ہے۔ علامہ نوویؒ نے اسی رائے کو درست تصور کیا ہے۔

2.8.2 وجادہ کی اہمیت:

تخل حدیث کے اس طریقہ (اسلوب) کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا کہ عصر حاضر میں احادیث کی جن کتب سے مرویات کو نقل کیا جاتا ہے وہ اسی اسلوب میں سے ہے چنانچہ داکٹر صبحی صالح اس اہمیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

”پس وجادہ کو جب صحیح طریقہ سے سمجھا جائے تو اس کی قیمت و اہمیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا اور وہ اخذ حدیث کے طریقوں میں ایک طریقہ قرار پاتا ہے۔ آج احادیث کی صحیح کتب میں سے جو روایات بھی ہم نقل کرتے ہیں وہ وجادہ کی قسم میں سے ہیں۔ اس لئے دور حاضر میں نشر و اشاعت کے عام ہونے کے بعد ایسے حفاظ حدیث کا وجود عقاد (نادرو کیا ب) ہے جن سے براہ راست احادیث سنی جائیں۔ بخلاف ازیں معتبر کتب حدیث کی جانب مراجعت نہایت آسان ہے۔ (علوم الحدیث و مصطلحہ ص ۱۰۳)“

www.kitabosunnat.com

روایت حدیث کے الفاظ:

تخل حدیث کے اس آخری طریقہ سے حاصل ہونے والی مرویات کو اداء یعنی آگے منتقل کرتے وقت شاگرد (راوی) ان الفاظ کو استعمال کرے۔

۱..... ((ووجدت بخط فلان)) ”میں نے اس حدیث یا کتاب کو فلاں شیخ کے خط کی صورت میں پایا

۲..... یا ((قرأت بخط فلان)) ”میں نے اس حدیث یا کتاب کو فلاں شیخ کی تحریر میں پڑھا“

۳..... یا ((فی کتابہ (فلان) بخطہ حدثنا فلان)) ”فلاں شیخ کے اپنے خط سے لکھی ہوئی اس کی اپنی کتاب میں تحریر تھا کہ ہم سے فلاں شخص نے حدیث بیان کی

۴..... یا ((فی کتاب فلان بخطہ أخبرنا فلان بن فلان)) ”فلاں کی کتاب میں اس کے اپنے خط میں تحریر ہے کہ فلاں بن فلاں نے ہمیں خبر دی“

ان الفاظ و صیغ کے کہنے کے بعد راوی اسناد اور متن حدیث بیان کر دے۔ امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) کا اسلوب یہی تھا۔ وہ اکثر یوں فرماتے کہ میں نے اپنے والد کی تحریر کو دیکھا کہ فلاں شخص نے مجھے حدیث سنائی۔ اس کے بعد اپنی مسند میں حدیث کی پوری عبارت نقل فرماتے ہیں۔

ادائے حدیث کے ان الفاظ کو راوی صرف اسی صورت میں استعمال کر سکتا ہے جبکہ اسے پورا وثوق (اعتماد) ہو کہ یہ حدیث یا کتاب حدیث واقعی فلاں شیخ کی تحریر کردہ ہے (یعنی اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے)۔ اس کے برعکس اگر اسے اعتماد نہ ہو (یعنی بے یقینی کی حالت پیدا ہو جائے کہ پتہ نہیں یہ اس کی تحریر ہے بھی یا کہ نہیں ہے) تو ایسی صورت حال میں اسے یوں کہنا چاہیے۔

۱..... ((بلغنی عن فلان)) ”مجھے فلاں کی طرف سے یہ روایت پہنچی ہے

۲..... یا ((وجدت عن فلان)) ”میں نے فلاں کی طرف سے اس طرح لکھا ہوا پایا“

۳..... یا ((قرأت فی کتاب . أخبرنی فلان أنه بخط فلان)) ”میں نے کتاب میں یوں پڑھا۔ فلاں نے خبر دی کہ وہ فلاں کی تحریر ہے“

۴..... یا ((ظننت أنه خط فلان)) ”میں نے گمان کیا کہ یہ فلاں شیخ کی تحریر ہے“

۵..... یا ((قیل بخط فلان)) ”کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں کے خط میں لکھی ہوئی ہے“

۶..... یا (قیل إنه، تصنیف فلان) ”کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب فلاں کی تصنیف کردہ ہے“
 وجاہہ کے اسلوب سے حاصل ہونے والی حدیث کو روایت کرتے وقت بعض الفاظ کے استعمال کو علماء حضرات نے درست قرار نہیں دیا ہے کیونکہ ان کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے شیخ سے حدیث کو براہ راست سن کر بیان کیا ہے۔ اس طرح سامع (سننے والے) وہم و شک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسے الفاظ میں سے کچھ یہ ہیں:

”عن فلان“، ”حدثنا فلان“، ”أخبرنا فلان“، ”سمعتُ منه“ وغیرہ وغیرہ اس نوعیت کے الفاظ سے حدیث اداء کرنے کے عمل کو بدترین تدلیس قرار دیا گیا ہے۔

اگر راوی کو کسی محدث کی تصنیف کردہ کتاب مل جائے اور وہ اس سے حدیث کو نقل و روایت کرنا چاہے مگر اسے کتاب کے نسخے کی کتبت کا یقین نہ ہو تو ایسی صورت میں ”قال فلان“ یا ”ذکر فلان“ جیسے الفاظ استعمال نہ کرے بلکہ یہ الفاظ استعمال کرے۔

۱..... (بلغنی عن فلان) ”فلاں شیخ سے مجھے یہ حدیث پہنچی ہے“

۲..... یا (وجدتُ فی نسخة من کتابہ) ”میں نے اس شیخ کی کتاب کے فلاں نسخہ میں فلاں حدیث پائی“

اصول حدیث کے بعض علماء نے اپنے دور کے مؤلفین کی ایک غلط عادت کی نشاہد ہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بہت سارے اداء و مؤرخین جب اپنے سے قبل علماء کی کتب سے کوئی بات اپنی کتب میں نقل کرتے ہیں تو نقل کرتے وقت ان صیغوں کو استعمال کرتے ہیں۔ جو براہ راست سامع پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے (حدثنا الطبرانی، أو ابن حجر أو الحافظ العراقي) ”یہ حدیث طبرانی یا ابن حجر یا حافظ عراقی نے ہم سے بیان کی“

ایسا کرنا نہ لغت کے موافق ہے اور نہ اصطلاح کے۔ ایسے مؤلفین اس بارے میں اگر محدثین حضرات

کے وضع کردہ قواعد کا التزام کریں تو ان کے لئے بہت بہتر رہے گا۔

اخبرنی کا استعمال:

وجاہہ کے طریقہ میں جہاں تک ”اخبرنی“ کے صیغہ یا لفظ کے استعمال کا تعلق ہے تو اسے علماء کے نزدیک اجازت روایت کے ساتھ مشروط کر کے بولا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔

”اور ایسے ہی انہوں نے وجاہہ میں اجازت کی شرط رکھی ہے..... اور راوی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ صرف اس (اجازت سے خالی) وجاہہ میں روایت کرتے وقت ”اخبرنی“ کہے ہاں اگر اسے شیخ (صاحب کتاب) سے روایت کی اجازت ہو تو صرف ”اخبرنی“ بول سکتا ہے اور جن لوگوں نے ”غیر ماذون“ وجاہہ میں ”اخبرنی“ کا اطلاق جائز قرار دیا ہے تو اس نے سخت غلطی کی ہے۔ (شرح نخبہ الفکر بتعلیق الصباغ ص ۱۴۰)

2.8.3 ادائے حدیث کے بعض صیغوں کی کتابت و قرات کا طریقہ:

جب احادیث نبویہ کی تعلیم و تدریس اور جمع و تدوین کے عمل کا آغاز ہوا تو سند و صیغہ اداء وجود میں آ گئے تو ان صیغہ اداء کے حوالے سے ایک چیز اور ایجاد ہوئی، وہ یہ ہے کہ محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں ان صیغوں کو مکمل شکل میں لکھنے کی بجائے ان کے مخففات (ABBREVIATIONS) کو رواج دیا۔ چنانچہ ان صیغوں کے لئے الگ الگ علامات مقرر ہوئیں، جنکو محدثین حضرات نے ایک اسلوب کے طور پر اپنالیا۔ ذیل میں اس اسلوب (طریقہ) کی وضاحت کی جاتی ہے۔

..... ”حدثنا“ کے بعد صرف ”ثنا“ لکھتے ہیں بعض اول حصہ (حد) حذف کر دیتے ہیں یا صرف ”ثنا“ لکھ کر ”حدثنا“ کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں یہاں ”حدث“ کو حذف کرتے ہیں۔ امام بخاری ”ثنا“ اور امام مسلم ”ثنا“ استعمال کرتے ہیں۔

..... ”اخبرنا“ کے لئے۔

(الف) ”أنا“ لکھتے ہیں اور ”خبیر“ کو حذف کر دیتے ہیں۔ یہ اسلوب زیادہ مستعمل و مشہور ہے۔
 (ب) یا ”أرنا“ لکھتے ہیں اور ”حب“ کو ترک کر دیتے ہیں۔
 (ج) یا ”ابنا“ لکھتے ہیں ایسا عام طور پر امام بیہقی کرتے ہیں یعنی ”اخبّرنا“ میں ”خ“ اور ”ر“ کو حذف کر دیتے ہیں اور باقی تین حروف کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس اسلوب کو اچھا قرار نہیں دیا گیا ہے۔

۳..... ”حدثنی“ کے لئے ”ثنی“ یا ”دثنی“ لکھتے ہیں۔

۴..... جہاں تک سند میں لفظ ”قال“ کا تعلق ہے تو محدثین حضرات اس کے ساتھ دو طرح کا برتاؤ کرتے ہیں۔

اولاً: اختصار کی خاطر اس کی جگہ درج ذیل مخففات (رموز، اشارات) کو لکھتے ہیں۔

(الف) بعض صرف ”ق“ لکھتے ہیں۔

(ب) بعض قال کو ”حدثنا“ کی علامت ”ثنا“ کے ساتھ کر لکھتے ہیں جیسے ”قثنا“ اور کبھی ”ق“ کو الگ لکھ کر ”ثنا“ لکھ دیتے ہیں یعنی ”ق ثنا“ یہ اور ما قبل والا ”قثنا“ دونوں اصل میں ”قال حدثنا“ کا مخفف ہیں۔ لیکن موجودہ کتب حدیث میں اس اسلوب کو ترک کر کے ”قال“ کو مکمل صورت میں لکھا جاتا ہے۔ ہاں اگر کہیں مخفف لکھا ہوا ہو تو اسے پورا ”قال“ ہی پڑھا جائے گا۔

ثانیاً: سند کو مختصر کرنے کیلئے اسے (یعنی قال کو) راویوں کے درمیان سے بالکل حذف کر دیتے ہیں۔ لیکن قاری کے لئے ضروری ہے کہ وہ لفظ ”قال“ زبان سے ادا کرے مثلاً ”حدثنا عبد اللہ بن یوسف اخبّرنا مالک“ کو پڑھتے وقت ”قال اخبّرنا مالک“ کہنا چاہیے (یعنی عبد اللہ بن یوسف نے ہم سے حدیث بیان کی (انہوں نے فرمایا) ہمیں مالک نے خبر دی۔)

اسی طرح جب لفظ ”قال“ مکرر ہوتا ہے تو محدثین ایک کو حذف کر دیتے ہیں۔

۵..... اور جہاں تک لفظ ”انہ“ کا تعلق ہے تو اختصار کی خاطر سند کے اخیر میں سے اسے بھی بالکل حذف کر دیتے ہیں مثلاً اس طرح کہتے ہیں ((عن ابی ہریرۃؓ قال)) یہاں قاری کے لئے ضروری ہے کہ وہ ((عن ابی ہریرۃؓ انہ قال)) پڑھے اس لئے کہ اعراب کے لحاظ سے کلام کی تصحیح کی خاطر ”انہ“ پڑھنا ضروری ہے۔

۶..... عن: اسانید میں حرف جر ”عن“ بغیر کسی فعل کے کثرت سے آیا ہے۔ اس حرف والی سند سے جو حدیث مروی ہوتی ہے اسے ”مُعْنَن“ کہتے ہیں جو لغوی لحاظ سے ”عنن“ سے اسم مفعول ہے۔ جس کے معنی ہیں عن عن کہنا۔ اور عن عن کہنے والا شخص (راوی ”مُعْنَن“ کہلائے گا۔ اصطلاحی لحاظ سے ”مُعْنَن“ راوی کے اس قول کو کہتے ہیں جو ”فلاں عن فلاں“ سے شروع ہو یعنی فلاں نے فلاں سے روایت کی ہے۔

علامہ سیوطی (۹۱۱ھ) فرماتے ہیں کہ ”مُعْنَن“ اسناد وہ ہوتی ہے جس میں تحدیث (حدیث، اخبار (اخبارنا) اور سماع (سمعت) کے بیان کے بغیر ہی راوی ”مُعْنَن“ فلاں عن فلاں کہتا چلا جائے“ (التدریب ج ۱ ص ۲۱۴)

2.8.4 سند میں لفظ ”عن“ کا کردار

سند میں لفظ ”عن“ دو کام کرتا ہے۔

الف..... پہلا کام یہ ہے کہ ایک طرف سے یہ روایت کے اسلوب اجازت کو ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف سے سند کے عدم اتصال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً

((قَرَأْتُ عَلَى فُلَانٍ عَنْ فُلَانٍ) کا مطلب یہ ہوگا کہ ((قَرَأْتُ عَنْ فُلَانٍ الذی تلقی حق الروایۃ بطریق الإجازۃ)) ”میں نے فلاں کے پاس پڑھا۔ جس نے روایت کا حق اجازت کے طریقہ سے حاصل کیا تھا۔

ب..... اور دوسرا کام سند کے بارے میں ہے مثلاً (حدثنا، وکیع عن علی بن مبارک عن یحییٰ بن معاذ بن جبل) یہاں دوسرا ”عن“ دو ایسے محدثین کو مربوط کر رہا ہے جن میں سے ایک وفات دوسرے سے ڈیڑھ سو برس بعد ہوئی (یعنی دونوں میں ایک سو پچاس سال کا وقفہ ہے) علم اصول حدیث میں ایسی حدیث کو مقطوع^(۴) یا مرسل^(۵) کہا جاتا ہے۔ یعنی غیر متصل اسناد والی تاریخ تالیف و تدوین حدیث کے نقطہ نظر سے اس سے مراد ایسی کتاب کا استعمال ہوا جو بقول محدثین غیر کامل (ناقص) اسناد والی ہے۔

”مُعْنَع“ حدیث کے متصل یا منقطع ہونے کے بارے میں علماء کرام کے دو قول ہیں۔

۱..... پہلے قول کے مطابق ایسی حدیث اس وقت تک منقطع ہی رہے گی جب تک اس کا اتصال واضح نہ ہو جائے۔

۲..... دوسرے صحیح، راجح اور قابل عمل قول (جو کہ جمہور محدثین، فقہاء اور علماء اصول کا ہے) کے مطابق ”مُعْنَع“ حدیث کو درج ذیل چند شرائط کے ساتھ متصل قرار دیا گیا ہے۔

(الف) ”مُعْنَع“ (عن عن سے روایت کرنے والا) مدلس نہ ہو۔

(ب) ”مُعْنَع“ راوی کی مروی عنہ (شیخ) سے ملاقات ممکن ہو یعنی دونوں ایک زمانہ میں مجتمع ہوں۔

ان دونوں شرطوں پر جمہور محدثین کا اتفاق ہے اور امام مسلم کا مسلک بھی یہی ہے کہ ان ہی دونوں پر اکتفا کیا جائے۔

بعض محدثین حضرات نے ”مُعْنَع“ روایت کے متصل ہونے لئے مزید تین شرائط عائد کی ہیں۔

۱..... ملاقات کا ثبوت یعنی راوی اور مروی عنہ کے درمیان ملاقات ثابت ہو (امام علی بن مدینی اور امام بخاری)

۲..... طول صحبت، یعنی دونوں کے درمیان طول صحبت ثابت ہو (ابوالمظفر سمعانی)

۳..... راوی کو مروی عنہ سے روایت کی معرفت، یعنی راوی اپنے جس شیخ سے بذریعہ ”عن“ روایت کر رہا ہے اسے جانتا بھی ہو (ابو عمر دانی)۔ آخری تین شرائط کے عائد کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔

پہلی دو شرطوں کیساتھ حافظ العراقی کے حوالے سے ڈاکٹر صبحی صالح نے ایک اور شرط ذکر کی ہے اور وہ ہے (عدالة الرواة) ”راویوں کی عدالت“ یعنی راویوں کا عادل ہونا۔

آن: عن کی طرح یہ بھی اسناد حدیث میں استعمال ہونے والا ایک لفظ ہے۔ اس کے ذریعہ سے جو حدیث مروی ہو اسے ”مؤن“ کہتے ہیں مؤن اصل میں آنن سے اسم مفعول ہے جس کے معنی ہیں راوی کا اپنے قول میں آن کہنا اور اصول حدیث کی اصطلاح ”مؤنن“ اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند میں ”فلان ان فلانا قال“ کہا گیا ہو۔ اور جس اسناد میں ”ان فلانا قال“ ہو وہ بھی ”مؤنن و مؤنان“ کہلاتی ہے اور ”آن“ ہمزہ کے فتح کیساتھ بھی اور کسرے کے ساتھ بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

مؤنن روایت کے منقطع یا متصل ہونے کے متعلق دو قول ہیں۔

(الف) امام احمد اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جب تک اس نوعیت کی روایت کا اتصال کسی اور سند سے ظاہر نہ ہو اس وقت تک اسے منقطع کہا جائے گا۔

(ب) جمہور محدثین کا کہنا ہے کہ ”ان“، ”عن“ کی مانند ہے اور اس کی مطلق صورت کو ”عن“ کی مذکورہ بالا شروط (امکانیت لقا اور راوی کا غیر مدلس ہونا) کی موجودگی میں سماع پر محمول کرتے ہوئے حدیث کو متصل قرار دیا جائے گا۔

2.8.5 تحویل سند:

تحویل سند کی دو (۲) صورتیں ہوتی ہیں۔

۱..... ابتداء سے دو سندیں ہوتی ہیں اور پھر درمیان میں ایک راوی پر پہنچ کر دونوں سندیں مل جاتی

ہیں۔ آگے چل کر سندیں متحد ہو جاتی ہیں یعنی آپس میں مل جاتی ہیں۔ یہی عام طریقہ ہے اکثر یہی صورت ہوتی ہے۔

۲..... دوسری صورت پہلی کے برعکس ہے کہ ابتداء سے تو سند ایک ہوتی ہے لیکن آگے جا کر دو ہو جاتی ہیں۔

جب کسی حدیث کی دو یا دو سے زائد اسناد ہوں اور ان سب سندوں سے صرف ایک متن نقل کرنا ہو تو جس وقت محدثین ایک سند سے دوسری سند کی طرف منتقل ہوتے ہیں تو وہاں ”ح“ لکھتے ہیں۔ سند کا قاری جب اس مقام پر پہنچے تو:

(۱) اس حرف کو حرف ہی کی آواز میں پڑھ کر گزر جائے۔ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ تر رواج بھی ”حا“ ہی پڑھنے کا ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ ”الحديث“ پڑھے، گویا وہ الحديث کا مخفف ہے۔

(۳) بعض لوگ کہتے ہیں کہ ”صح“ پڑھے کہ وہ صح کا مخفف ہے۔

(۴) اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ”تحویل“ پڑھا جائے کیونکہ ”ح“ تحویل کا مخفف ہے۔

(۵) جبکہ بعض کہتے ہیں کہ اس کو کچھ بھی نہ پڑھے کیونکہ یہ ”ح“ تو دو سندوں کے درمیان ایک علامت ہے تاکہ کوئی دو سندوں کو ایک نہ سمجھ لے۔

احادیث قدسیہ کے اداء کے طریقے:

احادیث قدسیہ کو اداء (یعنی روایت و بیان) کرنے کیلئے یہ صیغہ والفاظ مقرر ہیں۔ مؤدی (راوی) جو چاہے استعمال کر سکتا ہے۔

۱..... ((قال رسول الله ﷺ فيما يرويه عن ربه عز وجل)) ”حضور ﷺ نے اپنے رب

عز وجل سے روایت کرتے ہوئے فرمایا“

۲..... ((قال الله تعالى فيما رواه عنه رسوله ﷺ)) ”یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جسے

حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے“

۳..... ((قال رسول الله ﷺ قال الله تعالى)) ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے“

خود آزمائی ①

- ۱- تحمل حدیث کا مفہوم بیان کیجئے؟
- ۲- تحمل حدیث کے طرق کی تعداد کتنی ہے ترتیب کے ساتھ بیان کیجئے؟
- ۳- تحمل حدیث کا پہلا طریقہ اصطلاح میں کیا کہلاتا ہے؟
- ۴- ”سماع“ کے ذریعے جو روایت اخذ کی جاتی ہے اس کو ادا کرنے کے لئے کون کون سے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔
- ۴- ”قرآۃ“ کے ذریعے جو حدیث حاصل کی جاتی ہے۔ اس کو روایت کرتے وقت کون سے صیغے ادا کئے جاتے ہیں۔
- ۵- ”اجازۃ“ سے کیا مراد ہے؟ کیا ہر قسم کے راوی کو ”اجازۃ“ حدیث بیان کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

کتابیات

اس پونٹ کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

- ۱- تدریب الراوی شرح تقریب النوای از حافظ جلال الدین سیوطی۔۔
- ۲- تاریخ التراث العربی از ڈاکٹر نواز سزگین۔
- ۳- تیسیر مصطلح الحدیث از ڈاکٹر محمود طحان۔
- ۴- قواعد التحديث من فنون مصطلح الحدیث از علامہ محمد جمال الدین القاسمی۔
- ۵- الوسیط فی علوم و مصطلح الحدیث از محمد بن محمد ابوشہبہ۔
- ۶- مقدمہ ابن الصلاح فی علوم الحدیث از حافظ ابو عمر و عثمان بن عبد الرحمن الشہر زوری المعروف بابن الصلاح۔
- ۷- شرح نخبة الفكر فی مصطلح اهل الاثر از امام احمد بن حجر عسقلانی۔
- ۸- فتح المغیث از علامہ شمس الدین محمد السخاوی۔
- ۹- علوم الحدیث و مصطلحہ از ڈاکٹر صفحی صالح۔
- ۱۰- الکفایۃ فی علم الروایۃ از علامہ خطیب البغدادی۔
- ۱۱- مقیاس الہدیۃ از شیخ عبد اللہ المقامانی۔
- ۱۲- جواهر الاصول فی علم حدیث الرسول از علامہ محمد بن علی الفارسی المشہور بشیخ الہروی۔
- ۱۳- توضیح الافکار لمعانی تنقیح الانظار از علامہ محمد بن اسماعیل الصنعائی۔
- ۱۴- اختصار علوم الحدیث از حافظ محمد بن کثیر۔

حواشی

۱..... حدیث کی سند کے عیب کو چھپا کر بظاہر سنوار کر پیش کر دینے کو تدلیس کہتے ہیں۔

۲..... یہاں اجازت سے مراد ”الاجازة المجردة عن المناولة“ ہے یعنی مناولت سے خالی اجازت دینا۔ مناولت سے مراد یہ ہے کہ شیخ تلمیذ کو کوئی کتاب یا لکھی ہوئی روایت دے کر کہے کہ تم اس کو میری جانب سے روایت کرو۔ مناولت کے متعلق تفصیل تحمل کے چوتھے اسلوب کے تحت آئی ہے۔

۳..... داؤد بن علی الظاہری (۲۷۰ھ) کا اتباع کرنے والوں کو ظاہری کہتے ہیں کیونکہ وہ ظواہر پر نصوص کا اتباع کرتے تھے۔

۴..... مقطوع اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جس کی نسبت تابعی تابع یا اس سے نیچے کسی شخص کی طرف کی جائے۔

۵..... مرسل وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سند کا آخری حصہ یعنی تابعی سے اوپر کا راوی ساقط ہو۔



یونٹ نمبر ⑥

اقسام حدیث باعتبارِ صحت

تحریر: ڈاکٹر سہیل حسن
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر چشتی



فہرست عنوانات

185	یونٹ کا تعارف
186	یونٹ کے مقاصد
187	اقسام حدیث
187	① حدیث صحیح
187	1.1 صحیح لذاتہ
192	1.2 صحیح لغیرہ
195	② حسن
195	2.1 حسن لذاتہ
200	2.2 حسن لغیرہ
202	③ ضعیف
203	خود آزمائی

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

اس وقت آپ جس یونٹ کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کا تعلق ایک بہت ہی اہم پہلو ”اقسام حدیث باعتبار صحت“ سے ہے..... علماء حدیث نے مقبول روایات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ روایات ہیں جنہیں اصطلاح میں ”صحیح“ کہتے ہیں۔ دوسری قسم ان روایات کی ہے جنہیں ”حسن“ کہتے ہیں اور تیسری قسم میں وہ روایات آتی ہیں جنہیں اصطلاح میں ”ضعیف“ کہا جاتا ہے۔ علمائے حدیث نے ان تینوں اقسام پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ہر ایک قسم کی بنیادی شرائط، خصوصیات اور حیثیت پر کلام کیا ہے..... حدیث کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اقسام کے بارے میں پوری طرح معلومات رکھتا ہو تاکہ مصادر کا مطالعہ کرتے وقت اسے استفادہ کرنے میں دقت محسوس نہ ہو..... اس یونٹ میں اختصار کے ساتھ آسان اور عام فہم زبان میں ان تینوں اقسام پر گفتگو کی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ موضوع سے متعلق بنیادی نکات آپ تک پہنچ جائیں۔ آپ اس یونٹ کا پوری توجہ اور انہماک کیساتھ مطالعہ کریں۔

امید ہے آپ اسے مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

⇐ حدیث کی مختلف اقسام پر بات کر سکیں۔

⇐ صحیح حدیث کی تعریف اور اس کی بنیادی شرائط بیان کر سکیں۔

⇐ ”صحیح“ اور ”حسن“ کے فرق کی نشاندہی کر سکیں اور حدیث حسن کی شرائط بتا سکیں۔

⇐ ”حدیث حسن“ کی تائیدی روایات کی وجہ سے اس کے درجہ میں اضافہ کی نوعیت بیان کر سکیں۔

⇐ ”حدیث ضعیف“ کی تعریف کر سکیں اور اس کی اہم خصوصیات پر بحث کر سکیں۔

⇐ ”حدیث ضعیف“ کی تائیدی روایات کی وجہ سے اس کی حیثیت بڑھ جانے کے بارے میں اصول بیان کر سکیں۔

اقسام حدیث

جیسا کہ آپ کو یونٹ کے تعارف میں بتایا گیا ہے کہ حدیث کو صحت کے اعتبار سے تین اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ صحیح ۲۔ حسن ۳۔ ضعیف

اب ان تینوں اقسام کے بارے میں ترتیب کے ساتھ بنیادی نکات پیش کئے جائیں گے۔

① حدیث صحیح

صحیح کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ صحیح لذاتہ ۲۔ صحیح لغيره

مذکورہ بالا تین اقسام میں سے صحیح اور حسن قابل قبول ہیں یعنی ان پر عمل کیا جاسکتا ہے اور حجت بنایا جاسکتا ہے، جبکہ ضعیف احادیث قابل عمل اور قابل حجت نہیں ہیں۔

1.1 صحیح لذاتہ:

حافظ ابن الصلاح نے صحیح حدیث کی تعریف اس طرح بیان کی ہے۔

(هو الحديث المسند الذي يتصل اسناده بنقل العدل الضابط عن العدل الضابط الى منتهاه ولا يكون شاذاً ولا معللاً) (مقدمہ ابن الصلاح - ص: ۱۵۱، تحقیق بنت الشاطی - دار المعارف قاہرہ) یعنی ”وہ مسند حدیث جس کی سند متصل ہو، جسے عادل ضابط راوی نے عادل ضابط راوی سے آخر تک نقل کیا ہو اور وہ نہ شاذ ہو اور نہ معلل“

مندرجہ بالا تعریف سے ان صفات کا علم ہو جاتا ہے جو صحیح لذاتہ میں لازمی طور پر ہونی چاہئیں۔

۱..... اتصال سند

حافظ ابن حجر نے اتصال کی تعریف اس طرح کی ہے۔

(والم متصل : ما سلم اسنادہ من سقوط فیہ بحیث یکون کل من رجالہ سمع ذلک المروى من شیخه) (شرح نخبۃ الفکر - ص: ۳۲) یعنی ”اتصال سند سے مراد وہ سند ہے جس میں کوئی راوی ساقط نہ ہو اور ہر راوی نے اس حدیث کو اپنے شیخ سے سنا ہو“

حافظ ابن حجر کی وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ اتصال سند کے لئے ضروری ہے کہ اس سند میں سے کوئی راوی ساقط نہ ہو، اس لئے وہ سند ضعیف قرار پاتی ہے جس میں کسی قسم کا سقوط واقع ہو جائے۔ اور دوسری بات کہ ہر راوی نے اپنے شیخ سے براہ راست سنا ہو یعنی سماعت کے اس طریقے کے مطابق ہو جو کہ طرق تخیل میں شمار کیا جاتا ہے۔

۲..... عدالت راوی

حافظ ابن حجر نے عدالت سے مندرجہ ذیل معنی مراد لیا ہے۔

(والمراد بالعدل من له ملكة تحمله على ملازمة التقوى والمروءة، والمراد بالتقوى: اجتناب الاعمال السيئة من شرک أو فسق أو بدعة) (شرح نخبۃ الفکر ص: ۳۱) مطبوعہ مکتبۃ الفزالی دمشق و مؤسسۃ مناهل العرفان بیروت - ۱۹۹۰) یعنی ”عادل سے مراد وہ شخص ہے جسے وہ قوت راسخ حاصل ہو جائے جو تقویٰ اور اخلاق حسنہ پر آمادہ کرے اور تقویٰ سے مراد شرک، فسق اور بدعت جیسے برے اعمال سے اجتناب ہے“

اس وضاحت سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عادل وہ شخص ہے جو متقی اور اچھے اخلاق کا حامل ہو اور کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو۔

۳..... ضبط راوی:

صحیح حدیث کی تیسری صفت راوی کا ضابطہ ہونا چاہیے، ضبط کی دو قسمیں ہیں۔

۱- ضبط صدر

۲- ضبط کتاب

ضبط صدر کے بارے میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

(وہو أن یثبت ماسمعه بحیث یتمکن من استحضاره متی شاء) (شرح نخبة الفکر

ص: ۳۲) یعنی ”راوی نے جو کچھ سنا ہے اس قدر راسخ ہو جائے کہ وہ جب چاہے اسے پیش کر سکے“

ضبط کتاب کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

(وہو صیانتہ لادیہ منذ سمع فیہ وصححہ الی أن یؤدی منہ) (شرح نخبة الفکر

ص: ۳۲) یعنی جب سے راوی نے اس روایت کو سنا ہے اس وقت سے لے کر اس کی ادائیگی تک اس کی

حفاظت کرتے رہنا اس وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ راوی کے لئے لازمی ہے کہ اس نے اپنی سنی ہوئی تمام

روایات کو اپنے سینے یا سفینے میں پوری احتیاط اور حفاظت سے رکھا ہو۔

یہ دونوں صفات ”عدالت اور ضبط“ جس راوی میں پائی جائیں وہ ثقہ کہلاتا ہے۔

۴..... شاذ نہ ہونا:

صحیح حدیث کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ شاذ نہ ہو اور شاذ کی وضاحت حافظ ابن حجر نے اس طرح کی

ہے:

(والشاذ لغة: المنفرد، اصطلاحاً: ما یخالف فیہ الراوی من ہو أرجح منہ) (شرح

نخبة الفکر: ص: ۳۳) یعنی ”شاذ کے لغوی معنی: تنہا کے ہیں اور اصطلاح میں شاذ سے مراد، راوی کا

اپنے سے زیادہ ثقہ اور برتر راوی کی مخالفت کرنا ہے“

۵..... علت کا نہ ہونا:

صحیح حدیث کی پانچویں صفت یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کی علت نہیں پائی جاتی اور علت کی وضاحت حافظ ابن حجر نے اس طرح کی ہے۔

(والمعلل لغة: مافيه علة، واصطلاحاً: مافيه علة خفية قاذحة) (شرح نخبه الفكر : ص ۳۲) یعنی ”معلل کے لغوی معنی ہیں وہ جس میں کوئی بیماری اور نقص ہو اور اصطلاحی معنی ہیں وہ جس میں کوئی ایسی خفیہ علت پائی جائے جو سند پر اثر انداز ہوتی ہو“

حافظ ابن الصلاح حدیث معلل کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

(هو الحديث الذي اطلع فيه على علة تقذح في صحته، مع أن ظاهره السلامة منها) (مقدمه ابن الصلاح: ۳۵۹) ”وہ حدیث جس میں کوئی ایسی علت پائی جائے جو اسکی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے باوجود اسکے کہ ظاہری طور پر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا“

اور اس قسم کی علت وہ ہو سکتی ہے جس میں راوی منفرد ہو اور دوسرے راوی کی مخالفت کر رہا، یا کوئی ایسا وہم ہو جس میں متصل کی مرسل، مرفوع کو موقوف یا کوئی حدیث دوسری حدیث میں داخل کر دی گئی ہو۔ اسی قسم کی علتیں جو ظاہری طور پر تو نظر نہیں آتیں لیکن حدیث کی قبولیت پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اس علم کے ماہرین ان علتوں کو پہچان لیتے ہیں۔

۶..... صحیح لذاتہ کی مثال:

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت:

(قالا : حدثنا حبيب بن سعيد حدثنا جرير عن عمارة بن القعقاع عن أبي زرعة عن

ابی ہریرہ قال: جاء رجل الى رسول الله ﷺ فقال: يا رسول الله! من أحق الناس بحسن صحابتي؟ قال: أمك: قال ثم من؟ قال: أمك، قال ثم من؟ قال: أمك، قال: ثم من؟ قال: أبوک) یہ حدیث صحیح لذاتہ کی مثال ہے اس لئے کہ اس میں وہ تمام شرائط اور صفات پائی جاتیں ہیں اس کی سند اول سے آخر تک متصل ہے، اس کے راوی عدل اور ضبط میں معروف ہیں اور کسی قسم کا کوئی شذوذ یا علت نہیں پائی جاتی۔

اس کے رواویوں کا تعارف:

امام بخاری اور امام مسلم حدیث کے مسلمہ ائمہ کرام ہیں ان کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان دونوں کے بعد سند میں مندرجہ ذیل شیوخ آتے ہیں۔

۱- قتیبہ بن سعید بن جمیل النخعی، حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ان کے بارے میں ثقہ ثبت کہا ہے اور یہ اعلیٰ ترین درجات میں سے ایک درجہ ہے (تقریب التہذیب ص: ۴۵۴، تحقیق محمد عوانہ، دار الرشید حلب، شام)

۲- جریر بن عبد الحمید بن قرط الکوفی۔ ان کے بارے میں تقریب التہذیب (ص: ۱۳۹) میں ہے: ثقہ صحیح الکتاب اور یہ بھی ثقاہت کے بلند درجوں میں سے ہے۔

۳- عمارہ بن القعقاع بن شرمۃ الکوفی، تقریب التہذیب (ص: ۴۰۹) میں ان کے بارے میں ہے: ثقہ۔

۴- ابو زرعہ بن عمرو بن جریر بن عبد اللہ البجلي الکوفی، تابعی، تقریب التہذیب (ص: ۶۴۱) میں ان کو ثقہ کہا گیا ہے۔

۵- حضرت ابو ہریرہؓ صحابی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں یعنی ان میں عدالت اور ضبط کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اس حدیث کی کوئی مخالفت، شذوذ اور علت نہیں پائی جاتی لہذا یہ حدیث صحیح لذاتہ قرار پائے گی۔

۶۔ صحیح حدیث کا حکم: تمام محدثین، فقہاء اور اصولیین کا اجماع ہے کہ صحیح حدیث حجت ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے چاہے اس کا راوی ایک ہو یا اس کے ساتھ کوئی اور راوی ہو یا وہ تین راویوں کے ذریعے سے مشہور ہو چاہے وہ حدیث صحیح بخاری یا صحیح مسلم میں ہو یا نہ ہو، اگر وہ صحیح ثابت ہو چکی ہے تو یہ اس کو قبول کرنے کیلئے کافی ہے۔

۷۔ مصادر حدیث صحیح: صحیح حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں سے حاصل کی جاسکتی ہے اس لئے کہ ان دونوں ائمہ کرام نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ صرف صحیح احادیث بیان کریں گے، لیکن تمام صحیح احادیث ان دونوں کتابوں میں نہیں ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے علاوہ: مؤطا امام مالک، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور باقی چاروں ائمہ کرام یعنی امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ کی کتابوں میں بھی صحیح احادیث پائی جاتی ہیں ماسوائے چند احادیث کے، جن کے بارے میں اہل علم نے وضاحت کر دی ہے کہ وہ صحیح کی شرائط کے مطابق نہیں ہیں۔

۸۔ مراتب حدیث صحیح: صحیح حدیث کا اعلیٰ ترین درجہ وہ حدیث ہے جو امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کی ہو، اس کے بعد جو صرف امام بخاری نے، اس کے بعد جو صرف امام مسلم نے اور اس کے بعد جو ان دونوں کی شرط کے مطابق ہو۔

1.2 صحیح لغیرہ

(۱) صحیح لغیرہ میں صحیح لذاتہ کی اعلیٰ صفات نہیں پائی جاتیں جبکہ ان کی کئی دیگر طرق سے آنے والی روایات کے ذریعے سے پوری کی جاتی ہے۔ اور یہ بیرونی تقویت حاصل کرنے کی بنا پر صحیح لغیرہ کہلاتی جاتی ہے۔ صحیح لغیرہ حقیقت میں حسن لذاتہ کی اعلیٰ صورت ہے، حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں یوں فرمایا ہے:

(إن وجد ما يجبر ذلك القصور ككثرة الطرق فهو الصحيح أيضا لكن لا لذاته،

وحيث لا جبران فهو الحسن لذاته (شرح نخبة الفكر : ص ۳۱) اگر ان صفات کی کمی کثرت طرق سے پوری ہو جائے تو وہ بھی صحیح ہے لیکن لذاتہ نہیں ہوگی (یعنی صحیح لغیرہ ہوگی) اور جہاں سے کمی پوری نہ ہو سکے تو وہ حسن لذاتہ رہے گی۔

(۲) صحیح لغیرہ کی مثال:

سنن ترمذی کی روایت:

(قال حدثنا ابو كريب حدثنا عبدة بن سليمان عن محمد بن عمرو عن أبي سلمة عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: لو لا أن أشق على أمتي لأمرتهم بالسواك عند كل صلاة) (سنن ترمذی - کتاب الطہارۃ: ۳۳/۱ - حدی نمبر ۲۲) یہ حدیث حقیقت میں حسن لذاتہ ہے اور کثرت طرق کی وجہ سے صحیح لغیرہ ہو چکی ہے، اسکے راویوں کا جائزہ:

۱. ابو کریب الکوفی، محمد بن العلاء بن کریب الہمدانی، ثقة حافظ، تقریب التہذیب ص: ۵۰۰.

۲. عبدة بن سليمان الکلابی، ثقة، تقریب التہذیب ص: ۳۶۹.

۳. محمد بن عمرو بن علقمہ بن وقاص الليثی، صدوق له اوہام، تقریب التہذیب ص: ۴۹۹.

۴. ابو سلمة بن عبدالرحمن بن عوف الزہری، تابعی، ثقة مکثر، تقریب التہذیب ص: ۶۴۵.

۵. ابو هريرة، مشہور صحابی ہیں.

مندرجہ بالا راویان کرام میں محمد بن عمرو کے بارے میں ”صدوق له اوہام“ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ ضبط کے اعلیٰ وصف کے حامل نہیں ہیں اور ان کے ہاں وہم بھی پایا جاتا ہے

اور باقی تمام صحیح حدیث کی شرائط پوری ہیں، اس لحاظ سے یہ حدیث حسن لذاتہ کہلائے گی، لیکن کثرت طرق کی وجہ سے صحیح لغیرہ کے درجے تک پہنچ گئی ہے۔

یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم نے بھی دوسری سند سے روایت کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن الصلاح اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

(فلما: انضم الى ذلك كونه روى من أوجه آخر زال بذلك ما كنا نخشاه عليه من جهة سوء حفظه، وانجبر به ذلك النقص اليسير، فصح هذا الاسناد، والتحقيق بدرجة الصحيح) (مقدمه ابن الصلاح ص: ۱۸۰) ”جب راوی میں نقص کے ساتھ وہ چیز بھی شامل ہوگئی جو کہ دوسرے طرق سے اسکی روایت ہے تو وہ نقص زائل ہو گیا جس کا ہمیں اندیشہ تھا کہ وہ راوی کے حفظ کی کمی کی وجہ سے نہ پیدا ہو جائے اور دوسری روایتوں سے یہ نقص پورا ہو گیا اور سند صحیح ہوگئی اور صحیح کے درجہ میں یہ حدیث شامل ہوگئی۔“

② حسن

حدیث کی ایک قسم حسن ہے۔ اسے بھی دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

2.1 حسن لذاتہ

محدثین کرام نے حسن کی مختلف تعریفات بیان کی ہیں۔

۱۔ امام خطابی فرماتے ہیں۔

(الحسن ماعرف مخرجه واشتهر رجاله، وعليه مدار اكثر الحديث، يقبله اكثر العلماء ويستعمله عامة الفقهاء) (معالم السنن ۶/۱) حسن وہ ہے جس کا مخرج معروف ہو اور اسکے راوی مشہور ہوں، اور اس پر اکثر احادیث کا دارومدار ہے اس کو علماء کی اکثریت قبول کرتی ہے اور عام فقہاء بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ امام ترمذی کے نزدیک حسن کی تعریف یہ ہے:

(كل حديث يروى لا يكون في اسناده متهم بالكذب، ولا يكون الحديث شاذاً ويروى من غير وجه نحو ذلك) ”وہ حدیث جس کی سند میں کوئی ایسا راوی نہ ہو جو متہم بالکذب ہو اور نہ ہی وہ حدیث شاذ ہو اور متعدد سندوں سے مروی ہو“ (شرح علل الترمذی ۱/۳۴۰)

۳۔ ابن الجوزی حسن کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

(الحديث الذي فيه ضعف قريب محتمل هو الحديث الحسن ويصلح للعمل به) (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۱۷۵) ”وہ حدیث جس میں معمولی درجہ کا ضعف ہو اور صحت کا احتمال ہو وہ حسن ہے اور عمل کے قابل ہے“

حافظ ابن الصلاح ان تعریفات کو نقل کرنے کے بعد ان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

میں نے غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حدیث حسن کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی سند ایسے مستور راوی سے خالی نہ ہو جس کی اہلیت ثابت نہ ہو، لیکن وہ مغفل نہ ہو اور روایت میں نہ زیادہ غلطیوں کا مرتکب ہو اور نہ ہی جھوٹ بولنے کا اس پر الزام ہو یعنی اس سے عملاً جھوٹ بولنا ثابت نہ ہو اور فسق کا کوئی سبب بھی ظاہر نہ ہو ہو۔ اس کے ساتھ حدیث کا متن معروف ہو یعنی اس طرح یا اس سے مشابہ متن، ایک یا کئی طرق سے مروی ہو یعنی کسی متابع یا شاہد سے مضبوط ہو جائے، اس طرح سے وہ شاذ اور منکر کی نوع سے خارج ہو جائے گی۔ امام ترمذی کا کلام اس پر صادق آتا ہے۔

۱۔ متابعت سے مراد ایک راوی کا دوسرے کے ساتھ روایت میں شریک ہونا ہے۔

۲۔ شاہد سے مراد وہ حدیث ہے جس کے راویوں کی کسی فرد حدیث کے راویوں کے ساتھ صرف حدیث کے معنی میں شرکت ہو، صحابی خواہ ایک ہو یا مختلف۔

دوسری قسم وہ ہے جس کے راوی صدق و امانت میں شہرت رکھتے ہوں لیکن ضبط و اتقان میں کمی کی وجہ سے صحیح کے رجال کا درجہ نہ حاصل کر پائیں، اسکے باوجود ایسے افراد سے خالی ہوں جس سے ان کی حدیث منکر شمار ہو اور دونوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ شاذ اور معلل نہ ہو۔ یہ وہ قسم ہے جس کے بارے میں امام خطابی نے ذکر کیا ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۱۷۵-۱۷۶)

حافظ ابن الصلاح کے تبصرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام خطابی اور امام ترمذی نے دو الگ الگ قسموں کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں حافظ ابن حجر نے حدیث صحیح کی تعریف بیان کی ہے اور پھر حسن کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(فان خف الضبط مع بقية الشروط المتقدمة في الصحيح فهو الحسن لذاته ، لالشي خارج) ”اگر ضبط راوی میں کمی ہو اور صحیح کی بقیہ شروط موجود ہوں تو وہ حسن لذاتہ ہے، یعنی اپنے

اوصاف کی بنا پر بغیر کسی خارجی سبب کے۔ (شرح نخبۃ الفکر ص: ۴۲)

۲..... مثال: حسن لذاتہ کی مثال صحیح لغیرہ کے تحت گزر چکی ہے۔

۳..... حدیث حسن کن کتابوں میں پائی جاسکتی ہے؟ کتب سنن، مسانید اور مصنفات میں حدیث حسن کثرت سے مل سکتی ہے۔ اور بقول حافظ ابن الصلاح: امام ابو عیسیٰ ترمذی کی کتاب اس بارے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اسکے بعد امام ابوداؤد کی سن ہے۔

۴..... حافظ بغوی کی اصطلاح:

حافظ بغوی نے اپنی کتاب مصابیح السنۃ میں حسن کے لئے ایک الگ اصطلاح مقرر کی ہے۔ انہوں نے فصل ثانی کی احادیث حسن قرار دی ہیں جو کہ اصحاب سنن یعنی امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام دارمی کی کتب سے لی گئی ہیں۔

اور فصل اول میں امام بخاری اور مسلم کی صحیح احادیث بیان کی ہیں اس طرح ان کی اصطلاح میں صحیح وہ ہے جو کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہو اور حسن وہ ہے جو سنن اربعہ میں پائی جائے۔

۵..... حدیث حسن کا حکم:

تمام محدثین اور فقہائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ حسن قابلِ حجت ہے اس لئے محدثین کرام نے صحاح کے ذیل میں حسن احادیث بھی ذکر کی ہیں۔ مثلاً ابن حبان، ابن خزیمہ اور امام حاکم وغیرہ۔

۶..... امام ترمذی کی اصطلاحات:

۱۔ حسن صحیح

۲۔ حسن غریب

۳۔ حسن صحیح غریب

۳۔ حسن الاسناد اور حدیث حسن میں فرق۔

ترمذی کی اصطلاحات:

۱.....صحیح غریب:

امام ترمذی یہ اصطلاح اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی حدیث کسی صحابی کی روایت سے معروف ہو اور اسکے مختلف طرق ہوں یا ایک ہی طریق ہو، پھر اس صحابی سے کسی اور طرق سے روایت سامنے آئے اور اسکو غریب جانا جائے یعنی لفظی طور پر غریب تھے، اسنادی طور پر نہیں۔

۲.....حسن صحیح:

امام ترمذی نے یہ اصطلاح اپنی کتاب میں استعمال کی ہے اور ظاہر ہے یہ ایک مشکل ترکیب ہے کیونکہ اصطلاحی طور پر حسن کا مرتبہ صحیح سے ادنیٰ ہے، تو اس فرق کے باوجود ان کو ایک ہی مرتبہ میں کیونکر اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔

محدثین کرام نے امام ترمذی کی اس اصطلاح کے کئی جواب دیئے ہیں اور سب سے عمدہ توجیہ حافظ ابن حجر نے کی ہے۔

(الف) اگر حدیث کی دو یا اس سے زائد سندیں ہوں تو اس سے مراد ہوگا کہ یہ حدیث ایک سند کے لحاظ سے حسن اور دوسری کے لحاظ سے صحیح ہے۔

(ب) اگر اس کی ایک ہی سند ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طبقہ کے ہاں یہ حدیث حسن اور دوسرے طبقہ کے ہاں صحیح ہے۔ یعنی محدث کی طرف سے اس حدیث کے بارے میں شک کا اظہار ہے کہ وہ حسن ہے یا صحیح۔

۳.....حسن غریب:

امام ترمذی یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور اسکے ساتھ انہوں نے دو طرح کا لاحقہ استعمال کیا ہے۔

۱. حسن غریب ، ولا نعرفه الا من هذا الوجه

۲. حسن غریب ، واسنادہ لیس بمتصل

جہاں تک پہلی اصطلاح کا تعلق ہے تو اس میں حسن اور غریب کو جمع کیا گیا ہے جو ایک مشکل ترکیب ہے اسلئے کہ حسن میں ایک سے زائد روایت ہو سکتی ہیں جبکہ غریب سے مراد وہ روایت ہے جو کہ صرف ایک طریق سے آئی ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث اپنے مرتبہ کے لحاظ سے حسن اور کسی خارجی تقویت کی محتاج نہیں اور اس بات کو انہوں نے غریب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی اسے حسن لذاتہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے بغیر استعمال کرنے میں یہ احتمال موجود تھا کہ وہ حدیث حسن لغیرہ ہو اور غریب لفظی طور پر ہو اسنادی لحاظ سے نہ ہو اس لئے اسے بغیر قید کے بیان کیا ہے۔

دوسری اصطلاح سے ضعیف مراد ہے، اس لئے کہ عموماً امام ترمذی نے یہ عبارت استعمال کرنے کے بعد اسکی علت بتائی ہے۔ یہاں پر حسن سے مراد ترمذی کی اس حسن سے جس میں راوی مہتمم بالکذب نہ ہو، یعنی سی، الحفظ ہو سکتا ہے اور غریب سے مراد یہاں اسکا ضعف ظاہر کرنا ہے اسلئے اس کی بعد اسکی علت بتادی ہے اور کہہ دیا ہے کہ اسنادہ لیس بحصل، یعنی اس کا ضعف خفیف ہے۔

حدیث حسن الاسناد اور حدیث حسن میں فرق:

محدثین حسن الاسناد اور حدیث حسن میں فرق کرتے ہیں۔ اور اول الذکر دوسرے کے مقابلے میں کم تر ہے اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ سند تو صحیح یا حسن درجہ کی ہوتی ہے۔ لیکن متن اس مرتبے کا نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی نہ کوئی علت یا شذوذ ہوتا ہے۔

یعنی حسن الاسناد کے ذریعے سے محدث سند کی شرائط کی ضمانت دیتا ہے لیکن متن کے شاذ یا معلول ہونے کے بارے میں خاموش رہتا ہے۔

2.2 الحسن لغیرہ:

الف..... وہ ضعیف حدیث جس کے راویوں میں اس قسم کا راوی موجود ہو۔

آئیہ مستور راوی جس کی اہلیت ثابت نہ ہو لیکن وہ فسق اور شدید غلطیوں کا مرتکب نہ ہوتا ہو اور نہ ہی عمداً جھوٹ بولنے کا مرتکب ہوتا ہو اور نہ ہی اس میں اور کوئی فسق و فجور کا کوئی سبب موجود ہو، یعنی ضعیف شدید نہ ہو۔ اور اس کے ساتھ یہ متن کسی اور روایت سے ایسے جیسا یا اس سے مشابہ پایا گیا ہو یا کسی متابع یا شاہد کے ذریعے سے تقویت پارہا ہو۔ اگر اس قسم کے اسباب کسی روایت کو مل جائیں تو وہ ضعیف سے حسن لغیرہ ہو جاتی ہے۔

..... اگر کوئی سبب نہ مل سکے تو وہ ضعیف باقی رہے گا۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص: ۱۷۵)

مندرجہ بالا تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ضعیف روایت دو شرطوں سے حسن لغیرہ کا درجہ پالیتی ہے۔

۱- روایت کے ضعف کا سبب اسکے راوی کا حفظ کی خرابی یا سند میں انقطاع یا اس کے رجال کی جہالت سے تعلق رکھتا ہے۔

۲- وہ مزید ایک یا اس سے زائد سندوں سے ثابت ہو اور یہ دوسری سند اس جیسی ہو یا اس سے قوی تر ہو۔

۲- حسن لغیرہ کا درجہ:

حسن لغیرہ کا مرتبہ حسن لذاتہ کے مقابلے میں کم ہے۔ اگر دو حدیثیں حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ کی جمع ہو جائیں تو حسن لذاتہ قابل ترجیح ہوگی۔

۳- مثال: سنن ابوداؤد کی حدیث جو کتاب الصلاۃ میں انہوں نے روایت کی ہے (۱۸/۲)۔ نمبر

حدیث ۱۳۲۸۔ (محض ایڈیشن) (حدیثنا محمد بن ہکار، حدیثنا عبداللہ بن المبارک عن عمران

بن زائده عن ابيه (زائدة بن نسيط الكوفي) عن أبي خالد الدالي عن أبي هريرة أنه قال: كانت قراءة النبي ﷺ بالليل يرفع طورا ويخفض طورا

مذکورہ بالا حدیث کے تمام راوی سوائے زائدہ بن نسیط کے، ثقہ راوی ہیں اور زائدہ کے بارے میں حافظ ابن حجر نے متابعت کی شرط کے ساتھ قبول کیا ہے ورنہ وہ لین الحدیث ہے (التقریب ص: ۲۱۳)

اس سند میں اس راوی کا کوئی متابع نہیں لہذا ضعف ہونے کی وجہ سے سند ضعیف قرار پائے گی۔ لیکن اس حدیث کا ایک شاہد موجود ہے اور وہ حضرت عائشہ کی حدیث ہے جو امام ترمذی نے روایت کی ہے۔ (کتاب الصلاة ۲/۲۱۱ - نمبر ۴۴۹)

(عن عبد الله بن ابي قيس، سألت عائشة: كيف كانت قراءة رسول الله ﷺ؟ فقالت: كل ذلك كان يفعل، ربما أسروا ربما جهر) یہ حدیث اپنی سند کے لحاظ سے صحیح ہے لہذا یہ اول الذکر کی تقویت کے لئے کافی ہے اور حدیث کو ضعیف سے ترقی دے کر حسن الغیرہ قرار پاسکتا ہے۔

③ ضعیف

.....تعریف:

حافظ ابن الصلاح نے ضعیف کی تعریف اس طرح کی ہے:

(کل حدیث لم یجتمع فيه صفات الحديث الصحيح ولا صفات الحديث الحسن فهو ضعیف) (مقدمہ ص: ۱۸۸) ”وہ حدیث جس میں نہ حدیث صحیح کی اور نہ حدیث حسن کی صفات پائی جائیں وہ ضعیف ہے“

ان منفی صفات کا دارود مدارد امر پر ہے۔

۱..... راوی حدیث پر ائمہ جرح و تعدیل کے اعتراضات۔

۲..... سند حدیث میں کسی قسم کے سقوط یا نقص کا پایا جانا۔

راوی حدیث پر اعتراض کے حوالے سے مندرجہ ذیل اقسام وجود میں آتی ہیں۔

موضوع، متروک، منکر، معلل، مخالفة الشقات، مدرج، مقلوب، المزید فی متصل الأسانید، مضطرب، مصحف اور شاذ وغیرہ۔

سند حدیث میں انقطاع یا سقوط کی وجہ سے مندرجہ ذیل اقسام وجود میں آتی ہیں۔ معلق، مرسل، معضل، منقطع، مدلس، مرسل خفی، معنعن، موقوف اور مقطوع وغیرہ۔

۲..... مثال: حسن لغیرہ کے بحث میں ضعیف حدیث کی مثال دی جا چکی ہے۔

۳..... ضعیف حدیث کا حکم:

محدثین اور فقہاء میں اہل تحقیق کے نزدیک ضعیف حدیث قابل عمل نہیں ہے، چاہے وہ فضائل اعمال میں ہو یا اصل اعمال کے بارے میں ہو۔

خود آزمائی

- ۱- صحیح حدیث کی کتنی قسمیں ہیں؟
- ۲ صحیح حدیث کی کیا شروط ہیں؟
- ۳- عدل راوی سے کیا مراد ہے؟
- ۴- ضبط کی کتنی قسمیں ہیں؟
- ۵- صحیح اور حسن میں کیا فرق ہے؟
- ۶- حسن کس طرح صحیح لغیرہ بن جاتی ہے؟
- ۷- ضعیف حدیث کی شرائط میں کیا کیا نقص پایا جاتا ہے؟
- ۸- ضعیف حدیث کس طرح حسن لغیرہ بن جاتی ہے۔



پونٹ نمبر 7

مصطلحات حدیث

تحریر: ڈاکٹر علی اصغر چشتی
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی



فہرست

209	یونٹ کا تعارف	
210	یونٹ کے اغراض و مقاصد	
211	سند	①
212	متن	②
214	زیادت ثقہ	③
214	3.1 اقسام	
216	3.2 اضافہ دوسری روایت کے منافی ہو	
216	3.3 الفاظ و کلمات کا اضافہ	
217	3.4 زیادت ثقہ کی قبولیت	
218	شاذ	④
219	4.1 شاذ کی اقسام	
219	(i) شاذ مقبول	
219	(ii) شاذ مردود	
220	متابعت	⑤
220	5.1 اقسام	
220	5.2 متابعت تامہ	
221	5.3 متابعت قاصرہ	

- 223 شابد ⑥
- 225 معطل ⑦
- 227 منقطع ⑧
- 229 خود آزمائی ⑨
- 230 مدلس ⑩
- 231 10.1 تدلیس کی اقسام
- 231 10.2 تدلیس الاسناد
- 233 10.3 تدلیس الشیوخ
- 235 (11) مرفوع
- 236 11.1 مرفوع کی اقسام
- 239 (12) موقوف
- 240 12.1 موقوف کی حجیت اور حیثیت
- 241 (13) مقطوع
- 242 13.1 مقطوع کی حیثیت
- 243 (14) خود آزمائی

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

اس وقت آپ جس یونٹ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس کا تعلق ”مصطلحات حدیث“ سے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر فن اور طبقہ کی اپنی ایک خاص اصطلاحی اور تکنیکی زبان ہوتی ہے۔ یہ زبان جہاں تحریر میں استعمال ہوتی وہاں تقریر میں بھی استعمال کی جاتی ہے..... جس طرح ہر فن اور ہر موضوع کے طالب علم کیلئے ضروری ہے کہ اس فن سے متعلق اصطلاحات (Terminology) کا اسے بخوبی علم ہو اسی طرح حدیث کے طلبہ کیلئے بھی لازمی ہے کہ اس علم کی مصطلحات اور اس (Terminology) کی تعبیر و تشریح ان کے ذہنوں میں محفوظ ہو۔ تاکہ جب وہ اس لٹریچر کا مطالعہ کریں تو اصطلاح سے عدم واقفیت کی بناء پر دقت کا شکار نہ ہوں..... اس یونٹ میں چند بنیادی مصطلحات کا ذکر کیا گیا ہے.....

ہر اصطلاح کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم بتایا گیا ہے۔ اور اس کی تشریح سے متعلق جو بھی اہم اور بنیادی نکتہ ہو سکتا ہے اسے مناسب جگہ دی گئی ہے۔ حدیث کا لٹریچر چونکہ بنیادی طور پر عربی میں ہے اس لئے اصطلاحات ساری کی ساری عربی ترکیب کے مطابق ہیں۔ یونٹ میں کوشش کی گئی ہے کہ ان اصطلاحات کو سلیس اور عام فہم انداز میں پیش کیا جائے۔

آپ اس یونٹ کے مواد کو بہت غور اور توجہ کے ساتھ پڑھیں اس لئے کہ دوران مطالعہ ان اصطلاحات سے آپ کو بار بار واسطہ پڑے گا..... ان اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں اور انہیں زبانی یاد کر لیں۔ ان اصطلاحات میں بعض اصطلاحات ایسی ہیں جن پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یونٹ میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہاں، جو بات اہم اور ضروری تھی وہ قلم بند کی گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس یونٹ کو موضوع کے حوالہ سے مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇐ سند کی لفظی اور اصطلاحی تعریف کر سکیں۔
- ⇐ متن کا مفہوم واضح کر سکیں۔
- ⇐ زیادت ثقہ کی تعریف کر سکیں اور اس کی حیثیت بتا سکیں۔
- ⇐ شاذ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم بیان کرتے ہوئے اس کے بارے میں مختلف علماء کی آراء پیش کر سکیں۔
- ⇐ متابعت کی تعریف کر سکیں اور اس کی اقسام پر بحث کر سکیں۔
- ⇐ شاہد کی اصطلاح واضح کر سکیں۔ اور اس ضمن میں علماء کی آراء کا احاطہ کر سکیں۔
- ⇐ معصل کی لفظی اور اصطلاحی تعریف کر سکیں اور اس کی حیثیت کے حوالہ سے گفتگو کر سکیں۔
- ⇐ منقطع، کے بارے میں جو اقوال رائج ہیں ان کا جائزہ لے سکیں۔

① سند

نفت میں سند سے مراد زمین پر ابھری ہوئی جگہ یا پہاڑ کی چوٹی لیا جاتا ہے۔ اس سے مراد پناہ گاہ اور سہارا بھی ہے۔ عربی محاورہ ہے ”فلان سند فلان“ ^(۱) ”فلان شخص فلاں کا سہارا ہے..... چونکہ راوی اپنی روایت کو آخری حد تک پہنچاتا ہے یا وہ ذریعہ جس سے خبر پہنچتی ہے قابل بھروسہ ہوتا ہے۔ اس لئے علماء حدیث (رواۃ کے سلسلہ) کو اصطلاح میں سند کہتے ہیں..... سند کی جمع اسناد ہے۔ علامہ طیبی کے مطابق ”الاسناد“ سے مراد روایت کو اسی کے آخری راوی تک پہنچانا ہے آپ کے نزدیک سند اور اسناد اعتماد کے لحاظ سے متقارب ہیں اور علماء حدیث دونوں کو ایک مقصد کیلئے استعمال کرتے ہیں..... اسناد کی حیثیت و اہمیت کے بارے میں عبد اللہ بن مبارک کا قول بنیادی حیثیت رکھتا ہے آپ کہتے ہیں ((الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال من شاء ماشاء)) ^(۲) اسناد ایک دینی معاملہ ہے اگر اسناد کا سلسلہ نہ ہوتا تو جس کے جی میں جو آتا کہہ دیتا.....

سفیان ثوری کہتے ہیں ((الاسناد سلاح المؤمن، اذالم یکن معہ سلاح فبای شی یقاتل)) ^(۳)

اسناد مومن کا ہتھیار ہے۔ ہتھیار نہ ہوں تو وہ میدان میں کیسے اترے گا۔

② متن

یہ لفظ لغوی اعتبار سے مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

مثلاً: (i) سخت اور بلند زمین۔ (ii) ٹالنا اور دو کرنا۔ (iii) غالب ہونا۔

علامہ طیبی کہتے ہیں: متن کے معنی قوی کے ہیں۔ اسی سے ”الحبل المتین“ (مضبوط رسی) مستعمل ہے۔۔۔۔۔ چونکہ متن سے مراد وہ بنیاد ہے جس سے کوئی چیز قوی ہوتی ہے، جیسے انسان اپنی پشت کے سہارے اٹھتا ہے اور قوت حاصل کرتا ہے، اس لئے متن وہ الفاظ و کلمات ہیں جن کے ذریعہ معانی و مقاصد نمایاں ہوتے ہیں۔

علامہ طیبی کہتے ہیں ((متن الحدیث الفاظ الیٰی یتقوم بها المعانی))^(۴) حدیث کا متن وہ الفاظ و کلمات ہیں جن سے معانی قائم ہوتے ہیں۔

ابن جماعة متن کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

((هو ما ينتهي إليه غاية السند من الكلام))^(۵) متن وہ ہے جس پر سند کی انتہا ہو۔ یعنی سلسلہ رواۃ ختم ہو جائے۔

علامہ طیبی نے متن کے احکام پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ متن حدیث کے بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں اس سے مراد رسول اللہ ﷺ سے منقول صحابی کا قول ہے یا صرف کلام رسول؟ پہلی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ سنت قول و فعل اور تقریر کا نام ہے اور علماء سلف نے اقوال صحابہ تابعین اور

ان کے آثار و فتاویٰ پر بھی ”حدیث“ کا اطلاق کیا ہے۔ (۶) سند اور متن کی وضاحت کے لئے اب ہم ایک مثال درج کرتے ہیں آپ اسے غور سے دیکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

مثال: ((حدثنا أبو الیمان ، قال أخبرنا شعیب ، قال حدثنا أبو الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة)) اَنَّ رسولَ ﷺ قال: ”والذی نفسی بیدہ لایؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والدہ وولده“ (۷)

اس حدیث میں ابو الیمان سے ابو ہریرہؓ تک کا حصہ اصطلاح میں سند کہلاتی ہے۔ اور اَنَّ رسول اللہ ﷺ سے آگے کا حصہ ”متن“ کہلاتا ہے۔

③ زیادت ثقہ

جب ایک ثقہ راوی اپنی طرف سے روایت میں اضافہ کرتا ہے تو اصطلاح میں اسے ”زیادت ثقہ“ کہتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر دمشقی اس ضمن میں کہتے ہیں ((اذا تفرد الراوی بزيادة فی الحدیث عن بقية الرواة عن شیخ لهم، وهذا الذی یعبر عنه بزيادة الثقة))^(۸)

یعنی جب راوی دیگر رواۃ کے مقابلہ میں اپنی روایت میں اضافہ کرتا ہے اور روایت ایک ہی شیخ سے ہو تو اس کے اس عمل کو اصطلاح میں ”زیادت ثقہ“ کہا جاتا ہے..... حافظ ابن الصلاح اس کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

(ذلک فن لطیف تستحسن العناية به، وقد کان ابو بکر بن زیاد النیسابوری، وأبو نعیم الجرجانی، وأبو الولید القرشی، الانمة مذکورین بمعرفة زیادات الألفاظ الفقهية فی الأحادیث)^(۹) ”یہ ایک باریک اور لطیف فن ہے جس کی طرف توجہ دینا بہت ہی مفید ہے ابو بکر بن زیاد نیشاپوری، ابو نعیم الجرجانی اور ابو الولید القرشی ایسے ائمہ ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں احادیث میں فقہی الفاظ کے اضافوں کی معرفت حاصل تھی۔

3.1 اقسام:

حافظ ابن الصلاح نے زیادت ثقہ کی تین اقسام بتائی ہیں۔

(الف) جملہ ثقہ راویوں کی روایت کے مخالف و منافی ہو۔ یہ مردود ہے۔

(ب) بالکل مخالف و منافی نہ ہو جیسے ایک ثقہ راوی پوری روایت میں متفرد ہو۔

(ج) متن میں ایک آدھ لفظ کا اضافہ ہو جبکہ دیگر تمام ثقہ رواۃ نے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔^(۱۰)

خطیب بغدادی نے (باب القول فی حکم خبر العدل اذا انفرد بروایة زیادة فیہ لم یرو غیرہ) کے عنوان سے ایک مستقل باب باندھا ہے اور اس میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ خطیب بغدادی اس بارے میں مختلف اقوال کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

(والذی نختاره من هذا الأقوال أن الزیادة الواردة مقبولة علی کل الوجوه ومعمول بها إذا كان راویها عدلاً، حافظاً، و متقناً، ضابطاً والدلیل علی صحة ذلك أمور: أحدها: اتفاق جمیع أهل العلم علی أنه لو انفرد الثقة بنقل حدیث لم ينقله غیره لوجب قبوله، ولم یکن ترک الرواة لنقله ان كانوا عرفوه وذهابه عن العلم به معارضاه ولا قاذحاً فی عدالة راویه ولا مبطلاله کذلک سبیل الانفراد بالزیادة^(۱۱))

ان اقوال میں سے جس قول کو ہم نے پسند کیا ہے وہ یہ ہے کہ وارد شدہ اضافہ ہر پہلو سے مقبول اور معمول بہا ہے۔ اگر راوی عادل، حافظ اور متقن و ضابط ہو..... اس کی صحت کی دلیل میں کئی امور ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس بات پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ اگر ثقہ راوی نقل حدیث میں منفرد ہو تو اسے قبول کرنا لازم ہوگا اگرچہ دیگر رواۃ نے اسے نقل نہ کیا ہو۔ دیگر رواۃ کا اسے نقل نہ کرنے کا اور اس سے لاعلم ہونے کی وجہ سے اس راوی کی عدالت و ثقاہت پر کوئی اثر نہیں پڑتا..... اضافہ میں منفرد ہونے کا یہی طریقہ ہے۔

حافظ ابن عبد البر اس بارے میں لکھتے ہیں۔

((انما تقبل إذا كان راویها أحفظ و اتقن ممن قصر أو مثله فی الحفظ كأنه حدیث

مستأنف، فإن كانت من غیر حافظ ولا متقن فلا التفات إليها))^(۱۲)

اضافہ والی روایت اس صورت میں قبول کی جائے گی جب اس کا راوی اس راوی سے زیادہ حافظ اور ثابت ہو جس کی روایت میں یہ اضافہ نہ ہو۔ گویا یہ ایک مستقل حدیث شمار ہوگی..... اگر راوی کے حفظ میں نقص ہو اور وہ قابل اعتماد نہ ہو تو ایسی صورت میں روایت قابل توجہ نہ ہوگی۔
امام ترمذی لکھتے ہیں۔

((وإنما يصح إذا كانت الزيادة ممن يعتمد على حفظه))^(۱۳) زیادت والی حدیث اس شکل میں قابل قبول ہوگی جب اس کا راوی حفظ و ضبط کے لحاظ سے قابل اعتماد ہو۔

3.2 اضافہ دوسری روایت کے منافی ہو

اگر راوی کی طرف سے اضافہ ایسا ہو جو دوسری روایت کے منافی اور مخالف ہو تو اس صورت میں دونوں روایتوں کا تقابل اور موازنہ کیا جائے گا۔ حافظ ابن حجر اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

((واما ان تكون منافية بحيث يلزم من قبولها رد رواية الأخرى، فهذه التي يقع الترجيح بينها وبين معارضها، فيقبل الراجح ويرد المرجوح)) (نزهة النظر: ص ۶۵)

”ہاں، اگر اضافہ والی روایت ایسی ہو کہ اس پر عمل کرنے سے دوسری روایت کو چھوڑنا لازم آئے تو اس صورت میں اس روایت کو اور اس کے مقابلہ میں آنے والی روایت کو ترجیح کے لحاظ سے دیکھنا ہوگا۔ جو روایت راجح ہوگی اسے اپنانا ہوگا اور جو مرجوح ہوگی اسے رد کرنا ہوگا“

3.3 الفاظ و کلمات کا اضافہ

اضافہ کی ایک صورت یہ ہے کہ راوی متن حدیث میں چند الفاظ یا کلمات کا اضافہ کر لیتا ہے جبکہ یہ اضافہ دوسری روایات میں نہیں پایا جاتا ہے..... حافظ ابن الصلاح اس ضمن میں لکھتے ہیں:

(الثالث ما يقع بين هاتين المرتبتين مثل زيادة لفظة في حديث لم يذكرها من روى ذلك الحديث) ^(۱۳) تیسری قسم وہ ہے جو ان دونوں کے بیچ میں ہے مثلاً راوی متن حدیث میں ایسے الفاظ بڑھا دے جو اس حدیث کے دوسرے راویوں نے ذکر نہ کئے ہوں۔

3.4 زیادت ثقہ کی قبولیت:

اس موضوع پر علوم الحدیث کے مصادر میں تفصیلی بحث پائی جاتی ہے حافظ سخاوی، حافظ سیوطی اور حافظ ابن حجر نے اس کی مختلف جہات اور پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے؟..... حافظ ابن حجر اس بارے میں لکھتے ہیں کہ راوی اگر ثقہ ہو تو اس کا اضافہ مطلقاً قابل قبول ہے۔ علماء کی ایک بڑی تعداد کا موقف یہی ہے۔

خطیب بغدادی کہتے ہیں (قال الجمهور من الفقهاء وأصحاب الحديث: زيادة الثقة مقبولة إذا انفرد بها) ^(۱۵) جمہور فقہاء اور محدثین کا موقف یہ ہے کہ زیادت ثقہ قابل قبول ہے..... حافظ ابن حجر نے امام ابن حبان اور امام حاکم کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ زیادت ثقہ کو مطلقاً قبول کرتے ہیں۔ ^(۱۶)

④ شاذ

”شاذ“ لغت میں جماعت سے الگ تھلک ہونے کو کہتے ہیں۔ ”شذ يشذ شذوذاً واذا انفرد.....“ (۱۷)

علمائے حدیث کی اصطلاح میں جب کوئی ثقہ راوی اپنے سے بہتر راوی کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے اس عمل کو شذوذ سے تعبیر کیا جاتا ہے..... حافظ ابن حجر عسقلانی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

(ان الشاذ ما رواه المقبول لمن هو أولى منه، وهذا هو المعتمد في تعريف الشاذ بحسب الإصطلاح) (۱۸) ”شاذ وہ حدیث ہے جس کو ایک ثقہ راوی نے اپنے سے بہتر راوی کی مخالفت کر کے روایت کیا ہو۔ اصطلاحاً شاذ کی یہی تعریف قابل اعتماد ہے“

حافظ ابن الصلاح نے یونس بن عبدالاعلیٰ کی سند سے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے۔ ((ليس الشاذ من الحديث أن يروى الثقة مالا يروى غيره، انما الشاذ أن يروى الثقة حديثاً يخالف ما روى الناس)) (۱۹) ”حدیث شاذ یہ نہیں کہ ثقہ راوی ایسی حدیث بیان کرے جو دیگر رواۃ حدیث نے روایت نہ کی ہو۔ بلکہ شاذ یہ ہے کہ ثقہ راوی وہ حدیث بیان کرے جو دیگر ثقہ رواۃ کی روایت کردہ حدیث کے مخالف ہو“

حافظ ابو یعلیٰ الخلیلی اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

(الذي عليه حفاظ الحديث، أن الشاذ ما ليس له إلا اسناد واحد يشذ بذلك شيخ ثقة)

كان أو غير ثقة، فما كان غير ثقة فمتروك لا يقبل، وما كان عن ثقة يتوقف فيه ولا يحتج به^(۲۰) علماء حدیث کے نزدیک شاذ وہ حدیث ہے جس کی صرف ایک سند ہو اور اس کا راوی اس کی روایت میں متفرد (اکیلا) ہو اس صورت میں راوی کو دیکھا جائے گا اگر راوی ثقہ و عادل نہ ہو تو روایت قابل رد ہوگی اور اگر راوی ثقہ ہو تو روایت میں توقف سے کام لیا جائے گا اور اسے فوراً قابل استدلال نہیں سمجھنا چاہئے۔

امام حاکم کہتے ہیں۔

(انّ الشاذ هو الحديث الذي يتفرد به ثقة من الثقات، وليس له أصل مما يتابع. لذلك الثقة)^(۲۱) ”شاذ وہ حدیث ہے جس میں ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ رواۃ سے متفرد ہوتا ہے اور اس ثقہ کے لئے اس حدیث کا کوئی متابع نہیں ہوتا“

4.1 شاذ کی اقسام

(i)..... شاذ مردود: حافظ ابن الصلاح نے شاذ کی اقسام بیان کرتے ہوئے کہا کہ منفرد راوی کو دیکھا جائے گا۔ اگر منفرد راوی نے اپنے سے بہتر اور ثقہ راوی کی مخالفت کی ہو جو حفظ و ضبط میں اس سے زیادہ معروف و مشہور ہو تو وہ شاذ مردود ہوگی۔

(ii)..... شاذ مقبول: اگر روایت میں مخالفت نہ ہو بلکہ ایک ایسا امر ہو جسے ایک راوی نے روایت کیا اور دوسرے راوی نے ترک کیا۔ تو اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ راوی کی حیثیت کیا ہے۔ اگر راوی عادل، حافظ اور ضابطہ ہو تو اس کی روایت قابل رد نہ ہوگی بلکہ شاذ مقبول کہلائے گی۔

⑤ متابعیت

متابعیت کو بالفاظ دیگر موافقت کہا جاتا ہے۔ متابعت سے مراد یہ ہے کہ ایک حدیث کا راوی دوسرے راوی سے اس طرح موافقت کرے کہ وہ اس راوی کے شیخ سے روایت کرے یا اس سے اوپر کے شیخ سے حافظ ابن حجر کہتے ہیں۔ ((وان شیخ الراوی اذا توبع أو شیخ شیخه، قد یطلق اسم المتابعة)) (۲۲)

5.1 اقسام:

متابعیت کی دو قسمیں ہیں: (۱) متابعت تامہ (۲) متابعت قاصرہ۔

5.2 متابعت تامہ:

حافظ ابن حجر اس کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں۔ (وان حصلت للراوی نفسہ فہی التامۃ) (۲۳) ”اگر یہ موافقت خود راوی کو حاصل ہو تو اس کو اصطلاح میں متابعت تامہ کہا جاتا ہے..... اس کی مثال امام شافعیؒ کی یہ روایت ہے جسے آپ نے کتاب الآم میں نقل کیا ہے“

(عن مالک، عن عبد اللہ بن دینار، عن ابن عمر، ان رسول اللہ ﷺ قال: الشہر تسع و عشرون، فلاتصوموا حتی تروہ، فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلاثین) (۲۴)

کچھ علماء کا خیال تھا کہ امام شافعیؒ، امام مالک سے بایں الفاظ روایت کرنے میں منفرد ہیں کیونکہ امام مالک کے دوسرے بشاردوں نے اس روایت کو ”فان غم علیکم فاقدروا لہ“ (۲۵) کے الفاظ سے نقل کیا ہے۔ لیکن تتبع نے معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کا متابع موجود ہے۔ اور وہ عبد اللہ بن مسلمہ القعقی ہیں۔ صحیح بخاری میں ان کی روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے۔

(عن عبد الله بن مسلمة، حدثنا مالك عن عبد الله بن دينار عن عبد الله بن عمر أن رسول الله ﷺ قال: الشهر تسع و عشرون ليلة فلا تصوموا حتى تروه ، فان غم عليكم فأكملوا العدة ثلاثين) (۲۶)

یہ متابعت تامہ ہے حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ امام بیہقی نے امام شافعیؒ کے نفرد کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ صحیح بخاری کی مذکورہ روایت موجود ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں۔

(والعجب من البيهقي كيف خفيت عليه) (۲۷) امام بیہقی پر تعجب ہے کہ آپ سے یہ روایت کس طرح اوجھل رہی۔

5.3 متابعت قاصره:

حافظ ابن حجر اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ((وان حصلت لشيخه فمن فوقه فهي القاصرة)) اگر راوی کے شیخ یا اوپر کے کسی راوی کیلئے متابعت ثابت ہو جائے تو اصطلاح میں متابعت قاصرہ کہلائے گی۔ (نزہۃ النظر: ص ۷۰)

حافظ ابن حجر نے متابعت قاصرہ کے ضمن میں بھی امام شافعیؒ کی روایت کو پیش کیا ہے..... امام شافعیؒ کے شیخ امام عبد اللہ بن دینار کا متابع موجود ہے..... امام ابن خزیمہ نے روایت نقل کی ہے:

(عاصم بن محمد بن زيد، عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: فان غم عليكم فأكملوا ثلاثين) (۲۸)

امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ روایت یوں نقل کی ہے:

((أبو اسامة ، عن عبد الله بن عمر، عن نافع عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: فان غم عليكم فأكملوا ثلاثين)) (۲۹)

یہ متابعت ہے لیکن ناقصہ ہے۔ متابعت کے لئے موافقت لفظی ضروری نہیں۔ موافقت بالمعنی کافی ہے۔ البتہ متابعت کے لئے دونوں روایتوں کا ایک صحابی سے ہونا ضروری ہے جیسا کہ اس روایت میں ہے۔ اصل اور متابع دونوں عبد اللہ بن عمرؓ سے ہیں۔

⑥ شاہد

جب دو روایتیں ایسی ہوں کہ ان میں معنی یا لفظ باہمی مشابہت پائی جائے تو اس صورت میں اصطلاحاً وہ ایک دوسرے کی شاہد کہلاتی ہیں..... حافظ ابن حجر شاہد کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(وان وجد متن یروی من حدیث صحابی آخر یشبہہ فی اللفظ والمعنی أو فی المعنی فقط فهو الشاهد) (۳۰)

علامہ بدر ابن جماعہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

(والشاهد أن یروی حدیث بمعنی حدیث لا بلفظہ فیکون شاہد الہ) (۳۱) شاہد یہ ہے کہ ایک حدیث دوسری حدیث کے الفاظ کے بجائے معنی کے مطابق روایت کی گئی ہو۔ اس صورت میں ایک حدیث دوسری حدیث کے لئے شاہد ہوگی۔ مثلاً (اخبرونا محمد بن عبد اللہ بن یزید، قال: حدثنا سفیان، عن عمر و بن دینار، عن محمد بن حنین، عن ابن عباس، قال: عجبت ممن یتقدم الشهر وقد قال رسول اللہ ﷺ إذا رأیتم الهلال فصوموا، وإذا رأیتموہ فافطروا فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلاثین) (۳۲)

اس حدیث کے راوی ابن عباسؓ ہیں۔ لیکن الفاظ وہی ہیں جو امام شافعیؒ کی اخذ کردہ روایت میں ہیں اور جس کے راوی ابن عمرؓ ہیں اس طرح ابن عمرؓ کی روایت کیلئے ابن عباسؓ کی یہ روایت شاہد کہلائے گی۔

اس سلسلے کی دوسری روایت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں نقل کی ہے:

(حدثنا آدم، حدثنا شعبة، حدثنا محمد بن زياد، قال: سمعت أبا هريرة يقول: قال النبي أو قال: قال أبو القاسم: صوموا لرويته وافطروا لرويته، فإن غبي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين)^(۳۳) یہ روایت سیدنا ابو ہریرہؓ سے مروی ہے اس لئے امام شافعیؒ کی روایت کردہ ابن عمرؓ کی روایت کے لئے شاہد ہے اور چونکہ لفظی موافقت نہیں ہے اس لئے معنی کے لحاظ سے اس کی تائید کرتی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت نے متابعت کو موافقت لفظی کے ساتھ مختص کیا ہے۔ ان کے نزدیک دارودار حدیث کے متن پر ہے۔ مروی عنہ (صحابی) پر نہیں ہے..... جبکہ شاہد سے معنوی موافقت ہے..... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ متابع کا اطلاق شاہد پر ہو اور شاہد کا اطلاق متابع پر ہو..... حافظ ابن حجر کہتے ہیں (الامر فیہ سہل)^(۳۴) یعنی اس میں حرج والی کوئی بات نہیں..... مقصود تائید اور تقویت کا حصول ہے اس لئے نام کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

⑦ معضل

معضل، عضل سے ہے جس کے معنی پیچیدہ اور مغلق کے ہیں۔ لسان العرب میں ہے۔ (عضل ہی الامر، واعضل ہی، واعضلی اشتد و غلظ واستغلق) ^(۳۵) یعنی معاملہ میرے لئے پیچیدہ ہو گیا اور مجھے اس نے بے بس کر دیا۔ علمائے حدیث کی اصطلاح میں معضل سے مراد وہ روایت ہے جس کی سند سے مسلسل دو یا دو سے زیادہ راوی ساقط ہوں..... حافظ ابن حجر اس ضمن میں لکھتے ہیں۔ (وان كان الشيخين فصاعدا مع التوالی فهو المعضل) ^(۳۶) اگر دو یا دو سے زیادہ راوی یکے بعد دیگرے سند سے ساقط ہوں تو روایت معضل کہلائے گی۔

حافظ ابن الصلاح، امام نووی اور بدر بن جماعة نے ”معضل“ کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کی ہے۔ (هو عبارة عما سقط من اسناده اثنان فصاعداً) ^(۳۷) معضل سے مراد وہ خبر ہے جس کی سند میں دو یا دو سے زیادہ راوی ساقط ہوں۔

معضل، کو معضل اس لئے کہا جاتا ہے کہ سند میں جب دو یا دو سے زیادہ راوی بیک وقت محذوف ہوں تو ایسے خلاء اور انقطاع کا ازالہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

امام حاکم نیشاپوری معضل کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(قد ذكر امام الحديث على بن المديني فمن بعده من ائمتنا أن المعضل

من الروايات أن يكون بين المرسل إلى رسول الله ﷺ أكثر من رجل،

وأنه غير المرسل، فإن المراسيل للتابعين دون غيرهم) ^(۳۸)

”امام علی بن المدینی اور آپ کے علاوہ دیگر ائمہ محدثین کا کہنا ہے کہ معضل وہ روایت ہے جس کی سند میں رسول اللہ ﷺ سے ارسال کرنے والے اور آپ ﷺ کے درمیان ایک سے زیادہ راوی محذوف ہوں۔ نوعیت کے لحاظ سے یہ خبر مرسل نہیں کہلاتی۔ اس لئے کہ مراسیل کا تعلق صرف طبقہ تابعین سے ہے۔“

معضل روایات آپ کو ذخیرہ حدیث میں اچھی خاصی تعداد میں ملیں گی۔ یہاں بطور مثال ہم ایک روایت نقل کرتے ہیں:

(مالک عن معاذ بن جبل قال: آخر ما أو صانی به رسول الله ﷺ حين وضعت رجلی فی الغرز أن قال: أحسن خلقک للناس یا معاذ!) (۳۹)

مذکورہ بالا روایت میں امام مالک، معاذ بن جبلؓ سے براہ راست روایت کر رہے ہیں۔ حالانکہ امام مالک اور معاذ بن جبل کے درمیان کم از کم دو واسطوں کا فاصلہ ہے۔ اس لئے یہ روایت معضل ہے۔

⑧ منقطع

لفظی مفہوم:

منقطع، قطع سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کر دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ (قطعت الحبل قطعاً فانقطع) ^(۴۰) اسی طرح جب کسی کام میں رکاوٹ پڑ جائے اور انسان کسی کام کے کرنے سے بے بس ہو جائے تو اس کیفیت کیلئے ”انقطاع“ کا کلمہ استعمال ہوتا ہے.....

”لسان العرب“ میں ہے:

(وانقطع به، فهو منقطع به اذا عجز عن سفره من نفقة ذهب، أو قامت عليه راحلته، أو اتاه أمر لا يقدر ان يتحرك معه) ^(۴۱)

”وہ شخص منقطع کہلاتا ہے جو زارِ راہ ختم ہونے کی وجہ سے، یا سواری کے رک جانے کی وجہ سے یا کسی کٹھن معاملہ کی وجہ سے سفر کرنے سے عاجز ہو جائے“

اصطلاحی مفہوم:

علمائے حدیث کی اصطلاح میں ”انقطاع“ سے مراد سلسلہ سند میں کسی راوی کا سقوط ہے۔ اگرچہ سقوط کی مختلف شکلیں ہیں اور اس کی شکل و صورت پر ہی روایت کی حیثیت متعین ہوتی ہے..... منقطع کی تعریف میں علماء حدیث کے اقوال مختلف ملتے ہیں۔ متقدمین کے نزدیک اس اصطلاح میں توسع اور گنجائش ہے جبکہ متاخرین نے اسے محدود کر دیا ہے۔ متقدمین کے ہاں ”انقطاع“ عدم اتصال کا نام ہے۔ اسی لئے حافظ ابن عبد البر نے منقطع کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

(المنقطع كل مالا يتصل سواء كان يعزى إلى النبي أو إلى غيره) ^(۴۲)

”منقطع ہر وہ روایت ہے جو غیر متصل ہو خواہ اس کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچے یا کسی اور تک“

اس لحاظ سے منقطع ایک عام قسم ہے جو مرسل معلق اور مدلس وغیرہ سب کو شامل ہے“
امام نووی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

(الصحيح الذي ذهب اليه طوائف من الفقهاء وغيرهم، والخطيب، وابن عبد البر وغيرهما من المحدثين، ان المنقطع: ما لم يتصل اسناده على اى وجه كان الإنقطاع) (۳۳)

”صحیح مذہب وہی ہے جسے فقہاء نے اختیار کیا ہے۔ خطیب بغدادی، حافظ ابن عبد البر اور دیگر محدثین کی رائے بھی یہی ہے کہ منقطع وہ خبر ہے جس کی سند میں اتصال نہ ہو خواہ انقطاع کی کوئی بھی صورت ہو“

خطیب بغدادی نے اس ضمن میں ایک اور قول بھی نقل کیا ہے آپ لکھتے ہیں:

(وقال بعض أهل العلم: الحديث المنقطع ما روى عن التابعي و من دونه موقوفا عليه من قوله و فعله) (۳۴) ”بعض علماء نے منقطع کی تعریف میں کہا ہے کہ منقطع وہ حدیث ہے جو تابعی یا اس سے نیچے کے راوی سے موقوفاً مروی ہو۔“

متاخرین علماء کے نزدیک یہ ایک خاص قسم ہے۔ ان کے نزدیک منقطع وہ حدیث ہے جس کے رواۃ میں ایک راوی طبقہ صحابہ کے بعد ایک یا متعدد مقامات سے ساقط ہو لیکن کہیں بھی سقوط ایک راوی سے زیادہ کا نہ ہو اور سقوط ابتداء سند میں نہ ہو۔ حافظ ابن حجر اس بارے میں کہتے ہیں:

(فان كان الساقط باثنين غير متواليين في موضعين مثلاً فهو المنقطع، وكذلك إن سقط واحد فقط، أو أكثر لكن بشرط عدم التوالي) (۳۵) ”اگر سقوط دو جگہ سے ہوتا ہو لیکن یکجا نہ

ہو تو ایسی روایت منقطع کہلائے گی۔ اسی طرح اگر ایک راوی محذوف ہو یا دو سے زیادہ محذوف ہوں لیکن حذف میں تسلسل نہ ہو تو بھی روایت منقطع شمار ہوگی۔“

خود آزمائی ①

- ۱- سند کا لفظی اور اصطلاحی مفہوم بیان کیجئے۔
- ۲- متن حدیث سے کیا مراد ہے مثال دے کر وضاحت کیجئے۔
- ۳- زیادت ثقہ کی اصطلاح کس ضمن میں استعمال ہوتی ہے۔ اس کی حیثیت پر بحث کیجئے۔
- ۴- شاذ کی اقسام بتائیے۔ اور ہر ایک قسم کی تعریف کیجئے۔
- ۵- متابعت تامہ اور متابعت قاصرہ میں کیا فرق ہے واضح کیجئے۔
- ۶- شاہد کا لفظی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے بتا دیجئے۔
- ۷- ”معصل“ کی تعریف کیجئے اور مختلف علماء کے اقوال پیش کیجئے۔
- ۸- منقطع کی تعریف کرہتے ہوئے اس کی حیثیت کی نشاندہی کیجئے۔

⑩ مدلس

لفظی مفہوم:

مدلس، دلس سے مشتق ہے جس کے معنی تاریکی اور روشنی کو خلط ملط کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ غلط کو صحیح کے ساتھ ملایا جائے اور اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی جائے..... بقاعی کہتے ہیں کہ اسی سے تدلیس فی البیع کی اصطلاح بھی رائج ہے۔ کہا جاتا ہے۔

(دلس فلان علی فلان ای ستر عنه عیب الذی فی متاعه کأنه أظلم علیہ الامر) (۴۶) ”ایک شخص نے دوسرے سے تدلیس کی یعنی اس نے اپنے سامان کے نقص کو دوسرے شخص سے چھپائے رکھا۔ گویا اس نے اس دوسرے شخص کو اندھیرے میں رکھا“

اصطلاحی مفہوم:

علماء حدیث کی اصطلاح میں تدلیس یہ ہے کہ سند کے سقوط کو چھپایا جائے یا کسی راوی کو اس کے غیر معروف وصف سے موسوم کیا جائے تاکہ اس کی حیثیت مخفی رہے۔ حافظ ابن حجر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

(سمى بذلك لا شتر اکهما فی الخفاء ويرد المدلس بصیغة من صیغة الاداء، تحتمل وقوع اللقاء بین المدلس ومن أسند عنه، کمن وکذا وقال، ومتی وقع بصیغة صریحة لا تجوز فیها کان کذباً) (۴۷) ”مدلس کو مدلس کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ لفظی اور اصطلاحی دونوں لحاظ سے اس کے مفہوم میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ مدلس جب روایت کرتا ہے تو ایسا صیغہ استعمال کرتا ہے جس سے مدلس اور مروی عنہ کی ملاقات کا احتمال نمایاں ہوتا ہے مثلاً ”عن“ کذا اور قال کے صیغے

استعمال کرتا ہے جن میں ابہام پایا جاتا ہے..... وہ ایسے صیغے استعمال نہیں کرتا جن میں ملاقات کی صراحت اور وضاحت کا اندازہ ہو سکے۔ اس لئے کہ اس صورت میں تدلیس نہیں رہے گی بلکہ ”کذب“ واقع ہوگا جس سے وہ بچنا چاہتا ہے.....

10.1 تدلیس کی اقسام

امام حاکم نے تدلیس کی چھ اقسام بتائی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

- (i) راوی ثقات سے تدلیس کرے۔
- (ii) استفسار پر مدلس کا نام بتائے۔
- (iii) غیر معروف رواۃ سے تدلیس کرے۔
- (iv) ضعیف رواۃ سے تدلیس کرے۔
- (v) ان رواۃ سے معمولی تدلیس کرے جن سے اس نے بکثرت استفادہ کیا ہو
- (vi) ایسے مجموعہ سے روایت کرے جو اس کے پاس نہیں تھا۔^(۴۸)

خطیب بغدادی نے تدلیس کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے۔^(۴۹) حافظ ابن الصلاح نے بھی دو اقسام بیان

کی ہیں۔^(۵۰) بنیادی طور پر تدلیس کی دو ہی اقسام ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تدلیس الأسناد۔ (۲) تدلیس الشیوخ۔

10.2 تدلیس الأسناد کی حیثیت

تدلیس الأسناد انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔ جمہور علماء نے اس کی مذمت کی ہے۔ حافظ ابو بکر خطیب

بغدادی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

(التدلیس للحديث مکروه عند اکثر اهل العلم، وقد عظم بعضهم الشان فی ذمه، و

تسبح بعضهم بالبواءة منه) (۵۱) یعنی جمہور علماء کے نزدیک حدیث میں تدلیس ناپسندیدہ ہے۔ بعض علماء نے تو اس کی بہت زیادہ مذمت کی ہے اور بعض نے اس سے برأت و پیزاری کا اعلان کیا ہے۔
امام شافعیؒ نے اس ضمن میں امام شعبہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ ((التدلیس اخو الکذب)) (۵۲)
”تدلیس اور جھوٹ دونوں ایک جیسے ہیں۔“

سلیمان بن داؤد کا قول ہے:

(التدلیس والغش والغرور والخداع والکذب يحشر يوم تبلى السرائر في نفاذ واحد) (۵۳) ”تدلیس، بددیانتی، دھوکہ، فریب اور جھوٹ، یہ سب اس دن ایک ہی جگہ میں اٹھائے جائیں گے جب تمام چھپے حقائق سامنے آئیں گے۔“

محمد بن جعفر غندر نے امام شعبہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

(لان اسقط من السماء أحب الي من ان ادلس) (۵۴) ”تدلیس کرنے کے بجائے آسمان سے گرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔“

جہاں تک تدلیس الأسناد کے مرتکب راوی کا تعلق ہے تو اس بارے میں علماء کے مختلف موقف ہیں۔ بعض علماء نے سختی سے کام لیتے ہوئے مدلس فی الاسناد کو مجروح قرار دیا ہے اور اس کی روایت کو مردود قرار دیا ہے..... بعض علماء نے تساہل سے کام لیتے ہوئے اس کی روایت کو مقبول قرار دیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے قاضی عبدالوہاب کا قول نقل کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

(التدلیس جرح، وإن ثبت انه كان يدلس لا يقبل حديثه مطلقا قال: وهو الظاهر من اصول مالک) (۵۵) ”تدلیس عدم اعتماد ہے اور جس راوی کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ وہ تدلیس کا

مرتب ہے تو اس کی حدیث مطلقاً ناقابل قبول ہوگی۔ آپ نے کہا۔ امام مالک کے اصول سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔“

حافظ ابن الصلاح، امام شافعیؒ کی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(والحكم بأنه لا يقبل من المدلس حتى يبين ، قد اجراه الشافعي فيمن عرفناه دلس مرة) (۵۶) یہ اصول کہ مدلس جب تک مروی عنہ کی وضاحت نہ کرے اس کی روایت قابل قبول نہ ہوگی اس کا اطلاق امام شافعیؒ نے اس راوی پر بھی کیا ہے جس نے ایک بار بھی تدلیس کی ہو..... جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے امام شافعیؒ کا اصول یہی ہے۔

10.3 تدلیس الشیوخ

حافظ ابن الصلاح نے تدلیس الشیوخ کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کی ہے:

(تدليس الشيوخ وهو أن يروي عن شيخ حديثاً سمعه، منه، فيسميه أو يكتمه، أو ينسبه، أو يصفه بما لا يعرف به كي لا يعرف) (۵۷) ”تدلیس الشیوخ سے مراد یہ ہے کہ راوی نے جس شیخ سے حدیث سنی ہے اسے روایت کرے لیکن روایت کرتے وقت شیخ کا مشہور و معروف نام نہ لے۔ بلکہ کنیت، نسبت یا ایسے وصف کا ذکر کرے جس سے وہ شیخ معروف نہ ہو..... راوی ایسا اس لئے کرے تاکہ اس کے شیخ کی حیثیت پوشیدہ رہے“

حافظ ابن کثیر نے تدلیس الشیوخ کی تعریف زیادہ واضح انداز میں کی ہے۔ آپ کہتے ہیں:

(أما القسم الثاني من التدليس : فهو إتيان باسم الشيخ أو كنيته على خلاف المشهور به، تعمية لأمره و توعيدا للوقوف على حاله) (۵۸) ”تدلیس کی دوسری قسم یہ ہے کہ شیخ کا ایسا نام یا کنیت لائی جائے جو اس کی مشہور کنیت کے برعکس غیر مشہور ہو تاکہ اس کی حیثیت پردہ اخفا میں رہے اور اس

کے حالات سے دیگر رواۃ واقف نہ ہو سکیں۔“

تدلیس الشیوخ کے بارے میں حافظ سخاوی، خطیب بغدادی کا قول ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وذلك خلاف موجب العدالة و مقتضى الديانة من التواضع فى طلب العلم و ترك الحمية فى الاخبار بأخذ العلم عن اخذه) (۵۹) ”جس شیخ سے استفادہ کیا اس کا ذکر نہ کرنا حمیت اور عدالت و دیانت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ نیز طلب علم کے لئے مطلوبہ مزاج کے بھی منافی ہے۔“

حافظ ابن الصلاح نے اس ضمن میں جو تجزیہ کیا ہے وہ بہت عمدہ اور واضح ہے۔ یہاں ہم اس کا مفہوم نقل کرتے ہیں آپ لکھتے ہیں:

تدلیس الشیوخ کی کراہت کا تعین اس کا ارتکاب کرنے والے کے اہداف و مقاصد کے مطابق ہوگا۔ کبھی شیخ کا غیر ثقہ ہونا راوی کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس کا نام تبدیل کر دے۔..... کبھی مروی عنہ کا راوی سے کم سن ہونا اس کا سبب ہوتا ہے اور کبھی یہ وجہ بھی ہوتی ہے کہ راوی، مروی عنہ سے بہت زیادہ روایات بیان کرتا ہے اس لئے اسے یہ بات پسند نہیں آتی کہ ایک ہی شیخ کا ذکر ایک ہی باب میں کئی بار ہوتا رہے۔

علماء کی ایک جماعت نے اس امر کی اجازت دی ہے۔ خطیب بغدادی کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے۔ خطیب نے اپنی تصانیف میں بکثرت تدلیس الشیوخ کا استعمال کیا ہے۔ (۶۰)

⑪ مرفوع

لفظی مفہوم:

مرفوع، رفع سے ہے جس کے معنی اٹھانا اور آگے بڑھانا ہے..... لسان العرب میں ہے: ((الرفع ضد الوضع))^(۲۱) یعنی رفع، وضع کی ضد ہے۔ رفع کے معنی اٹھانے کے ہیں اور وضع کے معنی رکھنے کے ہیں۔

اصطلاحی مفہوم:

علماء حدیث نے مروی عنہ کے اعتبار سے خبر کی جو تقسیم کی ہے اس میں اگر سلسلہ اسناد رسول کریم ﷺ تک پہنچے تو اس روایت کو مرفوع کہا جاتا ہے..... اس بارے میں خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

(المرفوع: ما أخبر فيه الصحابي عن قول رسول الله أو فعله)^(۲۲) ”مرفوع وہ روایت ہے جس میں ایک صحابی رسول ﷺ کے قول یا فعل کے بارے میں خبر دے“

حافظ ابن الصلاح کہتے ہیں:

(وهو ما أضيف إلى رسول الله خاصة، ولا يقع مطلقة على غير ذلك. ويدخل في المرفوع المتصل، والمنقطع والمرسل ونحوها)^(۲۳) ”مرفوع سے مراد وہ حدیث ہے جو خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی جائے اور اس کے علاوہ کسی اور پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس میں منقطع، مرسل اور اسی طرح کی تمام روایات داخل ہیں۔“

علامہ طبری مرفوع کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(هو ما اُضيف الى النبي خاصة من قول، أو فعل، أو تقرير، سواء كان متصلاً أو منقطعاً. هذا هو المشهور، فقد ظهر من هذا الفرق بين المسند والمتصل والمرفوع) (۶۳)

”مرفوع وہ حدیث ہے جسے خاص طور پر نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کیا جائے۔ یہ آپ ﷺ کا قول ہو، فعل ہو یا تقریر ہو اور یہ مسند ہو متصل ہو یا منقطع ہو۔ یہی وہ تعریف ہے جو علماء کے ہاں مشہور ہے اور اس سے مسند، متصل اور مرفوع میں فرق ظاہر ہو گیا۔“

حافظ ابن حجر مرفوع کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وهو إِمَّا أن ينتهي إلى النبي و يقتضي لفظه أما تصريحاً أو حكماً. أن المنقول بذلك الإسناد من قوله أو من فعله أو من تقريره) (۶۵)

”مرفوع سے مراد وہ حدیث ہے جو رسول اللہ ﷺ پر منتہی ہوتی ہے اور اس کے الفاظ تصریحاً یا حکماً یہ تقاضا کرتے ہیں کہ اس اسناد سے جو کچھ منقول ہے وہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے، فعل ہے یا تقریر ہے۔“

11.1 مرفوع کی اقسام:

اس اعتبار سے حدیث مرفوع کی چھ اقسام بنتی ہیں۔ (۶۶)

- (i) مرفوع قولی تصریحی
- (ii) مرفوع فعلی تصریحی
- (iii) مرفوع تقریری تصریحی
- (iv) مرفوع قولی حکمی
- (v) مرفوع فعلی حکمی
- (vi) مرفوع تقریری حکمی

1- مرفوع قولی تصریحی:

مرفوع قول تصریحی سے مراد وہ حدیث ہے جس میں صحابی یا راوی یہ تصریح کرے کہ یہ قول رسول اللہ ﷺ کا ہے مثلاً صحابی کہے۔ ”سمعت رسول اللہ ﷺ يقول كذا“ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یوں کہتے ہوئے سنا..... ”حدثنا رسول اللہ ﷺ بكذا“ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان کیا۔ ”قال رسول الله ﷺ كذا“..... رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا۔ ”عن رسول الله انه قال كذا“

۲- مرفوع فعلی تصریحی:

اس سے مراد وہ روایت ہے جس میں صحابی، رسول اللہ ﷺ کے کسی فعل کا صراحت کے ساتھ ذکر کرے۔ مثلاً صحابی کہے۔ ”رايت رسول الله ﷺ فعل كذا“..... میں نے آپ ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا..... یادہ کہے۔ ”كان رسول الله ﷺ يفعل كذا“ رسول اللہ ﷺ ایسا کیا کرتے تھے۔

۳- مرفوع تقریری تصریحی:

اس سے مراد وہ روایت ہے جس میں راوی اس بات کی صراحت کرے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے کوئی کام کیا اور آپ ﷺ نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

۴- مرفوع قولی حکمی:

مرفوع قولی حکمی یہ ہے کہ کوئی صحابی کسی ایسے واقعہ کی خبر دے اور کوئی ایسی بات کہے جس میں نہ اس صحابی کے اجتہاد کو دخل ہو نہ اس بات کا تعلق مشکل اور غریب کلمات کی تشریح و تعبیر سے ہو۔ جیسے بدء خلق اور انبیاء کے حالات یا علامات، قیامت اور فتن وغیرہ۔

۵۔ مرفوع فعلی حکمی:

اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی صحابی ایسا کام کرے جس میں اس کے اجتہاد کا کوئی دخل نہ ہو تو اس سے حکمانہ ظاہر ہوگا کہ یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے فعل پر مبنی ہوگا۔ جیسے امام شافعی نے حضرت علیؓ کی صلاۃ کسوف کے بارے میں لکھا ہے کہ آپؐ اس کی ہر رکعت میں دو سے زائد رکوع فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ اس میں اجتہاد کا دخل نہیں اس لئے حضرت علیؓ کا فعل حکما مرفوع متصور ہوگا۔

۶۔ مرفوع تقریری حکمی:

اگر صحابی یہ خبر دے کہ لوگ آپ ﷺ کے زمانے میں ایسا کہتے تھے یا ایسا کرتے تھے تو یہ خبر تقریری حکمی ہوگی کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دور رسالت میں لوگ اگر کوئی کام کرتے تھے تو آپ ﷺ کو اس کی اطلاع تو ہوگی اور اگر یہ غیر شرعی فعل ہوتا تو آپ ﷺ کو بذریعہ وحی اطلاع ہو جاتی کیونکہ وحی کا سلسلہ تو آپ ﷺ کی زندگی میں آخر تک جاری رہا۔

⑫ موقوف

لفظی مفہوم:

وقوف، وقف سے ہے جس کے معنی ٹھہرنا یا چپ چاپ کھڑے ہونا ہے۔ ”لسان العرب“ میں ہے۔ ”الوقوف خلاف الجلوس“ (۶۷) وقوف بیٹھنے کی ضد ہے۔

اصطلاحی مفہوم:

علماء حدیث کی اصطلاح میں جب اسناد کا سلسلہ صحابی پر آ کر رک جائے تو ایسی روایت کو موقوف کہا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر موقوف کی تعریف کے ضمن میں لکھتے ہیں:

(اوینتهی غاية الاسناد إلى الصحابی كذلك ، أى مثل ما تقدم فى كون اللفظ يقتضى التصريح بأن المنقول هو من قول الصحابی أو من فعله أو من تقريره، ولايجب فيه جميع ما تقدم بل معظمه، والتشبيه لا تشترط فيه المساواة من كل جهة) (۶۸) ”موقوف یہ ہے کہ سلسلہ اسناد اسی طرح صحابی پر ختم ہو جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے کہ الفاظ میں اس بات کی وضاحت موجود ہو کہ منقول روایت کا تعلق صحابی کے قول، فعل یا تقریر سے ہے..... اس میں تمام سابقہ شرائط تو نہیں آئیں گی لیکن گزشتہ بحث کا زیادہ تر حصہ شامل ہوگا۔ تشبیہ کیلئے ضروری نہیں کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں ہر پہلو سے مشابہت پائی جائے۔“

حافظ ابن الصلاح کی تعریف اس بارے میں زیادہ واضح اور عمدہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

(وہو ما یروی عن الصحابة من اقوالہم و افعالہم ونحوہا فیوقف علیہم ولا یتجاوز بہ
 الی رسول اللہ، ثم ان منه ما یتصل الاسناد فیہ الی الصحابی فیکون من الموقوف الموصول
 و منه مالا یتصل اسنادہ فیکون من الموقوف غیر الموصول علی حسب ما عرف مثله فی
 المرفوع الی رسول اللہ) (۶۹) ”موقوف روایت وہ ہے جو صحابہ سے ان کے اقوال و افعال کی صورت
 میں مروی ہو۔ انہی پر موقوف ہو اور رسول اللہ ﷺ تک نہ پہنچے۔ پھر ان میں سے جس کی سند صحابی تک متصل
 ہو تو وہ موقوف کہلائے گی اور جس کی سند غیر متصل ہو تو وہ موقوف غیر موصول ہوگی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ
 تک پہنچنے والی مرفوع روایت کے سلسلہ میں معلوم ہو چکا۔“

12.1 موقوف روایت کی حیثیت

موقوف روایت کی حیثیت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ احناف میں سے ابو بکر رزائی، فخر
 الاسلام بزدوی، شمس الانمہ سرخسی علاوہ ازیں امام مالک، امام احمد ایک روایت کے مطابق یہ موقوف رکھتے
 ہیں کہ موقوف روایت سے احکام شرعیہ ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ کی مجموعی کیفیت یہ تھی کہ ان کا ہر عمل
 سنت کے مطابق تھا۔ بعض حنفیہ و شافعیہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ موقوف روایت حجت نہیں کیونکہ اس امر کا
 احتمال موجود ہے کہ یہ صحابی کا اجتہاد ہو یا اس نے رسول اللہ ﷺ کی بجائے کسی اور سے سنا ہو۔ علامہ آمدی
 نے موقوف روایت کے لئے استعمال ہونے والے مختلف الفاظ و کلمات پر الگ الگ بحث کی ہے۔ جس میں
 حیثیت کے قائلین اور مخالفین کے دلائل کا تجزیہ موجود ہے..... آپ اگر اس موضوع کو تفصیل سے دیکھنا چاہیں
 تو ”الاحکام فی اصول الاحکام“ سے متعلقہ بحث کو پڑھ لیجئے۔

⑬ مقطوع

لفظی مفہوم:

مقطوع، قطع سے ہے جس کے معنی کاٹنا یا جدا کرنا ہے..... ”لسان العرب“ میں ہے۔ القطع: إبانة بعض اجزاء الجرم من بعض فصلاً“ (۷۰) قطع کے معنی جسم کے بعض اجزاء کو دوسرے اجزاء سے الگ کرنے کے ہیں۔

اصطلاحی مفہوم:

مقطوع سے مراد وہ حدیث ہے جس کا سلسلہ سند کہیں سے کٹ جاتا ہے۔ امام نووی اس بارے میں لکھتے ہیں: ((المقطوع وجمعه المقاطيع، وهو الموقوف على التابعي قولاً له أو فعلاً)) (۷۱)

مقطوع جس کی جمع مقاطع اور مقاطيع ہے وہ روایت کہلاتی ہے جو قول و فعل کے لحاظ سے تابعی پر موقوف ہو جائے..... یعنی اگر سلسلہ سند تابعی تا تبع تابعی تک پہنچ کر ختم ہو جائے تو وہ حدیث مقطوع کہلاتی ہے..... حافظ ابن الصلاح اس ضمن میں کہتے ہیں ((هو ما جاء عن التابعين موقوفا عليهم من أقوالهم وأفعالهم“ (۷۲) مقطوع وہ روایت ہے جس کی سند تابعین کے اقوال و افعال پر رک جائے۔

حافظ ابن حجر مقطوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((والثالث: المقطوع وهو ما انتهى إلى التابعي و من دون التابعي عن أتباع التابعين فمن بعد هم فيه أي في التسمية مثله أي مثل ما ينتهي إلى التابعي في تسمية جميع ذلك مقطوعاً وإن شئت قلت: موقوف على فلان فحصلت التفرقة في الاصطلاح بين المقطوع والمنقطع، فالمنقطع من مباحث الاسناد كما تقدم، والمقطوع من مباحث المتن كما ترى

وقد أطلق بعضهم هذا في موضع هذا و بالعكس تجوزا عن الاصطلاح (۷۳) ”تیسری قسم مقطوع ہے..... مقطوع وہ حدیث ہے جس کی سند تابعی یا اس سے نیچے تبع تابعی یا اس کے بعد کسی راوی پر ختم ہو جاتی ہے۔ گویا تابعی، تبع تابعی اور اس کے بعد کے شخص پر ختم ہونے والی تمام روایات مقطوع کہلائیں گی۔ اگر تم چاہو تو یوں بھی کہہ سکتے ہو۔ ”موقوف علی فلان“ اس لئے مقطوع اور منقطع میں اصطلاحی فرق واضح ہوا۔ جب کہ پہلے گزر چکا ہے کہ منقطع کا تعلق سند کے مباحث سے ہے جبکہ مقطوع کا تعلق متن کے مباحث سے ہے۔ بعض حضرات نے اس کے برعکس صورت پر بھی اطلاق کیا ہے۔ جو کہ اصطلاح سے تجاوز ہے۔“

13.1 مقطوع کی حجیت

حدیث مقطوع احکام شرعیہ کے اثبات میں حجت نہیں ہے اس لئے اسے مدار استدلال نہیں بنایا جاسکتا۔ الا یہ کہ اس کے ساتھ ایسے عوامل و قرائن مل جائیں جو اسے مرفوع بنادیں..... اس صورت میں اس کی حیثیت مرفوع مرسل کی ہوگی..... مرسل کے بارے میں آپ تفصیلی مطالعہ مستقل یونٹ میں کریں گے۔

خود آزمائی ②

- ۱- تدلیس کی تعریف کیجئے اور اس کی اقسام بتائیے۔
- ۲- تدلیس الا سناد اور تدلیس الشیوخ میں کیا فرق ہے واضح کیجئے۔
- ۳- مرفوع کا لفظی اور اصطلاحی مفہوم علماء حدیث کے اقوال کے مطابق تحریر کیجئے۔
- ۴- مرفوع قولی تصریحی اور فعلی تصریح میں کیا فرق ہے واضح کیجئے۔
- ۵- مرفوع قولی حکمی اور فعلی حکمی کی تعریف بیان کیجئے۔
- ۶- موقوف کی تعریف علماء حدیث نے کس طرح کی۔ تفصیل سے بتائیے۔
- ۷- موقوف کی حجیت اور حیثیت کے ضمن میں مختلف اقوال پیش کیجئے۔
- ۸- مقطوع کا لفظی اور اصطلاحی مفہوم بتائیے۔
- ۹- مقطوع کی حیثیت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ بیان کیجئے۔

حواشی

- ۱ لسان العرب، ج ۳: ص ۲۲۰
- ۲ معرفۃ علوم الحدیث: ص ۶
- ۳ الکفایۃ فی علم الروایۃ: ۳۹۲
- ۴ الخلاصۃ: ۳۰
- ۵ تدریب الراوی: ج ۱- ص ۲۳
- ۶ الخلاصۃ: ۳۰
- ۷ الباعث الحثیث: ص ۵۱
- ۸ الباعث الحثیث: ۲- ۵۱
- ۹ مقدمۃ ابن الصلاح، ص: ۸۵
- ۱۰ ایضاً: ص ۸۶
- ۱۱ الکفایۃ فی علم الروایۃ: ص ۴۲۶
- ۱۲ فتح الباری: ج ۱- ص ۲۱۲
- ۱۳ شرح علل الترمذی: ج ۱- ص ۴۱۸
- ۱۴ مقدمۃ ابن الصلاح: ص ۸۶
- ۱۵ الکفایۃ: ص ۴۲۲
- ۱۶ التلک: ج ۲- ص ۲۸۷
- ۱۷ لسان العرب: ۳/ ۴۹۰
- ۱۸ نزہۃ النظر: ص ۶۹

۱۹	مقدمۃ ابن الصلاح: ص- ۷۶
۲۰	الباعث الحشیت: ص- ۴۷
۲۱	معرفۃ علوم الحدیث: ص- ۱۱۹
۲۲	الثک: ج ۲- ص- ۶۸۲
۲۳	نزہۃ النظر: ص- ۷۰
۲۴	کتاب الام: ج ۲- ص- ۹۳
۲۵	مؤطا: باب فی رویۃ الهلال
۲۶	صحیح بخاری- کتاب الصوم
۲۷	الثک: ج ۲- ص- ۶۸۳
۲۸	صحیح ابن خزیمہ: ج ۳- ص- ۲۰۲
۲۹	صحیح مسلم، کتاب الصوم
۳۰	نزہۃ النظر: ص- ۷۱
۳۱	المنہل الروی: ص- ۵۹
۳۲	سنن نسائی- کتاب الصوم- باب اکمال ثلاثین یوما
۳۳	صحیح بخاری کتاب الصوم- باب قول النبی اذا رايتم الهلال
۳۴	نزہۃ النظر: ص- ۷۲
۳۵	لسان العرب: ۴۵۲/۱۱
۳۶	نزہۃ النظر: ص- ۸۰
۳۷	مقدمۃ ابن الصلاح: ص- ۵۹
۳۸	معرفۃ علوم الحدیث: ص- ۳۶
۳۹	المؤطا- کتاب حسن الخلق: ج ۲- ص- ۹۰۲

۴۰	لسان العرب: ج-۷-ص-۲۷۶
۴۱	لسان العرب: ج-۷-ص-۲۷۶
۴۲	التمهید: ج-۱-ص-۲۱
۴۳	الارشاد: ص-۸۴
۴۴	الکفایۃ: ص-۲۱
۴۵	نزہۃ النظر: ص-۸۰، ۸۱
۴۶	لقط الدرر: ص-۷۶
۴۷	نزہۃ النظر: ص-۸۲
۴۸	معرفۃ علوم الحدیث: ص-۱۰۳
۴۹	الکفایۃ: ص-۳۵۵
۵۰	مقدمہ: ص-۷۳
۵۱	الکفایۃ: ص-۳۵۵
۵۲	ایضاً
۵۳	معرفۃ علوم الحدیث: ص-۱۰۳
۵۴	الکفایۃ: ص-۳۵۶
۵۵	الثلث: ج-۲-ص-۶۳۲
۵۶	مقدمۃ ابن الصلاح: ص-۷۵
۵۷	مقدمہ ابن الصلاح: ص-۷۴
۵۸	الباعث الحثیث: ص-۴۶
۵۹	فتح المغیث: ج-۱-ص-۲۲۳
۶۰	مقدمہ ابن الصلاح: ص-۷۶

۶۱	لسان العرب: ۸/۱۲۹
۶۲	الکفایۃ: ص-۲۱
۶۳	مقدمۃ ابن الصلاح: ص-۴۵
۶۴	الخلاصۃ: ص-۴۶
۶۵	نزہۃ النظر: ص-۱۰۳
۶۶	نزہۃ النظر: ص-۱۰۳
۶۷	لسان العرب
۶۸	نزہۃ النظر: ص-۱۰۸
۶۹	مقدمۃ ابن الصلاح: ص-۴۶
۷۰	لسان العرب ۸/۲۷۸
۷۱	التقریب: ص-۶
۷۲	مقدمۃ ابن الصلاح: ص-۴۷
۷۳	نزہۃ النظر: ص-۱۱۲



یونٹ نمبر ⑧

خبر متواتر

تحریر: پروفیسر محمد شریف شاہ
نظر ثانی: ڈاکٹر علی اصغر چشتی



فہرست مضامین

253	یونٹ کا تعارف	
254	یونٹ کے مقاصد	
255	خبر و حدیث	①
255	متواتر کا لغوی مفہوم	1.1
256	متواتر کا اصطلاحی مفہوم	1.2
259	متواتر کی اقسام	②
259	متواتر لفظی	2.1
259	متواتر معنوی	2.2
268	خود آزمائی 1	
269	متواتر حدیث کی حیثیت	③
270	علمائے حدیث اور علمائے اصول کی آراء	3.1
275	متواتر کے بارے میں علماء کی آراء	3.2
276	خبر متواتر کی تعریف و تقسیم کے بارے میں علماء کی آراء	3.3
279	متواتر حدیث کی رواۃ کے تعداد کے بارے میں علماء کی آراء	3.4
282	خود آزمائی 2	

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

اس وقت جو یونٹ آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کا تعلق ایک بہت ہی اہم اور بنیادی موضوع ”خبر متواتر“ سے ہے۔ علماء حدیث نے سند کے لحاظ سے روایات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ روایات ہیں جو اصطلاح میں ”متواتر“ کہلاتی ہیں اور دوسری وہ روایات ہیں جو اصطلاح میں ”آحاد“ کہلاتی ہیں۔ خبر واحد کی حیثیت اور حیثیت کے بارے میں آپ یونٹ نمبر ۹ میں ان شاء اللہ تفصیل کے ساتھ مطالعہ کریں گے۔

خبر متواتر سے مراد وہ روایت ہے جس کے رواۃ کی تعداد ہر طبقہ میں اتنی زیادہ ہو کہ عقلاً ان رواۃ کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو۔ مثلاً بیس، تیس یا چالیس پچاس راوی اگر ایک ”متن“ روایت کرتے ہوں اور ہر دور میں ان کی تعداد کثرت کی حامل ہو تو ایسی روایت کو ظاہر ہے روایتیں کیا جاسکتا۔

خبر متواتر کی حیثیت کے بارے میں علماء حدیث کا اتفاق ہے کہ یہ قابل حجت اور قابل استدلال ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت قطعی اور یقینی ہے۔ اس یونٹ میں اجمال اور اختصار کے ساتھ خبر متواتر کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ موضوع سے متعلق اہم نکات اور بنیادی مواد آپ تک پہنچ جائے۔ آپ اس یونٹ کا پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کریں۔ امید ہے آپ اسے مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇐ ”متواتر“ کا لغوی مفہوم بتا سکیں۔
- ⇐ خبر متواتر کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت کر سکیں۔
- ⇐ خبر متواتر کی اقسام پر گفتگو کر سکیں۔
- ⇐ متواتر لفظی اور متواتر معنوی کے فرق کی نشاندہی کر سکیں۔
- ⇐ متواتر کی حیثیت پر بحث کر سکیں۔
- ⇐ متواتر کی حیثیت کے بارے میں علمائے حدیث اور علمائے اصول کے اقوال پیش کر سکیں۔
- ⇐ خبر متواتر کے روادے کی تعداد کے بارے میں مختلف اقوال کا تذکرہ کر سکیں۔

① خبر و حدیث

جمہور علماء حدیث کے ہاں خبر و حدیث مترادف ہیں، البتہ بعض کا قول ہے کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہو وہ حدیث اور جو غیر سے مروی ہو وہ خبر ہے۔ اس تفریق کے سبب، مؤرخ کو اخباری اور سنت نبویہ کا شغل رکھنے والے کو محدث کہا جاتا ہے۔ لہذا ہر حدیث کو خبر کہہ سکتے ہیں، ہر خبر کو حدیث نہیں کہا جاسکتا۔^(۱)

ہم تک پہنچنے کے لحاظ سے خبر کی دو قسمیں ہیں:

(۱)..... خبر متواتر

(۲)..... خبر واحد

1.1 متواتر کا لغوی مفہوم:

متواتر تواتر سے اسم فاعل ہے اور تواتر کا معنی وقفوں کے ساتھ آگے پیچھے آنا ہے۔ معنی میں اختلاف: المحیانی تواتر کے معنی میں اختلاف یوں ذکر کرتے ہیں۔

(لا تكون متواترة الا اذا وقعت بينهما فترة والا فهي مداركة،

ويقال: ناقة مواترة: تضع ركبها ثم تمكث ثم تضع الاخرى)^(۲)

ترجمہ: متواترہ، متابعہ کو کہا جاتا ہے، تو چیزوں میں تواتر صرف اس وقت ہوگا جب دونوں کے درمیان وقفہ ہو، ورنہ اسے مدارکہ کہا جائے گا۔ ناقة متواترہ (آگے پیچھے پاؤں رکھنے والی اونٹنی) اسے کہا جاتا ہے جو اپنا ایک گھٹنا رکھ کر ٹھہر جائے۔ پھر دوسرا گھٹنا رکھے۔

(۱)..... ایک چیز کا دوسری چیز کے پیچھے وقفے کے ساتھ آنا۔

(۲)..... ایک چیز کا دوسری چیز کے پیچھے بغیر وقفے کے آنا۔

پہلے معنی کی تائید قرآن مجید سے ہوتی ہے:

﴿ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا فَيُخَافُونَ﴾ (المؤمنون: ۴۴)

ترجمہ ”پھر ہم نے لگا تار رسول بھیجے یعنی ایک کے بعد دوسرے کو بھیجا۔“

الجوبہری (متوفی ۳۹۳ھ) پہلے قول کی تائید میں لکھتے ہیں:

(المتواترة المتابعة ولا تكون المتواترة بين الاشياء الا اذا وقعت بينهما فترة وإلا فهي مداركة و مواصلة) (۳)

ترجمہ: ”متواترہ، سے مراد متابعت ہے۔ دو چیزوں میں تواتر صرف اس وقت ہوگا جب دونوں چیزوں کے درمیان (ایک دوسرے کے آگے پیچھے آنے میں) وقفہ ہو، ورنہ اسے مدارکہ (۴) اور مواصلہ (۵) کہا جائے گا۔

1.2 خبر متواتر کا اصطلاحی مفہوم:

حافظ ابن الصلاح (متوفی ۶۴۲ھ) اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

(فانه عبارة عن الخبر الذي ينقله من يحصل العلم بصدقه ضرورة، ولا بد في الأسناد من استمرار هذا الشرط في روايته من أوله الى منتهاه) (۶)

ترجمہ ”متواتر سے مراد ایسی خبر ہے جس کی سچائی کے بارے میں علم ضروری حاصل ہو، اور اس خبر کو روایت کرنے میں اس شرط (خبر کی سچائی کے بارے میں حصول علم ضروری کا) سند کے اول سے آخر تک

جاری رہنا ضروری ہے۔“

الجزائری (متوفی ۱۳۳۸ھ) اس کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

(وحد التواتر مالا یمكن الشك فيه كالعلم بوجود الانبياء ووجود
البلاد المشهورة وغيرها وانه متواتر الا عصار كلها عصارا بعد عصر
الى زمان النبوة) (۷)

ترجمہ: ”متواتر وہ ہوتی ہے جس میں شک کا امکان نہ ہو جیسے انبیاء اور بلاد مشہورہ وغیرہ کے وجود کے بارے میں علم ہے اور یہ (علم ضروری) ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں ہوتا ہوا زمانہ نبوت تک تمام زمانوں میں متواتر رہے۔ خبر متواتر کی شروط: خبر کے متواتر ثابت ہونے کیلئے اس میں درج ذیل شروط کا پایا جانا ضروری ہے۔“

- ۱۔ اس کی اسناد بلا تعین کثیر ہوں۔
- ۲۔ راویوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ ان کا عادتاً جھوٹ پر جمع ہونا یا ان سے جھوٹ کا اتفاق صادر ہونا محال ہو۔
- ۳۔ یہ کثرت ابتدائے سند سے انتہائے سند تک یکساں ہو۔
- ۴۔ خبر کا تعلق جس (یعنی مشاہدہ یا سماع) سے ہو عقل سے نہ ہو (یعنی راوی سمعنا، رأینا وغیرہ الفاظ کے ساتھ روایت کریں۔
- ۵۔ خبر مفید علم یقینی ضروری ہو۔ (۸)
- علم یقینی: ایسے اعتقاد کو کہا جاتا ہے جو واقع کے مطابق ہو اور جس پر پورا اعتماد و یقین ہو۔
- علم یقینی کی اقسام: اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱)..... علم ضروری (۲)..... علم نظری

(۱)..... علم ضروری:

یہ علم ہر سامع کو حاصل ہوتا ہے اور اسے ہر انسان بتلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے مسترد کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ (نزہۃ النظر ۱۵)

(۲)..... علم نظری:

اس سے مراد ایسا علم ہے جس میں نظر و استدلال کی اہلیت ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ) نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

(النظر : ترتیب امور معلومۃ او مظنونۃ یتوصل بہا الی علوم او ظنون)

(نزہۃ النظر . ص ۱۵)

یعنی چند امور معلومہ یا امور مظنونہ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ علوم و ظنون تک پہنچا جاسکے۔ جو علم اس طرح حاصل ہوتا ہے اسے علم نظری کہتے ہیں۔

② خبر متواتر کی اقسام

متواتر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) متواتر لفظی (۲) متواتر معنوی

2.1 متواتر لفظی

یہ ایسی خبر ہے جس کے رواۃ کے الفاظ میں موافقت پائی جائے۔ مثلاً رواۃ کہیں کہ فلاں نے فلاں شہر فتح کر لیا۔ یہ خبر ان الفاظ کے ساتھ ہو یا اس کے قائم مقام دیگر الفاظ کے ساتھ ہو جو معنی مقصود پر صریح دلالت کرتے ہوں۔

2.2 متواتر معنوی

جس (خبر) میں رواۃ کے الفاظ مختلف ہوں۔ ان میں سے کچھ لوگ ایک واقعہ روایت کریں جبکہ ان کے غیر کوئی اور واقعہ روایت کریں، ایسے ہی آگے چلتے رہیں، مگر یہ تمام واقعات ایک ”قدر مشترک“ پر مشتمل ہوں، اسکو متواتر معنوی یا معنی کے لحاظ سے متواتر کا نام دیا جاتا ہے۔

مثال: اس کی مثال ایسے دی جاسکتی ہے کہ ایک شخص روایت کرے کہ حاتم نے سودینار بہہ کیے اور دوسرا شخص کہے کہ اس نے سوانٹ بہہ کیے، ایک اور شخص کہے حاتم نے بیس گھوڑے بہہ کیے، اور یہ سلسلہ جاری رہے حتیٰ کہ رواۃ کی تعداد حد تو اترا کو پہنچ جائے۔ یہ تمام خبریں ایک چیز میں مشترک ہیں وہ ہے حاتم کا اپنے مال سے کوئی چیز بہہ کرنا اور یہ اس کی سخاوت کی دلیل ہے اور یہ تو اترا معنوی کے طریقہ سے ثابت ہے۔^(۹) مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی (متوفی ۱۳۵۲ھ) نے متواتر کی چار اقسام بیان کی ہیں۔

۱.....تواتر الاسناد

۲.....تواتر الطبقة

۳.....تواتر العمل والتوراث

۴.....تواتر القدر المشترك

۱.....تواتر کبھی اسناد کی حیثیت سے ہوتا ہے اور یہ معروف ہے جیسے حدیث ((من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار))

۲.....تواتر کبھی طبقہ کی حیثیت سے ہوتا ہے جیسے تواتر قرآن، یہ شرق تا غرب روئے زمین پر درس و تلاوت اور حفظ و قرأت کے لحاظ سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ جسے ایک زمانہ کے لوگ دوسرے زمانے کے لوگوں سے حاصل کر رہے ہیں۔ یہ معین سند ”عن فلان عن فلان“ کا محتاج نہیں ہے۔

۳.....کبھی تواتر عمل و تورات ہوتا ہے (یعنی) صاحب شریعت کے زمانے سے ہمارے اس دن تک کسی چیز پر تواتر کے ساتھ عمل ہوتا چلا آ رہا ہو جیسے مسواک۔

۴.....اور چوتھا تواتر قدر مشترک ہو جیسے تواتر معجزات ہے، ان میں سے ہر ایک اگرچہ آحاد کے درجہ میں ہے لیکن قدر مشترک قطعی متواتر ہے، ایسی ہی مثال حاتم طائی کی سخاوت ہے، اگرچہ اس کی خبریں آحاد ہیں، مگر اس کی سخاوت تواتر کے ساتھ معلوم ہے۔^(۱۰)

یہ تو مولانا کشمیری کی تقسیم ہے لیکن آئندہ سطور میں جمہور محدثین کی تقسیم تواتر کے مطابق ”متواتر لفظی اور متواتر معنوی“ کا تفصیلی بیان ہوگا۔ جمال الدین القاسمی (متوفی ۱۳۳۲ھ) نے متواتر لفظی کی چار مثالیں ذکر کی ہیں۔

۱.....من کذب علی متعمدا جسے دو صحابہ نے روایت کیا“

۲.....حدیث حوض جسے تقریباً ستر صحابہ نے روایت کیا۔

۳ نماز میں رفع یدین کی حدیث، جسے تقریباً پچاس صحابہ نے روایت کیا ہے۔^(۱۱)

لیکن یہ سب متواتر لفظی کی مثالیں نہیں بلکہ ان میں سے بعض صرف تواتر معنوی ثابت ہوئی ہیں ان میں سے صرف تین مثالوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

..... من کذب علی متعمدا (زبیدی (متوفی ۱۲۰۵ھ) نے اس کے صحابہ رواۃ کی تعداد ننانوے ذکر کی ہے^(۱۲) اور لکھا ہے کہ ابو بکر الصیرفی نے ”شرح الرسالۃ“ میں کہا کہ اسے ستر سے زائد صحابہ نے روایت کیا، اور ابن وحید نے کہا کہ یہ حدیث تقریباً نوے صحابہ سے روایت کی گئی ہے اور تقریباً چار سو طرق کے ساتھ تخریج کی گئی ہے۔ اور ابن جوزی نے کہا ہے کہ اٹھانوے صحابہ نے اسے روایت کیا، اور نووی نے شرح مسلم (۸/۱) میں نقل کیا کہ اسے دو سو صحابہ نے روایت کیا ہے۔^(۱۳) اور حافظ ابن الصلاح کہتے ہیں کہ شروط متواتر کے تحت ہم صرف من کذب علی..... الخ کو متواتر خیال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اسے صحابہ کی ایک بڑی جماعت نے نقل کیا ہے۔

حافظ ابو بکر بزار نے اپنی مسند میں ذکر کیا کہ اسے تقریباً چالیس صحابہ نے روایت کیا اور بعض حفاظ حدیث نے ذکر کیا کہ اسے عشرہ مبشرہ سمیت بائیس صحابہ نے روایت کیا ہے۔^(۱۴)

ملا علی قاری اس کے ۹۸ صحابہ رواۃ کے اسماء گرامی اور ان کتب حدیث کا تذکرہ کرتے ہیں جن میں یہ حدیث تخریج کی گئی ہے۔ ان میں سے ۴۲ صحابہ نے اس حدیث کو ایک ہی متن کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ الفاظ کا باطل کوئی فرق نہیں پایا جاتا، یوں یہ روایت متواتر لفظی کی بہترین مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔

2.2 متواتر معنوی

یہ ایسی خبر ہے جس میں معنوی تواتر پایا جاتا ہو^(۱۵) یعنی اسکے تمام راویوں کے روایت کردہ الفاظ آپس میں نہ ملتے ہوں، بلکہ تمام رواۃ کی مرویات کا صرف معنی و مفہوم آپس میں مطابقت رکھتا ہو۔

مثالیں: اس کی بہت سی مثالیں ہیں ”متواتر لفظی“ کے تحت مذکورہ بالا ”حدیث مسح علی الخفین“ اور ”حدیث رفع الیدین“ کی مثالیں بھی دراصل متواتر معنوی کی مثالیں بنتی ہیں۔ تواتر معنوی کی ایک مثال دعا میں ہاتھ اٹھانا ہے۔ جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں ”وللثانی امثلة ایضاً“

(۱) (فمنہ احادیث رفع الیدین فی الدعاء فقد روی عنہ ﷺ نحو مئة حدیث فیہ رفع یدیه فی الدعاء لكنها فی قضایا مختلفة، فكل قضية منها لم تتواتر، والقدر المشترك فیہا، وهو الرفع عند الدعاء تواتر باعتبار المجموع) (۱۲) یعنی ”متواتر معنوی کی کئی مثالیں ہیں: اس کی ایک مثال دعا میں ہاتھ اٹھانا ہے، نبی ﷺ سے اس بارے میں تقریباً ایک سو احادیث روایت کی گئی ہیں جن میں دعا میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر موجود ہے۔ لیکن یہ مختلف معمولات سے متعلق ہیں اور ہر واقعہ میں ہاتھ اٹھانا تواتر سے ثابت نہیں، البتہ تمام معمولات میں جو قدر مشترک ہے وہ دعا میں ہاتھ اٹھانا ہے۔

امام نووی لکھتے ہیں:

(قد ثبت رفع یدیه ﷺ للدعاء فی مواطن غیر الاستسقاء وہی اکثر من ان تحصره قد جمعتہ منها نحواً من ثلاثین حدیثاً من الصحیحین او احدهما او ذکرتها فی او اخر صفة الصلاة من شرح المہذب) (۱۳) یعنی رسول اللہ ﷺ کا استسقاء کے علاوہ بھی بے شمار مقامات میں دعا کیلئے دونوں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے اور میں نے اس بارے میں تقریباً تیس احادیث بخاری و مسلم یا کسی ایک سے جمع کی ہیں۔ جنہیں میں نے ”شرح المہذب“ کے باب صفة الصلاة کے آخر میں ذکر کیا ہے۔

۲..... (حدیث النزول ينزل الله تبارك و تعالى الى سماء الدنيا كل ليلة..... الخ)

یہ حدیث بہت سے اصحاب رسول سے مروی ہے۔ امام ترمذی اسے ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس باب میں (۱) علی ابن ابی طالب (۲) ابوسعید (۳) رفاعہ جھنی (۴) جبیر بن مطعم (۵)

ابن مسعود (۶) ابودرداء (۷) عثمان بن ابی العاص سے مروی ہے ابو یسیٰ نے کہا کہ ابو ہریرہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہ حدیث ابو ہریرہ سے کئی سندوں سے (عن النبی ﷺ اِنَّہ قال ینزل اللہ تبارک و تعالیٰ حین یشقی ثلث اللیل الآخر) ”نبی ﷺ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے“ اور یہ سب سے زیادہ صحیح روایت ہے۔ (۱۸)

عبدالرحمن مبارکپوری متذکرہ بالاصحابہ کی مرویات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

حافظ ابن حجر اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

ترجمہ: اس باب میں امام احمد کے ہاں علی، ابن مسعود، عثمان بن ابی العاص اور عمرو بن عبسہ سے، نسائی کے ہاں جبیر بن مطعم اور رفاعہ جہنی سے اور طبرانی کے ہاں ابودرداء، عبادہ بن صامت اور ابو الخطاب سے بغیر نسبت کے (۱۹) (حدیث) روایت کی گئی ہے اور دارقطنی کے ہاں ”کتاب السنۃ“ میں عقبہ بن عامر، جابر اور عبدالحمید بن سلمہ کے دادا سے (یہ حدیث) روایت کی گئی ہے۔ حافظ ابن حجر نے متذکرہ بالا عبارت میں مندرجہ ذیل چھ اصحاب رسول کا اضافہ کیا ہے۔ عمرو بن عبسہ، عبادہ بن صامت، ابو الخطاب، عقبہ بن عامر، جابر بن عبداللہ اور عبدالحمید کا دادا۔

علامہ بیہقی نے اس حدیث کے مزید رواۃ کے اسماء گرامی ذکر کئے ہیں عینی لکھتے ہیں:

- (۱) وفی الباب عن جابر بن عبداللہ (۲) وعبادۃ بن الصامت (۳) وعقبۃ بن عامر (۴) و عمرو بن عبسۃ (۵) و ابی الخطاب (۶) و ابی بکر الصدیق (۷) و انس بن مالک (۸) و ابی موسیٰ الاشعری (۹) و معاذ بن جبل (۱۰) و ابی ثعلبۃ الخشنی (۱۱) و عائشۃ (۱۲) و ابن عباس (۱۳) و النواس بن سمرعان (۱۴) و ام سلمۃ (۱۵) و جد عبدالحمید“ (۲۰)

علامہ یحییٰ کی ذکر کردہ لسٹ میں نوئے ناموں کا اضافہ ہوا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔ ”ابو بکر صدیق، انس بن مالک، ابو موسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، ابو ثعلبہ خثنی، عائشہ، ابن عباس، نواس بن سمعان اور ام سلمہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) یہ کل تیس صحابہ کرام ہیں جن کا تذکرہ الکتانی نے بھی کیا ہے (۲۱) اسکے بعد الکتانی لکھتے ہیں۔

”ابو زرہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ متواتر حدیثیں کہ ”اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے“ یہ حدیثیں بہت سے اصحاب رسول ﷺ نے روایت کی ہیں۔ اور یہ ہمارے نزدیک صحیح اور قوی ہیں۔ (۲۲)

الکتانی مزید لکھتے ہیں کہ امام سخاوی نے فتح المغیث میں کہا ہے کہ بعض نے اس حدیث کو متواتر میں شمار کیا اور الصارم المنکی میں ہے کہ ((حدیث النزول متواتر عن رسول اللہ)) یعنی حدیث نزول رسول اللہ سے متواتر روایت کی گئی ہے۔ (۲۳)

چونکہ ان تمام مرویات کے الفاظ ایک طرح کے نہیں بلکہ ان میں کچھ تفاوت پایا جاتا ہے لیکن مفہوم تمام مرویات کا ایک جیسا ہے۔ اس لئے اسے متواتر معنوی کہنا زیادہ مناسب ہے۔

۳..... حدیث المسح علی الخفین : (۲۴) ”عن المغيرة، ان النبي مسح علی الخفین“ (۲۵)

الکتانی لکھتے ہیں کہ ابو بکر بزار نے ذکر کیا کہ مغیرہ کی یہ روایت تقریباً ساٹھ طرق کے ساتھ روایت کی گئی ہے اور ان میں پینتالیس طرق ابن مندہ نے ذکر کئے ہیں۔ (۲۶)

الکتانی مزید لکھتے ہیں:

ترجمہ: ”امام احمد بن حنبل نے کہا کہ مسح علی الخفین کے بارے میں مرفوع و موقوف چالیس حدیثیں مروی ہیں۔

ابن ابی حاتم نے کہا کہ اس بارے میں چالیس حدیثیں مروی ہیں۔ ابن عبد البر نے ”الاستذکار“ میں کہا کہ نبی ﷺ سے یہ حدیث چالیس صحابہ نے روایت کی ہے۔

ابن منذر نے حسن بصری سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا: مجھے رسول اللہ ﷺ سے ستر صحابہ نے حدیث روایت کی کہ آپؐ موزوں پر مسح کرتے تھے۔ (۲۷)

اور ابو القاسم ابن مندہ نے اپنے ”تذکرہ“ میں اس حدیث کے صحابہ رواۃ کے نام ذکر کئے تو ان کی تعداد اسی تک پہنچ گئی۔ اور حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حفاظ کی ایک جماعت نے صراحتہ کہا ہے کہ مسح علی الخفین متواتر ہے اور بعض محدثین نے اس کے رواۃ جمع کئے تو ان کی تعداد اسی سے بڑھ گئی، ان میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں حسن بصری سے مروی ہے کہ مجھے ستر صحابہ نے مسح علی الخفین روایت کیا ہے۔ (۲۸)

الکلتانی نے قاضی عیاض کی ”الاکمال“ کے حوالے سے لکھا ہے (النصوص : بتواترہ کثیرہ ولكن تواتره كما نقلنا عن المازري و عياض معنوی لا لفظی وقد صرح بذلك السيوطی) (۲۹) ”یعنی اس (مسح علی الخفین) کے تواتر کے بارے میں بہت سی نصوص ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے المازری اور قاضی عیاض سے نقل کیا اس (حدیث) کا متواتر ہونا لفظی نہیں، معنوی ہے اور سیوطی نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

۴..... حدیث رفع الیدین :

الکلتانی نے نماز میں تین وقتوں (تکبیر تحریمہ، رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت) رفع یدین

کرنے کی حدیث کے تیس صحابہ رواۃ کے اسماء گرامی ذکر کئے ہیں۔ (۳۰)

اور زبیدی نے ان تین وقتوں میں رفع یدین کرنے کی حدیث روایت کرنے والے بائیس اصحاب رسول ﷺ اور اس حدیث کی تخریج کر نیوالے محدثین کا یوں ذکر کیا ہے۔

”(۱) ابن عمر (۲) مالک بن حویرث (۳) وائل بن حجر (۴) علی بن ابی طالب (۵) سہل بن سعد (۶) ابن الزبیر (۷) ابن عباس (۸) محمد بن سلمہ (۹) ابو اسید (۱۰) ابو حمید الساعدی (۱۱) ابو قتادہ (۱۲) ابو ہریرہ (۱۳) انس (۱۴) جابر بن عبد اللہ (۱۵) عمیر اللیثی (۱۶) الحکم بن عمیر (۱۷) ابو بکر صدیق (۱۸) البراء بن عازب (۱۹) عمر (۲۰) ابو موسیٰ (۲۱) عقبہ بن عامر (۲۲) معاذ بن جبل“ پہلے دو (ابن عمر، مالک بن حویرث) کی روایت شیخین (بخاری و مسلم) نے تخریج کی، تیسرے (وائل بن حجر) کی روایت صرف مسلم نے، چوتھے کی روایت اصحاب سنن اربعہ نے، اس کے بعد آٹھ (صحابہ) کی روایت ابن ماجہ نے اپنی سنن میں سولہویں (صحابی) کی روایت (امام) احمد نے اپنی مسند میں، اس کے بعد کے دو نمبر (۱۸، ۱۷) کی روایت (امام) بیہقی نے اس کے بعد کے دو (۱۹، ۲۰) کی روایت دارقطنی نے اور آخری دو کی روایت طبرانی نے تخریج کی ہے۔ (۳۱)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

(و ذکر شیخنا ابو الفضل الحافظ انه تتبع من رواه من الصحابة فبلغوا خفسين رجلا) (۳۲) ”ہمارے استاد ابو الفضل الحافظ نے ذکر کیا کہ انہوں نے اس حدیث کے صحابہ راویوں کا تتبع کیا تو ان کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی۔“

اور یہی بات امام سیوطی نے ذکر کی ہے:

(وحدیث رفع الیدین فی الصلاة من روایة نحو خمین) (۳۲) ”نماز میں رفع یدین کی

حدیث تقریباً پچاس صحابہ سے مروی ہے“ اور اکتانی نے فتح المغیث سے سخاوی کا یہ قول نقل کیا ہے“

”بہت ہی“ نے کہا میں نے حاکم“ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہمارے علم کے مطابق اگر کوئی ایسی سنت ہو سکتی ہے۔ جسے نبی ﷺ سے روایت کرنے پر خلفاء اربعہ اور عشرہ مبشرہ پھر ان کے بعد اکابر ائمہ دور دراز شہروں میں منتشر ہونے کے باوجود متفق ہوئے ہیں تو وہ صرف یہی (رفع یدین) سنت ہے۔ (۳۳)

تواتر معنوی:

علامہ محمد حسن سنہلی حنفی، صاحب سفر السعادة کا قول یوں نقل کرتے ہیں:

ترجمہ: ”بے شک رفع یدین کرنا بغیر کسی شک و شبہ کے نماز کے تین مقامات: شروع نماز، رکوع جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے ثابت ہے۔ اور کثرت رواۃ کے سبب تواتر معنوی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ رفع یدین کے بارے میں صحیح چار سو احادیث و آثار ملتے ہیں۔ اور عشرہ مبشرہ نے روایت کیا کہ آپ کا یہ عمل ہمیشہ رہا اور آپ اپنی وفات تک اسی طریقہ پر قائم رہے۔ (۳۵)

اس ساری بحث سے ثابت ہوا کہ تین مقامات پر رفع یدین کی احادیث میں تواتر معنوی پایا جاتا ہے۔

رفع یدین کی سند: امام بخاری لکھتے ہیں:

(لم یثبت عن احد منهم ترکہ، قال: ولا اسانید اصح من اسانید الرفع) (۳۶)

ترجمہ: ”کسی صحابی سے ترک رفع یدین ثابت نہیں اور نہ ہی رفع یدین کی اسناد سے صحیح ترین اسناد موجود ہیں۔“

خود آزمائی ①

- ۱- حدیث اور خبر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ بیان کیجئے؟
- ۲- خبر متواتر کا لغوی مفہوم کیا ہے؟
- ۳- خبر متواتر کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت کیجئے؟
- ۴- خبر متواتر کی اقسام سے کیا مراد ہے بتائیے؟
- ۵- متواتر لفظی اور متواتر معنوی کے باہمی فرق پر ایک نوٹ قلم بند کیجئے؟

③ متواتر حدیث کی حیثیت

جس حدیث میں تواتر کی شروط مکمل طور پر پائی جائیں وہ علم یقینی ضروری کا فائدہ دیتی ہے۔ اس لئے اس پر عمل کرنا واجب اور فرض ہے۔

چنانچہ الجزائری، حافظ ابن حزم کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

ترجمہ ”(اللہ کی جانب سے) ایسی دلیل آچکی جس میں دو مسلمانوں کا بھی اختلاف نہیں (وہ یہ) کہ جو حدیث رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت ہو جائے اس کی پیروی فرض ہے اور یہ (بھی نص سے ثابت ہے) کہ رسول اللہ کی حدیث قرآن میں اللہ کی (ذکر کردہ) مراد کی تفسیر اور اس کے مجمل کا بیان ہے، پھر ہمارے ذکر کردہ (فرضیت اتباع رسول) کے سبب ہر مسلمان کی طرف سے اطاعت رسول پر قطعی یقینی اجماع کے بعد مسلمانوں نے نبی علیہ السلام کی حدیث کی صحت تک پہنچانے والے طریق میں اختلاف کیا ہے، لہذا ہم نے اس پر غور کیا تو ہم نے احادیث کو دو قسموں میں منقسم پایا۔ (۱) خبر متواتر جسے آپ ایک جماعت کے بعد دوسری جماعت سے نقل کریں یہاں تک کہ آپ اس خبر کو نبی ﷺ تک پہنچا دیں۔ اس حدیث پر عمل کے قطعی فرض اور واجب ہونے میں دو مسلمانوں نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ الجزائری بعض علمائے اعلام کا قول یوں نقل کرتے ہیں۔

(والمستواتر لا یبحث فیہ عن رواۃ بل یجب العمل بہ من غیر بحث لا فادۃ علی الیقین وان ورد عن غیر الابرار عن الکفار) (۳۷) ترجمہ ”اور متواتر میں اس کے راویوں کے بارے میں بحث نہیں کی جاتی بلکہ اس کے مفید علم یقینی ہونے کے سبب بغیر کسی بحث کے اس پر عمل واجب

ہوتا ہے اگرچہ یہ (خبر متواتر) غیر نیکو کار سے بلکہ کفار سے کیوں نہ آئی ہو۔

مذکورہ بالا اقتباس کی توضیح کرتے ہوئے الجزائری لکھتے ہیں:

ترجمہ ”اور مذکورہ بالا سے (علمائے اعلام کی) مراد یہ ہے کہ متواتر میں رواۃ اور ان کی صفات کے بارے میں جو طریقہ اخبار آحاد میں رائج ہوتا ہے اس طریقہ پر متواتر میں بحث نہیں کی جاتی۔ اور یہ چیز رواۃ کے متعلق ایسی اجمالی بحث کے منافی نہیں جو (اجمالی بحث) رواۃ کے کثرت میں اس حد تک پہنچنے کی جہت سے ہوتی ہے جس (حد کثرت) میں ان کا جھوٹ پر متفق ہونا یا ان سے اتفاقہ جھوٹ صادر ہونا ممنوع ٹھہرتا ہو۔ (۳۸)

ابو الفیض الزبیدی ابن ابی الدم کا قول یوں نقل کرتے ہیں:

(والمتواتر لا یبحث عن رجاله بل یجب العمل به من غیر بحث لا یجابه الیقین) (۳۹) ترجمہ: ”اور متواتر کے رجال کے بارے میں بحث نہیں کی جاتی بلکہ بحث کئے بغیر اس کے مفید علم یقینی ضروری ہونے کے سبب اس پر عمل واجب ہوتا ہے۔

3.1 خبر متواتر کی حیثیت کے بارے علمائے حدیث اور علمائے اصول کا اختلاف

خبر متواتر کے بارے میں محدثین اور اہل اصول میں چند واضح اختلاف پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے خبر متواتر کی حیثیت متعین کرنے میں بھی دونوں کی آراء مختلف ہیں۔

رواۃ خبر کی شرعی حیثیت

علمائے اصول کے ہاں خبر متواتر کے رواۃ کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔ اور محدثین میں سے امام نووی کا بھی یہی نظریہ ہے۔

چنانچہ جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں۔

(وقع فی کلام النووی فی شرح مسلم فی المتواتر انه لا یشرط فی المخبرین به الاسلام، وکذا قال الأصولیون ولا یخفی ان هذا اصطلاح للأصولیین) ^(۳۰) ترجمہ: ”شرح صحیح مسلم میں خبر متواتر کے بارے میں امام نووی کے کلام میں یہ موجود ہے کہ خبر دینے والوں کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے اور اصولیوں نے بھی ایسا ہی کہا ہے“

تقریباً یہی بات الکتانی لکھتے ہیں:

(فان لم یکن تواطؤهم علی الکذب وهم فساق او کفار سمعی متواترا و هذا بالنظر الی اصطلاح الأصولیین لان کلامهم فی الخبر المتواتر من الناس) ^(۳۱) ترجمہ: ”اگر رواۃ جھوٹ پر متفق نہ ہوں، اور وہ فاسق و کافر ہوں (تب بھی) خبر کو متواتر کا نام دیا جائے گا۔ اور یہ اصولیوں کی اصطلاح کے پیش نظر ہے کیوں کہ خبر متواتر میں کلام کا مرکز لوگ ہوتے ہیں۔ (خواہ) مسلمان ہوں یا کافر۔“

یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن الصلاح لکھتے ہیں کہ متواتر کا تذکرہ اصولیوں نے کیا ہے۔ محدثین میں سے صرف خطیب ابو بکر بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) نے ان کی پیروی کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا ہے۔ محدثین اس کا تذکرہ اس کے خاص نام کے ساتھ جس سے اس کا خاص معنی سمجھا جاتا ہے۔ نہیں کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ”متواتر“ محدثین کی صنعت (یعنی سند کی پرکھ) میں شامل نہیں اور نہ ہی ان کی روایات میں پائی جاسکتی ہے، کیونکہ خبر متواتر سے مراد ایسی خبر ہے جسے رواۃ کی اتنی بڑی تعداد روایت کرے کہ ان کی سچائی کے بارے میں علم ضروری حاصل ہو جائے اور اس خبر کو روایت کرنے میں اس شرط کا اس کی سند میں اول تا آخر جاری رہنا ضروری ہے۔ ^(۳۲)

محدثین کے ہاں رواۃ کا مسلمان ہونا شرط ہے، کیونکہ محدثین کے ہاں موضوع بحث لوگ نہیں، بلکہ موضوع بحث حدیث ہوتی ہے چنانچہ الکتانی لکھتے ہیں:

(اما المحدثون فالظاهر انه لا بد عندهم من الاسلام في روايته لأن

كلامهم في التواتر من الحديث) (۴۳)

یہی بات جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ”خبر متواتر کے بارے میں محدثین کی اصطلاح یہ ہے کہ اسے مسلمانوں کی ایک (کثیر) تعداد روایت کرے، کیونکہ انہوں نے روایت کے قابل حجت ہونے کیلئے اس کے راوی کا عادل ضابطہ اور بالغ مسلمان ہونا شرط قرار دیا ہے۔ لہذا خبر دینے کے سلسلے میں کفار کی تعداد خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو ان (کفار) کی روایت قبول نہیں جائے گی۔“ (۴۴)

منصب روایت کفر سے بالاتر ہے، اس ضمن میں:

”جمع الجوامع مع شرحہ کی عبارت یہ ہے کہ (ولا تقبل رواية كافر، وان عرف بالصدق لعلو مصب الرواية عن الكفار) ”کافر اگرچہ سچائی میں معروف ہو اس کی خبر قبول نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ منصب روایت کفار سے بالاتر ہے“ (۴۵)



مختلف علماء کی آراء متواتر حدیث کے بارے میں

- ۱- خبر کے وجود اور عدم وجود کے بارے میں محدثین کا اختلاف
- ۲- خبر متواتر کی تعریف و تقسیم کے بارے میں مختلف علماء کی آراء
- ۳- مفید علم یقینی ہونے کے بارے میں مختلف علماء کی آراء
- ۴- متواتر حدیث کے رواۃ کی تعداد کے بارے میں مختلف علماء کی آراء



3.2 متواتر حدیث کے بارے میں مختلف علماء کی آراء

خبر متواتر کے وجود اور عدم وجود کے بارے میں محدثین کا اختلاف:

محدثین کے ہاں خبر متواتر کی قبولیت کیلئے جو شرائط رکھی گئی ہیں ان شرائط کے تحت خبر متواتر کا وجود مشکل ہے۔ چنانچہ ابوالفیض الزبیدی، ابن ابی الدم کا قول یوں نقل کرتے ہیں۔

(من وام من المحدثین وغیرہم ذکر حدیث عن النبی ﷺ متواتر، وجدت فیہ شروط التواتر الآمن ذکرہا فقد رام محالا) (۳۶) یعنی محدثین وغیرہ میں سے جس نے بھی نبی ﷺ کی متواتر حدیث۔ جس میں شروط تواتر موجود ہوں کا تذکرہ کرنا چاہا اس نے ایک محال چیز کا قصد کیا۔

الزبیدی مزید لکھتے ہیں کہ حافظ ابن الصلاح، الحازمی، اور ابن حبان نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کا وجود معدوم ہے ابن ابی الدم نے ”العزۃ“ (عدم الوجود ہونے) کی وجہ سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”کیونکہ تواتر کی ایک شرط یہ ہے کہ اسے ایک ایسی جماعت نقل کرے جس کا جھوٹ پر مجتمع ہونا تصور نہ کیا جاسکے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے بارے میں ان کی قطعی سچائی کا علم (ضروری یا نظری) حاصل ہو۔ پھر اس جماعت دوسری جماعت نے جس کے جھوٹ پر جمع ہونے کا تصور نہ کیا جاسکے اور اس کی سچائی کا علم حاصل ہو۔ پھر اس طرح دوسری جماعت سے تیسری جماعت نے اور یہ سلسلہ سند کے آخر تک چلا جائے اور اس شرط کا سند کے اول و آخر اور وسط میں ثابت ہونا ضروری ہو جبکہ ایسی شرط احادیث نبویہ میں نہیں پائی جاتی“ (۳۷)

الجزائری تمام طبقات میں تواتر کو لازم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترجمہ ”خبر متواتر میں شرط یہ ہے کہ اس میں تواتر طبقہ اولیٰ سے آخری طبقہ تک موجود ہو، جب یہ (تواتر) کسی ایک طبقہ میں مفقود ہو جائے، خاص کر پہلے طبقہ میں تو اسے متواتر نہیں کہا جائے گا۔ اگر خبر شروع میں (پہلے طبقہ میں) متواتر ہو پھر اس سے تواتر زائل ہو جائے تو اس خبر کو ”منقطع التواتر“ کہا جائے گا۔ اگر خبر شروع میں متواتر نہ ہو تو اسے متواتر نہیں کہا جائے گا۔ (توجیہ النظر ص: ۳۷)

تمام طبقات میں تواتر کے بارے میں تقریباً یہی بات اکتانی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ”متواتر کے رواۃ اگر ایک ہی طبقہ ہوں تو واضح ہے کہ متواتر کی مذکورہ قیود کی موجودگی میں ان کے خبر دینے سے تواتر حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو یعنی رواۃ کے کئی طبقات ہوں اور محسوس کی صرف ایک ہی طبقہ نے خبر دی ہو تو ان طبقات کا ایسی جماعت ہونا شرط ہوگا کہ سند کے اول سے آخر تک تمام طبقات میں انکا جھوٹ پر مجتمع ہونا ممنوع و ناممکن ہو۔“ (۴۸)

3.3 خبر متواتر کی تعریف و تقسیم کے بارے میں مختلف علماء کی آراء

اولاً: خبر کی دو قسمیں ہیں۔ (۱)..... متواتر (۲)..... آحاد

خبر آحاد کی تین قسمیں ہیں۔ (۱)..... مشہور (۲)..... عزیز (۳)..... غریب

خبر کی مندرجہ بالا تقسیم اکثر محدثین نے کی ہے اور حافظ ابن حجر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ (۴۹)

بعض علماء اصول نے خبر کی تین قسمیں کی ہیں:

(۱)..... متواتر (۲)..... مشہور (۳)..... آحاد

انہوں نے مشہور کو ایک مستقل قسم قرار دیا ہے نہ تو اسے بھاس کی طرح متواتر میں داخل کیا اور نہ ہی

اپنے غیروں کی طرح اسے آحاد میں داخل کیا ہے (۵۰)

(۱).....حصاص کی تعریف:

حصاص نے متواتر کی تعریف اس طرح کی ہے:

(هو ما افاد العلم بمضمون الخبر ضرورة او نظراً) ^(۵۱) ”یعنی جس خبر کے مضمون سے علم ضروری یا نظری حاصل ہو وہ متواتر ہوتی ہے“ حصاص نے ”اونظراً“ کا اضافہ اس لئے کیا کہ اس میں مشہور بھی داخل ہو جائے۔ ^(۵۲)

(۲).....بعض علماء نے اس کی تعریف یوں بھی کی ہے۔

(هو الخبر الذى يوجب بنفسه العلم) ^(۵۳) ”یعنی خبر متواتر وہ ہوتی ہے جو بذات خود موجب

علم ہو۔“

اس تعریف سے خبر آخدا خارج ہو گئی، کیونکہ کچھ اخبار آخدا ایسی ہیں جو اصلاً موجب علم نہیں ہیں اور کچھ بذات خود موجب علم نہیں ہوتیں بلکہ محتف۔ ^(۵۴) بالقرائن ^(۵۵) ہو کر موجب علم ہوتی ہیں لیکن اس تعریف میں اشکال ہے، کیونکہ اس تعریف سے یہ وہم پڑتا ہے کہ مجرد کثرت خبرین ^(۵۶) ہی متواتر میں موجب علم ہوتی ہے۔ جو اشکال اس تعریف پر وارد ہوتا ہے اسے امام فخر الدین رازی نے ”الحصول“ میں ذکر کیا ہے۔ ^(۵۷)

(۳).....بعض نے متواتر کی تعریف سے ”بنفسه“ کا لفظ ساقط کر کے یہ تعریف کی: ((هو الخبر

الذى يوجب العلم)) یعنی ”جو خبر موجب علم ہو وہ متواتر ہوتی ہے“ اس کی تعریف میں بھی اشکال ہے کیونکہ اس میں وہ خبر آخدا بھی داخل ہو جاتی جو محتف بالقرائن ہو کر موجب علم ہوتی ہے۔ ^(۵۸)

(۴).....بعض نے متواتر کی تعریف یوں کی ہے۔ ((هو الخبر المفيد للعلم اليقيني)) ^(۵۹)

”یعنی خبر متواتر وہ ہوتی ہے جو مفید علم یقینی ہو“ یہ تعریف قابل ترجیح ہے اور ابن حجر نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔

مفید علم یقینی ہونے کے بارے میں مختلف علماء کی آراء

حدیث متواتر کے افادہ علم کے بارے میں اختلاف کی نشان دہی کرتے ہوئے الجزائری لکھتے ہیں۔
ترجمہ ”بعض کتب کلام اور کتب اصول میں یہ بات ذکر کئی گئی ہے کہ:

(۱) لوگوں کا ایک گروہ خبر متواتر کے مفید علم یقینی ہونے کا انکاری ہے اور اس گروہ کا یہ قول ہے کہ خبر متواتر سے حاصل ہونے والا علم غالب ظن قوی ہوتا ہے۔

(۲) اور ایک گروہ خبر متواتر کو امور حاضرہ میں تو مفید علم یقینی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن امور ماضیہ میں اسے مفید علم یقینی ماننے سے انکاری ہے

(۳) اور ایک تیسرا گروہ سمدیہ (ہندوستان میں سومنات کا پجاری) سرے سے خبر متواتر کے مفید علم ہونے کا انکاری ہے۔ ان کے بارے میں امام غزالی المستصفیٰ میں لکھتے ہیں کہ متواتر کا مفید علم ہونے کا اثبات تو ظاہر ہے۔ یہ سمدیہ کے خلاف ہے کیونکہ انہوں نے علم کو حواس پر منحصر سمجھا ہے اور اس (خبر متواتر کے مفید علم ہونے) کا انکار کیا ہے۔ حالانکہ ان کا (علم کو حواس پر) سمجھنا باطل ہے۔ (توجیہ النظر۔ ص ۳۸)

ابو فیض الزبیدی خبر متواتر کے علم یقینی ہونے کے بارے میں مختلف علماء کے خیالات و آراء کا یوں تذکرہ کرتے ہیں۔ ”خبر متواتر کے اپنے سامع کے لئے مفید علم ہونے میں اختلاف ہے، کیا یہ مفید علم ضروری ہے؟ نظری ہے؟ یا بین بین ہے؟

..... پہلا (مذہب) جو قابل اعتماد ہے (وہ یہ ہے کہ یہ علم ضروری کا فائدہ دیتی ہے) اور علم ضروری سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اس کا علم و یقین لازماً حاصل ہو جائے اور اس کو رد کرنا اس کیلئے

ناممکن ہو۔

۲..... دوسرا (مذہب) یعنی اس سے علم نظری کا حاصل ہونا، یہ امام الحرمین (متوفی ۴۱۹/۱۰۲۸ء) کا

قول ہے اور معتزلہ میں سے الکعبی (متوفی ۳۱۹ھ/۹۳۱ء) کا بھی یہی قول ہے۔

۳..... تیسرا مذہب جو الاعدی سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ اس میں توقف اختیار کیا جائے اور امام

الحرمین کا بھی ایک قول ایسا ہی ہے۔ (نزہۃ النظر۔ ص ۱۴)

حافظ ابن حجر کے ہاں بھی حدیث متواتر مفید علم یقینی ضروری ہوتی ہے۔^(۶۰)

اور جمہور محدثین و اصولیین کا بھی یہی مذہب ہے چنانچہ الکتانی لکھتے ہیں:

(والعلم الحاصل به ضروری علی الاصح وهو مذهب المجهور من المحدثین من
والاصولیین)^(۶۱) ”اور خبر متواتر سے حاصل ہونے والا علم اصح (زیادہ صحیح) مذہب کے مطابق علم ضروری

ہوتا ہے اور یہ جمہور محدثین اور جمہور اصولیین کا مذہب ہے۔

علم نظری کے قائلین

امام الحرمین اور الکعبی کی طرح کچھ اور علماء بھی خبر متواتر کے مفید علم نظری ہونے کے قائل ہیں۔ چنانچہ
الکتانی ان کا تذکرہ یوں کرتے ہیں ”خبر متواتر کے مفید علم ضروری ہونے سے الکعبی معتزلی ابو الحسن بصری
معتزلی اور اہل سنت میں سے امام الحرمین اور امام غزالی کو اختلاف ہے۔ یعنی یہ حضرات متواتر حدیث کے
مفید علم نظری ہونے کے قائل ہیں۔

3.4 متواتر حدیث کے رواۃ تعداد کے بارے میں مختلف علماء کی آراء

کثرت رواۃ:

کثرت رواۃ کے بارے میں مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ مثلاً:

(۱) بعض نے شہادت زنا پر قیاس کرتے ہوئے چار کا تعین کیا (۶۳)

ان کی دلیل یہ آیت ہے ﴿لَوْ لَا جَاءَ وَاَعْلِيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ﴾ (۶۴)

(۲) بعض نے کم از کم پانچ کا تعین کیا ہے (۶۵) اور ان کی دلیل شہادت لعان کے بارے میں نازل شدہ

یہ آیات ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ . وَالْخَامِسَةُ اَنْ لَعَنَ اللّٰهُ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَذٰبِيْنَ . وَيَدْرُوْا عَنْهَا الْعَذَابُ اِنْ تَشْهَدُ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهُ لَمِنَ الْكَذٰبِيْنَ . وَالْخَامِسَةُ اَنْ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (۶۶)

”اور جو اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور ان کے گواہ ان کے سوا (کوئی اور) نہ ہو تو ایسے شخص کی گواہی کی یہ صورت ہے کہ چار بار گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر کہ یہ سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اللہ کی لعنت ہو اس شخص پر اگر یہ جھوٹا ہو۔ اور عورت سے اس طرح سزا مل سکتی ہے کہ وہ چار دفعہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس (عورت) پر اللہ کا غضب ہوا اگر وہ (خاوند اپنے الزام میں) سچا ہو“

۲ اور بعض نے زمین و آسمان اور دنوں کی تعداد پر قیاس کرتے ہوئے کم از کم سات کا تعین کیا ہے۔ (۶۷)

۳ بعض نے اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ جمع کثرت کا اطلاق کم از کم دس پر ہوتا ہے، اس کے

رواۃ کی کم از کم تعداد دس بتائی ہے۔ (۶۸)

۵..... بعض نے نقباء بنی اسرائیل پر قیاس کرتے ہوئے کم از کم تعداد بارہ بتائی ہے۔ (۶۹) اور ان کی دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا﴾ (۷۰)

”اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کئے“

۶..... اور بعض کے ہاں اس کے رواۃ کی کم از کم تعداد چالیس ہے۔ (۷۱) اور ان کے پیش نظر یہ آیت ہے

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ ابْتَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۷۲)

”اے نبی! اللہ آپ کو اور آپ کے پیروکار مومنوں کو کافی ہے“

۷..... بعض کے ہاں خبر متواتر کے رواۃ کی کم از کم تعداد ستر ہونی چاہئے۔ (۷۳)

ان کی دلیل یہ آیت ہے ﴿وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ جَلَالَةً لِّمِيقَاتِنَا﴾ (۷۴)

”اور موسیٰ نے ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر حاضر ہونے کے لئے قوم کے ستر سردار منتخب کئے“

الکتانی نے حافظ ابن حزم سے خبر متواتر کی مقبولیت کے لئے مختلف لوگوں سے مختلف تعداد نقل کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ بعض نے تعداد تمام اہل مشرق و مغرب بتائی ہے اور ایک جماعت نے بے شمار تعداد اس کیلئے شرط قرار دی ہے، بعض نے کم از کم اہل بدر کی تعداد کے برابر تین سو دس سے کچھ زائد، بعض نے بیس، بعض نے پندرہ، بعض نے بارہ، ایک جماعت نے کم از کم چار اور ایک جماعت نے یہ تعداد تین بتائی ہے۔ (۷۵)

لیکن یہ تمام خیالات بلا دلیل ہیں، چنانچہ حافظ ابن حزم لکھتے ہیں۔

”یہ تمام اقوال بلادلیل ہیں“ (۷۶) اگرچہ یہ مختلف تعداد قرآن مجید کی مختلف آیات یا بعض احادیث سے استنباط کی گئی ہے۔ لیکن اس کو قطعی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ آیات مخصوص واقعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے انہیں متواتر کے رواۃ کی تعداد قطعی بنیاد بنانا واضح نہیں ہوتا۔

لہذا جو تعداد بھی مفید علم ضروری ہو وہ کافی ہے، اور یہی صحیح ہے اور حافظ ابن حجر کی رائے بھی یہی ہے چنانچہ آپ لکھتے ہیں (لا معنی لتعيين العدد على الصحيح) (۷۷) یعنی صحیح مذہب کے مطابق تعداد کا تعین بے معنی ہے۔

خود آزمائی ②

- ۱- خبر متواتر کی حیثیت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تبصرہ کیجئے۔
- ۲- خبر متواتر اور خبر واحد کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ تجزیہ کریں
- ۳- خبر متواتر کے بارے میں علماء اصول کے موقف کی وضاحت پیش کریں۔
- ۴- کیا خبر متواتر کے رواۃ کی تعداد ہر طبقہ میں کثیر، ہونا ضروری ہے؟
- ۵- خبر متواتر کے رواۃ کی تعداد کے بارے میں جو اقوال منقول ہیں ان کو جمع کیجئے۔

حواشی

- ۱ ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی: نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ص ۸: فاروقی کتب خانہ ملتان
- ۲ حمد بن فارس بن زکریا، ابوالحسن: معجم مقاییس اللغة تاج ۶، ص ۸۴: مکتبۃ الاعلام الاسلامی، ۱۴۰۴۔
- ۳ الجوهري، اسماعيل بن حماد: تاج اللغة وصحاح العربية: ج ۲ ص ۸۴۳: دار الملائین، بیروت۔
- ۴ مدارکت: ایک چیز کا دوسری چیز کو پالینا۔
- ۵ مواصلة: ایک چیز کا دوسری چیز سے مل جانا۔
- ۶ ابن الصلاح، عثمان بن عبد الرحمن، ابو عمرو، الحافظ: ص ۳۵: فاروقی کتب خانہ، ملتان
- ۷ الجزائری، طاہر بن صالح بن احمد الدمشقی: توجیہ النظر الی اصول الاثر: ص ۴۲: دار المعرفۃ، بیروت۔
- ۸ نزہۃ النظر توضیح نخبۃ الفکر: ص ۱۲۹۔
- ۹ توجیہ النظر الی اصول الاثر: ص ۴۶
- ۱۰ کشمیری، محمد انور، مولانا فیض الباری علی صحیح البخاری: ج ۱ ص ۷۰: المجلس العلمی ڈابھیل، ہندوستان۔
- ۱۱ القاسمی، محمد جمال الدین: قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث: ص ۱۴۶: دار اکتب العلمیہ، بیروت۔
- ۱۲، ۱۳ الزبیدی، محمد مرتضیٰ، الحسینی: لفظ اللائی المتناثرة فی الاحادیث المتواترة (تحقیق: محمد عبدالقادر عطا دار الکتب العلمیہ، بیروت: ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)
- ۱۴ مقدمہ ابن الصلاح: ۲: ۱۳۵
- ۱۵ قواعد التحدیث: ص ۶: ۴۶ بابا الکتانی جعفر، ابو الفیض: نظم الحاثین من الحدیث المتواتر: ص ۱۱۳، ۱۱۴

- دارالباز، مکتہ المکتزہ، السیوطی، عبدالرحیم بن ابی بکر، جلال الدین: تدریب الراوی فی شرح تقریب النوادی: ج ۲ ص: ۱۸۰: دارالکتب العلمیہ، بیروت: ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء
- قواعد التحدیث: ص ۱۴۶، ۱۴۷
- ۱۶
- النووی: یحییٰ بن شرف: محی الدین: الشرح علی الجامع الصحیح: ج ۱ ص: ۲۹۳: کتب خانہ رشیدیہ، دہلی
- ۱۷
- الترمذی، محمد بن عیسیٰ ابو عیسیٰ: جامع الترمذی: ج ۱ ص: ۵۹: کتب خانہ رشیدیہ دہلی
- ۱۸
- یعنی ایسا صحابی جس کا نام غیر معروف ہے (نظم المتناثر ص: ۱۱۵)
- ۱۹
- العینی، محمود بن احمد، ابو محمد، بدر الدین: عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری: ج ۷ ص: ۱۹۷، ۱۹۸: دارالفکر
- ۲۰
- نظم المتناثر من الحدیث المتواتر: ص ۱۱۴
- ۲۱
- نفس المرجع
- ۲۲
- نفس المرجع
- ۲۳
- دونوں موزوں پر مسح کرنا
- ۲۴
- القشیری، النیشاپوری، محمد بن حجاج: الجامع الصحیح: ج ۱ ص: ۱۳۴: کتب خانہ رشیدیہ دہلی
- ۲۵
- نظم المتناثر من الحدیث المتواتر: ص ۴۳
- ۲۶
- نفس المرجع
- ۲۷
- نفس المرجع: ص ۴۴ لفظ اللابی المتناثرہ فی الاحادیث المتواترہ، ص ۳۷ بافتح الباری: ج ۱ ص: ۳۰۶
- ۲۸
- نفس المرجع
- ۲۹
- نفس المرجع: ص ۵۸
- ۳۰
- لفظ اللابی المتناثرہ فی الاحادیث المتواترہ، ص: ۲۰۷، ۲۱۳
- ۳۱
- فتح الباری، ج ۲، ص: ۲۲۰
- ۳۲
- السیوطی عبدالرحمن بن ابی بکر، جلال الدین: تدریب الراوی فی شرح تقریب النوادی، ج ۲: ۷۹، ۸۰
- ۳۳
- دارالکتب العلمیہ، بیروت: ۱۴۰۹ھ-۱۹۸۹ء

- ۳۴ نظم المتناثر من الحديث المتواتر: ص ۵۹
- ۳۵ السنبلی، محمد حسن الفقیہ: تنسيق النظام في مسند الامام: ص ۵۱ میر محمد کتب خانہ، مرکز علم و ادب، کراچی
- ۳۶ فتح الباری: ج ۲- ص ۲۲۰
- ۳۷ نفس المرجع: ص: ۴۹
- ۳۸ نفس المرجع
- ۳۹ لفظ اللائی المتناثرة في الاحاديث المتواتره: ص: ۱۷
- ۴۰ قواعد التحدیث: ص: ۱۴۶
- ۴۱ نظم المتناثر من الحديث المتواتر: ۶
- ۴۲ مقدمہ ابن الصلاح: ص: ۱۳۵
- ۴۳ نظم المتناثر من الحديث المتواتر: ص: ۶
- ۴۴ قواعد التحدیث: ص: ۱۴۷
- ۴۵ نفس المرجع: ص: ۱۴۷
- ۴۶ لفظ اللائی المتناثرة في الاحاديث المتواتره: ص: ۱۷
- ۴۷ نفس المرجع: ص: ۱۸، ۱۹
- ۴۸ نظم المتناثر: ص: ۷
- ۴۹ نزہۃ النظر فی توضیح نخبة الفكر: ص: ۱۷
- ۵۰ المرجع السابق
- ۵۱ توجیہ النظر الی اصول الاثر: ص: ۳۶
- ۵۲ توجیہ النظر الی اصول الاثر: ص: ۳۶
- ۵۳ نفس المرجع
- ۵۴ محتف بالقراءن: قراءن میں گہری ہوئی خبر

۵۵ قرآن: یہ قرینہ کی جمع ہے اور قرآن کی دو قسمیں ہیں۔

۱- قرآن متصل۔

۲- قرآن منفصلہ

قرآن متصلہ خان کا تعلق مخبر، مخبر بہ اور خبر کے ساتھ ہوتا ہے۔

مخبر: یہ گویا کذب بیانی میں غیر معروف ہوتا ہے، اسے اس خبر میں خوف و لالچ پر ابھارنے والی ایسی چیز نہیں ہوتی جس کے بارے میں خبر دی جائے۔ یہ ایک ممکن الوقوع چیز ہوتی ہے، خاص کر اگر اس سے پہلے چند مقدمات کا ظہور ہو جائے تو اس کا واقع ہونا روشن ہو جاتا ہے۔

مخبر: جس چیز کے بارے میں خبر دی جائے۔ یہ ایک ممکن الوقوع چیز ہوتی ہے، خاص کر اگر اس سے پہلے چند مقدمات کا ظہور ہو جائے تو اس کا واقع ہونا روشن ہو جاتا ہے۔

خبر: یہ تو ایسی واضح صورت میں پھیلی ہوتی ہے کہ اس میں کوئی توقف اور اضطراب نہیں ہوتا۔

قرآن منفصلہ: جس کا تعلق مذکورہ تینوں چیزوں سے نہیں ہوتا، اس کی مثال ایسے ہے کہ کسی رئیس کے

بیمار بیٹے کی خبر وفات ایک جماعت نے دی۔ اس کے ساتھ ہی ایسا ہوا کہ رئیس (لڑکے کے باپ)

ننگے سر، ننگے پاؤں، پٹھے پرانے کپڑوں اور اضطراب کی حالت میں گھر سے نکلا، جبکہ وہ بڑے مرتبہ

والا، صاحب ثروت شخص ہے۔ اسکی مذکورہ بالا حالت اس جیسے مصیبت کے بغیر بدل نہیں سکتی، تو یہ

اس ”خبر وفات“ کا منفصلہ قرینہ“ ہے جس کا اس خبر کی صداقت میں بہت بڑا دخل ہے۔ (توجیہ النظر

الی اصول الاثر: ص: ۴۱)

۵۶ مجرد کثرت: مجرد کثرت مخبرین کی وضاحت کرتے ہوئے امام رازی المحصول میں لکھتے ہیں کہ اگر

ہم اس بات پر غور کریں کہ ایک شہر کے باشندوں کو اگر معلوم ہو کہ جب تمام شہروں کے رہنے والوں

کو ان کے شہر میں پھونسنے والی وبا کا علم ہوگا تو وہ ان کے شہر میں آنا ترک کر دیں گے۔ اگر انہوں

نے ان کے شہر میں آنا ترک کر دیا، تو ان کے شہر کی معیشت تباہ ہو کر رہ جائیگی اور اس شہر کے

باشندے ہوں بھی علماء اور دانشور، تو صورت مذکورہ میں ان کے لئے جھوٹ پر متفق ہو جانا جائز ہوگا۔

اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ، تو اس امکان کی وجہ سے ثابت ہوا کہ رغبت لالچ کی وجہ سے

خلق عظیم بھی جھوٹ پر متفق ہو سکتی ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ بسا اوقات بہت سارے لوگ ایسی چیز کے بارے میں خبر دیتے ہیں جس کے اظہار کا تقاضا بادشاہ کی حکومت و ریاست کیا کرتی ہے۔ اور خبر دینے والے بادشاہ کے لشکر کے رؤساً ہوتے ہیں۔ تو اس صورت میں ان کا حکومتی کنٹرول کے تحت جھوٹ پر مجتمع ہونا تصور کیا جائے گا اور اگر وہ متفرق ہوں اور حکومتی کنٹرول کے تحت نہ ہوں تو ان کے بارے میں یہ وہم نہیں ہو سکتا۔
(توجیہ النظر الی اصول الاثر: ص: ۴۱)

۵۷	نفس المرجع: ص: ۴۰
۵۸	نفس المرجع
۵۹	نفس المراجع بانزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ النظر: ۱۴
۶۰	نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ص: ۱۴
۶۱	نظم المتناثر من الحدیث المتواتر: ص: ۸
۶۲	نفس المرجع
۶۳	نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ص: ۱۰
۶۴	النور: ۱۳
۶۵	المرجع السابق
۶۶	النور: ۶-۹
۶۷	نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ص: ۱۰
۶۸	نفس المرجع
۶۹	نفس المرجع
۷۱	المائدة: ۱۲
۷۱	نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ص: ۱۰

- ۷۲ الانفال: ۶۳
 ۷۳ المرجع السابق
 ۷۴ الاعراف: ۱۵۵
 ۷۵ توجیہ النظر الى اصول الاثر: ص: ۴۲
 ۷۶ نفس المرجع
 ۷۷ نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر: ص: ۱۰



یونٹ نمبر 9

خبر واحد کی حجیت

تحریر: ڈاکٹر علی اصغر چشتی
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی



فہرست مضامین

293	یونٹ کا تعارف
294	یونٹ کے مقاصد
295	① خبر واحد
295	1.1 خبر واحد کا لغوی مفہوم
295	1.2 خبر واحد کا اصطلاحی مفہوم
	1.3 خبر واحد کی اقسام
297	1.4 خبر واحد کی حیثیت
299	1.5 دلائل
300	خود آزمائی نمبر ۱
301	② خبر واحد کی حجیت اور عہد رسالت
307	③ خبر واحد کی حجیت اور عہد صحابہؓ
311	3.1 عہد صحابہ کے بعد خبر واحد کی حجیت
314	خود آزمائی نمبر ۲

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇐ خبر واحد کی تعریف بیان کر سکیں۔
- ⇐ خبر واحد کی حیثیت کے بارے میں مختلف اقوال پیش کر سکیں۔
- ⇐ خبر واحد کی حیثیت کے بارے میں جمہور علماء کے موقف پر بات کر سکیں۔
- ⇐ خبر واحد کی حیثیت قرآنی آیات سے ثابت کر سکیں۔
- ⇐ خبر واحد کی حیثیت پر دور رسالت کے واقعات کی روشنی میں بحث کر سکیں۔
- ⇐ خبر واحد کی حیثیت پر عہد صحابہ کے واقعات کی بنیاد پر تبصرہ کر سکیں۔
- ⇐ خبر واحد پر عمل کے بارے میں مشہور فقہاء کے اقوال اور آراء پیش کر سکیں۔

① خبر واحد

علمائے حدیث نے روایت کو راویوں کی تعداد کے لحاظ سے ابتدائی طور پر ان دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) خبر متواتر (۲) خبر واحد

خبر متواتر کی تعریف اور حیثیت کے بارے میں آپ یونٹ نمبر ۸..... میں تفصیل کے ساتھ مطالعہ کر چکے ہیں..... اس یونٹ میں آپ خبر واحد کی تعریف اور حیثیت و حجیت کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔

1.1 خبر واحد کا لغوی مفہوم:

لغوی اعتبار سے خبر واحد کے معنی اس خبر کے ہیں جسے کسی ایک شخص نے بیان کیا ہو۔ ”خبر الواحد فی اللغة ما یرویه شخص واحد“ (الوجیز: ص ۱۶۱)

1.2 اصطلاحی مفہوم:

علمائے حدیث کی اصطلاح میں خبر واحد سے مراد وہ حدیث ہے جس کے راویوں کی تعداد تواتر کے درجہ تک نہ پہنچے..... علامہ طاہر بن صالح الجزائری اپنی کتاب ”توجیہ النظر إلى أصول الاثر“ میں خبر واحد کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”خبر الواحد حاد جسے عام طور پر خبر واحد کہا جاتا ہے۔ ایسی خبر ہے جس کے رواۃ کثرت میں خبر متواتر کے رواۃ کی تعداد کو نہ پہنچیں۔ خواہ مخبر ایک ہو، دو ہوں، تین ہوں، چار ہوں یا پانچ ہوں یا اس کے علاوہ اتنی تعداد تک پہنچ جائیں جس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ خبر واحد، متواتر کے دائرہ میں داخل ہو گئی ہے۔ (توجیہ النظر

(ص ۲۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں ”مالم یجمع شروط التواتر“ نزہۃ النظر..... ص ۲۱)

جس خبر میں تواتر کی شروط نہ پائی جائیں وہ خبر واحد کہلاتی ہے۔ اس تعریف کی رو سے خبر واحد کے دائرہ میں مندرجہ ذیل تین قسم کی خبریں آتی ہیں۔

(۱) خبر مشہور (۲) خبر عزیز (۳) خبر غریب

علمائے اصول میں سے امام ابو بکر بھاص نے خبر مشہور کو مستقل حیثیت دی ہے۔ علامہ طاہر بن صالح لکھتے ہیں۔

(وقد قسم بعض علماء الاصول الخبر الى ثلاثة أقسام، متواتر ومشہور واحاد، فجعلوا المشہور قسماً مستقلاً بنفسه، ولم يدخلوه في المتواتر كما فعل الجصاص (توجیہ النظر..... ص ۳۶)

بعض اہل اصول نے خبر کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ متواتر، مشہور اور احاد۔ ان حضرات نے ”مشہور“ کو مستقل حیثیت دی ہے اور اسے متواتر میں شامل نہیں کیا ہے۔ جیسے کہ ابو بکر بھاص کا موقف ہے۔

امام غزالی کے مطابق خبر واحد وہ حدیث ہے جسے پانچ یا چھ راویوں تک کی جماعت نے روایت کیا ہو لیکن وہ حد تواتر سے نیچے ہے..... (المحصفی - ج ۱ - ص ۱۹۳)

احناف کے نزدیک خبر واحد وہ حدیث ہے جسے ایک دو یا زیادہ صحابی اس طرح روایت کریں کہ وہ حد تواتر اور شہرت کو نہ پہنچے۔ اس طرح ایک دو یا زیادہ تابعی روایت کریں لیکن یہ تعداد حد تواتر اور شہرت کو نہ پہنچے یا تبع تابعی ایک دو یا زیادہ تعداد میں روایت کریں بشرطیکہ وہ حد تواتر و شہرت کو نہ پہنچے (اصول السنن - ج ۱ - ص ۳۹۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں۔

خبر واحد کو راوی کے صدق و کذب کی بنا پر مقبول و مردود قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس خبر کا دار و مدار راویوں کے حالات پر ہوتا ہے..... جہاں تک خبر متواتر کا تعلق ہے تو اس میں راویوں کے حالات کی بحث نہیں ہوتی خبر متواتر تو بالکل مقبول ہوتی ہے خبر واحد میں چونکہ تواتر کی صفت نہیں ہوتی اس لئے اس کی تین اقسام قرار پائیں۔

(۱)..... مقبول :- وہ خبر جس میں خبر دینے والے (راوی) کی صداقت کو ترجیح حاصل ہو۔ روایت کرنے والے کی مسلمہ صداقت کے پیش نظر اسے مقبول کہا جاتا ہے۔

(۲)..... مردود :- وہ خبر جس میں خبر دینے والے کی صداقت کو ترجیح حاصل نہ ہو بلکہ صفت رد، یعنی نقل کرنے والے کا جھوٹ واضح ہو اسے خبر مردود کہا جاتا ہے۔

(۳)..... متوقف فیہ :- وہ خبر جس میں صدق و کذب میں سے کوئی پہلو قابل ترجیح نہ ہو اسے ”متوقف فیہ“ کہا جائے گا۔ الا یہ کہ کوئی قرینہ اسے مقبول یا مردود بنا دے۔ توقف عن العمل اگرچہ مردود ہی کی ایک صورت ہے مگر اس لئے نہیں کہ اس میں مردود کی صفات ہیں بلکہ اس لئے کہ اس میں قبولیت کی صفات نہیں پائی جاتیں..... (نزہۃ النظر۔ ص ۲۸)

1.4 خبر واحد کی حیثیت:

خبر واحد پر عمل کے سلسلے میں تین نقطہ ہائے نظر ہیں۔

(۱) خبر واحد پر عمل ممنوع ہے۔

(۲) خبر واحد پر عمل جائز ہے۔

(۳) خبر واحد پر عمل واجب ہے۔

ان تین نقطہ ہائے نظر سے تعلق رکھنے والے علماء کے دلائل اصول کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ پائی

جاتی ہیں۔ یہاں ان میں سے ہر ایک کے دلائل اور جوابی دلائل پر گفتگو کرنا اس لئے مشکل ہے کہ یونٹ بہت طویل ہو جائے گا۔ اس لئے ہم صرف جمہور علماء کے موقف پر بات کریں گے اور دیکھیں گے کہ ان حضرات نے اپنے موقف کو کس طرح پیش کیا ہے۔

جمہور علماء کی رائے میں خبر واحد پر عمل ضروری ہے۔ قاضی بیضاوی نے معاملات اور امور دینیہ میں وجوب عمل پر اتفاق نقل کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔ (اتفقوا علی الوجوب فی الفتویٰ، والشہادة والأموال الدینیة) (نہایۃ السؤل شرح منهاج الوصول فی علم الاصول ۲/۲۳۰)

”جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ فتویٰ، شہادت اور امور دینیہ میں خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے۔“

امام شافعی نے اپنی مشہور کتاب ”الرسالۃ“ میں دو مختلف ابواب میں خبر واحد پر مفصل بحث کی ہے ایک باب کا عنوان ہے ”الحجة فی تثبیت خبر الواحد“ اس میں خبر واحد کے ثبوت سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح باب ”خبر الواحد“ میں بھی خبر واحد کی حجیت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں ﴿اذا ثبت الخبر عن النبی بهذه الصفة، وجب قبوله والعمل به و ترک مخالفته﴾ (الكفاية فی علم الرویة ص ۲۰)

جب کوئی خبر اس اصول کے مطابق رسول اکرمؐ سے ثابت ہو جائے تو اسے قبول کرنا،

اس پر عمل کرنا اور اس کی مخالفت نہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

امام ابن حزم اندلسی نے ابوسلیمان، حسین بن علی الکرانیسی اور حارث بن اسد المجاسبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے (ان الخبر الواحد العدل عن مثله إلی رسول الله ﷺ یوجب العلم والعمل معاً وبهذا نقول) (الإحکام فی أصول الاحکام، ج ۱، ص ۱۱۹)

وہ خبر واحد جس کا راوی عادل ہو اور وہ اسے اپنے جیسے عادل راویوں سے نقل کرے یہاں تک کہ اس کی سند رسول اکرم ﷺ تک پہنچ جائے تو اس کو ماننا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ یہی ہمارا موقف ہے۔

1.5 دلائل:

(۱) قرآن مجید نے بعثت انبیاء کے سلسلہ میں مختلف انبیاء کا ذکر کیا ہے۔ قرآن مجید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکیلے اپنی قوموں کے پاس دعوت الہی لے کر پیش ہوئے۔ اگر ایک آدمی کی خبر واجب العمل نہ ہوتی تو انکار کرنے والے مستحق عذاب کیسے ٹھہرتے؟ قرآن مجید کے یہ الفاظ خبر واحد پر حجت ہیں۔

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ ، فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرِهِ﴾ (الاعراف : ۵۹)

”ہم نے (حضرت) نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ انہوں نے اپنی قوم کے افراد کو مخاطب کر کے کہا: میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں“.....

﴿وَالِی ثمود اخاهم صالحاً . قَالَ یقُولُ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَکُمْ مِنْ إِلَهٍ غَیْرِهِ﴾ (الاعراف . ۷۳)

”اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ انہوں نے کہا میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں“
رسول اکرم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَیْکَ کَمَا أَوْحِینَا الِی نُوْحٍ وَالنَّبِیِّیْنَ مِنْ بَعْدِهِ﴾ (النساء: ۱۶۳)

”اے محمد ﷺ! ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کی طرف بھیجی تھی“

ان آیات سے ثابت ہوا کہ قوموں کی طرف ایک ایک نبی بھیجا گیا اور اس کی بات کو حجت قرار دیا

گیا۔ صرف سورہ یاسین میں دو اور تین کا ذکر ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ خبر واحد میں ایک سے زیادہ رواۃ کی گنجائش موجود ہے۔

خود آزمائی ①

- ۱- خبر واحد کا لغوی مفہوم کیا ہے۔
- ۲- خبر واحد کی اصطلاحی تعریف اور مفہوم بیان کیجئے۔
- ۳- خبر واحد کی اقسام کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔
- ۴- خبر واحد کی حیثیت اور حجت پر ایک نوٹ لکھئے۔
- ۵- جو علماء خبر واحد کی حجت کو تسلیم نہیں کرتے ان کے بنیادی دلائل کی نشاندہی کیجئے۔

② خبر واحد کی حجت اور عہد رسالت

قرآنی نظائر پیش کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کا بھی جائزہ لے لیا جائے کہ خود نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں خبر واحد کے رد و قبول کے بارے میں صورت حال کیا تھی۔ اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ سے بے شمار ایسے واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے خبر واحد کی حجت ثابت ہوتی ہے لیکن یہاں صرف حوالے کے طور پر چند چیدہ چیدہ واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)..... ایک شخص نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لیا مگر بعد میں اسے شدید ندامت کا احساس ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کو مسئلہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا وہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حقیقت حال بیان کی۔ حضرت ام سلمہؓ نے جواب دیا: ”رسول اللہ ﷺ بھی روزہ کی حالت میں ایسا کر لیا کرتے ہیں“ اس خاتون نے واپس جا کر اپنے شوہر کو بتایا تو وہ ناراض ہو کر کہنے لگا۔ ”ہم رسول اللہ ﷺ کی طرح نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے لئے جو چاہے حلال کر دے“..... وہ خاتون پھر حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”یہ خاتون کس مقصد کیلئے آئی ہے؟ حضرت ام سلمہؓ نے اس کے آنے کا سبب بتایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ روزہ کی حالت میں، میں بھی اس طرح کر لیا کرتا ہوں۔ حضرت ام سلمہؓ نے پوری تفصیل بتائی اور کہا کہ اس کے شوہر نے میرے جواب کے بارے میں اس طرح کی بات کی..... رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: ”میں تم میں سے زیادہ متقی اور حدود اللہ کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں“۔

اس واقعہ میں نبی کریم ﷺ کا یہ قول کہ ”کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں بھی روزہ کی حالت میں اس طرح کر لیا کرتا ہوں“ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کی ذات سے متعلق ایک عمل کی خبر جو حضرت ام سلمہؓ نے اس خاتون کو دی تھی وہ نبی کریم ﷺ کی نظر میں خبر واحد ہونے کے باوجود معتبر اور قابل قبول تھی۔

اگر آپ ﷺ کی نظر میں حضرت ام سلمہؓ کا بیان حجت نہ ہوتا تو آپ ان سے اس بیان کے بارے میں اس طرح دریافت نہ فرماتے۔ اسی طرح اس شخص کی بیوی کی خبر اپنے شوہر کے قول کے بارے میں اگر آپ ﷺ کی نظر میں قابل تسلیم نہ ہوتی تو آپ ﷺ اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار نہ فرماتے۔

(۲)..... لوگ مسجد قبا میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا قاصد تحویل قبلہ کی خبر لے کر ان کے پاس پہنچا۔ سب نے اس کا کلام سنتے ہی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس کی طرف سے ہٹا کر بیت اللہ کی طرف کر لیا..... اہل قبا انصار میں سابق الاسلام تھے وہ نماز جیسے فریضہ کو صرف اسی صورت میں ترک کر سکتے تھے جب ان پر کوئی شرعی حجت قائم ہو جاتی۔ تحویل قبلہ کی خبر نہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے بذات خود سنی نہ کسی جماعت نے آ کر انہیں یہ خبر سنائی بلکہ صرف ایک شخص سے یہ خبر سن کر وہ کعبۃ اللہ کی جانب پھر گئے۔ معلوم ہوا ان کے نزدیک دینی امور میں خبر واحد حجت تھی۔ بالفرض ان کا یہ اقدام اگر غلط ہوتا تو یقیناً نبی کریم ﷺ ان کو تنبیہ فرماتے کہ جب تم ایک قطعی قبلہ پر قائم تھے تو تم نے صرف ایک شخص کے کہنے پر ایک فرض قطعی کو کیسے چھوڑ دیا اور براہ راست میری ہدایت یا خبر متواتر کا انتظار کیوں نہ کیا مگر یہاں تنبیہ یا اعتراض تو درکنار اپنی جانب سے فرد واحد کا بھیجنا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خود نبی کریم ﷺ کے نزدیک بھی دین کے بارے میں ایک ثقہ راوی اور صادق شخص کی دی ہوئی خبر معتبر اور حجت تھی..... یہ واقعہ تو بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خبر واحد کا قبول کرنا صرف جائز ہی نہیں فرض ہے۔ اگر خبر واحد کو قبول کرنا صرف جائز ہوتا تو سابق الاسلام صحابہ ایک یقینی اور قطعی فریضہ (بیت المقدس کی طرف رخ کرنے) کو حالت نماز میں ترک کر کے ایک غیر یقینی خبر کی بنا پر دوسرے قبلہ کی جانب متوجہ نہ ہوتے اس لئے کہ ایک یقینی امر کو دوسرے یقینی امر ہی کی بنا پر ترک کیا جاسکتا ہے۔

(۳)..... حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں ابو عبیدہؓ، ابو طلحہؓ اور ابی بن کعبؓ کو شراب پلا رہا تھا کہ دفعۃً ایک شخص آیا اور اس نے خبر دی کہ شراب حرام ہو گئی۔ یہ سن کر فوراً ابو طلحہؓ نے کہا: ”انس! اٹھو اور شراب کے مٹکے توڑ ڈالو“ میں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر ان منکوں پر دے مارا جس سے وہ ریزہ ریزہ

ہو گئے۔

ان صحابہ کرام کا جو علمی مقام تھا اور صحبت نبوی ﷺ کے لحاظ سے یہ جس مرتبہ پر فائز تھے کوئی صاحب علم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے شراب پہلے شرعاً حلال تھی اور عام لوگ ان دنوں شراب پیتے تھے لیکن اچانک ایک شخص آ کر حرمت شراب کی خبر دیتا ہے اور شراب کے منکوں کے مالک ابو طلحہ غوری طور پر ان کو توڑنے کا حکم دے دیتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ آنیے نبی کریم ﷺ سے دریافت کر لیں یا عام لوگوں سے پوچھ لیں۔ نہ کسی نے یہ اعتراض کیا کہ قبل از تحقیق یہ اضاعت مال اور اسراف بے جا قزین عقل نہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ سب ایک شخص کی خبر پر پورا پورا اعتماد کرتے تھے۔

(۴)..... نبی کریم ﷺ نے زنا کے ایک مقدمہ میں زانی کے اقرار پر اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ اور جس عورت کے متعلق اس شخص نے زنا کا اقرار کیا تھا۔ اس کے پاس حضرت انیس کو بھیجا اور فرمایا کہ اس سے دریافت کرو اگر وہ بھی اقرار کر لے تو اس کو رجم کر دو ورنہ اس شخص کو حد قذف بھی لگاؤ کہ اس نے بلا شرعی ثبوت کے ایک عورت پر زنا کی تہمت کیسے رکھی۔ حضرت انیس پہنچے۔ اس عورت نے زنا کا اقرار کیا اور وہ رجم بھی کر دی گئی۔

اس واقعہ سے بھی خبر واحد کا حجت ہونا واضح ہوتا ہے نبی کریم ﷺ کا ایک فرد واحد کو رجم کا حکم دے کر بھیجنا اور ایک فرد واحد کے ذریعہ سے پہنچے ہوئے حکم نبوی کے سامنے اس خاتون کا اپنے آپ کو رجم کے لئے پیش کر دینا دونوں اپنی اپنی جگہ پر خبر واحد کی حجت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

(۵)..... عمرو بن سلیم الزرقی اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم مقام منیٰ میں مقیم تھے کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ اونٹ پر سوار چلا چلا کر یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ کھانے پینے کے دن ہیں کوئی شخص روزہ نہ رکھے۔

ظاہر ہے نبی کریم ﷺ اسی صورت میں ایک فرد واحد کو یہ پیغام پہنچانے کیلئے بھیج سکتے تھے جب اس کا

قول واجب التسليم حجت ہو ورنہ آپ ﷺ اس پیغام رسانی کے لئے چند آدمیوں کو بھی مامور فرما سکتے تھے۔

(۶)..... یزید ابن شیبان کہتے ہیں کہ ہم عرفات میں ایک ایسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے جو نبی کریم کی قیام گاہ سے کافی دور تھی اسی اثنا میں ہمارے پاس حضرت مرلیح انصاریؓ آئے اور کہا کہ میں آپ لوگوں کی طرف رسول اللہ کا قاصد بن کر آیا ہوں۔ آپ نے حکم دیا ہے کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو وہاں سے منتقل ہونے کی ضرورت نہیں مطلب یہ تھا کہ میدان عرفات میں جہاں بھی قیام ہو جائے فریضہ وقوف ادا ہو جاتا ہے..... اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے اگر خبر واحد نبی کریم ﷺ کے نزدیک حجت نہ ہوتی تو ایک آدمی کے بجائے ایک جماعت کو اس پیغام رسانی کے لئے مامور فرماتے۔

(۷)..... ۹ھ میں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر کو امیر حج بنا کر بھیجا مختلف علاقوں اور قبیلوں کے حاجی جمع تھے آپ نے ان کو احکام حج بتلائے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی سے انکو مطلع کیا۔ احکام حج سنانے اور مناسک حج ادا کرانے کے لئے ”تہا حضرت ابو بکرؓ کا مامور کیا جانا خبر واحد کی حجت کی کھلی دلیل ہے۔“

(۸)..... اسی طرح ۹ھ میں ہی اسی حج کے موقع پر حضرت علیؓ کو روانہ کیا گیا کہ وہ کفار کو سورۃ برات کی تازہ نازل شدہ آیات سنا کر ہوشیار کر دیں کہ انہوں نے خود بد عہدی کی ہے اب اللہ تعالیٰ کا بھی ان سے کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔

نبی کریم ﷺ کی جانب سے ایک فرد واحد کو احکام قرآنی پہنچانے کیلئے روانہ فرمانا اسی صورت میں کار آمد اور مفید ہو سکتا تھا جب اس کا قول لوگوں پر حجت ہوتا۔

(۹)..... حجة الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے حق میں با واز بلند تعریفی کلمات ارشاد فرمائے جو آپؐ کی بات یاد رکھ کر دوسروں تک پہنچائے..... آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

((نَصْرُ اللَّهِ عِندَ سَمْعٍ مُّقَالَتِي، فَوَعَاها، ثُمَّ إِذَا هِيَ إِلَى مَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا))

”اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور پھر اسے

اس تک پہنچایا جس نے نہیں سنا تھا“

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے کسی ایک شخص کے لئے اپنی بات کو محفوظ کر کے دوسرے شخص تک پہنچانے پر خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔ حدیث میں واحد کا صیغہ ”عبد“ استعمال کیا گیا ہے جو فرد واحد پر دلالت کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فرد واحد کی اطلاع دوسرے کے لئے قابل حجت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ ایک شخص کی اطلاع پر خوشی کا اظہار نہ فرماتے اور نہ خبر دینے والے کے حق میں آپ کی زبان مبارک سے دعائیہ کلمات صادر ہوتے۔

(۱۰)..... حجة الوداع کا موقع ہے اور منیٰ کا میدان ہے نبی کریم ﷺ اپنے خطبہ کا اختتام اس مشہور متواتر فقرے پر ختم فرماتے ہیں۔

((الا فليبلغ الشاهد الغائب))..... (چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ غائب تک پہنچاتا جائے)

یہاں بھی نبی کریم ﷺ نے ارشادات نبویؐ روایت کرنے والے کے لئے واحد کا صیغہ ”شاهد“ استعمال کیا ہے جو ظاہر ہے فرد واحد پر دلالت کرتا ہے اگر فرد واحد کی اطلاع دوسرے کے لئے قابل حجت نہ ہوتی تو نبی کریمؐ واحد کے بجائے بالالتزام جمع کا صیغہ استعمال فرماتے۔

یہ چند واقعات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ سے ایسی بے شمار نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے خبر واحد کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کے واقعات کے علاوہ ایسے نظائر بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مختلف اطراف و اکناف میں اپنے عمال روانہ فرمائے مگر کہیں بھی ان میں مدد کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ اکثر و بیشتر آپ نے ایک ہی عامل روانہ فرمایا چنانچہ حضرت قیس بن عاصمؓ، حضرت زبیر بن بدرؓ اور حضرت ابن نوریہؓ کو فرداً فرداً ہی اپنے قبائل کی طرف بھیجا۔ اسی طرح وفد بحرین کے ساتھ حضرت سعید بن العاصؓ کو اور یمن کی جانب حضرت معاذ بن جبلؓ کو روانہ

کیا۔ آپ ﷺ نے جتنے عمال بھی بھیجے ہیں تاریخ کے اوراق میں ان کے نام بھی محفوظ ہیں اور وہ مقامات بھی درج ہیں جہاں انہیں بھیجا گیا لیکن کوئی بتا سکتا ہے کہ کبھی آپ ﷺ نے بطور خاص ان میں عدد کا لحاظ کیا ہو۔ آپ نے اگر اہتمام کیا تو صرف اس بات کا کہ ایسے لوگ بھیجے جائیں جو معروف ہوں اور لوگ ان کی صداقت و امانت سے آشنا ہوں۔ تاریخ میں کہیں منقول نہیں کہ نبی کریم کے عاتلوں کے ساتھ کسی نے یہ مناقشہ کیا ہو کہ چونکہ یہ ایک ہی فرد ہے اس لئے اس کو صدقات و عشر نہیں دیئے جائیں گے.....

اسی طرح نبی کریم ﷺ جب مختلف دیار و امصار کی طرف فوجی دستے روانہ کرتے تو ایک ایک صحابی کو ہی دستے کا امیر مقرر فرماتے چنانچہ جب مقام موتہ کی طرف فوج روانہ کی تو حضرت زید بن حارثہؓ کو سالار لشکر مقرر فرمایا، ان کے شہید ہونے پر حضرت جعفرؓ کو اور پھر ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو امیر لشکر مقرر کئے جانے کی تاکید فرمائی۔

اس کے علاوہ ایک زمانے میں آپ ﷺ نے دعوت اسلام کے لئے مختلف بلاد میں بارہ قاصد روانہ فرمائے اور صرف اس بات کا خیال رکھا کہ ہر علاقہ میں ایسا شخص بھیجا جائے جو ان اطراف میں متعارف ہو تاکہ اس کے جھوٹے ہونے کا شبہ نہ رہے اور لوگوں کو اس کا اطمینان ہو جائے کہ وہ رسول اللہ کا قاصد ہے چنانچہ حضرت دحیہ کلبیؓ کو اس علاقے کی طرف ایچی بنا کر بھیجا گیا جہاں وہ لوگوں میں جانے پہچانے تھے۔

..... اسی طرح اپنے عمال کی طرف خطوط بھیجنے کیلئے آپ ﷺ نے انہی لوگوں کو سفارت پر مامور فرمایا جو مرسل الیہ کے لئے متعارف اور قابل اعتماد ہوتا تھا۔ کبھی آپ ﷺ نے یہ اہتمام نہیں فرمایا کہ ایک شخص کے بجائے ایک جماعت کو سفارت کے لئے روانہ کیا جائے نہ ہی کسی عامل یا قاضی نے فرد واحد کے ذریعہ موصول شدہ خطوط پر کبھی کسی شک و شبہ کا اظہار کیا۔ جب بھی کسی عامل کے پاس آپ کا کوئی خط پہنچا ہمیشہ فوراً اس نے اس میں درج ہدایات کو نافذ کیا..... غرض عہد رسالت کے یہ تمام واقعات اور حیات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے یہ تمام نظائر اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ خبر واحد کی حجت کو خود نبی کریم سے سند قبول حاصل ہے۔

③ خبر واحد کی حجت اور عہد صحابہ

نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد عہد صحابہ میں بھی ایسی واضح شہادتیں موجود ہیں جو اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان خبر واحد کی حجت کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل تھی۔ اس ضمن میں بھی چند نظائر پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)..... نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد جب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ آپ ﷺ کی تدفین کس جگہ عمل میں لائی جائے تو کون نہیں جانتا کہ اس کا فیصلہ خبر واحد ہی کی بنیاد پر کیا گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے (الانبياء يدفنون حيث يموتون) ”انبیاء جہاں فوت ہوتے ہیں وہی دفن کئے جاتے ہیں..... اس خبر کو سننے کے بعد کسی ایک فرد کو بھی یہ کہتے نہیں سنا گیا کہ اس خبر پر کوئی شاہد لاؤ۔ کسی نے بھی اس پر عمل کرنے کے کیلئے تواتر کی شرط نہیں لگائی۔ دنیا جانتی ہے کہ اس خبر واحد کی تعمیل میں نبی کریم ﷺ کی تدفین حضرت عائشہؓ کے حجرہ مبارکہ میں ہی عمل میں آئی جہاں آپؐ کی وفات ہوئی تھی۔ اسی طرح سفینہ بنی ساعدہ کے واقعہ میں ایسے موقع پر جبکہ خلافت کے مسئلہ پر صحابہ کرامؓ کے اختلاف نے نزاع کی شکل اختیار کر لی تھی اور عقل پر جذباتیت کے غالب آنے کا خدشہ پیدا ہو چکا تھا۔ ایک خبر واحد ہی تھی جس نے آنا فانا صحابہ کرامؓ کے باہمی اختلاف کا خاتمہ کر دیا اور سب کے سر تسلیم و رضا کے اظہار میں جھکے نظر آنے لگے اس وقت بھی صرف تنہا حضرت ابو بکر ہی تھے جو نبی کریمؐ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہوئے سنے گئے کہ: ”الانمة من قریش“ (خلفاء قریش میں سے ہوں گے) حضرت ابو بکرؓ کی زبان سے ان الفاظ کے نکلنے کی دیر تھی کہ سارے اختلافات مٹ گئے اور قریش میں سے خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔

(۲)..... نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور نبی کریم ﷺ

کی میراث کا معاملہ پیش آیا حضرت فاطمہؑ کی جانب سے ”فدک“ کا مطالبہ ہوا اور آپ ﷺ کے چچا حضرت عباسؑ نے سہم خیر پر اپنا حق جتایا تو اس کا فیصلہ بھی خبر واحد ہی کی بنیاد پر کیا گیا..... حضرت ابو بکرؓ نے ان دونوں سے فرمایا: ((سمعت رسول اللہ ﷺ يقول: لا نورث ما تركناه صدقة)) (رواہ البخاری فی صحیحہ) ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم گروہ (انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وہ سب صدقہ ہے۔

پھر اسی حدیث پر آپؐ نے عمل فرمایا حضرت فاطمہؑ اور حضرت عباسؑ نے بھی نبی کریمؐ کے اس ارشاد کے سامنے (فنی طور پر خبر واحد ہونے کے باوجود) سر تسلیم خم کر دیا نیز تمام صحابہ کرامؓ نے حضرت ابو بکرؓ کے اس فیصلے سے اتفاق کیا..... اگر صحابہ کرامؓ کے ہاں خبر واحد حجت نہ ہوتی تو نہ حضرت ابو بکرؓ اپنی معلومات پر اکتفا کر کے کوئی فیصلہ دیتے اور نہ دیگر صحابہ ہی حضرت ابو بکرؓ کے اس فیصلہ کو قبول کرتے۔ معلوم ہوا خبر واحد کی حجت صحابہ کرامؓ کے درمیان مسلم تھی۔

(۳)..... ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر جھگڑے میں کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہئے؟ یہ سن کر حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور بتایا: ایک مرتبہ میری دو لونڈیوں کے درمیان لڑائی ہو گئی ایک نے دوسری کے خیمے کی چوب دے ماری جس کے صدمے سے اس کا حمل ساقط ہو گیا مقدمہ نبی کریم ﷺ کے سامنے آیا۔ آپ ﷺ نے قاتلہ پر پانچ سو درہم بطور دیت لازم فرمائے۔ حضرت حمل بن مالک سے یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ کرتے..... حضرت حمل بن مالک کی یہ روایت ظاہر ہے خبر واحد تھی اگر حضرت عمرؓ کے نزدیک خبر واحد حجت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت حمل سے شاہد طلب کرتے یا بصورت دیگر اس کو رد کر کے اپنی عقل کے مطابق فیصلہ دیتے مگر ایسا نہیں ہوا حضرت حمل بن مالک کی روایت کردہ حدیث سن کر حضرت عمرؓ جو فیصلہ صادر کرنا چاہتے تھے اس سے باز رہے اور نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق فیصلہ دے دیا۔

(۴)..... جب حضرت عمرؓ ملک شام کے سفر پر تھے تو راستہ میں آپ کو پتہ چلا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے اس موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد نقل کیا جس میں ذکر ہے کہ ایسے علاقہ میں جانا ممنوع ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس حدیث کے سنتے ہی جو ظاہر ہے خبر واحد تھی آگے سفر جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مدینہ منورہ لوٹ آئے.....

(۵)..... حضرت عمرؓ کو مجوس سے جزیہ لینے کے بارے میں تردد تھا مگر جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی زبانی ان تک نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد پہنچا کہ مجوسی سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کیا جائے نیز یہ کہ آپؐ نے مقام حجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا تو اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنا سابقہ خیال ترک کر دیا اور مجوس سے جزیہ لینا شروع کر دیا۔

اس ارشاد نبویؐ کی روایت میں بھی حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اکیلے ہی تھے اور اس لئے فنی طور پر یہ روایت بھی خبر واحد ہی کا درجہ رکھتی تھی مگر حضرت عمرؓ نے اس خبر واحد کو بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لیا اور اپنے خیال سے رجوع کر کے مجوس کے ساتھ اہل کتاب جیسا برتاؤ کرنے لگے.....

(۶)..... حضرت عمرؓ دیت کے مسئلہ میں اس رائے کے حامل تھے کہ بیوی کو اپنے شوہر کی دیت سے وراثت نہیں ملنی چاہیے۔ حضرت ضحاک بن سفیان کو معلوم ہوا تو حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ایک بار نبی کریم ﷺ نے مجھے لکھا تھا کہ اشم ضیابی کی بیوی کو اس کی دیت سے حصہ دیا جائے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا۔

(۷)..... حضرت عثمانؓ کو اپنے عہد خلافت میں ایک موقع پر نبی کریم ﷺ کے کسی ایسے قول یا فعل کی تلاش تھی جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہو کہ شوہر کی وفات کے بعد بیوی کیلئے اپنی عدت کی مدت شوہر ہی کے گھر میں پوری کرنی ضروری ہے یا یہ مدت وہ اپنے والدین یا کسی اور عزیز رشتے دار کے گھر میں رہ کر بھی پوری کر سکتی ہے۔ حضرت فریعب بنت مالک بن سنان کو جن کے ساتھ یہ صورت حال پیش آچکی تھی نبی کریمؐ کا

اس بارے میں ایک ارشاد معلوم تھا۔ حضرت عثمانؓ نے ان کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں کیا حکم دیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ ﷺ نے انہیں شوہر ہی کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے یہ سنا تو اسی کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرنے لگے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے ایسی خبر واحد بھی قبول کر لی جو صرف ایک عورت کی روایت کردہ تھی۔

(۸)..... حضرت زید بن ثابتؓ نے سن رکھا تھا کہ کوئی حاجی آخری طواف یعنی طواف وداع کیے بغیر وطن واپس نہیں جاسکتا، ان کے نزدیک حائضہ عورت بھی اس ممانعت میں شامل تھی۔ چنانچہ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر حائضہ عورت یوم النحر (قربانی کے دن) میں طواف کر چکی ہو تو آخری طواف سے قبل واپس جاسکتی ہے۔ تو انہیں بہت تعجب ہوا۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے ایک انصاری عورت کا حوالہ دیا کہ ان سے مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی کریمؐ نے ان کو اس امر کی اجازت دی تھی اس کی بنیاد پر میں ایسا فتویٰ دیتا ہوں..... حضرت زیدؓ ان انصاری صحابیہ کے پاس پہنچے انہوں نے تصدیق کی حضرت زیدؓ مطمئن ہو گئے اور اپنے موقف سے رجوع فرمالیا..... یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ صحابہ نے بھی محض ایک خاتون کی روایت کردہ خبر واحد کو بلا تردد قبول فرمالیا۔

(۹)..... حضرت عبداللہ بن عمرؓ ابتدا میں مخبرہ کے قائل تھے یعنی بٹائی پر زمین دیا کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت رافع بن خدیجؓ نے انہیں بتایا کہ رسول اللہؐ نے اس سے منع کیا ہے یہ سنا تو حضرت ابن عمرؓ نے مخبرہ ترک کر دیا.....

نوٹ: امام نسائی نے اپنی سنن میں ”کتاب المزارعة“ کے تحت حضرت رافع بن خدیجؓ کی روایت نقل کی ہے اور بتایا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جب رافع بن خدیجؓ کی روایت پہنچی تو انہوں نے اپنی زمین بٹائی پر دینا ترک کر دیا..... امام نسائی نے اپنی سنن میں اس کے بعد حضرت زید بن ثابتؓ کی وہ روایت نقل کی ہے جس میں ہے کہ زمین کا بٹائی پر دینا جائز ہے..... حضرت زید بن ثابتؓ نے رافع بن

خدیجہؓ کی روایت کے بارے میں بتایا ہے کہ رافع بن خدیج کو صورت حال کا علم نہیں اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ دو لوگوں کو آپس میں زمین کی فصل کی تقسیم کے بارے میں لڑتے ہوئے دیکھا اور فرمایا ”جب تم آپس میں فصل کی تقسیم پر لڑتے ہو تو زمین بنائی پر کیوں دیتے ہو“ مطلب یہ کہ فصل کی تقسیم معاہدے کے مطابق ہونی چاہیے اور اس بارے میں لڑنے سے اجتناب کرنا چاہیے..... (تفصیل کیلئے دیکھئے کورس نمبر ۲ کا پونٹ نمبر ۸)

(۱۰)..... حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے کسی شخص کا یہ قول بیان کیا گیا کہ قرآن کریم میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰؑ کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس میں حضرت خضر کے ساتھی جس موسیٰ کا ذکر ہے وہ وہ موسیٰ نہ تھے جن کو بنی اسرائیل کی جانب نبی بنا کر مبعوث کیا گیا تھا۔ بلکہ کوئی اور شخصیت تھے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سن کر کہا: آپ کی بات ٹھیک نہیں مجھے ابی بن کعب نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار خطبہ دیتے ہوئے ہمیں حضرت خضر و حضرت موسیٰ علیہما السلام کا واقعہ سنایا جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت خضر کے ساتھی حضرت موسیٰؑ وہی تھے جو بنی اسرائیل کی جانب نبی ہو کر آئے تھے..... یہ واقعہ بھی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے فقیہ صحابی نے فرد واحد کی روایت کردہ حدیث کو تاکید کیساتھ دلیل کے طور پر پیش فرمایا جو بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک خبر واحد حجت تھی.....

3.1 عہد صحابہ کے بعد خبر واحد کی حیثیت:

عہد صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بھی خبر واحد کی حیثیت کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل رہی ہے..... امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ”الرسالۃ“ میں اخبار آحاد کی حیثیت کے اثبات میں جو ایک طویل مقالہ تحریر فرمایا ہے اس میں انہوں نے مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، یمن اور شام کے متعدد علماء کے نام گنوائے ہیں جو اخبار آحاد کو باہم نقل و روایت کرتے، انکو قبول کرتے، ان کی روشنی میں فتویٰ دیتے اور ان کو دین میں بلا نزاع و جدال حجت قرار دیتے تھے۔ امام شافعیؒ نے اس ضمن میں سلف سے لے کر خلف تک بکثرت ائمہ محققین کے اسماء گرامی ذکر کئے ہیں۔ ان میں سے چند کے نام پیش کئے جاتے ہیں۔

اہل مدینہ

- | | | |
|----------------------------|---------------------|----------------------------|
| (۱) محمد بن جبیر | (۲) نافع ابن جبیر | (۳) یزید بن طلحہ |
| (۴) محمد بن طلحہ | (۵) نافع ابن عجم | (۶) ابو مسلم بن عبد الرحمن |
| (۷) حمید بن عبد الرحمن | (۸) خارجہ بن زید | (۹) عبد الرحمن بن کعب |
| (۱۰) عبد اللہ بن ابی قتادہ | (۱۱) سلیمان بن یسار | (۱۲) عطاء بن یسار |

اہل مکہ

- | | | |
|-----------------------|-------------------|---------------------------|
| (۱) عطاء بن ابی رباح | (۲) طاؤس | (۳) مجاہد |
| (۴) ابن ابی ملیکہ | (۵) عکرمہ بن خالد | (۶) عبید اللہ بن ابی یزید |
| (۷) عبد اللہ بن باباہ | (۸) ابن ابی عمار | (۹) محمد بن المنکدر |

اہل کوفہ

- | | | |
|----------|-----------|----------|
| (۱) اسود | (۲) علقمہ | (۳) شعبی |
|----------|-----------|----------|

اہل بصرہ

- | | | |
|-----------------------|--------------|-------------------|
| (۱) عبد الرحمن بن غنم | (۲) حسن بصری | (۳) محمد بن سیرین |
|-----------------------|--------------|-------------------|

اسی طرح یمن میں وہب بن منبہ اور شام سے مکحول دمشقی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام حضرات صرف ایک صحابی سے روایت کرتے تھے اور اس ایک صحابی کی حدیث کی بنیاد پر فتویٰ صادر کرتے تھے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ اگر بالفرض کسی خاص مسئلہ کے متعلق کسی کے لئے کہنا جائز ہوتا کہ اس پر مسلمانوں کا ہمیشہ اجماع رہا ہے تو خبر واحد کی حیثیت کے متعلق بھی میں یہ بات کہہ دیتا مگر اسے احتیاط کے خلاف سمجھ کر اتنا پھر بھی کہتا ہوں کہ اہل اسلام کے فقہاء میں سے مجھے ایک نام بھی ایسا معلوم نہیں جس کے بارے میں میں کہا جاسکے کہ وہ خبر واحد کو حیثیت تصور نہیں کرتا تھا ان کے مابین یہ مسئلہ سرے سے متنازعہ تھا ہی نہیں..... خطیب بغدادی نے صحابہ کرام کے طرز عمل سے ثابت کیا ہے کہ خبر واحد پر عمل واجب ہے۔ اس

ضمن میں آپ نے صحابہ کرامؓ کے کئی واقعات نقل کئے ہیں۔

خبر واحد کی حجیت پر دلائل کا بڑا حصہ امام ابن حزم اندلسی نے اپنی مشہور کتاب ”الاحکام فی اصول الاحکام“ میں جمع کیا ہے۔ بعد کے علماء نے انہی کی دلائل کو بنیاد بنایا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ مباحث میں اضافہ کیا ہے۔ اس بارے میں محمد بن ابراہیم المعروف بابن الوزیر الہیثمی نے بہت جامع گفتگو کی ہے آپ لکھتے ہیں۔

(وقد انعقد اجماع المسلمین علی وجوب قبول الثقات فیما لا یدخله النظر ، و لیس ذالک بتقلید بل عمل بمقتضی الادلة القاطعة الموجبة لقبول خبر الاحاد وهی محررة فی موضعها من فن الاصول ولم یخالف فی هذا الا شذمة یسیرة ، وهم متکلموا ببغداد من المعتزلة ، و الاجماع منطبق قبلهم و بعد هم علی بطلان قولهم) (الروضی الباسم: ص ۳۲)

”ثقة رواة کی ایسی روایات جن پر کوئی اعتراض نہ ہو ان کے قبول پر اہل اسلام کا اجماع ہے اور یہ محض تقلید نہیں بلکہ قطعی دلائل کا تقاضہ ہے۔ اس ضمن میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اخبار آحاد کو قبول کرنا اور ان کی بنیاد پر استدلال کرنا ضروری ہے۔ خبر واحد کی حجیت پر علماء کا اتفاق ہے ہاں بغداد کے متکلمین معتزلہ کی ایک مختصر جماعت نے خبر واحد کی حجیت کا انکار کیا تھا لیکن ان کے موقف کے باطل اور غلط ہونے پر علماء امت کا پہلے بھی اتفاق تھا اور اب بھی اتفاق ہے“

علامہ سید انور شاہ کشمیری لکھتے ہیں

(حاصلہ انه یفید القطع ، اذا احتف بالقرائن ، کخبر الصحیحین علی الصحیح ، بید انه یکون نظریا ، و نسب الی أحمد أن اخبار الأحاد تفید القطع مطلقاً فیض الباری ، کتاب اخبار الاحاد) (ج ۳، ص ۵۰۶)

حاصل کلام یہ ہے کہ خبر واحد کی صحت کے لئے اگر قرآن موجود ہوں تو اس سے علم یقینی نظری حاصل ہوگا۔ امام احمد سے منقول ہے کہ اس قسم کی خبر واحد سے قطعیت کا فائدہ حاصل ہوگا۔

خبر واحد کی حجیت چونکہ بہت اہم موضوع ہے اس لئے اصول حدیث اور اصول فقہ کے مصادر میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اگر آپ اس کی تفصیل دیکھنا چاہیں تو امام شافعی کی کتاب ”الرسالۃ“ امام ابن حزم اندلسی کی ”الاحکام فی اصول الاحکام“ اور خطیب بغدادی کی ”الکفایہ فی علم الروایۃ“ کا مطالعہ کر لیں۔ یہاں اس یونٹ میں جو روایات، واقعات اور بحث پیش کی گئی ہیں وہ ان مذکورہ مصادر سے ماخوذ ہے۔

خود آزمائی ②

- ۱- جو علماء خبر واحد کی حجیت کے قائل ہیں ان کے دلائل کی نشاندہی کیجئے؟
- ۲- کیا قرآن مجید میں ایسی آیات ہیں جن سے خبر واحد کی حجیت ثابت کی جاسکتی ہے؟
- ۳- کیا عہد رسالت میں خبر واحد کی حجیت زیر بحث تھی؟
- ۴- عہد صحابہ کے بعد ائمہ مجتہدین اور محدثین نے خبر واحد کی حجیت کے بارے میں کیا موقف اختیار کیا؟
- ۵- کیا مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے علماء خبر واحد کو حجت تسلیم کرتے تھے؟



یونٹ نمبر 10

حدیث مرسل

تحریر: ڈاکٹر علی اصغر چشتی
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی



فہرست

319	یونٹ کا تعارف	
321	یونٹ کے مقاصد	①
323	1.1 مرسل کی تعریف..... لفظی اعتبار سے	
323	1.2 مرسل کا اصطلاحی مفہوم	
326	خود آزمائی 1	
327	مرسل کے بارے میں مختلف اقوال	②
330	حدیث مرسل قابل قبول نہیں	③
333	مرسل کے قابل قبول نہ ہونے کی وجوہ	④
333	4.1 سلسلہ سند میں انقطاع	
335	4.2 محذوف راوی کی شخصیت	
337	4.3 شہادت اور روایت	
337	4.4 حدیث مرسل اور علماء کا رویہ	
338	4.5 مرسل اور اجماع صحابہ	
339	خود آزمائی 2	
340	حدیث مرسل قابل قبول ہے	⑤
341	5.1 اجماع صحابہ و تابعین	
345	5.2 مرسل صحابی حجت ہے	

- 344 5.3 تقدراوی کا ارسال تعدیل ہے
- 346 5.4 روایت اور شہادت میں فرق
- 348 خود آزمائی 3
- 349 ⑥ حدیث مرسل شروط کیساتھ قابل حجت ہے
- 350 6-1 شرائط حجیت
- 353 ⑦ اہم نکات

یوٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات:

اس وقت جو یوٹ آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کا تعلق ”حدیث مرسل“ سے ہے..... آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ حدیث کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک اس کی ”سند“ ہوتی ہے اور دوسرا حصہ ”متن“ کہلاتا ہے..... آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ علماء حدیث کسی حدیث کو پرکھنے کے لئے پہلے اس کی سند کو دیکھتے ہیں..... پھر اس کے ”متن“ کی طرف آتے ہیں..... حدیث کی سند جب شروع سے لیکر آخر تک مجبوری ہوئی ہوتی ہے تو اس کو اصلاح میں ”متصل“ کہتے ہیں..... اور جب اس میں کہیں سے کوئی راوی گر جائے تو سند ”متصل“ کے درجہ سے گر جاتی ہے۔ اور اصطلاح میں منقطع کہلاتی ہے۔ علماء حدیث کے ہاں ”منقطع“ کی کئی اقسام ہیں۔ ان اقسام میں ایک مشہور قسم ”حدیث مرسل“ کی ہے..... حدیث مرسل سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحابی کا واسطہ موجود نہ ہو اور تابعی براہ راست رسول اللہ ﷺ کے قول یا فعل کو روایت کر رہا ہو..... امام حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب ”معرفۃ علوم الحدیث“ میں حدیث مرسل کی پہچان کو بہت اہم قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس نوع سے واقفیت اور آگاہی کے لئے بہت گہرے اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے..... ذخیرہ حدیث میں مرسل روایات اچھی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں..... ان کی حیثیت کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف نظر آتے ہیں۔ اس موضوع پر معروف و مشہور کتاب حافظ علائی کی ”جامع التحصیل فی احکام المرسل“ ہے۔ ابن ابی حاتم نے بھی اس پر کتاب لکھی ہے جس کا نام ”المراسیل“ ہے۔ امام ابو داؤد و حجتانی کا رسالہ بھی اس ضمن میں علمائے حدیث کے ہاں شہرت رکھتا ہے..... اب یوٹ میں سب سے پہلے حدیث مرسل کے لغوی و اصطلاحی مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ علماء جو مراسیل

سے استدلال نہیں کرتے ان کا موقف اور دلائل بیان کئے گئے ہیں..... پھر ان علماء کا نقطہء نظر پیش کیا گیا ہے جو مراہیل سے استدلال کرتے ہیں۔ بعد میں امام شافعیؒ کے موقف پر گفتگو کی گئی ہے..... مجھے امید ہے کہ آپ اس یونٹ کو اس موضوع کے حوالہ سے مفید پائیں گے۔ اور اس کی بنیاد پر دوسرے مراجع کا مطالعہ بھی کریں گے..... یونٹ میں چونکہ تفصیل کے ساتھ لکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے اختصار سے کام لیا گیا ہے اور صرف ان نکات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جواز بس ضروری ہیں..... آپ سے گزارش ہے کہ یونٹ کو محض ایک بار پڑھ کر چھوڑ دیں بلکہ اسے بار بار پڑھیں اور پوری طرح سمجھنے کی کوشش کریں..... اسے محض مشقی سوالات کے جوابات کی خاطر مطالعہ نہ کریں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایات و تعلیمات اور ارشادات کو سمجھنے کی خاطر پوری لگن اور خلوص کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں..... آپ کے مطالعہ میں جتنا خلوص ہوگا اتنا ہی آپ اس کی برکات سے مستفید ہوں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇐ حدیث مرسل کا لفظی مفہوم بیان کر سکیں۔
- ⇐ حدیث مرسل کا اصطلاحی مفہوم پوری تفصیل کے ساتھ بتا سکیں۔
- ⇐ حدیث مرسل کی تعریف کے بارے میں فقہاء اور محدثین کے اقوال پر بحث کر سکیں۔
- ⇐ حدیث مرسل کے بارے میں علماء حدیث کا موقف پیش کر سکیں۔
- ⇐ حدیث مرسل کے ضمن میں علماء حدیث کے موقف کی تائید میں دلائل کا جائزہ لے سکیں۔
- ⇐ حدیث مرسل پر فقہاء کے موقف اور ان کے اقوال و دلائل پر بحث کر سکیں۔
- ⇐ حدیث مرسل کی حجیت پر امام شافعی کا موقف اور امور خمسہ پر گفتگو کر سکیں۔

① مرسل

1.1 مرسل کی تعریف:

لفظی اعتبار سے:

لفظی لحاظ سے ”مرسل“ ارسل سے اسم مفعول ہے..... ارسال کے معنی چھوڑ دینے کے آتے ہیں ”مرسل“ وہ چیز کہلاتی ہے جو چھوڑ دی گئی ہو..... عربی محاورہ میں پرندہ چھوڑنے کے بعد کہا جاتا ہے (أرسلت الطائر) ”میں نے پرندہ (ہوا میں) چھوڑ دیا۔“

”رسل“ چھوٹے چھوٹے گرد ہوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جب لوگ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں آتے ہیں تو محاورہ کہا جاتا ہے ”جاء وإرسلة رسالة“..... امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ایک طویل روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں (أَنَّ النَّاسَ دَخَلُوا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ مَوْتِهِ فَصَلُّوا عَلَيْهِ إِرسالاً)..... ”رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد لوگ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں آتے رہے اور دعا کرتے رہے“

مرسل، تیز رفتار جانور کو بھی کہتے ہیں..... ”ناقلہ مرسل“ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو بہت تیز چال چلتی ہے..... لفظی لحاظ سے مرسل کے بہت سارے مفہوم لئے جاتے ہیں۔ اگر آپ اس کی تفصیل دیکھنا چاہیں تو لسان العرب: ج ۱۱- ص ۲۸۱ اور النہایۃ فی غریب الحدیث: ج ۲- ص ۲۲۵ کا مطالعہ کر لیں۔ لفظی لحاظ سے ”مرسل“ کا جو بھی مفہوم لیا جائے وہ صحیح اور درست ہے اور اس میں کوئی قباحت اور حرج نہیں۔

1.2 اصطلاحی مفہوم:

اصطلاحی لحاظ سے ”مرسل“ ہر وہ حدیث کہلاتی ہے جسکی سند میں صحابی کا نام نہ ہو۔ تابعی براہ راست

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کر رہا ہو۔ مثلاً

۱..... ((عن يحيى عن سعيد بن المسيب انه قال : بلغني أن رسول الله ﷺ قال لرجل من اسلم يقال له هزال ، يا هزال ! لو سترته برءائك خيراً لك))

۲..... ((عن ابن شهاب عن سعيد بن المسيب انه قال : بلغني أن رسول الله ﷺ قضى في الجنين قتل في بطن امه بغرة عبد او وليدة فقال الذي قضى عليه: كيف اغرم ما لا شرب و مثالا أكل و لا نطق و لا استهل و مثل ذلك يطل، فقال رسول الله ﷺ إن هذا من اخوان الكهان))

یہاں پہلی حدیث میں سعید بن المسیب رسول اللہ ﷺ کا قول براہ راست بیان کر رہے ہیں۔ اور بتا رہے ہیں کہ مجھے یہ قول کسی کے ذریعہ پہنچا ہے لیکن جس کے ذریعہ سے قول پہنچا ہے اس کا نام نہیں لے رہے۔ سعید بن المسیب چونکہ تابعی ہیں اور تابعی ہونے کی وجہ سے رسول اللہ سے آپ نے خود یہ قول نہیں سنا۔ اس لئے علماء حدیث کے ہاں ایسی حدیث کو ”حدیث مرسل“ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ دوسری حدیث میں سعید ابن المسیب رسول اللہ کے ایک فعل (فیصلہ) کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ حالانکہ سعید بن المسیب نے خود رسول اللہ کو یہ فیصلہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا کیونکہ آپ تابعی ہیں۔ ظاہر ہے اس بارے میں آپ کو کسی صحابی نے بتایا ہوگا۔ لیکن یہاں آپ نے اس صحابی کا نام نہیں لیا ہے۔ اس لئے علماء حدیث کی اصطلاح میں یہ حدیث ”حدیث مرسل“ کہلائے گی۔

امام حاکم نیشاپوری حدیث مرسل کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں۔

(أما المرسل فان مشايخ الحديث على أن الحديث المرسل هو الذي يرويه المحدث بأسانيد متصلة إلى التابعين ، فيقول التابعي:

قال رسول الله ﷺ) (معرفة علوم الحديث : ص ۲۲۵)

جہاں تک ”مرسل“ کا تعلق ہے تو علمائے حدیث اپنی اصطلاح میں اس حدیث کو ”مرسل“ کہتے ہیں۔ جسے کسی محدث نے سند متصل کیساتھ تابعی تک نقل کیا ہو۔ لیکن جب سلسلہء سند تابعی تک پہنچ جائے تو اس کے بعد صحابی کا ذکر نہ ہو اور تابعی براہ راست کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا:

حافظ ابن عبد البر اندلسی مالکی کہتے ہیں:

(أما المرسل فان هذا الإسم أو قعوه باجماع على حديث التابعي

عن النبي ﷺ مثل : أن يقول أبو امامة بن سهل أو عبيد الله بن عدي

أو عبد الله بن عامر أو من كان مثلهم : قال رسول الله ﷺ).....

(التمهيد / جامع التحصيل : ص ۱۷۰)

جہاں تک ”مرسل“ کا تعلق ہے یہ اصطلاح بالاتفاق علماء نے اس حدیث کے لئے استعمال کی ہے جو کسی تابعی نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست نقل کی ہو۔ مثلاً ابو امامہ بن سہل یا عبيد الله بن عدي یا عبد الله بن عامر یا ان کے درجہ کا کوئی اور راوی حدیث بیان کرتے ہوئے کہے: قال رسول الله ﷺ

حافظ ابن الصلاح حدیث مرسل کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وصورته التي لا خلاف فيها حديث التابعي الكبير الذي لقي

جماعة من الصحابة كعبيد الله بن عدي ثم سعيد بن المسيب و

أمثالهما إذا قال قال رسول الله ﷺ ، والمشهور التسوية بين

(التابعين اجمعين)..... (التقييد والايضاح : ص ۷۰)

جس ”مرسل“ کے بارے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں اس سے مراد وہ حدیث ہے جسے کبار تابعین میں سے کسی نے نقل کیا ہو۔ مثلاً اس کا راوی عبيد الله بن عدي ہو یا سعيد بن المسيب ہو یا ان کے درجہ کا کوئی

اور تابعی ہو..... لیکن مرسل کے بارے میں مشہور و معروف قول یہ ہے کہ اس کا راوی تابعی ہو خواہ تابعین کے کسی بھی طبقہ سے ہو.....

حدیث مرسل کی تعریف مختلف علماء نے اپنے اپنے الفاظ میں کی ہے۔ لیکن الفاظ میں فرق کے علاوہ اس کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا..... اس ضمن میں پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ علمائے حدیث ہر اس حدیث کو ”مرسل“ کہتے ہیں جس کا راوی تابعی ہو۔ یعنی صحابہ کرام سے اس کی ملاقات ثابت ہو۔

خود آزمائی ①

- ۱- لفظی اعتبار سے ”مرسل“ کے معنی کیا ہیں؟
- ۲- علماء حدیث کی اصطلاح میں حدیث مرسل کی تعریف بتائیے۔
- ۳- مرسل کی تعریف کرتے ہوئے ایک حدیث بطور مثال پیش کیجئے۔
- ۴- حافظ ابن عبد البر نے حدیث مرسل کی تعریف کس طرح کی؟
- ۵- حافظ ابن الصلاح نے ”مرسل“ کی تعریف کن الفاظ کے ساتھ کی ہے۔
- ۶- مرسل کی مشہور معروف تعریف کیا ہے۔

② مرسل کے بارے میں مختلف اقوال

حدیث مرسل کی حیثیت فقہاء اور محدثین کے ہاں مختلف رہی ہے..... بعض علماء اسے قابل استدلال کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے استدلال جائز نہیں۔ اس بارے میں کئی آراء اور اقوال منقول ہیں علامہ جلال الدین السيوطی نے اپنی کتاب ”تدريب الراوي“ میں ان اقوال کو نقل کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

2.1 في الإحتجاج بالمرسل عشرة أقوال:

۱. المرسل هو حجة مطلقاً
۲. لا يحتج به مطلقاً
۳. يحتج به إن أرسله أهل القرون الثلاثة
۴. يحتج به إن لم يرو إلا عن عدل
۵. يحتج به إن أرسله سعيد، فقط
۶. يحتج به إن لم يكن في الباب سواه
۷. المرسل هو أقوى من المسند
۸. يحتج به ندباً لا وجوباً
۹. يحتج به إن أرسله صحابي
۱۰. اجمع التابعيون على قبول المرسل

حدیث مرسل کی حیثیت اور حجیت کے بارے میں دس اقوال ملتے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

- ۱- مرسل مطلقاً حجت ہے۔ یعنی ہر حال میں قابل استدلال ہے (یہ قول جمہور فقہاء کی طرف منسوب ہے)۔
- ۲- مرسل قابل استدلال نہیں ہے۔ یعنی کسی حال میں بھی قابل استدلال نہیں (یہ قول علمائے حدیث، ابن حزم ظاہری اور خطیب بغدادی کا ہے)۔
- ۳- ارسال کرنے والے راوی کا تعلق ابتدائی تین ادوار سے ہو تو قابل قبول ہے۔ (یہ قول عیسیٰ بن ابان، ابو بکر رازی اور علمائے احناف کی ایک جماعت کا ہے)۔
- ۴- اگر ”مرسل“ کے سارے راوی عادل ہوں تو قابل استدلال ہے (یہ مسلک عام فقہاء کا ہے)
- ۵- اگر سعید بن المسیب نے ارسال کیا ہو تو قابل قبول ہے (یہ قول امام شافعی کی طرف منسوب ہے)
- ۶- اگر کسی موضوع پر حدیث مرسل کے علاوہ کوئی اور حدیث متصل نہ ملے تو حدیث مرسل قابل استدلال ہے (یہ مسلک مجتہدین حضرات کا ہے)۔
- ۷- مرسل، متصل سے زیادہ قوی اور افضل ہے۔ (یہ قول عیسیٰ بن ابان، اور مالکیہ کی ایک جماعت کا ہے)۔
- ۸- مرسل پر عمل واجب نہیں، مستحب ہے۔
- ۹- اگر ارسال کرنے والا راوی صحابی ہو تو اس کی روایت قابل حجت ہے (یہ جمہور علماء کا موقف ہے)۔

۱۰- تابعین کے ہاں حدیث مرسل قابل قبول رہی ہے (یہ ابن جریر طبری کا قول ہے)۔

ان اقوال سے بظاہر یوں لگتا ہے کہ علماء کے ہاں ”مرسل“ کی حیثیت اور حجیت کے بارے میں اچھا خاصا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس ضمن میں مختلف جماعتوں کے اصول مختلف رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اقوال میں سے ہر ایک قول کو علماء کی ایک مستقل جماعت کی حمایت حاصل نہیں بلکہ ایک ایک جماعت سے تعلق رکھنے والے حضرات نے مختلف اقوال کو پیش نظر رکھا ہے..... اس بارے میں مشہور اقوال تین ہیں:

۱۔ مرسل قابل قبول نہیں۔

۲۔ مرسل قابل قبول ہے۔

۳۔ مرسل شروط کے ساتھ قابل قبول ہے۔

ان اقوال سے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو آپ کے سامنے اس یونٹ میں آرہی ہے.....
مجھے امید ہے کہ آپ یونٹ کے اس حصہ کو بہت توجہ اور انہماک کے ساتھ پڑھیں گے..... اور اس حصہ میں
جو اقوال اور دلائل دیئے گئے ہیں انہیں اچھی طرح ذہن نشین کریں گے.....

③ حدیث مرسل قابل قبول نہیں

”مرسل“ کی حیثیت اور حجیت کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ان اقوال کی کچھ تفصیل آپ نے ابھی ابھی پڑھ لی ہے..... علماء کی ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ ”مرسل“ قابل قبول اور قابل استدلال نہیں ہے۔ یہاں اس ”موقف“ کے قائل چند نمائندہ علماء کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں تاکہ اس مسلک کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے۔

امام مسلم کہتے ہیں (المرسل فی اصل قولنا و قول اهل العلم بالآخبار ليس بحجة)..... (مقدمہ صحیح مسلم)

جہاں تک حدیث مرسل کا تعلق ہے تو اصل بات یہ ہے کہ یہ ہمارے نزدیک اور علماء حدیث کے نزدیک قابل قبول و قابل استدلال نہیں ہے۔ امام ابن ابی حاتم رازیؒ کہتے ہیں۔ (سمعت ابی و ابا زرعة يقولان: لا يحتج بالمراسيل ولا تقوم الحجة إلا بالاسانيد الصحاح المتصلة و كذا أقول أنا)..... (کتاب المراسیل: ص-۷)

میں نے اپنے والد اور امام ابو زرعة رازیؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مراسیل قابل استدلال نہیں..... استدلال کے لئے صحیح اور متصل السند روایات کا ہونا ضروری اور لازمی ہے..... اور میرا بھی یہی موقف ہے۔ حافظ ابن الصلاح کہتے ہیں:

(إعلم أن حكم المرسل حكم الحديث الضعيف إلا أن يصح مخرجه بمجئته من وجه آخر)..... (مقدمہ ابن الصلاح: ص-۲۲۵)

”حدیث مرسل“ اور ”حدیث ضعیف“ حکم کے لحاظ سے دونوں ایک جیسی ہیں۔ ہاں اگر مرسل کی بنیاد دوسری سند کے ذریعہ معلوم ہو جائے تو پھر ”مرسل“ کو ضعیف پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔

حافظ عراقی کہتے ہیں: (ماذکرناہ من سقوط الاحتجاج بالمرسل والحکم بضعفه هو المذهب الذی استقر علیہ آراء جماہیر حفاظ الحدیث ونقاد الأثر، وقد تداولوه فی تصانیفہم) (التقیید والایضاح: ص ۸۲) ”ہم نے ”حدیث مرسل“ کے قابل استدلال نہ ہونے اور اس کے ضعیف ہونے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے یہ دراصل جمہور علماء حدیث اور ناقدین روایت کا موقف ہے۔ ان حضرات نے اپنی کتابوں میں پوری وضاحت کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے۔“

خطیب بغدادی لکھتے ہیں: (قال محمد بن ادريس الشافعي وغيره من اهل العلم: لا يجب العمل بالمرسل، وعلى ذلك اكثر الانمة من حفاظ الحدیث ونقاد الأثر) (الکفایۃ فی علم الروایۃ: ص ۳۸۴) ”امام شافعیؒ اور دیگر اہل علم کا کہنا ہے کہ حدیث مرسل پر عمل کرنا ضروری نہیں“..... علماء حدیث میں سے اکثر کا موقف بھی یہی ہے۔

خطیب بغدادی ”مرسل“ کی حیثیت پر مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنی بحث کو سیٹھتے ہوئے کہتے ہیں (والذی نختاره من هذه الجملة سقوط فرض العمل بالمراسیل، وأن المرسل غیر مقبول) (الکفایۃ: ص ۳۸۶)

اس پوری تفصیل کے بعد جو بات ہمیں درست معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ”مراسیل“ پر عمل کرنا ضروری نہیں اور حدیث مرسل کی بنیاد پر استدلال کرنا جائز نہیں۔

ابن حزم اندلسی ظاہری حدیث مرسل کے بارے میں لکھتے ہیں: (المرسل من الحدیث هو المنقطع ایضاً وهو غیر مقبول، ولا تقوم به حجة لانه عن مجهول) (الاحکام فی اصول الاحکام - ج ۲ - ص ۳) ”حدیث مرسل“ چونکہ سند کے لحاظ سے منقطع ہوتی ہے اس لئے قابل قبول نہیں.....

اس کے اصل راوی کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا کہ کون ہے۔ اس لئے اس کی بنیاد پر استنباط نہیں کیا جاسکتا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک ”حدیث مرسل“ قابل استدلال اور قابل قبول نہیں ہے..... ان حضرات نے اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کیلئے دلائل دیئے ہیں اور ان وجوہات تذکرہ کیا ہے جنکی بنا پر انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے..... اب آپ ان حضرات کے دلائل کا مطالعہ کریں گے۔ ان دلائل میں چونکہ لطافت بھی ہے اور گہرائی بھی ہے اس لئے میری آپ سے گزارش یہ ہے کہ یونٹ کے اس حصہ کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت زیادہ توجہ اور غور و فکر سے کام لیں۔

..... آئیے اب دیکھتے ہیں کہ ”حدیث مرسل“ کو قابل استدلال نہ ماننے والے حضرات نے اپنے موقف کے حق میں کون سے دلائل پیش کئے ہیں۔

④ حدیث مرسل کے قابل قبول نہ ہونے کی وجوہ

جو حضرات حدیث مرسل کو قابل استدلال نہیں سمجھتے ان کے نزدیک اس کے چند اسباب ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

4.1 سلسلہء سند میں انقطاع

علماء حدیث کے ہاں حدیث کی صحت کے لئے لازمی ہے کہ اس کی سند میں ”اتصال“ ہو..... اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سند اگر متصل نہ ہو تو حدیث کی حیثیت متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ حدیث کا دار و مدار اس کی سند پر ہوتا ہے۔

علماء حدیث روایت کو پرکھنے کے لئے سب سے پہلے اس کی سند کو دیکھتے ہیں..... اگر سند میں اتصال ہو تو پھر اس کے ہر ایک ”راوی“ کو دیکھتے ہیں..... اگر سند کے ہر ایک راوی میں صحت کی بنیادی شرائط موجود ہوں تو کہہ دیتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے اور اگر راویوں میں صحت کی شرائط کم ہوں..... تو اس لحاظ سے حدیث کی حیثیت متعین کرتے ہیں..... اب اگر حدیث کی سند میں اتصال ہی نہ ہو تو نامعلوم راوی کے بارے میں کس بنیاد پر فیصلہ کریں گے اور کیسے کریں گے.....؟

حافظ ابن عبد البر حدیث مرسل کی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(قال سائر أهل الفقه وجماعات أهل الحديث فيما علمت : الإنقطاع في الأثر

علة تمنع من إيجاب العمل به.....) (جامع التحصيل : ص ۲۷)

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے فقہاء اور محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ روایت کی سند میں

انقطاع ایسا سبب ہے جو اس کے قابل قبول اور قابل عمل ہونے میں رکاوٹ بنتی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں:

(إنما ذكر یعنی المرسل فی قسم المردود للجہل بحال المحذوف ، لأنه یحتمل أن یكون صحابياً و یحتمل أن یكون تابعياً ، وعلى التالی یحتمل أن یكون ضعيفاً و یحتمل أن یكون ثقةً ، وعلى التالی یحتمل أن یكون حمل عن صحابی و یحتمل أن یكون حمل عن تابعی آخر) (نخبة الفكر: ص: ۱۷۱)

”حدیث مرسل“ کو اس لئے مردود کی اقسام میں شامل کیا گیا ہے کہ اس کی سند میں جو راوی محذوف ہوتا ہے اس کا حال معلوم نہیں ہوتا..... پہلی بات یہ ہے کہ وہ صحابی بھی ہو سکتا ہے اور تابعی بھی..... پھر جو راوی محذوف ہے ممکن ہے وہ ضعیف ہو اور ممکن ہے کہ ثقہ ہو..... پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے حدیث کسی صحابی سے سنی ہو یا کسی اور تابعی سے سنی ہو۔ ان سارے شبہات کی وجہ سے حدیث مرسل محدثین کے ہاں قابل رد ہے..... قابل قبول نہیں۔

علامہ طاہر بن صالح الجزائری کہتے ہیں۔

(الحديث المرسل ضعيف لا یحتج به و ذلك للجہل بحال الساقط من السند ، فانه یحتمل أن یكون غیر صحابی ، وإذا كان كذلك فیحتمل أن یكون ضعيفاً ، ان اتفق ان المرسل لا یروی إلا عن ثقة ، فالتوثیق مع الإبهام غیر كاف) (توجیه النظر: ص: ۱۵۲)

حدیث مرسل ضعیف ہے اور قابل قبول نہیں..... اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں جو راوی ساقط ہوتا ہے اس کا حال معلوم نہیں ہوتا..... یہاں یہ شبہ بہر حال موجود ہے کہ وہ ساقط راوی صحابی نہ ہوتا بلکہ ہو..... اور اگر وہ واقعی تابعی ہو تو ممکن ہے کہ وہ ضعیف ہو..... اور اگر یہ بات مان لی جائے کہ ارسال کرنے والا

راوی صرف اور صرف قابل اعتماد راویوں سے حدیث لیتا ہے تو بھی ابہام اپنی جگہ موجود ہے..... اور ابہام کی موجودگی میں یہ اطمینان کر لینا کہ روایت صحیح ہے مناسب نہیں.....

4.2 محذوف راوی کی شخصیت

جو علماء ”حدیث مرسل“ کو قابل قبول نہیں مانتے ان کی دلیل یہ ہے کہ محذوف راوی مجہول العین ہوتا ہے یعنی اس کی شخصیت بالکل پردہ خفا میں ہوتی ہے۔ اب جس شخص کی ذات معلوم نہ ہو اس کی صفات اور احوال کے بارے میں کیسے معلوم کیا جاسکتا ہے..... علماء حدیث کے نزدیک ”مجہول الحال“ راوی کی حدیث قابل قبول نہیں اور جب مجہول الحال کی روایت قابل قبول نہیں تو ”مجہول العین والحال“ کی حدیث کیسے قابل استدلال ہو سکتی ہے؟

امام نوویؒ کہتے ہیں: (ودلیلنا فی رد العمل بہ، انه اذا كانت رواية المجهول المسمى لا تقبل لجهالة حاله، فرواية المرسل أولى، لأن المزوی عنه، محذوف مجهول العین والحال) (تدریب الراوی: ص ۱۹۸) ”حدیث مرسل کے قابل رد ہونے کی دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ جب علماء حدیث کے اصول کے مطابق ایسے راوی کی روایت قابل قبول نہیں جس کا نام معلوم ہو حال معلوم نہ ہو..... تو ایسے راوی کی روایت کیسے مقبول ہو سکتی ہے۔“ جس کا نہ نام معلوم ہو نہ حال معلوم ہو..... اور ”مرسل“ میں یہی ہوتا ہے کہ اس کا راوی مجہول العین بھی ہوتا ہے اور مجہول الحال بھی۔

خطیب بغدادی حدیث مرسل کی حجیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (المرسل غیر مقبول..... والذی يدل على ذلك أن إرسال الحديث يؤدي إلى جهل بعين راويه ويستحيل العلم بعدالته مع الجهل بعينه، و قدبيننا من قبل انه لا يجوز قبول الخبر إلا ممن عرفت عدالته، فوجب لذلك كونه غير مقبول) (الكفاية: ص ۳۸۷) ”حدیث مرسل قابل قبول نہیں اور جو چیز اس کی عدم قبولیت پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں جب ”ارسال“ ہوتا ہے۔ تو اسکی وجہ سے راوی ”مجہول العین“ ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی عدالت کے بارے میں معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔“

ہم اس سے پہلے علماء حدیث کے اس اصول پر گفتگو کر چکے ہیں کہ حدیث صرف اس راوی کی قابل قبول ہے جس کی حیثیت معروف و مشہور ہو اس اصول کی بناء پر ضروری ہے کہ حدیث مرسل کو غیر مقبول کہا جائے۔

حافظ عراقی اپنی ”الفیہ“ میں کہتے ہیں: (ورده جماہر النقاد..... للجهل بالساقط فی الاسناد) یعنی جمہور علماء نقد نے حدیث مرسل کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ اس کی سند میں جو راوی محذوف ہوتا ہے اس کی حیثیت معلوم نہیں ہوتی.....

حافظ سخاوی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (هو تعلیل لرد المرسل و ذلک..... ان من شرط الحدیث الصحیح ثقة رجاله، والمرسل سقط منه رجل لا یعلم حاله، فعدم معرفة عدالة بعض رواه، وان اتفق ان الذی أرسله کان لا یروی إلا عن الثقة، فالتوثیق فی الرجل المبہم غیر کاف) (فتح المغیث ص: ۷۵) ”للجهل، بالساقط“ کہہ کر حافظ عراقی نے حدیث مرسل کے قابل رد ہونے کی دلیل دی ہے..... اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ حدیث صحیح کے راویوں کا ثقہ اور عادل ہونا ضروری ہے..... مرسل میں چونکہ ایک راوی محذوف ہوتا ہے اور اس کا حال معلوم نہیں ہوتا اس لئے حدیث مرسل کو قابل قبول نہیں کہا جاسکتا..... اور اگر یہ مان لیا جائے کہ ارسال کرنے والا صرف قابل اعتماد راوی سے اخذ کرتا ہے تو بھی یہاں ابہام پایا جاتا ہے اور ابہام کے ہوتے ہوئے کسی راوی کی توثیق نہیں کی جاسکتی.....

مذکورہ بالا تفصیل سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو علماء حدیث مرسل کو قابل استدلال نہیں سمجھتے اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ مرسل میں ایک یا دو راوی محذوف ہوتے ہیں۔ اور ان کے محذوف ہونے کی وجہ سے ان کی عدالت و ثقاہت معلوم نہیں ہوتی۔ جبکہ علماء حدیث کے نزدیک حدیث صحیح کیلئے ضروری ہے کہ اس کی سند کا ہر ایک راوی عادل اور ضابط ہو۔

4.3 شہادت اور روایت

جو علماء ”حدیث مرسل“ کو قابل قبول نہیں سمجھتے ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جس طرح عدالت میں اصل گواہوں کی گواہی قبول کی جاتی ہے ”فرع“ کی شہادت نہیں لی جاتی۔ اسی طرح روایت کے لئے اصل راوی کا ہونا ضروری ہے..... ان حضرات کا کہنا ہے کہ روایت اور شہادت میں بعض پہلوؤں سے مماثلت پائی جاتی ہے مثلاً مجہول اور مجروح کی نہ روایت قابل تسلیم ہے اور نہ شہادت قابل قبول ہے۔ امام غزالی روایت اور شہادت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”پوری وضاحت کے بغیر ”فرع“ کی شہادت ”اصل“ کے برابر نہیں قرار دی جاسکتی روایت اور شہادت کو دیکھا جائے تو بعض پہلوؤں سے ان میں کوئی خاص فرق نہیں پایا جاتا..... مثلاً مجہول اور مجروح کی گواہی بھی ناقابل اعتبار ہے اور ”روایت“ بھی ناقابل اعتماد ہے۔ جب شہادت کا اصول یہ ہے کہ ”عادل“ کی شہادت پر ”عادل“ ہی گواہ بن سکتا ہے تو روایت میں بھی اس اصول کو مد نظر رکھنا چاہئے اور یہ بات لازمی قرار دینی چاہے کہ راوی اپنے شیخ کی ذات اور حالات سے پوری طرح واقف ہو۔ تاکہ ”اصل“ اور ”فرع“ کے راویوں کو پرکھا جاسکے۔

4.4 حدیث مرسل اور علماء کا رویہ

جو علماء ”حدیث مرسل“ کو حجت نہیں مانتے ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ حدیث مرسل کو حجت ماننے والے حضرات خود بعض مرتبہ حدیث مرسل سے استدلال نہیں کرتے بلکہ ”مرسل“ کو یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ ”مرسل“ ہے۔ امام ابن حزم اندلسی نے اپنی کتاب ”الاحکام فی اصول الاحکام“ میں اس موضوع پر بڑی عمدہ گفتگو کی ہے..... آپ لکھتے ہیں:

(ترک مالک حدیث ابی العالیۃ فی الوضوء من الضحک فی الصلاة، ولم یعیوہ إلا با الإرسال، وأبو العالیۃ قد أدرك الصحابة، وقد رواه أيضاً الحسن و ابراهیم النخعی والزہری مرسلًا..... وترکوا حدیث مالک عن هشام ابن عروۃ عن أبیہ أن النبی ﷺ صلی فی مرضہ الذی مات فیہ بالناس جالساً و الناس قیام) (الاحکام فی اصول الاحکام: ج ۲، ص ۴۰)

امام مالک نے ابو العالیہ کی حدیث مرسل ہونے کی بناء پر چھوڑ دی جس کا تعلق نماز میں ہنسنے کے بعد وضو کرنے سے ہے..... حالانکہ ابو العالیہ نے صحابہ کرام کا دور پایا ہے علاوہ ازیں اس حدیث کو حسن، ابراہیم نخعی اور زہری نے بھی مرسل روایت کیا ہے..... اسی طرح ان حضرات نے عروہ کی حدیث محض مرسل ہونے کی وجہ سے چھوڑ دی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض وفات میں بیٹھ کر نماز پڑھائی جبکہ آپ کے پیچھے صحابہ کرام کھڑے رہے۔

آپ اگر تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں تو ”الاحکام“ کا نسخہ لے کر ان روایات کو دیکھ لیں۔ یہاں اگر ساری روایات نقل کی جائیں تو پونٹ بہت طویل ہو جائے گا۔

4.5 مرسل اور اجماع صحابہ و تابعین

جن علماء کے نزدیک حدیث مرسل قابل استدلال نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کا اس کے حجت ہونے پر اجماع ثابت نہیں..... امام غزالی نے اس پر اپنی کتاب ”المستصفی من علم الاصول“ میں تفصیل کیساتھ گفتگو کی ہے..... امام غزالی کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام و تابعین کا اجماع حدیث مرسل کے حجت ہونے پر ثابت نہیں..... ہاں ان حضرات نے بعض مراسیل کو لیا ہے اور ان پر عمل کیا ہے لیکن ان کے عمل اور قبول کی بنیاد ایک تو ان کے اجتہاد پر ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ان کے پاس جو مراسیل تھیں وہ صحابہ کرام سے منقول تھیں..... ہمیں بھی اگر ایسی ”مرسل“ مل جائے جس کے بارے میں یقین اور اطمینان ہو کہ وہ کسی صحابی سے منقول ہے تو ہمیں اس پر عمل کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوگی۔ ہمارے لئے تو مشکل یہ ہے کہ مراسیل کے بارے میں کئی احتمالات پائے جاتے ہیں اور ان احتمالات کی وجہ سے ہم حدیث مرسل پر عمل کرنے سے کتراتے ہیں۔

خود آزمائی ②

- ۱- حدیث مرسل کے بارے میں علامہ سیوطی کے بیان کردہ اقوال ترتیب کے ساتھ بیان کیجئے
- ۲- حدیث مرسل کی حجیت کے بارے میں مشہور ترین مذاہب کتنے ہیں۔
- ۳- امام ابن ابی حاتم رازی نے حدیث مرسل کی حجیت سے متعلق کونسی روایت ذکر کی ہے۔
- ۴- حافظ عراقی نے حدیث مرسل کی بنیاد پر استدلال سے متعلق کیا تبصرہ کیا ہے۔
- ۵- خطیب بغدادی نے حدیث مرسل کے ضمن میں امام شافعیؒ کی طرف کونسا قول منسوب کیا ہے
- ۶- سلسلہ سند میں انقطاع سے کیا مراد ہے
- ۷- مخدوف راوی کی وجہ سے روایت کی حیثیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔
- ۸- شہادت اور روایت میں کیا مماثلت ہے۔

⑤ حدیث مرسل قابل قبول ہے

عزیز طلبہ!

آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ حدیث مرسل کی حیثیت کے بارے میں علماء حضرات کے اقوال مختلف ہیں..... ان علماء میں سے ایک جماعت ان حضرات کی ہے جو حدیث مرسل کو قابل قبول مانتے ہیں۔ یونٹ کے اس حصہ میں ہم ”حدیث مرسل“ کے بارے میں ان علماء کا موقف اور ان کے دلائل پر گفتگو کریں گے.....

آپ سے گزارش ہے کہ یونٹ کے اس حصہ کا مطالعہ ایک بار نہیں بلکہ بار بار کریں کیونکہ یہ بہت اہم اور مفید موضوع ہے۔ آپ اسے توجہ اور دلجمعی کے ساتھ پڑھیں گے۔ تو ان شاء اللہ اسے بہت دلچسپ اور مفید پائیں گے..... آئیے! پہلے اس جماعت کے نمائندہ علماء کے اقوال کا مطالعہ کرتے ہیں۔

خطیب بغدادی حدیث مرسل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(اختلاف العلماء فی وجوب العمل بما هذه حالة، فقال بعضهم انه مقبول ويجب العمل به اذا كان المرسل ثقة عدلا، وهذا قول مالک و اهل مدينة و أبی حنیفة و اهل العراق) (الكفاية ص: ۳۸۳)

حدیث مرسل پر عمل کرنے کے ضمن میں علماء کا اختلاف ہے بعض حضرات کہتے ہیں کہ ”مرسل“ قابل قبول ہے۔ جو راوی ارسال کر رہا ہے اس کی ثقاہت اور عدالت اگر ثابت ہو تو پھر ایسی مرسل پر عمل کرنا واجب اور ضروری ہے..... یہ قول امام مالک، علماء مدینہ علماء عراق اور امام ابو حنیفہ کا ہے۔

امام حاکم لکھتے ہیں:

(اما مشائخ اهل الكوفة فكل من أرسل الحديث من التابعين و أتباع التابعين من العلماء فإنه عند هم مرسل محتج به) (معرفة علوم الحديث: ص ۲۶)

جہاں تک علماء کوفہ کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک تابعین اور تبع تابعین میں سے جس نے بھی حدیث براہ راست روایت کی ہو وہ ”مرسل“ کہلاتی ہے اور قابل قبول ہے۔۔۔۔۔

امام غزالی کہتے ہیں:

(المرسل مقبول عند مالک و ابی حنیفة و الجماہیر) (المتصفح: ج ۱ . ص ۷۱)

حدیث مرسل امام مالک، امام ابو حنیفہ اور جمہور علماء کے نزدیک قابل قبول ہے۔

حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں:

(وأصل مذهب مالک، والذي عليه جماعة أصحابنا المالكيين . ان مرسل الثقة

تجب به الحجة ويلزم به العمل كما يجب بالمسند سواء) (التمهيد: ج ۱ . ص ۳)

امام مالک کا موقف یہ ہے کہ ثقہ راوی کی ”مرسل“ حجت اور قابل استدلال ہے اور اس پر عمل کرنا

ضروری ہے مالکی مسلک کے علماء کا اس اصول پر اتفاق ہے۔

حافظ ابن عبد البر نے (التمهيد لما في المؤطا من المعاني والأسانيد) میں اس موضوع پر

بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ آپ اگر مزید مطالعہ کرنا چاہیں تو اس کی طرف رجوع کریں۔۔۔۔۔ پونٹ

میں چونکہ زیادہ لمبی بات کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے اب ہم ان علماء کے دلائل کی طرف آتے ہیں

اور ترتیب کے ساتھ ان کا جائزہ لیتے ہیں۔۔۔۔۔

5.1 اجماع صحابہ و تابعین

حدیث مرسل کو قابل قبول ماننے والے علماء کی پہلی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں

حدیث مرسل پر بغیر کسی اختلاف کے عمل رہا۔ علامہ سیف الدین آمدی کہتے ہیں (المختار قبول مراسیل العدل مطلقاً و دلیلہ الاجماع والمعقول) (الاحکام فی اصول الاحکام: ج ۲- ص ۱۲۷)

پسندیدہ اور بہترین موقف یہ ہے کہ ثقہ راوی کی مراسیل قابل قبول ہیں۔ اس موقف کی تائید اجماع اور عقل دونوں سے ہوتی ہے..... آپ لکھتے ہیں (أما الاجماع فهو أن الصحابة والتابعين اجمعوا على قبول المراسيل من العدل، أما الصحابة فانهم قبلوا أخبار عبدالله بن عباس مع كثرة روايته، وقد قيل انه لم يسمع من رسول الله ﷺ سوى أربعة احاديث لصغر سنه، وايضا ماروى عن البراء بن عازب انه قال: ما كل ما نحدثكم به سمعناه من رسول الله ﷺ ولكن سمعنا بعضه وحدثنا اصحابنا ببعضه) (الاحکام: ج ۲- ص ۱۷۷)

جہاں تک اجماع کا تعلق ہے تو صحابہ کرام اور تابعین اس بات پر متفق رہے کہ ثقہ راوی کی مراسیل حجت اور قابل قبول ہیں۔ صحابہ کرام نے عبد اللہ بن عباس کی روایات کو قبول کیا حالانکہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست صرف چار روایات اخذ کی ہیں۔ اس لئے کہ آپ کم عمر تھے..... اسی طرح حضرت براء بن عازب سے منقول ہے کہ ہم جو کچھ روایت کرتے ہیں یہ سب کچھ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست نہیں سنا بلکہ کچھ تو ہم نے اپنے ساتھیوں (صحابہ) سے سنا ہے اور کچھ رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سنا ہے۔

ابن جریر کہتے ہیں:

(أجمع التابعون بأسرهم على قبول المرسل ولم يأت عنهم انحره ولا عن أحد من الانمة بعدهم إلى رأس المأتين) (تواعد التحدیث: ص ۱۳۴)

”مرسل“ کے قابل عمل ہونے پر تابعین کا اتفاق رہا اس بارے میں ان حضرات کا اختلاف اور انکار ثابت نہیں۔

امام ابو داؤد اس ضمن میں کہتے ہیں:

(أما المراسيل فقد كان يحتج بها العلماء فيما مضى مثل سفیان الثوري و مالک و
الاوزاعي حتى جاء الشافعي فتكلم فيها و تابعه على ذلك أحمد بن حنبل وغيره) (مقدمہ
على المراسيل للامام أبي داؤد: ص - ۱)

جہاں تک مراسیل کا تعلق ہے تو شروع کے فقہاء مثلاً سفیان ثوری، امام مالک اور امام اوزاعی ان
سے استدلال کرتے تھے ہاں جب امام شافعی کا دور آیا تو آپؒ نے مراسیل کی حیثیت پر کلام کیا اور امام احمد
بن حنبل نے اس ضمن میں ان کی پیروی کی۔ علامہ آدمی نے ”الاحکام فی اصول الاحکام“ میں اس موضوع
پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اگر آپ اس سلسلے میں مزید مطالعہ کرنا چاہیں تو اس کی طرف رجوع کریں۔

5.2 صحابی کی ”مرسل“ حجت ہے

”مرسل“ کو حجت کہنے والے علماء کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب صحابی کی ”مرسل“ محض اس لئے حجت
ہے کہ اس کی عدالت یقینی ہے اور جس سے اس نے ارسال کیا ہے وہ بھی صحابی ہونے کی وجہ سے ثقہ ہے۔ تو
پھر وہ تابعی جس کی عدالت ثابت ہے اس کی مرسل بھی قابل قبول ہونی چاہیے۔ اس لئے کہ جس راوی کا نام
اس نے نہیں لیا وہ صحابی ہوگا۔ اور صحابہ سب کے سب عادل ہیں یا وہ کبار تابعین میں سے ہوگا جو اس ثقہ
راوی کے نزدیک قابل اعتماد ہوگا۔ ان حضرات کی یہ دلیل بہت وزنی ہے اس لئے کہ صحابی کی مرسل کے
حجت ہونے پر جمہور علماء کا اتفاق ہے۔

حافظ عراقی ”الفیہ“ میں کہتے ہیں:

(أما الذي أرسله، الصحابي..... فحكمه الوصل على الصواب)
وہ حدیث جسے کسی صحابی نے مرسل بیان کیا ہو اس کا حکم علماء کے نزدیک موصول کا ہے۔

امام نووی لکھتے ہیں:

(أما مرسل الصحابي وهو روايته مالم يدركه أو يحضره كقول عائشة: أول ما بدئ به رسول الله منها الوحي الرؤيا الصالحة..... فمذهب الشافعي والجماهير أنه يحتاج به) (شرح مقدمه صحيح مسلم: ص- 14)

جہاں تک مرسل صحابی کا تعلق ہے تو یہ جمہور علماء کے نزدیک حجت ہے اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ صحابی نے خود رسول اللہ ﷺ سے حدیث نہ سنی ہو بلکہ کسی اور صحابی سے سن کر پھر اس حدیث کو براہ راست روایت کر دیا ہو..... مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ”آغاز وحی والی حدیث“ اس قسم کی حدیث کے بارے میں امام شافعی اور جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ یہ حجت، قابل قبول اور قابل عمل ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی مرسل صحابی کے بارے میں لکھتے ہیں: جس ”مرسل“ کے بارے میں علماء کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے وہ ”وہ مرسل“ ہے جو صحابی کی نہ ہو..... جہاں تک مرسل صحابی کا تعلق ہے جس میں اس نے رسول اللہ ﷺ کے کسی قول یا فعل کو نقل کیا ہو تو مشہور اور صحیح قول یہ ہے کہ ایسی روایت حجت ہے۔

محدثین اور فقہاء نے جمہور کا موقف یہی بتایا ہے کہ صحابی کی ”مرسل“ قابل تسلیم و اعتماد ہے ان حضرات کے نزدیک صحابی کی ”مرسل“ اس لئے قابل استدلال ہے کہ اصولاً صحابہ سب کے سب عادل ہیں اور ”عادل راوی“ کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے جو روایت بیان کی ہے وہ بے بنیاد اور بے اصل ہے..... اس اصول کو مد نظر رکھ کر اگر یہ کہا جائے کہ غیر صحابی یعنی تابعی کے بارے میں بھی اگر علمائے رجال کا اتفاق ہو جائے کہ وہ ثقہ اور عادل ہے تو پھر اس کے ارسال کی بھی وہی حیثیت ہونی چاہیے جو صحابی کی ارسال کی ہے اس لئے کہ دونوں کی ثقاہت اور عدالت کی شہادت موجود ہے۔

5.3 ثقہ راوی کا ارسال تعدیل ہے

جو علماء ”حدیث مرسل“ کو حجت کہتے ہیں ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب ارسال کرنے والا راوی ثقہ اور عادل ہے اور اس کی روایت پر اعتماد کرنا اصولاً ہماری ذمہ داری ہے تو پھر اگر وہ اپنے سے پیشتر راوی کا نام لئے بغیر روایت کرتا ہے تو ہمیں اس کی عدالت کی بنیاد پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے جس راوی کا نام

نہیں لیا وہ اس کے نزدیک عادل اور قابل اعتماد ہے علامہ آمدی نے اس پر بڑی عمدہ گفتگو کی ہے۔ ہم یہاں اس کا مفہوم پیش کرتے ہیں۔

”عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ جب ایک ثقہ راوی پورے اعتماد کے ساتھ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا تو اس کی روایت کو قبول کر لینا چاہئے اس لئے کہ اس کی حیثیت کبھی بھی اس کو یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ بغیر علم و یقین کے وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی روایت منسوب کرے اگر اس کے ذہن میں یہ بات ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات نہیں کہی یا اسے کسی قسم کا شک ہو تو وہ کبھی بھی اعتماد اور رسوخ کے ساتھ ایسی بات نہ کرے۔ اس کی تقویٰ اور دین داری اس کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ اگر روایت میں جھوٹ اور تدلیس ہو تو وہ ضرور اس کی صراحت کرے اور جب صورت حال ایسی ہے تو پھر لازم ہے کہ جس سے اس نے روایت اخذ کی ہے اسے ثقہ تسلیم کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ نامعلوم راوی ثقہ و عادل ہے۔ اگر ہم یہ ماننے کیلئے تیار نہ ہوں تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اسے اس خبر کی صداقت کا علم اور یقین نہیں تھا۔ جبکہ ثقہ راوی کے بارے میں ایسا کہنا اور سمجھنا اصولاً صحیح نہیں۔ (الاحکام فی اصول الاحکام: ج ۲، ص ۱۸۵)

حدیث مرسل کو حجت کہنے والے علماء کہتے ہیں کہ ارسال کرنے والا راوی ثقہ ہوتے ہوئے اگر کسی راوی کے بارے میں کہہ دے کہ وہ ثقہ ہے تو ہم اس کی بات مانتے ہیں۔ اب اگر وہ کسی راوی کے بارے میں خاموشی اختیار کرتا ہے تو ہمیں اس کی اس خاموشی کو بھی تسلیم کر لینا چاہئے اور سمجھ لینا چاہے کہ محذوف راوی ارسال کرنے والے راوی کے نزدیک ثقہ اور عادل ہے..... ابوالحسن بصری نے اس دلیل کو اپنی کتاب ”المعتمد“ میں بڑی تفصیل اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے..... اگر آپ اس کی تفصیل میں جانا چاہیں تو اس کی طرف رجوع کریں..... ابوالحسن بصری مذکورہ بالا نکتہ کے بعد لکھتے ہیں۔

”راوی اگر اپنے شیخ کے بارے میں کہہ دے کہ وہ ثقہ ہے اور شیخ کی ثقاہت کے اسباب بیان نہ کرے تو اس صورت میں اس کی روایت کو قبول کرنا اصولاً لازم ہے..... اس اصول پر امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے اصحاب کا اتفاق ہے..... آپ لکھتے ہیں علمائے حدیث کسی راوی کو اسباب عدالت بیان کئے بغیر

بھی عادل قرار دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اصولاً راوی اس وقت تک ثقہ ہے جب تک وہ کبار سے اجتناب کرتا ہے اور فرائض و واجبات کو ادا کرتا ہے۔ (کتاب المستمد: ص-۶۳۳)

علمائے حدیث اور فقہاء کے اس اصول کو مد نظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ جب اسباب عدالت بیان کئے بغیر ثقہ راوی کی تعدیل قابل قبول ہے تو پھر اس کا ارسال بھی قابل قبول ہونا چاہیے اس لئے کہ تعدیل اور ارسال میں کوئی خاص فرق نہیں..... تعدیل میں راوی اپنے الفاظ کے ذریعہ دوسرے راوی کی تعدیل کرتا ہے اور ارسال کی صورت میں وہ فعل کے ذریعہ مروی عنہ کو عادل بتاتا ہے..... گویا تعدیل کسی راوی کی قوی تعدیل ہے اور ”ارسال“ کسی راوی کی فعلی تعدیل ہے۔

علامہ قرانی نے اس ضمن میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے یہاں انکی بحث کا مفہوم پیش کیا جاتا ہے: ”مرسل کے جواز کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ارسال کرنے والا جب عادل اور ثقہ ہوتے ہوئے خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو اس کی یہ خاموشی بے وجہ نہیں ہو سکتی..... وہ جانتا ہے کہ جو حدیث وہ روایت کر رہا ہے شریعت پر اس کے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں..... لیکن پھر بھی خاموش رہتا ہے اس کی خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ جس راوی کا نام اس نے نہیں لیا وہ اس کے نزدیک عادل ہے اور اس کی عدالت میں اسے تردد نہیں ہے۔ یہاں اس کی خاموشی ایسی ہے گویا کہ وہ اس کی عدالت کی خبر دے رہا ہے..... اگر یہ راوی صراحتہ کہہ دیتا ہے کہ محذوف راوی ثقہ ہے تو ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے اور روایت قبول کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے سکوت کا بھی یہی حکم ہے۔“

5.4 روایت اور شہادت میں فرق

جن علماء کے نزدیک ”مرسل“ قابل قبول ہے ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ روایت اور شہادت میں اصولی اور فطری طور پر بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً شاہد (گواہ) جب قاضی کے سامنے پیش ہو کر شہادت دیتا ہے تو قاضی اس کی شہادت پر جرح کرتا ہے اور دیگر گواہوں کے بیانات کے ساتھ اس کا موازنہ کرنے کے بعد اس کی حیثیت متعین کرتا ہے..... جبکہ راوی جب اپنے تلامذہ کے سامنے روایت پیش کرتا ہے تو تلامذہ

پورے ادب و احترام کے ساتھ اسے سنتے ہیں اور روایت اپنے پاس محفوظ کرتے ہیں..... اسی طرح شہادت میں عدد کا اعتبار کیا جاتا ہے لیکن روایت میں عدد کا اعتبار نہیں..... شہادت میں حریت کا لحاظ رکھا جاتا ہے لیکن روایت میں حریت کی کوئی حیثیت نہیں..... امام ابوالحسن بصری نے اپنی کتاب ”المعتد“ میں اس دلیل کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اگر آپ تفصیل دیکھنا چاہیں تو اس کی طرف رجوع کر لیں.....

اب ہم حدیث مرسل کے بارے میں ایک اور جہت کی طرف آتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اسے مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

خود آزمائی ③

- ۱- امام حاکم نیشاپوری نے مشائخ کوفہ کا حدیث مرسل کی حجیت کے ضمن میں کیا موقف بتایا ہے۔
- ۲- حافظ ابن عبدالبر نے حدیث مرسل کے قابل استدلال ہونے سے متعلق مالکیہ کے مذہب پر کیا بحث کی ہے۔
- ۳- حدیث مرسل کی حجیت پر اجماع صحابہ و تابعین سے کیا مراد ہے؟
- ۴- حافظ ابن جریر نے حدیث مرسل پر عمل کرنے کے بارے میں کونسا نکتہ پیش کیا ہے۔
- ۵- صحابی کی مرسل کے بارے میں جمہور کا کیا مسلک ہے۔
- ۶- علامہ جلال الدین سیوطی نے مرسل صحابی کے بارے میں کیا گفتگو کی ہے۔
- ۷- ارسال کرنے والا راوی اگر ثقہ ہو تو اس کی روایت اخذ کرنے میں کیا حرج ہے؟
- ۸- امام شافعی نے حدیث مرسل کی قبولیت کیلئے کتنی شرائط پیش کی ہیں۔

⑥ حدیث مرسل شروط کے ساتھ قابل قبول ہے

عزیز طلبہ!

اب تک آپ ”حدیث مرسل“ کے بارے میں پڑھ چکے ہیں کہ ”حدیث مرسل“ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک قابل قبول نہیں جبکہ دوسری جماعت کے نزدیک قابل قبول ہے..... یونٹ کے اس حصہ میں ہم علماء کی اس جماعت کا تذکرہ کریں گے جن کا موقف یہ ہے کہ ”حدیث مرسل“ شروط کے ساتھ قابل قبول ہے۔ علامہ جلال الدین السیوطی کہتے ہیں:

(ذهب كثير من الائمة إلى الاحتجاج بالمرسل بملاحظات دقيقا فيها، منهم الامام الشافعي رحمه الله) (تدريب الراوى : ص-۲۰۰)
نووی لکھتے ہیں:

(قال الشافعي : احتج بمرسل كبار التابعين إذا اسند من جهة اخرى ، أو ارسله من اخذ عن غير رجاله الاول أو وافق قول الصحابي أو أفتى اكثر العلماء بمقتضاه..... هذا نظر الشافعي في الرسالة وغيرها وهكذا نقل عنه، الائمة المتقنون من الفقهاء والمحدثين كالبيهقي والخطيب) (تدريب الراوى : ص-۲۰۱)

امام شافعیؒ کہتے ہیں: میں اس ”مرسل“ کو قبول کرتا ہوں جسے کبار تابعین میں سے کسی نے روایت کیا ہو لیکن کسی دوسری سند سے وہ متصل ہو..... یا اس کا ارسال ایسے راوی نے کیا ہو جس نے پہلی روایت کے رواۃ کے علاوہ دیگر رواۃ سے اسے اخذ کیا ہو..... یا وہ کسی صحابی کے قول سے مطابقت رکھتی ہو یا اکثر علماء نے اس کی بنیاد پر فتویٰ دیا ہو..... (امام نوویؒ کہتے ہیں) کہ الرسالۃ میں امام شافعیؒ نے اپنا موقف یہی بتایا ہے

اور محققین فقہاء اور محدثین نے ان کا یہی قول نقل کیا ہے امام بیہقی اور خطیب بغدادی سے بھی یہی منقول ہے۔

”مرسل“ کی تائید میں اگر مسند یا مرسل روایت ہو تو امام شافعی اسے حجت کہتے ہیں حافظ عراقی اس بارے میں لکھتے ہیں:

(اعلم ان حکم المرسل حکم الحديث الضعيف إلا أن يصح مخرجه بمجئته من وجه آخر..... ولذا احتج الشافعي بمرسلات سعيد بن المسيب، فانها وجدت مسانيد من وجوه آخر، ولا يختص ذلك عنده بارسال ابن المسيب) (التقييد والايضاح: ص ۷۲)

حدیث مرسل کا حکم وہی ہے جو ضعیف کا ہے ہاں اگر اس کا مخرج دوسری سند سے ثابت ہو جائے تو پھر وہ ضعیف نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ امام شافعی نے سعید بن المسيب کی مراسیل کو قابل استدلال کہا ہے۔ سعید کی مراسیل کی تائید مسند روایات سے ہوتی ہے..... امام شافعی کا موقف یہ نہیں کہ سعید کی مراسیل سعید کی وجہ سے قابل قبول ہیں بلکہ ان کی قبولیت کی بنیاد ان روایات پر ہے جو ان کی تائید کرتی ہیں۔ اگر سعید کی مراسیل کے علاوہ کسی اور راوی کی مراسیل بھی ایسی ہوں جن کی تائید مسند روایات سے ہوتی ہو تو وہ بھی امام شافعی کے نزدیک قابل قبول ہیں۔

6.1 شرائط بحیثیت

امام شافعی نے حدیث مرسل کے قابل استدلال ہونے کیلئے چند شرائط کا تذکرہ کیا ہے۔

یہاں ترتیب وار ان شروط کو نقل کیا جاتا ہے تاکہ امام کے موقف کی پوری طرح وضاحت ہو سکے۔

(قال الشافعي: فقلت له: المنقطع مختلف: فمن شاهد أصحاب رسول الله ﷺ من

التابعين فحدث حديثا منقطعا اعتبر عليه بأمور)

(۱)..... (منها: أن ينظروا إلى ما أرسل من الحديث، فإن شرکه فيه الحفاظ المأمونون

فأَسْنَدُوهُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ بِمِثْلِ مَعْنَى مَا رَوَى كَانَتْ هَذِهِ دَلَالَةٌ عَلَى صِحَّةِ مَنْ قَبْلَ عِنْدِهِ، وَحَفَظَهُ) (كتاب الرسالة: ص-۴۶۲)

امام شافعی کہتے ہیں۔ ”میں نے سوال کر نیوالے کو بتایا کہ منقطع روایت کے درجات مختلف ہیں۔ اگر تابعین میں سے ایسے راوی نے جسے صحابہ کرامؓ کی صحبت حاصل رہی ہو رسول اللہ ﷺ کی حدیث سند منقطع کے ساتھ روایت کی تو اس صورت میں چند امور کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

(۱)۔۔۔۔۔ ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ جس حدیث میں اس راوی نے ارسال کیا ہے اسے دیکھا جائے۔ اگر دوسرے ثقہ راویوں نے بھی اسے روایت کیا ہو اور انہوں نے اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ جس راوی سے روایت اخذ کی گئی ہے وہ صحیح ہے۔

(۲)۔۔۔۔۔ اگر ارسال کرنے والا راوی ارسال میں منفرد ہو اور دوسرے رواۃ نے سنداً اس قسم کی حدیث روایت نہ کی ہو تو اس صورت میں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا اس ”مرسل“ کی تائید میں کوئی اور ”مرسل“ موجود ہے یا نہیں۔۔۔۔۔ اگر مرسل کی تائید میں دوسری ایسی ”مرسل“ موجود ہو تو جس کے شیوخ مختلف ہوں تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ یہ مرسل قوی ہے۔

(۳)۔۔۔۔۔ اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی صحابی کا قول اس مرسل کی تائید میں پایا جاتا ہے؟۔۔۔۔۔ اگر کسی صحابی کا قول اس کی تائید کر رہا ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس مرسل کی بنیاد کسی صحیح حدیث پر ہے۔۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ صحابی کے قول کی بنیاد حدیث صحیح پر ہوتی ہے اور جب وہ ”مرسل“ کی تائید کر رہا ہو تو اس کے معنی ہیں کہ روایت کی بنیاد مضبوط اور قوی ہے۔

(۴)۔۔۔۔۔ اسی طرح اگر علماء حضرات کسی مرسل روایت کی بنیاد پر فتویٰ دیتے رہے ہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ روایت صحیح ہے۔۔۔۔۔ مقصد یہ ہے کہ ”مرسل“ کی تائید اگر عام علماء کے فتویٰ سے ہو رہی ہو تو قابل استدلال ہے۔

(۵)..... امام شافعی نے کہا ”پھر یہ دیکھا جائے گا کہ راوی سے جس شخص نے روایت کیا ہے وہ مجہول اور غیر مقبول مشائخ سے اخذ تو نہیں کرتا..... اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ غیر مقبول مشائخ سے اخذ نہیں کرتا تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس کی روایت میں صحت ہے.....

ان شرائط کو ترتیب کیساتھ بیان کر لینے کے بعد امام شافعی کہتے ہیں ”جب ارسال کرنے والے کی روایت میں مذکورہ شرائط موجود ہوں تو ہم چاہیں گے کہ اسے قبول کر لیں۔ (الرسالۃ: ص-۲۶۴)

امام شافعیؒ نے کبار تابعین کے بعد دوسرے اور تیسرے طبقہ کے تابعین کی مراسیل کو قابل قبول نہیں سمجھا۔ آپؒ لکھتے ہیں: (فاما من بعد کبار التابعین الذین کثرت مشاہدتهم بعض اصحاب رسول اللہ ﷺ فلا اعلم منهم واحداً یقبل مرسله)

کبار تابعین کے بعد جن حضرات نے بعض صحابہ کرامؓ کو دیکھا اور ان سے استفادہ کیا میں نہیں جانتا کہ کسی نے بھی ان کی مرسل کو قبول کیا ہو..... اس کے بعد امام صاحب نے صغار تابعین کی مراسیل کی عدم قبولیت کے اسباب بیان کئے ہیں۔ اور اس ضمن میں اپنے تجربات پیش کئے ہیں اگر آپ اس بحث کو تفصیلاً دیکھنا چاہیں تو کتاب الرسالۃ کی طرف رجوع کریں۔

امام شافعی نے اس موضوع پر سوال و جواب کی شکل میں بڑی عمدہ گفتگو فرمائی ہے..... امام ابو داؤد کا کہنا ہے کہ امام شافعی نے پہلی مرتبہ ”مراسیل“ کو موضوع بحث بنایا۔ آپ سے پہلے اس موضوع پر کسی نے بھی بات نہیں کی..... حقیقت یہ ہے کہ امام شافعی سے پہلے جن حضرات نے ”مراسیل“ پر گفتگو کی ہے وہ اجمالی اور غیر مرتب ہے۔ امام شافعی نے بڑی ترتیب اور تفصیل کے ساتھ اسے پیش کیا ہے اور بہت خوبصورت اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے۔

⑦ اہم نکات

عزیز طلبہ!

آپ نے ”حدیث مرسل“ کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ مطالعہ کر لیا..... مجھے امید ہے کہ آپ نے اس کے مضامین کو سمجھ لیا ہوگا یہاں ایک بار پھر آپ کی توجہ چند اہم نکات کی طرف دلائی جاتی ہے۔

(۱)..... ”مرسل“ کی حیثیت اور حجیت کے بارے میں علماء حضرات کا اختلاف کیوں پیدا ہوا؟..... اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ”مرسل“ علمائے حدیث کی اصطلاح میں کچھ اور ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں کچھ اور ہے اور فقہاء و اہل اصول اس میں تعیم کرتے ہیں اور قرن ثانی و ثالث تک ہر ثقہ راوی کی روایت کو مرسل کہتے ہیں..... پھر علمائے حدیث کے اندر اس کی تعریف کے سلسلہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک محض کبار تابعین کی روایات مراسل ہیں اور بعض کے نزدیک صغارتا تابعین کی روایات بھی مراسل کے زمرہ میں آتی ہیں.....

(۲)..... علمائے حدیث ”مرسل“ کو اس لئے حجت نہیں مانتے کہ اس کی سند میں انقطاع ہوتا ہے اور انقطاع ایسی وجہ ہے جس سے روایت کی صحت بری طرح متاثر ہوتی ہے..... علمائے حدیث کی یہ دلیل بڑی ٹھوس اور مضبوط دلیل ہے لیکن یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سند میں انقطاع تو اس صورت میں بھی ہوتا ہے جب صحابی ارسال کر رہا ہو۔ صحابہ میں بھی تو مختلف طبقات تھیں۔ کئی صحابہ ایسے ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست بہت کم روایات لی ہیں ان کی زیادہ تر روایات کبار صحابہ سے ہیں صحابہ کی مراسل کے بارے میں علمائے حدیث کا موقف یہ ہے کہ یہ قابل قبول اور حجت ہیں..... اگر صحابی کی مرسل (سند میں

انقطاع) کے باوجود قابل قبول ہے تو تابعی کی مرسل کیوں قابل رد ہے.....؟

(۳)..... علمائے حدیث کہتے ہیں کہ جس طرح شہادت میں ارسال قابل قبول نہیں اسی طرح روایت میں بھی ارسال قابل قبول نہیں۔ قاضی کے سامنے اگر فرع کے گواہ اصل گواہوں کا تذکرہ کئے بغیر شہادت دیں تو وہ کبھی بھی شہادت قبول نہ کرے..... یہ دلیل اپنی جگہ مضبوط سہی لیکن یہ بات ثابت ہے کہ شہادت اور روایت میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ روایت میں عدد کی کوئی شرط نہیں لیکن شہادت میں عدد شرط ہے۔ روایت میں حریت کی شرط نہیں لیکن شہادت میں ہے۔ قاضی اور محدث کی حیثیت میں بھی نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ قاضی کے سامنے اگر مدعی گواہ پیش نہ کر سکے تو وہ مدعی علیہ سے قسم کا مطالبہ کرتا ہے..... محدث سند اور متن کو پرکھ کر فیصلہ کرتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ قاضی کے پاس مقدمہ کا تفصیلی ریکارڈ ہوتا ہے۔ مقدمہ اس کے اپنے دور کا ہوتا ہے اور اس میں براہ راست چھان پھنک کر سکتا ہے۔ جبکہ محدث کی حیثیت اس پہلو سے اس طرح کی نہیں.....

(۴)..... امام شافعی نے حدیث مرسل کے قابل قبول ہونے کے لئے ایک شرط یہ رکھی ہے کہ اس کی تائید میں دوسری ایسی ”مرسل“ ہو جس کے شیوخ اس کے شیوخ سے مختلف ہوں..... یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک اگر مرسل حجت نہیں تو دوسری مرسل کی تائید سے وہ حجت کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لئے کہ دونوں حجت نہیں..... امام شافعی کی اس شرط کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے.....؟

(۵)..... امام شافعی کی ایک شرط یہ ہے کہ مرسل تب قابل قبول ہے جب اس کی تائید میں کسی صحابی کا قول ہو..... یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ کبار تابعین نے زیادہ تر استفادہ صحابہ کرام سے کیا ہے اگر ایک راوی کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا تعلق کبار تابعین کے طبقہ سے ہے تو اس کے بعد یقین کر لینا چاہیے کہ اس کی ”مرسل“ بے بنیاد نہیں ہوگی..... آپ اس شرط کے بارے میں کیا کہتے ہیں.....؟



یونٹ نمبر ⑪

روایۃ الحدیث بالمعنی

تحریر: ڈاکٹر علی اصغر چشتی
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی



فہرست

359	یونٹ کا تعارف	
360	یونٹ کے مقاصد	
361	روایت باللفظ اور روایت بالمعنی	①
365	روایت بالمعنی جائز ہے	②
369	خود آزمائی 1	
370	روایت بالمعنی جائز نہیں	③
377	روایت بالمعنی شروط کے ساتھ جائز ہے	④
384	4.1 دلائل	
385	4.2 نص	
386	4.3 اجماع	
386	4.4 آثار	
387	4.5 عقلی دلیل	
390	خود آزمائی 2	

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ!

اس وقت جو یونٹ آپ کے ہاتھ میں ہے اس کا تعلق علم حدیث کے ایک بہت اہم پہلو سے ہے۔ علمائے حدیث نے اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ اپنے شیوخ سے انہیں جن الفاظ اور کلمات کے ساتھ حدیث حاصل ہو وہ اس حدیث کو انہی الفاظ اور کلمات کے ساتھ اپنے پاس محفوظ کر لیں۔ حدیث کو اپنے پاس محفوظ کرنے کیلئے علمائے حدیث کے ہاں ”ضبط“ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ”ضبط“ کے بارے میں آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں۔

محدثین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ شیخ سے جو حدیث سنی اسے ہو بہو ضبط کر لیا۔ لیکن بعض مرتبہ ایسا ہوتا رہا کہ شیخ سے جو حدیث سنی اس کے الفاظ اور کلمات کے بجائے اس کا مفہوم ضبط کر لیا۔ علمائے حدیث کے ہاں کسی حدیث کے الفاظ و کلمات کو ضبط کر کے اس کے روایت کرنے کو ”روایت باللفظ“ کہتے ہیں۔ اور حدیث کے مفہوم و مطالب کو ضبط کر کے اس کے روایت کرنے کو ”روایت بالمعنی“ کہتے ہیں۔ آپ اس یونٹ میں ان دونوں حوالوں سے مطالعہ کریں گے ”روایت باللفظ“ اور ”روایت بالمعنی“ کے بارے میں علماء اور فقہاء سے جو اقوال منقول ہیں انہیں پڑھیں گے۔ یونٹ میں چونکہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے اختصار کے ساتھ اہم نکات کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کی گئی ہے۔ آپ کی سہولت کیلئے مآخذ کے حوالہ جات دیئے گئے ہیں۔ آپ اس یونٹ کو ایک بار نہیں بلکہ بار بار پڑھیں۔ امید ہے جب آپ اس کا مطالعہ توجہ اور انہماک کے ساتھ کریں گے تو اسے مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

- اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:
- ⇐ روایت باللفظ کا مفہوم لفظاً اور اصطلاحاً بیان کر سکیں۔
 - ⇐ روایت بالمعنی کی تعریف کر سکیں۔
 - ⇐ روایت باللفظ کی اہمیت اور افادیت پر بحث کر سکیں۔
 - ⇐ روایت بالمعنی کے بارے میں علمائے حدیث کے اقوال اور موقف کا جائزہ لے سکیں۔
 - ⇐ روایت بالمعنی کے بارے میں فقہاء کے موقف اور دلائل پر تبصرہ کر سکیں۔
 - ⇐ روایت بالمعنی کے جواز اور عدم جواز کے ضمن میں فقہاء اور محدثین کے دلائل کا موازنہ کر سکیں۔

① روایت باللفظ..... اور..... روایت بالمعنی

مفہوم:- روایت باللفظ

روایت باللفظ سے مراد یہ ہے کہ راوی اپنے شیخ سے جن الفاظ اور کلمات کے ساتھ حدیث اخذ کرے۔ انہی کلمات اور الفاظ کے ساتھ اسے اپنے پاس محفوظ کر لے..... حدیث کے الفاظ اور کلمات میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرے..... اس کے بعد جب اپنے تلامذہ (شاگردوں) کے سامنے اس حدیث کو روایت (بیان) کرے تو بھی اس کے الفاظ اور کلمات کا پورا پورا خیال رکھے..... علمائے حدیث کے ہاں ضبط لفظی کو ”ضبط ظاہر“ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ضبط اور روایت کا سب سے اعلیٰ اور قابل ترجیح طریقہ ہے۔

روایت بالمعنی:

روایت بالمعنی سے مراد یہ ہے کہ راوی حدیث کے الفاظ و کلمات کے بجائے، حدیث کے معنی و مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کرے۔

حافظ ابن الصلاح روایت بالمعنی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(إذا أراد رواية ما سمعه على معناه دون لفظه) (ابن الصلاح: ۲۱۳)

جب راوی حدیث کے الفاظ کے بجائے اس کے معنی و مفہوم کی روایت (بیان) کرے..... تو اس کا یہ عمل ”روایت بالمعنی“ کہلائے گا..... مقصد یہ ہے کہ راوی کے پاس جو حدیث ہے وہ اس کو ہو بہو الفاظ کے بجائے اس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں پیش کرے.....

حدیث کی روایت کے سلسلے میں علمائے حدیث کا اصول یہ ہے کہ اس میں انتہائی اہتمام سے کام لیا جائے۔ یہاں تک کہ حروف اور اعراب تک کا خیال رکھا جائے۔ اس لئے بعض علماء کے نزدیک ”روایت بالمعنی“ جائز نہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ حدیث کی اہمیت اور حیثیت کو پیش نظر رکھ کر ”روایت باللفظ“ ہی کو بنیاد بنانا چاہیے۔ اور روایت بالمعنی کی اجازت نہیں دینی چاہیے..... علماء کی ایک اور جماعت کے نزدیک روایت باللفظ اور روایت بالمعنی دونوں جائز ہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ راوی اگر حدیث کے الفاظ اور ترتیب و ترکیب سے پوری طرح واقف ہو اور اتنی صلاحیت رکھتا ہو کہ حدیث کے مفہوم کو کسی تغیر کے بغیر اپنے الفاظ میں منتقل کر سکے تو اس میں کوئی حرج نہیں..... ہاں اگر راوی حدیث کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کیلئے ”روایت بالمعنی“ بالکل جائز نہیں..... امام غزالی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

(قال العلماء: نقل الحديث بالمعنى دون اللفظ حرام على الجاهل بمواقع الخطاب، و دقائق الالفاظ) (المستصفى: ج. ۱، ص. ۱۶۸)

جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ جو راوی حدیث کی ترتیب و ترکیب اور اسکے الفاظ کے صحیح مفہوم سے واقف نہ ہو اس کے لئے ”روایت بالمعنی“ حرام ہے..... ہاں اگر راوی ایسا ہو کہ محتمل اور غیر محتمل میں فرق کر سکتا ہو۔ ظاہر اور اظہر کو جانتا ہو، عام اور اعم سے واقف ہو تو اس کے لئے روایت بالمعنی جائز ہے۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ، جمہور فقہاء اور محدثین کی اکثریت کا یہی مسلک ہے۔

حافظ ابن الصلاح ”روایت بالمعنی“ کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(فإن لم يكن عالماً عارفاً بالالفاظ و مقاصدها.....) (ابن الصلاح: ۲۱۳)

اگر راوی کو حدیث کے الفاظ و کلمات کے مقاصد و مفہوم کی صحیح سمجھ نہ ہو وہ یہ نہ جانتا ہو کہ الفاظ کی تبدیلی سے مفہوم میں کیا تبدیلی آتی ہے..... اسے یہ علم نہ ہو کہ الفاظ اور متبادل الفاظ میں کیا فرق ہے..... تو ایسے راوی کیلئے بالاتفاق جائز نہیں کہ وہ ”روایت بالمعنی“ سے کام لے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ حدیث کی روایت انہی الفاظ میں کرے جو اس نے اپنے شیخ سے سنے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کرے۔

امام ابن حزم اندلی ظاہری ”روایۃ بالمعنی“ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

(وَأَمَّا مِنْ حَدِيثٍ وَأَسْنَدُ الْقَوْلِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَقَصْدُ التَّبْلِيغِ لِمَا بَلَغَهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَا يَحِلُّ لَهُ إِلَّا أَنْ يَتَحَرَّى كَمَا سَمِعَهَا، لَا يَبْدُلُ حَرْفًا مَكَانَ آخَرَ وَإِنْ كَانَ مَعْنَاهُمَا وَاحِدًا وَلَا يَقْدُمُ حَرْفًا وَلَا يُؤَخِّرُ آخَرَ) (الاحکام: ج. ۲، ص. ۸۶)

حدیث کا جو بھی راوی رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد کو روایت کرنا چاہے اور اس کی نیت یہ ہو کہ جو حدیث اس کے پاس ہے وہ امت مسلمہ کے دوسرے افراد تک پہنچ جائے تو اس صورت میں اس کے لئے ضروری ہے کہ انہی الفاظ کے ساتھ حدیث روایت کرے جن کے ساتھ اس نے اپنے شیخ سے حدیث اخذ کی ہے۔ کسی لفظ کو دوسرے لفظ کے آگے پیچھے نہ رکھے۔ یعنی الفاظ کی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھے۔

علامہ سیف الدین الآمدی نے اپنی کتاب ”الاحکام فی اصول الاحکام“ میں اس موضوع پر بہت عمدہ اور مفید گفتگو کی ہے۔ آپ اس ضمن میں فقہاء کا موقف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(والذی علیہ اتفاق الشافعی، ومالک وابو حنیفہ و احمد بن حنبل والحسن البصری.....) (الاحکام: ج. ۲، ص. ۱۴۶)

امام شافعی، امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد، امام حسن بصری اور جمہور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس راوی کو الفاظ کے مدلولات اور مواقع کے اختلاف کا علم نہ ہو اس کیلئے ”روایۃ بالمعنی“ حرام ہے۔

راوی اگر حدیث کے الفاظ، کلمات اور اسکی ترتیب و ترکیب سے پوری طرح واقف ہو اور علمی رسوخ رکھتا ہو تو اس کے لئے ”روایۃ بالمعنی“ جائز ہے یا نہیں.....؟ اس پہلو سے بھی علماء کے اقوال میں اختلاف ملتا ہے..... جمہور کے نزدیک علمی صلاحیت رکھنے والے راوی کے لئے ”روایۃ بالمعنی“ جائز ہے۔ لیکن بعض محدثین اور فقہاء کے نزدیک ”روایۃ بالمعنی“ بالکل جائز نہیں..... حافظ ابن الصلاح اس بارے میں لکھتے ہیں:

(اما اذا كان عالماً عارفاً بذلك فهذا مما اختلف فيه.....) (التقييد والايضاح: ص ۲۲۶)
اگر راوی حدیث کے متن کو ہر پہلو سے سمجھتا ہو تو اس بارے میں محدثین، فقہاء اور اہل اصول کا
اختلاف ہے۔ جمہور نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض محدثین اور شافعی علماء کی ایک جماعت نے اس کی
اجازت نہیں دی ہے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں:

(فالخلاف فيها شهير والاكثر على الجواز ايضاً) (نزهة النظر: ۹۴)
”روایۃ بالمعنی“ کے سلسلہ میں اختلاف مشہور ہے لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ راوی اگر عالم ہو تو اس
کیلئے جائز ہے۔

”روایۃ بالمعنی“ کے ضمن میں علماء سے جتنے اقوال منقول ہیں ان سب کو جمع کر کے دیکھا جائے تو تین
موقف سامنے آتے ہیں۔

- (i) ”روایۃ بالمعنی“ مطلقاً جائز ہے۔
- (ii) ”روایۃ بالمعنی“ مطلقاً ناجائز ہے۔
- (iii) ”روایۃ بالمعنی“ شروط کے ساتھ جائز ہے۔

اب ہم ان تینوں مسالک پر ترتیب کے ساتھ بحث کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہر گروہ نے اپنے
اپنے موقف کے حق میں جو دلائل دیئے ہیں ان کی نوعیت اور حیثیت کیا ہے.....؟ آپ یونٹ کے اس حصہ کو
بہت توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں۔ پہلی مرتبہ مطالعہ کرنے سے ممکن ہے آپ کو سمجھنے میں دقت محسوس ہو لیکن
جب آپ دوسری اور تیسری مرتبہ اس کو پڑھیں گے تو آپ کے ذہن میں خود بخود مواد بیٹھتا چلا جائے گا اور
آپ محسوس کریں گے کہ یہ بحث نہ صرف یہ کہ مفید ہے بلکہ دلچسپ اور خوشگوار بھی ہے۔ سب سے پہلے ہم ان
نما کا موقف پیش کر رہے ہیں جن کے نزدیک ”روایۃ بالمعنی“ جائز ہے۔

② روایت بالمعنی جائز ہے

جن حضرات کے نزدیک ”روایت بالمعنی“ جائز ہے وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جسے امام ابن مندہ نے معرفۃ الصحابہ اور امام طبرانی نے معجم کبیر میں نقل کیا ہے۔

((عن عبد الله بن سليمان بن اكنمه الليثي قال: قلت: يا رسول الله اني اسمع منك الحديث لا استطيع أن أوديه كما اسمع منك يزيد حرفاً أو ينقص حرفاً، فقال: إذا لم تحلوا حراماً ولم تحرموا حلالاً، وأصبتم المعنى فلا بأس..... فذكر ذلك للحسن فقال: لولا هذا ما حدثنا)) (تدريب الراوى : ج. ۲، ص ۹۲/ قواعد التحديث : ص ۲۳۲)

عبداللہ بن سلیمان کہتے ہیں ”میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا اللہ کے رسول! میں آپ سے حدیث سنتا ہوں لیکن کما حقہ اسے ادا نہیں کر سکتا۔ ادائیگی میں مجھ سے حروف کی کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ میری عرض سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں اگر حرام اور حلال کا مسئلہ پیدا نہ ہو اور مفہوم کو تم پوری طرح سمجھو تو حروف میں کمی بیشی کوئی ایسی بات نہیں۔“

اس حدیث کا تذکرہ جب امام حسن (بھری) کے سامنے کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اگر مفہوم بیان کرنے کی اجازت نہ ہوتی تو ہم روایت کیسے کرتے؟

امام شافعی نے (انزل القرآن علی سبعة أحرف فاقروا ماتیسر منه) کو بنیاد بنا کر اس ضمن میں گفتگو کی ہے۔ آپؒ لکھتے ہیں:

((وإذا كان الله برأفته بخلقه انزل كتابه على سبعة أحرف علمنا منه بأن الكتاب قد نزل لتحل لهم قراءته، وإن اختلف لفظهم فيه مالم يكن اختلافهم إحالة معنى كان ما سوى كتاب الله أولى أن يجوز فيه اختلاف اللفظ مالم يحل معناه)) (الرسالة : ص ۲۷۴)

جب اللہ جل شانہ نے مخلوق پر کمال مہربانی کرتے ہوئے اپنی کتاب کو سات حرفوں میں نازل فرمایا تو اس سے آسانی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم کا اس طرح (سات حروف میں) نزول تلاوت کرنے والوں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے..... اگر قرآن سات حرفوں میں نازل ہوا ہے تو دیگر امور میں تو الفاظ کا اختلاف بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔ بشرطیکہ معنی و مفہوم تبدیل نہ ہو۔

امام بیہقی نے امام مکحول الدمشقی سے نقل کیا ہے۔ آپؒ کہتے ہیں:

(دخلت أنا و أبو الازهر علی واثلة بن الأسقع فقلنا له، یا أبا الأسقع! حدثنا بحديث سمعته من رسول الله ﷺ ليس فيه وهم ولا مزيد ولا نسيان.....) (الكفاية في علم الرواية: ص ۲۰۵)۔

امام مکحولؒ کہتے ہیں ”میں اور ابو الازھر واثلہ بن الاسقع کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم نے دوران گفتگو آپؒ سے کہا: ابو الاسقع! ہمیں کوئی ایسی حدیث سنا دیجئے جو آپؒ نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سنی ہو اور اس کے بارے میں آپؒ کو کسی قسم کی کمی بیشی کا وہم نہ ہو..... ہماری بات سن کر آپؒ نے ہمیں مخاطب کیا اور کہا: آپؒ میں سے کسی نے قرآن کا کچھ حصہ حفظ کیا ہے؟ ہم نے کہا ہاں، لیکن ہم اتنے اچھے حافظ نہیں، ہم سے ”واو“ اور ”ہمزہ“ میں کمی بیشی ہو جاتی ہے..... ہماری بات سن کر حضرت واثلہ نے کہا: یہ قرآن ہے جو تمہارے پاس محفوظ و مکتوب ہے۔ تم اسے حفظ میں پورا اہتمام کرتے ہو اس کے باوجود تمہارا خیال ہے کہ، واو اور ہمزہ کی کمی بیشی ہو جاتی ہے..... جب قرآن کے حفظ کا یہ حال ہے تو حدیث کی روایت میں کیونکر ممکن ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے جن الفاظ و کلمات کے ساتھ سنا انہی الفاظ کے ساتھ اس کی روایت کریں..... ممکن ہے کہ روایات ایسی ہوں جو ہم نے رسول اللہ ﷺ سے محض ایک بار سنی ہوں..... آپ لوگوں کو اگر ہم حدیث کا معنی و مفہوم بتا دیں تو یہ آپؒ کے لئے کافی ہے۔

امام بیہقی نے جابر بن عبد اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے کہا (انا قوم عرب نردد الاحادیث فنقدم و نوخر) (تدریب الراوی: ج ۲، ص ۹۳)

ہم عربوں کا طریقہ یہ ہے کہ باتوں کو دہراتے رہتے ہیں اس لئے تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے۔

امام بیہقی، شعیب بن الحجاب سے نقل کرتے ہیں آپ نے کہا:

(دخلت انا و عبد ان علی الحسن، فقلنا: یا أبا سعید! الرجل يحدث بالحديث فيزيد فيه أو ينقص منه: قال: إنما الكذب على من تعمد ذلك)

میں اور عبد ان حضرت حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے بات چیت کے دوران میں ہم نے آپ سے پوچھا: ابو سعید! اس راوی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو حدیث روایت کرتے وقت حروف میں کمی بیشی کرتا ہے؟..... آپ نے فرمایا: اس کا یہ عمل جھوٹ کے زمرہ میں نہیں آتا..... جھوٹا راوی وہ ہے جو جان بوجھ کر حدیث کے الفاظ میں کمی بیشی کرتا ہے اور اس کے مفہوم کو بد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

جریر بن حازم کہتے ہیں:

(سمعت الحسن يحدث بأحاديث، الأصل واحد والكلام مختلف)
میں نے حضرت حسن بصری سے کئی ایسی روایات سنیں جن کا مفہوم ایک تھا اور الفاظ مختلف تھے۔

ابن عون کہتے ہیں:

(كان الحسن و ابراهيم الشعبي يأتون بالحديث على المعاني)
حسن بصری، ابراہیم نخعی اور شعبی حدیث کی روایت کرتے وقت معنی و مفہوم کو پیش نظر رکھتے تھے اور قاسم بن سعید، ابن سیرین اور رجا بن حیوہ الفاظ و حروف کا التزام کرتے تھے۔

ابو اویس کہتے ہیں:

(سألنا الزهري عن التقديم والتأخير في الحديث. فقال: إن هذا يجوز في القرآن فكيف به في الحديث؟ إذا أصبت معنى الحديث فلم تحل به حراماً ولم تحرم به حلالاً فلا بأس)

ہم نے امام محمد بن شہاب الزہری سے حدیث کے الفاظ میں تقدیم و تاخیر کے بارے میں پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا: تقدیم و تاخیر اگر آیات میں جائز ہے تو روایات میں کیوں جائز نہیں۔ اگر آپ کی رسائی حدیث کے صحیح مفہوم تک ہے اور الفاظ کی تبدیلی سے حرام، حلال اور حلال، حرام نہیں ہوتا تو ایسی تبدیلی میں کوئی حرج نہیں۔

سفیان کہتے ہیں:

(کان عمر بن دینار یحدث بالحديث علی المعنی، وکان ابراہیم بن میسرہ لا یحدث الا علی ماسمع)

عمر بن دینار حدیث کا معنی و مفہوم بیان کرتے تھے اور ابراہیم بن میسرہ حدیث کے الفاظ و کلمات کا اہتمام کرتے تھے۔

حضرت ولیع کہتے ہیں:

(ان لم یکن المعنی واسعا فقد هلك الناس)

حدیث کی روایت میں اگر مفہوم بیان کرنے کی گنجائش نہ ہو تو حدیث کے رواۃ کے پاس کوئی راستہ نہیں رہے گا۔

حافظ ابن جریر اقوال کو پیش نظر رکھ کر اپنی تعلیق میں کہتے ہیں:

(ومن اقوی حججهم الاجماع علی جواز شرح الشریعة بلسانها للعارف به، فاذا جاز الابدال بلغة اخرى، فجوازہ باللغة العربیة اولی)

روایت بالمعنی کے قائلین کے پاس سب سے زیادہ مضبوط اور ٹھوس دلیل یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی تعبیر و تشریح دوسری زبانوں میں بالاتفاق جائز ہے۔ اگر عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں شریعت کی تشریح و تفسیر جائز ہے تو عربی زبان میں متبادل الفاظ کا سہارا لیکر مفہوم بیان کرنے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔

خطیب بغدادی نے ”الکفایۃ“ میں حافظ سخاوی نے ”فتح المغیث“ میں اور علامہ جلال الدین السیوطی نے ”تدریب الراوی“ میں اس موضوع پر اچھی خاصی روایات جمع کی ہیں۔ اگر آپ تفصیل دیکھنا چاہیں تو ان کتب کی طرف رجوع کریں۔

خود آزمائی ①

- ۱- روایت باللفظ کا اصطلاحی مفہوم کیا ہے؟
- ۲- روایت بالمعنی کی تعریف میں علماء حدیث کے اقوال بیان کیجئے۔
- ۳- امام غزالی نے ”روایت الحدیث بالمعنی“ کے سلسلہ میں علماء کا کیا موقف بتایا ہے۔
- ۴- امام ابن حزم اندلسی نے ”روایت بالمعنی“ کے بارے میں کیا اصول بتایا ہے۔
- ۵- علامہ سیف الدین آمدی نے امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام حسن بصری اور جمہور فقہاء کا روایت بالمعنی کے ضمن میں کیا موقف بیان کیا ہے۔
- ۶- کیا ہر قسم کا راوی روایت بالمعنی کر سکتا ہے؟
- ۷- روایت بالمعنی کے بارے میں بنیادی طور پر کتنے مواقف پائے جاتے ہیں۔
- ۸- امام طبرانی نے معجم کبیر میں کون سی روایت نقل کی ہے۔

③ روایت بالمعنی جائز نہیں

آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک روایت بالمعنی جائز نہیں۔ ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ راوی جن الفاظ و کلمات کے ساتھ حدیث اپنے شیخ سے حاصل کرے انہی الفاظ و کلمات کے ساتھ اس کی روایت کرے۔ الفاظ و کلمات میں تقدیم و تاخیر اور تبدیلی ان حضرات کے ہاں جائز نہیں..... پونٹ کے اس حصہ میں ہم دیکھیں گے کہ ان حضرات نے اپنے موقف کی تائید میں کس نوعیت کے دلائل دیئے ہیں..... آپ اس حصہ کا پوری توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں..... اس موقف کا ذکر کرتے ہوئے خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

(قال كثير من السلف وأهل التحري في الحديث لا تجوز الرواية على المعنى، بل يجب مثل تأدية اللفظ بعينه من غير تقديم ولا تاخير ولا زيادة ولا حذف.....) (الكفاية في علم الرواية: ص ۱۹۸)

علمائے سلف اور حدیث کے معاملہ میں محتاط رہنے والے علماء کی بڑی جماعت کا موقف یہ ہے کہ روایت بالمعنی جائز نہیں..... ان حضرات کا کہنا ہے کہ الفاظ کو تقدیم و تاخیر اور ترمیم کے بغیر ادا کرنا واجب اور ضروری ہے۔ اس موقف سے تعلق رکھنے والے بعض علماء کی روایات اور اقوال کو ہم نے نقل کیا ہے۔ ان کے اقوال سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ راوی جس درجہ کا بھی ہو اس کیلئے ”روایت بالمعنی“ جائز نہیں۔ وہ الفاظ کے مفہوم، ترتیب، موضوع اور متبادل کلمات میں متن بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تب بھی ضروری ہے کہ ”روایت باللفظ“ کرے۔

حافظ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں:

(ذهب قوم إلى إتياع لفظ الحديث..... (شرح علل الترمذی: ج. ۱، ص. ۱۴۵)
 علماء کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ حدیث کی روایت کرتے وقت الفاظ و کلمات کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ اس جماعت میں ابن عمر، قاسم بن محمد، ابن سیرین، رجاء بن حیوہ، مالک بن انس، ابن عیینہ، عبدالوارث، یزید بن ذریع اور وہیب شامل ہیں۔ امام احمد بن حنبل و ربیع بن معین کی رائے بھی یہی ہے۔
 علامہ سیف الدین الأمدی لکھتے ہیں:

(ونقل عن ابن سيرين وجماعة من السلف وجوب نقل اللفظ على صورته..... وهو اختيار أبي بكر الرازي من أصحاب أبي حنيفة) (الإحكام في أصول الأحكام: ج. ۲، ص. ۱۴۷)

امام ابن سیرین اور علمائے سلف کی ایک جماعت کا موقف یہ نقل کیا گیا ہے کہ حدیث کے الفاظ و کلمات کو ہر بہ ہو نقل کرنا ضروری اور لازمی ہے..... ائمہ احناف میں سے امام ابو بکر رازی نے اس موقف کو پسند کیا ہے۔

حافظ شمس الدین سخاوی لکھتے ہیں:

(وقيل لا تجوز له' الرواية بالمعنى مطلقاً، قاله' طائفة من المحدثين والفقهاء والأصوليين من الشافعية وغيرهم) (فتح المغیث: ج. ۳، ص. ۱۴۰)
 روایت بالمعنی کے ضمن میں ایک قول یہ ہے کہ حدیث کے راوی کیلئے روایت بالمعنی بالکل جائز نہیں..... یہ موقف بعض محدثین، کچھ فقہاء اور شوافع میں سے ایک جماعت کا ہے۔

دلائل:

ان حضرات کے پاس اپنے موقف کی تائید کیلئے بنیادی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

((عن عبد الله بن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ نضر الله امرأ سمع منا حديثاً فآذی

کما سمعہ، فَرُبَّ مَبْلَغٍ أَوْ عَمَى مِنْ سَامِعٍ) (جامع ترمذی: ج. ۵، ص. ۳۴)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرم رکھے جس نے ہم سے حدیث سنی اور پھر اس حدیث کو ہو بہو دوسروں تک پہنچایا، کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ براہ راست سننے والے کے مقابلہ میں بالواسطہ سننے والا زیادہ سمجھ دار اور دانشمند ہوتا ہے۔ خطیب بغدادی نے ابن عمرؓ کے حوالے سے اپنی کتاب ”الکفایۃ فی علم الروایۃ“ میں یہ روایت نقل کی ہے:

(عن محمد بن علی قال: کان ابن عمر إذا سمع الحدیث لم یزد فیہ ولم ینقص منه ولم یجاوزہ ولم یقصر عنه)

خطیب لکھتے ہیں کہ ابن عمرؓ حدیث کے الفاظ و کلمات میں تقدیم و تاخیر کے بھی روادار نہیں تھے۔ اس ضمن میں آپ نے یہ روایت نقل کی ہے:

((عن عبید بن عمیر وهو یقص یقول: قال رسول اللہ ﷺ: مثل المنافق کمثل الشاة الرابضة بین الغنمین، فقال ابن عمر: ویلکم لا تکذبوا علی رسول اللہ ﷺ انما قال رسول اللہ: مثل المنافق کمثل الشاة العائرة بین الغنمین)) (الکفایۃ فی علم الروایۃ: ۱۷۳)

عبید بن عمر کہتے ہیں کہ ایک موقع پر وہ یہ حدیث بیان کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے جو دو بکریوں کے درمیان گھسٹ کر چلتی ہے۔..... ابن عمرؓ نے یہ کلمات سنے۔ تو فوراً اپنا رد عمل ظاہر کیا اور کہا: تم لوگوں کو کیا ہوا؟ کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف وہ کلمات منسوب کر رہے ہو جو آپؐ نے ادا نہیں کئے ہیں۔ پھر کہنے لگے: رسول اللہ ﷺ نے تو یوں ارشاد فرمایا ہے ”منافق کی مثال اس بچھری ہوئی بکری کی ہے جو بکریوں کی دو ٹکڑیوں کے درمیان چلے۔“

خطیب لکھتے ہیں کہ ابن عمرؓ کو الفاظ میں بھی تقدیم و تاخیر گوارا نہ تھی..... اس سلسلے میں آپ نے یہ روایت نقل کی ہے۔

یزید بن بشر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ابن عمرؓ سے پوچھا آپ حج و عمرہ کرتے ہیں لیکن جہاد نہیں کرتے اس کی کیا وجہ ہے! جب اس شخص نے تین مرتبہ اپنا سوال دہرایا تو ابن عمرؓ نے اس کو مخاطب کیا اور کہا:

(ويحك ان الاسلام بنى على خمس : شهادة ان لا اله الا الله، واقام الصلاة، و ايتاء الزكاة، وحج البيت، وصيام، رمضان، قال يزيدي بن بشر، فقلت له : وانا مستفهم بنى الاسلام على خمس : شهادة ان لا اله الا الله، واقام الصلاة و ايتاء الزكاة و صوم رمضان و حج البيت فقال ابن عمر : لا حج البيت، ولكن وصيام رمضان هكذا قال رسول الله ﷺ (الكفاية في علم الرواية : ص ۱۷۶)

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اس بات کی گواہی کہ اللہ جل شانہ کے سوا کوئی معبود نہیں، نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، بیت اللہ کا حج کرنا اور ماہ رمضان میں روزے رکھنا..... یزید بن بشر کہتے ہیں: میں نے کہا اور میں سمجھنا چاہتا تھا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ شہادت توحید، اقامت صلاۃ، اداء زکوٰۃ، رمضان کے روزے اور حج بیت اللہ..... میری ترتیب سن کر ابن عمرؓ نے کہا: بیت اللہ کا حج نہیں بلکہ آخر میں ”صیام رمضان“..... رسول اللہؐ نے اس ترتیب کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے۔

خطیب بغدادی نے اس بارے میں ایک اور روایت بھی نقل کی ہے:

(حدثنا سفیان : قال حدثنا الزهري أنه سمع انس بن مالك يقول: نهى رسول الله ﷺ عن الدباء والمزفت ان يتبذ فيه فقیل لسفیان: ان ینبذ فيه؟..... فقال: لا ، هكذا قال لنا الزهري) (الكفاية : ص ۱۷۷)

سفیان کہتے ہیں کہ زہری نے انہیں بتایا کہ انہوں نے انس بن مالک کو یوں کہتے ہوئے سنا: رسول اللہ ﷺ نے دباء (کدو کا برتن) اور مزفت (تارکول ملا برتن) میں نبذ بنانے سے منع کیا..... سفیان ثوری سے پوچھا گیا کہ متن میں ”ان ینبذ فيه“ کے الفاظ ہیں یا ”ان یتبذ فيه“ کے؟ سفیان نے جواب دیا! ہم نے زہری سے ”ان یتبذ فيه“ کے الفاظ سنے ہیں..... سفیان ثوری کا مقصد یہ تھا کہ جو کلمات انہوں نے

امام زہری سے سنے ہیں وہی ان کے نزدیک قابل اعتماد اور قابل ترجیح ہیں۔ حضرت اعمش کہتے ہیں۔

(كان هذا العلم عند اقوام كان احدهم لأن يخر من السماء احب إليه من أن يزيد فيه
واوا أو الف او دالاً) (الكفاية : ص. ۱۷۸)

یہ علم (حدیث) ان حضرات کے ہاتھوں میں رہا۔ جنہیں آسمان سے گرنا گوارا تھا لیکن اس میں واو، الف اور دال تک کا اضافہ گوارا نہ تھا۔

حدیث کا اصل مفہوم ضائع ہونے کا احتمال

جو حضرات روایت بالمعنی کے جواز کے قائل نہیں ان کی ایک اہم اور بنیادی دلیل یہ بھی ہے کہ روایت بالمعنی کی اجازت اگر دے دی جائے تو حدیث کے اصل مفہوم اور مقصد کی حفاظت بہت دشوار ہو جائے گی۔ سند میں اگر سات راوی ہوں اور ہر ایک راوی نے اپنے الفاظ میں ”متن“ روایت کیا ہو تو پہلے راوی سے لے کر ساتویں راوی تک متن کے الفاظ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوں گے..... عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ سامع جب دوسروں کے سامنے کلام بیان کرتا ہے تو اس میں قدرتی طور پر رد و بدل ضرور کرتا ہے..... علمائے حدیث نے متن کے الفاظ و کلمات کی حفاظت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ اصول اختیار کیا کہ روایت بالمعنی سے اجتناب کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ حدیث ان الفاظ و کلمات میں بیان کی جائے جن کلمات کے ساتھ وہ اوپر کے طبقات سے چلی ہو۔ اس سلسلے میں علامہ جلال الدین السيوطی نے قاضی عیاض کا یہ قول نقل کیا ہے۔

روایت بالمعنی کا سد باب بہت ضروری ہے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ جو راوی روایت بالمعنی کی صلاحیت سے عاری ہیں انکا غلبہ ہو جائے اور جو روایت بالمعنی کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ دب جائیں..... عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ لوگ رخصت کو بنیاد بنا کر احتیاط کا دامن چھوڑ دیتے ہیں..... یہ کسی ایک دور کی بات نہیں ہر دور میں ایسا ہوتا آ رہا ہے۔ روایت بالمعنی کی اجازت کے مقابلہ میں یہ اصول بہر حال بہتر ہے کہ حدیث کی روایت باللفظ کی جائے اور اس کے متن میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے۔ خاص کر وہ روایات جن میں تعبیری الفاظ بیان

ہوتے ہوں۔ ان کی روایت میں یہ شرط لگائی جائے کہ انہیں ہو بہ ہو نقل کیا جائے (تدریب الراوی: ج ۲، ص ۹۵)

امام بیہقی اور خطیب نے امام مالک کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ حدیث کے علاوہ دیگر روایات کے بارے میں روایت بالمعنی کے قائل تھے..... لیکن حدیث کی روایت میں لفظ کی رعایت آپ کے نزدیک واجب تھی۔ امام قرطبی کہتے ہیں کہ امام مالک روایت بالمعنی کے بالکل قائل نہیں تھے۔ آپ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

(وبدل علی ذلک قوله: لا اکتب الا عن رجل يعرف ما یخرج من رأسه وذلک فی جواب من قال له: لم لم تکتب عن الناس و قد أدرکتهم متوافرین و کذلک ترکہ الأخذ من لهم فضل و صلاح اذا كانوا لا یعرفون ما یحدثون) (توجیہ النظر: ص ۳۰۵)

امام مالک کا موقف اس لحاظ سے بالکل واضح ہے۔ ایک بار جب آپ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے بہت سارے رواۃ کو پایا لیکن ان سے روایت نہیں لی۔ تو آپ نے جواب دیا: ”میں کسی ایسے راوی سے اخذ نہیں کرتا جو اس حدیث کے بارے میں نہ جانتا ہو جس کے الفاظ وہ اپنی زبان سے بیان کرتا ہے۔“

امام مالک نے اپنے دور کے بڑے بڑے اہل فضل و کمال کی روایات کو اس لئے ترک کیا کہ وہ حدیث کی روایت کے معاملہ میں قابل اعتماد نہیں تھے۔

امام مالک کے اس اصول سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے دور میں روایت بالمعنی کا رواج تھا۔ اس دور میں چونکہ روایات کا دار و مدار حافظہ پر تھا اس لئے امام مالک، ابن سیرین اور امام ابو حنیفہ نے روایات کے اخذ اور تحدیث کیلئے ایسے اصول مقرر کئے جو دیگر فقہاء اور محدثین کے تداول کے مقابلہ میں زیادہ سخت تھے۔ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ”الکفایۃ فی علم الروایۃ“ میں اس موضوع سے متعلق بہت ساری روایات نقل کی ہیں۔ اور ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ امام ابن حزم ظاہری نے ”الإحکام فی اصول

الاحکام“ میں اس پر بحث لی ہے۔ ابن حزم چونکہ روایت بالمعنی کے قائل نہیں اس لئے انہوں نے ”روایت باللفظ“ کے حق میں گفتگو کی ہے..... شیخ طاہر بن صالح الجوزاڑی نے ”توجیہ النظر الی اصول الاثر“ میں اس موضوع کو بہت تفصیل کے ساتھ لیا ہے۔ اور متقدمین و متاخرین علماء کے اقوال کو بہت خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دیا ہے..... آپ اگر اس موضوع پر مزید تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں تو ان مصادر کی طرف رجوع کریں۔ یہاں کوشش کی گئی ہے کہ بطور خلاصہ آپ کے سامنے علماء کے بنیادی اقوال پیش کئے جائیں.....

اب ہم ”روایت بالمعنی“ کے ضمن میں تیسرے موقف کا مطالعہ کریں گے۔ اور دیکھیں گے کہ اس موقف سے تعلق رکھنے والے علماء نے اس موضوع کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے اور اپنے موقف کی وضاحت میں کیا کچھ کہا ہے۔

④ روایت بالمعنی شروط کے ساتھ جائز ہے

”روایت بالمعنی“ کے سلسلے میں علماء کی ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ یہ نہ تو مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز۔ بلکہ شروط کے ساتھ جائز ہے..... حافظ ابن الصلاح اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

(فاما اذا كان عالماً عارفاً بذلك فهذا مما يختلف فيه السلف وأصحاب الحديث،

وأرباب الفقه والأصول، فجوّزه أكثرهم) (التقييد والايضاح: ص ۲۲۶)

اگر راوی حدیث کے متن اور اس کے معنی و مفہوم کو پوری طرح سمجھتا ہو تو اس کی روایت بالمعنی کے بارے میں محدثین، فقہاء اور اہل اصول کے ہاں اختلاف ہے۔ جمہور نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ بعض علماء نے رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کی روایت میں ”روایت بالمعنی“ کی اجازت نہیں دی ہے اور صحابہ و تابعین کے اقوال کو بالمعنی نقل کرنے کی اجازت دی ہے..... زیادہ وقیع اور صحیح رائے یہ ہے کہ حدیث کی روایت میں ”روایت بالمعنی“ جائز ہے۔ بشرطیکہ راوی عالم ہو اسے یقین ہو کہ حدیث کا جو متن اس تک پہنچا تھا اس نے اس کے معنی و مفہوم کو پوری طرح ادا کر دیا۔ اس جواز کی بنیاد صحابہ کرام اور علماء سلف کے اس معمول پر ہے کہ یہ حضرات ایک معاملہ کو مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا کرتے تھے۔ روایت کرتے وقت ان کے پیش نظر معنی و مفہوم ہوتا تھا۔ الفاظ نہ ہوتے تھے۔

علامہ سیف الدین الأمدی اس بارے میں لکھتے ہیں:

(والذى عليه اتفاق الشافعى، ومالك و ابى حنيفة واحمد بن حنبل، والحسن

البصرى واكثر الانمة.....) الاحكام فى اصول الاحكام: ج ۲، ص ۴۶)

جس اصول پر امام شافعی، امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد، امام حسن بصری اور جمہور ائمہ کا اتفاق

ہے وہ یہ ہے کہ ایسے راوی کیلئے جو حدیث کے الفاظ و کلمات کی ترتیب و ترکیب اور معنی و مفہوم سے پوری طرح آگاہ نہ ہو روایت بالمعنی حرام ہے..... اگر راوی حدیث کے متن کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور الفاظ و کلمات کے معنی و مفہوم سے واقف ہو تو بھی بہتر یہ ہے کہ حدیث روایت کرتے وقت متن کے الفاظ کو ہو بہو نقل کرے کیونکہ اس میں کمی بیشی اور تغیر و تاویل کا احتمال کم ہے..... اگر راوی عالم ہے اور متن کے الفاظ کے مفہوم و مقاصد سے پوری طرح باخبر ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ ”روایت بالمعنی“ کرے..... مقصد یہ ہے کہ ”روایت باللفظ“ بہر حال قابل ترجیح ہے..... لیکن عالم راوی کیلئے ”روایت بالمعنی“ کا جواز موجود ہے۔

حافظ ابن رجب نے امام ترمذی کا یہ قول نقل کیا ہے:

(اما من اقام الاسناد وحفظه وغير اللفظ فان هذا واسع عند اهل العلم ، اذا لم يتغير

(المعنى) (شرح علل الترمذی : ج. ۱، ص. ۱۴۵)

جس راوی نے سند کو اچھی طرح حفظ کیا اور اسے برقرار رکھا لیکن متن میں الفاظ کی تبدیلی کی..... تو

علمائے حدیث کے ہاں اس پہلو سے بڑی گنجائش ہے بشرطیکہ لفظ کی تبدیلی سے مفہوم میں تبدیلی نہ آئے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں:

(اما الرواية بالمعنى ، فالخلاف فيها شهير والاكثر على الجواز ايضا) (نزهة النظر:

ص. ۹۳)

جہاں تک روایت بالمعنی کا تعلق ہے تو اس بارے میں علماء کا اختلاف مشہور ہے۔ لیکن جمہور کے نزدیک

روایت بالمعنی جائز ہے۔

امام غزالی اپنی کتاب ”المستصفی من علم الاصول“ میں لکھتے ہیں:

(نقل الحديث بالمعنى دون اللفظ حرام على الجاهل بمواقع الخطاب ، و دقائق

الالفاظ.....) (المستصفی ج. ۱، ص. ۱۶۸)

روایت بالمعنی ایسے راوی کیلئے بالکل ناجائز ہے جو حدیث کے متن کی ترتیب و ترکیب اور معنی و مفہوم سے ناواقف ہو..... لیکن اس راوی کیلئے جو محتمل و غیر محتمل، ظاہر اور اظہر، عام اور اعم کے فرق کا علم رکھتا ہے روایت بالمعنی کو امام شافعی، امام مالک، امام ابو حنیفہ اور جمہور فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ وہ متن کے معنی و مفہوم کو سوچ سمجھ کر نقل کرے۔

امام ابن حزم ظاہری لکھتے ہیں۔

(وحکم الخبر عن النبي أن يورد بنص لفظ لا يبدل ولا يغير، إلا في حال واحدة، وهي أن يكون المرء قد ثبت فيه و عرف معناه يقينا، فيستل فيفتي بمعناه وموجه، أو يناظر فيحتج بمعناه و موجه، فيقول: حكم رسول الله بكذا، و امر عليه السلام بكذا، وأباح عليه السلام بكذا، ونهى عن كذا وحرم كذا، والواجب في هذه القضية ما صح عن النبي وهو كذا) (الاحكام: ج. ۲، ص. ۸۶)

حدیث کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اسے بغیر کسی تغیر کے ہو بہو بیان کیا جائے۔ ہاں ایک صورت ایسی ہے جس میں حدیث کے مفہوم کو نقل کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ راوی ثقہ اور حدیث کے معنی و مفہوم کو یقینی طور پر جانتا ہو..... جب اس سے سوال ہو تو وہ اس کے معنی و مفہوم کے مطابق جواب دے۔ جب وہ مناظرہ کرے تو اس کی بنیاد پر استدلال کرے اور کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں فیصلہ فرمایا..... آپؐ نے یہ حکم دیا..... آپؐ نے اس بات کی اجازت دی اور اس بات سے منع فرمایا..... اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے۔

امام رازی کہتے ہیں:

(يجوز نقل الخبر بالمعنى وهو مذهب الحسن البصري، وأبى حنيفة خلافاً لابن

سيرين و بعض المحدثين) (توجيه النظر: ص. ۳۰۰)

امام حسن بصری اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک روایت بالمعنی کی اجازت ہے ابن سیرین اور محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک اس کی اجازت نہیں۔

حافظ ابن رجب امام ترمذی کی رائے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(ومقصود الترمذی بهذا الفصل الذی ذکره ههنا ان من اقام الأسانید و حفظها وغیر المتون تغیرا لا یغیر المعنی انه حافظ ثقة یعتبر بحديثه.....) (شرح علل الترمذی)

امام ترمذی نے یہاں جو گفتگو کی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جس راوی نے سند کو اچھی طرح یاد کیا اور اسے برقرار رکھا لیکن متن میں ایسی تبدیلی کی جس سے حدیث کے مفہوم میں تبدیلی نہ آئے ایسا راوی ثقہ اور ضابط ہے اور اس کی حدیث قابل اعتماد ہے اور یہ کہ روایت بالمعنی اس پہلو سے جائز ہے اور علماء سے اس پر عمل منقول ہے آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ روایت بالمعنی پر علماء کے ہاں اجماع رہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں..... یہ علماء کی ایک بڑی جماعت کی رائے ہے اور امام احمد نے اس کی وضاحت کی ہے آپ کہتے ہیں کہ محدثین روایت بالمعنی شروع سے کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن یہ صرف اس راوی کیلئے جائز ہے جو عربی زبان اور عربی کے مختلف لہجات کا عالم ہو۔ روایات کے الفاظ و کلمات کے معنی و مفہوم کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور کلمات کے متبادل کلمات کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہو..... امام شافعی نے ان شرائط کی وضاحت کی ہے۔

حافظ ابو بکر ابن العربی کا موقف یہ ہے کہ روایت بالمعنی کو دور صحابہ تک محدود رکھنا چاہئے صحابہ کرام اگر روایت بالمعنی کرتے تھے تو ان کے دور تک اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور افعال کے براہ راست سامع اور شاہد تھے اور اصول یہ ہے کہ ”شنیدہ کے شود مانند دیدہ“..... آپ لکھتے ہیں:

(إن هذا الخلاف إنما يكون في عصر الصحابة و منهم . وأما من سواهم فلا يجوز لهم تبديل اللفظ بالمعنى وإن استوفى ذلك المعنى، فإنه لو جوزنا لكل واحد لما كنا على ثقة

من الأخذ بالحدیث.....)

روایت بالمعنی کے سلسلہ میں اختلاف صحابہ کرام کے دور سے شروع ہوا اور اب تک چل رہا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کے علاوہ کسی اور کیلئے روایت بالمعنی کی اجازت دینا مناسب نہیں..... اگرچہ اس کا مفہوم پوری طرح منتقل ہوا اگر ہم نے روایت بالمعنی کی اجازت ہر ایک راوی کو دے دی۔ تو اس طرح اخذ حدیث کے سلسلے میں ہمارے اعتماد کی بنیاد ختم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ ہمارے دور تک ہر ایک راوی نے یکے بعد دیگرے متن کو بدل دیا ہوگا..... اور متن کے الفاظ و کلمات میں کئی بار تبدیلی آچکی ہوگی..... ہر ایک راوی نے اپنے ذہن اور سطح کے مطابق الفاظ کا انتخاب کیا ہوگا اور حدیث کے اصل الفاظ مرور زمانہ کے ساتھ گم ہو چکے ہوں گے..... جہاں تک صحابہ کرام کا تعلق ہے تو ان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ان میں دو خصوصیات ایسی تھیں جو بعد کے ادوار کے رواد کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ایک یہ کہ ان کی زبان بہت صاف اور فصیح و بلیغ تھی۔ دوسری یہ کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو براہ راست سنا اور آپ کے افعال کا مشاہدہ کیا..... براہ راست سماع اور مشاہدہ کی وجہ سے انہوں نے روایات کے معانی کا پوری طرح ادراک کیا..... یہ حقیقت ہے کہ براہ راست سننے اور دیکھنے والے کی معلومات میں جو وثوق ہوتا ہے وہ بالواسطہ سننے والے کی معلومات میں نہیں ہو سکتا۔

آپ دیکھتے نہیں کہ صحابہ کرام جب حدیث روایت کرتے ہیں تو کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ایسا کرنے کا حکم دیا۔ اور ایسا کرنے سے منع فرمایا..... ان کا اس طرح روایت کرنا بالکل درست اور یقینی ہوتا ہے اگرچہ روایت کرتے وقت یہ الفاظ کا خیال نہیں رکھتے..... یہ ایسی حقیقت ہے جس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

علامہ عبد العلی نے اپنی کتاب ”فوائح الرحمت“ میں روایت بالمعنی پر بحث کی ہے۔ اس ضمن میں آپ نے امام فخر الاسلام کے اصول کی وضاحت کی ہے..... یہاں ہم اس بحث کا مفہوم پیش کر رہے ہیں۔

امام فخر الاسلام نے جو بحث کی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ روایت کی پانچ قسمیں ہیں:

- چوتھی قسم وہ ہے جس میں روایت بالمعنی کی گنجائش ہی نہیں اس لئے کہ مشابہ کے معنی تو تاویل کے باوجود سمجھ میں نہیں آتے۔ جہاں تک پانچویں قسم کا تعلق ہے تو اس کی روایت بالمعنی بھی جائز نہیں اس لئے کہ جوامع الکلم رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کے ساتھ مختص ہیں۔ اور ان کے متبادل الفاظ لائے ہی نہیں جاسکتے۔ (فوائد الحرموت: ج ۲، ص ۱۶۷)

جو حضرات ”روایت بالمعنی“ کے مشروط جواز کے قائل ہیں انہوں نے اس بارے میں جو شرائط وضع کی ہیں ہم ترتیب کے ساتھ ان شرائط کو پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو ان کے سمجھنے اور ذہن میں رکھنے کے لحاظ سے سہولت ہو۔

(i) ”روایت بالمعنی“ اس راوی کیلئے جائز ہے جسے حدیث یاد تھی لیکن بعد میں ایسا ہوا کہ متن کے الفاظ و کلمات اس کے ذہن سے اتر گئے اور معنی و مفہوم محفوظ رہا..... (الباعث الحثیث: ص ۷۴)

(ii) روایت بالمعنی اس راوی کیلئے جائز ہے جس کے پاس الفاظ کا بھرپور ذخیرہ ہو اور وہ الفاظ کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہو۔ (نزہۃ النظر: ص ۹۵)

(iii) مفردات میں لفظ کی تبدیلی جائز ہے لیکن مرکبات میں نہیں۔ اس لئے کہ مرکبات کے متبادل مرکبات کا لانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ (نزہۃ النظر: ص ۹۵)

(iv) ”روایت بالمعنی“ ایسے راوی کیلئے جائز ہے جو الفاظ و معانی کے مدلولات اور دقائق کا عالم ہو..... یہ جمہور فقہاء اور محدثین کا موقف ہے۔ (الاحکام للآمدی: ج ۲، ص ۱۴۶)

(v) مترادفات کا استعمال جائز ہے۔ بشرطیکہ واقعی مترادفات ہوں اور ان سے صحیح مفہوم ادا ہوتا ہو۔ (الاحکام للآمدی: ج ۲، ص ۱۴۶)

(vi) حدیث رسولؐ میں ”روایت بالمعنی“ جائز نہیں جبکہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے آثار میں جائز ہے۔ (الکفایۃ: ص ۱۸۸)

(vii) جوامع الکلم میں ”روایت بالمعنی“ جائز نہیں کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔ (تدریب الراوی: ج ۲، ص ۹۵)

(viii) حدیث کا تعلق اگر امور تعبیدیٰ سے ہو تو اس کی روایت بالمعنی جائز نہیں ہے جیسے تکبیر، صلوٰۃ، تشہد وغیرہ۔

(ix) اگر حدیث کا تعلق احکام سے ہے تو روایت بالمعنی کی صورت میں راوی کیلئے فقیہ ہونا ضروری

ہے۔ (فوائد الرحمت: ج ۲، ص ۱۶)

(x) ”روایت بالمعنی“ صحابی کیلئے جائز ہے۔ غیر صحابی کے لئے جائز نہیں۔ (احکام القرآن: ج ۱، ص ۱۰)

علامہ طاہر بن صالح الجزائری نے امام قرانی کے حوالے سے تین شرائط کا تذکرہ کیا ہے۔

(i) متبادل الفاظ اصل الفاظ کے مفہوم کو پوری طرح ادا کرتے ہوں۔

(ii) متن میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ آئے۔

(iii) ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے مفہوم کی ادائیگی میں فرق نہ آئے۔

یہ تینوں شرائط ملتی جلتی ہیں اور دیگر علماء نے جو شرائط بیان کی ہیں ان میں یہ بھی شامل

ہیں (توجیہ النظر: ص ۳۰۰)

4.1 دلائل

جن علماء کے نزدیک روایت بالمعنی شروط کے ساتھ جائز ہے انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں نقلی اور عقلی دلائل دیئے ہیں۔ متقدمین اور متاخرین کے دلائل میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ علامہ سیف الدین الآمدی نے اپنی کتاب ”الإحکام فی أصول الاحکام“ میں ان دلائل کو بہت عمدہ ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ان دلائل کو آسان اور سلیس انداز میں آپ کے سامنے رکھیں۔ آپ پونٹ کے اس حصہ کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھیں اور کوشش کریں کہ یہ دلائل آپ کو اچھی طرح ذہن نشین ہوں۔

علامہ آمدی لکھتے ہیں:

(والمنحدر مذهب الجمهور، وبدل عليه النص، الإجماع والمعقول) (الإحکام

فی اصول الاحکام: ج ۲، ص ۱۴۷)

روایت بالمعنی کے سلسلے میں جمہور کا موقف پسندیدہ ہے اس موقف کی تائید نص، اجماع اور عقل سے

ہوتی ہے۔

4.2 نص

امام احمد نے اس ضمن میں دو دلائل پیش کئے ہیں ایک تو عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت جس کا متن یہ ہے:

(ان رجلا سألا النبي وقال له: يا رسول الله! تحدثنا بحديث لا نقدر أن نسوقه كما سمعناه، فقال: إذا أصاب أحدكم المعنى فليحدث)

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اللہ کے رسول! ہم آپ سے آپ کے ارشادات سنتے ہیں۔ لیکن جن الفاظ کے ساتھ آپ سے سنتے ہیں ان الفاظ کے ساتھ دوسروں کے سامنے بیان نہیں کر سکتے۔ اس بارے میں آپ کا فرمان کیا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: جب تم میں سے کوئی میری حدیث سن لے اور وہ اس کے صحیح مفہوم کو دوسروں کے سامنے بیان کر سکے تو اسے چاہیے کہ دوسروں کے سامنے بیان کیا کرے۔

اس حدیث کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ عبد اللہ بن مسعودؓ کی اس حدیث سے تکرار ہی ہے جس میں ”اذاها كما سمعها“ منقول ہے اور جسے ”روایۃ بالمعنی“ کے مخالفین اپنے موقف کے حق میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں..... امام غزالی اس کا جواب یوں دیتے ہیں۔

”یہ حدیث بذات خود مختلف الفاظ سے منقول ہے۔ اگرچہ اس بات کا امکان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر مختلف الفاظ استعمال کئے ہوں لیکن غالب امکان یہ ہے کہ یہ ایک حدیث ہے جو مختلف الفاظ میں مختلف رواۃ سے منقول ہے..... کہیں ”رحم اللہ امرأ“ کے الفاظ آتے ہیں اور کہیں ”نضر اللہ امرأ“ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ”رب حامل فقه لا فقه له“ کے کلمات آئے ہیں اور کہیں ”حامل فقه غیر فقیہ“ کے کلمات استعمال کئے گئے ہیں۔

یہی حال ان خطبات اور واقعات کا ہے جنہیں مختلف رواۃ نے مختلف الفاظ میں روایت کیا ہے..... یہ

اس بات کی دلیل ہے کہ ”روایۃ بالمعنی“ جائز ہے..... (المستصفیٰ: ج ۱، ص ۱۳۹)

اس ضمن میں دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف علاقوں میں وہاں کے لوگوں کو سمجھانے کیلئے اپنے نمائندوں کو بھیجا..... یہ نمائندے آپ علیہ السلام کی ہدایات اور احکام اپنے الفاظ، اپنے انداز اور اسلوب میں وہاں کے عوام تک پہنچاتے تھے..... یہ عمل دور رسالت میں متداول رہا۔

4.3 اجماع

اجماع کے سلسلہ میں علامہ آدمی لکھتے ہیں:

(وَأَمَّا الْإِجْمَاعُ فَمَا رَوَى عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّهُ كَانَ إِذَا حَدَّثَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَكَذَا، أَوْ نَحْوَهُ، وَلَمْ يَنْكُرْ عَلَيْهِ مَنْكُرٌ، فَكَانَ إِجْمَاعٌ.....) (الاحکام: ج. ۲، ص. ۱۴۷)

جہاں تک اجماع کا تعلق ہے تو اس ضمن میں عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ عمل معروف و مشہور ہے کہ آپؐ جب حدیث بیان کرتے تو کہتے: رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا..... یا..... اس طرح فرمایا۔ ابن مسعودؓ کے اس عمل پر کسی نے بھی کلام نہیں کیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ صحابہ کے ہاں آپؐ کا یہ عمل ناپسندیدہ نہیں تھا۔

..... اسی طرح ابوالدرداءؓ کے بارے میں بھی آتا ہے کہ جب آپؐ حدیث بیان کرتے تو کہتے (أو نحو هذا أو شبهه)

4.4 آثار

روایت بالمعنی کے جواز کے ضمن میں صحابہ اور تابعین کے اقوال اس سے پہلے آپؐ پڑھ چکے ہیں..... علامہ آدمی نے آثار کے ضمن میں جو روایت پیش کی ہے وہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(عن محكول انه قال: دخلنا على وائلة بن الأسقع فقلنا: حدثنا حديثاً ليس فيه تقديم ولا تاخير، فغضب و قال: لا بأس اذا قدمت و اخرت اذا اصتتم المعنى) (الاحکام: ج. ۲، ص. ۱۴۸)

محكول دمشقیؓ کہتے ہیں:

ہم وائلہ بن الاسقع کی خدمت میں حاضر ہوئے..... دوران گفتگو ہم نے عرض کیا: ہمیں ایسی حدیث سنائیے جس میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہ ہو۔ ہماری یہ بات سن کر آپ کو اچھی نہیں لگی۔ پھر فرمایا۔ اگر تم حدیث کا معنی و مفہوم سمجھ لو تو الفاظ میں تقدیم و تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

4.5 عقلی دلیل

ہمامہ سیف ممدین الآمدی نے نقلی دلائل کے بعد اس موضوع پر عقلی بحث کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

(واما المعقول فمن وجهين : الاول : انه الاجماع منعقد على جواز شرح الشرع للعجم بلسانهم.....) (الاحکام : ج. ۲، ص. ۱۳۸)

جہاں تک عقلی دلیل کا تعلق ہے تو اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اہل عجم کے لئے ان کی زبان میں احکام شرعیہ کی تعبیر و تشریح کے جواز پر اجماع اور اتفاق ہے اس لئے اگر کسی نص کے مفہوم کو سمجھانے کے لئے غیر عربی الفاظ کا استعمال ہو سکتا ہے تو عربی الفاظ کو مترادف الفاظ کے ساتھ پیش کرنے میں کیا حرج ہے۔

دوسری بات یہ کہ الفاظ مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ معانی اور مفہام مقصود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مفہوم کئی الفاظ میں بیان کرتے تھے..... اصل مقصود معنی ہے اگر معنی حاصل ہو جائے تو الفاظ کے اختلاف کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”روایت بالمعنی“ میں ضروری ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن سے راوی کا محتاط رویہ ظاہر ہوتا ہو۔ مثلاً ”أو كما قال“، ”أو كما ورد“ وغیرہ عبد اللہ بن مسعود، ابوالدرداء اور انس بن مالکؓ اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں۔ ”صحابہ کرامؓ اہل زبان تھے اور کلام کے مفہوم کو سمجھنے میں انہیں کوئی دقت نہیں تھی“ ان سے اس طرح کے جو الفاظ منقول ہیں یہ دراصل احتیاط اور خطا کے خوف کی وجہ سے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ روایت بالمعنی میں کیا کیا احتمالات ہو سکتے ہیں۔ (مقدمہ ابن الصلاح: ص۔ ۲۱۵: الکفایۃ۔ ص: ۲۰۵، ۲۰۶)

حافظ ابن الصلاح خطیب کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

(قلت : واذا اشتبه على القارى فيما يقرأه لفظة فقرأها على وجه يشك فيه.....)

(مقدمة: ص ۲۱۵)

اس سلسلے میں ہماری رائے یہ ہے کہ جب راوی کو متن کے کلمات میں اشتباہ ہو جائے اور وہ کسی لفظ کو شک کے ساتھ ادا کر دے اور اس شک کی بناء پر روایت کے آخر میں کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں کہا یا یوں کہا تو یہ بہت اچھی بات ہے اور ایسی صورت میں ایسا کہنا بالکل درست ہے۔ اس لئے کہ راوی کا ”اوکما قال“ کہنا روایت کی اجازت میں شامل ہے۔ راوی کو روایت کی اجازت اس صورت میں ہوتی ہے جب متن کے بارے میں اس کا ذہن بالکل صاف اور واضح ہو..... اگر وہ ”اوکما قال“ کہہ کر روایت کرتا تو پھر ”الاجازة“ کی شرط نہیں رہتی۔ جیسا کہ ہم پہلے اس پر بحث کر چکے ہیں۔

”روایت بالمعنی“ کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں جو اختلاف علماء کے ہاں ملتا ہے۔ ان ساری تفصیلات اور بحث و تہیص کا تعلق اس دور سے ہے جب حدیث کی روایات تدوین و ترتیب کے مراحل میں تھیں۔ اب جب حدیث کے ذخائر مختلف عنوانات اور انواع کے تحت مرتب شکل میں محفوظ ہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتب میں محفوظ روایات کو بالالفاظ بیان کیا جائے اور بالمعنی روایت سے اجتناب کیا جائے۔ اب مصادر و مآخذ کی طرف رجوع کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر کسی کو اشتباہ ہو بھی جائے تو اس کا ازالہ آسانی ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن الصلاح لکھتے ہیں:

(ثم إن هذا الخلاف لا نراه جاريا ولا اجراه الناس فيما نعلم فيما تضمنته بطون الكتب، فليس لأحد أن يغير لفظ شئ من كتاب مصنف و يثبت بدله فيه لفظا آخر بمعناه.....) (مقدمه: ص ۲۱۴)

جہاں تک ”روایت بالمعنی“ کے سلسلے میں اختلاف کا تعلق ہے تو یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ہم اس اختلاف کو جاری نہیں سمجھتے۔ ہمارے مطالعہ اور معلومات کے مطابق علماء نے اس اختلاف کو (تدوین روایات) کے بعد جاری نہیں رکھا۔ اس بناء پر اب کسی کو بھی یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ کسی ”مصدر“ اور ”ماخذ“ کی حدیث کے الفاظ میں تبدیلی کر سکے۔ اور اپنی طرف سے مترادف الفاظ اس میں داخل کرے..... ”روایت بالمعنی“ کی اجازت جن علماء نے دی اور جن علماء کو دی یہ اس وقت کی بات ہے جب الفاظ کو ضبط کرنے اور ہو بہ ہو قرار رکھنے میں دقت اور مشقت تھی (اور تدوین و ترتیب روایات کا کام جاری تھا) اب صورت حال یہ ہے کہ روایات کے الفاظ و کلمات اور اق و کتب میں محفوظ ہیں۔ اب اگر کوئی شخص الفاظ میں تبدیلی کرنا چاہے تو مصادر میں تبدیلی کرنا اس کے بس میں نہیں..... اس لئے اب ”روایت بالمعنی“ کی گنجائش نہیں۔

”روایت بالمعنی“ کے بارے میں اس بحث اور علماء کے اقوال سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حدیث کی روایات کو ضبط کرنے کے سلسلے میں ہمارے اسلاف نے انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے۔ ان حضرات نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال امت مسلمہ کے افراد تک پوری صحت کے ساتھ پہنچائیں..... آج جو لوگ ”روایت بالمعنی“ کو بنیاد بنا کر یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ حدیث کے بنیادی مصادر میں جو روایات موجود ہیں یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات نہیں ہیں بلکہ محدثین کے خود ساختہ الفاظ و کلمات ہیں یہ لوگ کہتے ہیں کہ محدثین نے ”روایت بالمعنی“ کی آڑ میں اپنی مرضی کی عبارات کو ترتیب دے کر حدیث کا نام دیا ہے..... ان لوگوں میں زیادہ تر تو ایسے ہیں جنہیں محدثین اور مجتہدین کے اصولوں کا علم ہی نہیں۔ محض سنی سنائی باتوں یا سطحی مقالات کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے اپنا ذہن بنالیا ہے اور کچھ ایسے ہیں جو جان بوجھ کر محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر بہت دور کی کوڑی لا کر ان افراد کا ذہن خراب کرنا چاہتے ہیں جنہیں حدیث اور علماء حدیث کے اصولوں کا علم نہیں۔ یہ لوگ اگر پوری دیانت کے ساتھ محدثین اور فقہاء کے مساعی اور مبادی کا مطالعہ کریں۔ تو انہیں یہ اعتراف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ علماء نے اس علم کی

خدمت محض علم کے طور پر نہیں کی بلکہ عبادت اور ذریعہ نجات کے طور پر کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن حضرات کا تعلق اس علم سے رہا انہوں نے اپنی تمام ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کو اس کی خدمت، ترویج اور آبیاری کے لئے استعمال کیا..... ”روایت بالمعنی“ کے ضمن میں راوی کے لئے جو کڑی شرائط علماء نے رکھی ہیں۔ ان کا مطالعہ آپ نے کر لیا۔ یونٹ میں چونکہ زیادہ تفصیلات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لئے چیدہ چیدہ نکات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ آپ اگر اس موضوع پر مزید تفصیل میں جانا چاہیں تو ان مآخذ کا مطالعہ کریں جن کا تذکرہ اس یونٹ میں حوالہ جات کے ضمن میں آیا ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب ہو۔ علم حدیث کا فہم حاصل ہو اور اس کی خدمت کے کیلئے صلاحیت اور مواقع نصیب ہوں۔..... آمین یا رب العالمین!

خود آزمائی ②

- ۱۔ خطیب بغدادی نے ”روایت بالمعنی“ کے ضمن میں جمہور علماء حدیث کا کیا موقف بتایا ہے۔
- ۲۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے ”روایت باللفظ اور روایت بالمعنی“ کے بارے میں کیا تجزیہ کیا ہے۔
- ۳۔ جو حضرات ”روایت بالمعنی“ کے قائل نہیں ان کے پاس اپنے موقف کی تائید میں بنیادی دلیل کون سی ہے؟
- ۴۔ کیا راوی متن حدیث کے الفاظ و کلمات میں تقدیم و تاخیر کر سکتا ہے۔
- ۵۔ امام بیہقی اور خطیب بغدادی نے ”روایت بالمعنی“ اور ”روایت باللفظ“ سے متعلق امام مالک کا کیا موقف بتایا ہے۔
- ۶۔ علماء نے ”روایت بالمعنی“ کے جواز کے لئے کوئی شرط وضع کی ہیں۔
- ۷۔ امام رازی نے ”روایت بالمعنی“ سے متعلق فقہاء کا کیا مسلک نقل کیا ہے۔
- ۸۔ حافظ ابوبکر العربی نے ”روایت بالمعنی“ کو کس دور تک محدود رکھا ہے۔



یونٹ نمبر 12

اقسام کتب حدیث

تحریر: ڈاکٹر علی اصغر چشتی
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی



فہرست

395	یونٹ کا تعارف
396	یونٹ کے مقاصد
397	① کتب حدیث
397	② کتب حدیث کی اقسام
397	2-1 الجوامع
399	2-2 السنن
399	2-3 المسانید
400	2-4 المعاجم
401	2-5 کتب الجمع
403	2-6 المستدرک
403	2-7 کتب التخریج
404	2-8 القہارس
404	2-9 الأطراف
405	2-10 الموضوعات
406	2-11 کتب الأحادیث الشہرة
407	2-12 مشکل الأحادیث
407	2-13 أسباب الحديث

408	2-14 الا جزاء
408	2-15 غریب الحدیث
412	2-16 الضعفاء
413	2-17 کتب الثقات
414	2-18 کتب العلل
416	خود آرمائی نمبر ۱
417	③ وحدانیات، ثنائیات، ثلاثیات
421	خود آرمائی نمبر ۲

یونٹ کا تعارف

اس وقت جو یونٹ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کا تعلق کتب حدیث کے انواع و اقسام سے ہے۔ آپ جب حدیث سے متعلق مصادر و مآخذ اور مراجع کا مطالعہ کریں گے تو آپ کے سامنے مختلف نوعیت کی کتابیں آئیں گی۔ علماء حدیث نے چونکہ مختلف جہات اور مختلف پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر حدیث کے لٹریچر کی تدوین کی ہے اس لئے ان کی علمی، تالیفی اور تصنیفی جدوجہد کے نتیجہ میں حدیث کا جوابدہ تخلیق ہوا ہے اس میں بڑی خوبصورت، عمدہ مفید اور خوشگوار تنوع پایا جاتا ہے۔ حدیث کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ مصادر کی اس ورائٹی سے بخوبی آگاہ ہو۔ تاکہ اس ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے مصادر کی نوعیت کے لحاظ سے اشکال اور دقت پیش نہ آئے۔ اس یونٹ میں مصادر حدیث کے ان انواع و اقسام کی تعریف کی گئی ہے جو زیادہ اہم اور بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ یونٹ میں محض انواع کی تعریف پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ہر نوع کے تحت اہم اور ضروری مآخذ کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے تاکہ آپ اگر ان مآخذ کو براہ راست دیکھنا چاہیں تو بہ سہولت دیکھ سکیں۔ مآخذ کی تالیف و تدوین میں زمانی ترتیب کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے اور جہاں ضروری سمجھا گیا ہے۔ وہاں مآخذ کی حیثیت اور اہمیت بھی اجاگر کی گئی ہے۔ آپ اس یونٹ کا مطالعہ پوری دلچسپی اور دلجمعی کے ساتھ کریں۔ اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان شاء اللہ آپ اسے مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

یونٹ کے اغرض و مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇨ ”جامع“ کی تعریف کر سکیں اور اہم جوامع کا تذکرہ کر سکیں۔
- ⇨ ”سنن“ اور ”مسانید“ کا فرق بتا سکیں اور اس ضمن میں اہم تالیفات پر گفتگو کر سکیں۔
- ⇨ ”معاجم“ اور ”کتب الجمع“ کا اصطلاحی مفہوم بتا سکیں۔ اور کتب الجمع کے تحت اہم مصادر پر تبصرہ کر سکیں۔
- ⇨ ”تخریج“ اور ”فہارس“ سے متعلق بنیادی مراجع پر بحث کر سکیں۔
- ⇨ ”موضوعات“ ”اسباب الحدیث“ اور ”اجزاء“ کا باہمی فرق واضح کر سکیں۔
- ⇨ ”مشکل الحدیث“ اور ”غریب الحدیث“ کی اہم اور بنیادی کتب کا ترتیب کے ساتھ جائزہ لے سکیں۔

① کتب حدیث

علماء حدیث نے علم کی ہر پہلو سے خدمت کی ہے۔ اور اس ضمن میں مختلف حیثیتوں سے کتابیں مرتب کی ہیں۔ چنانچہ کتب حدیث کی اپنے موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے بہت سی اقسام ہیں۔ جن میں سے ہر ایک قسم کا ایک خاص اصطلاحی نام ہے..... حدیث کے طلبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان انواع و اقسام کے بارے میں علم رکھتے ہوں تاکہ حدیث کے لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہوئے انہیں کتب حدیث کی طرف مراجعت کرنے میں آسانی ہو۔ یہاں ہماری کوشش ہوگی کہ ان انواع کے بارے میں بنیادی معلومات سلیس زبان اور عام فہم انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کر سکیں۔

② کتب حدیث کی اقسام

1- 2 الجوامع:

یہ جامع کی جمع ہے۔ جامع اس کتاب حدیث کو کہتے ہیں جس میں مندرجہ ذیل آٹھ مضامین سے متعلق روایات جمع کر دی گئی ہوں۔

سیر..... آداب..... تفسیر..... عقائد..... فتن..... اشراط..... احکام..... مناقب

سیر سیرت کی جمع ہے۔ یعنی وہ مضامین جو رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے واقعات پر مشتمل ہیں..... آداب ادب کی جمع ہے اس سے مراد ”آداب المعاشرت“ ہیں مثلاً کھانے پینے کے آداب، چلنے کے آداب، ملنے جلنے کے آداب، لباس کے آداب، گفتگو کے آداب، عبادت کے آداب وغیرہ..... تفسیر یعنی وہ احادیث جو قرآنی آیات کی تفسیر سے متعلق ہوں..... عقائد وہ احادیث یا مضامین جن کا تعلق عقائد و ایمانیات سے ہے۔ مثلاً ایمان باللہ، ایمان بالرسالۃ، ایمان بالکتاب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالقدر وغیرہ

وغیرہ..... فتن فتنہ کی جمع ہے یعنی وہ بڑے بڑے واقعات جن کی پیشگوئی رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے.....
 اشراط سے مراد علامات قیامت ہیں یعنی وہ احادیث جن میں علامات قیامت کے بارے میں آپ ﷺ نے
 اپنی امت کو بتایا ہے..... احکام سے مراد احکام عملیہ ہیں..... جو فقہ کا موضوع ہے۔ ان کو السنن بھی کہا جاتا
 ہے..... مناقب منقبت کی جمع ہے یعنی صحابہ کرام اور صحابیات اور مختلف قبائل اور طبقات کے فضائل.....
 حدیث کی جس کتاب میں ان آٹھ مضامین سے متعلق روایات جمع کی گئی ہوں اس کو اصطلاح میں ”جامع“ کہا
 جاتا ہے۔

سب سے پہلی جامع امام معمر بن راشد الیمینی نے مرتب کی تھی۔ جو امام زہری کے معروف شاگرد ہیں۔
 یہ جامع پہلی صدی ہجری میں مرتب ہوئی تھی۔ لیکن اب یہ نایاب ہے۔

دوسری جامع امام سفیان بن سعید ثوری کی ہے۔ اس جامع سے امام محمد بن ادریس الشافعی نے بھی
 استفادہ کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ابتدائی صدیوں میں یہ کتاب متداول رہی ہے۔ لیکن اب یہ
 کتاب نایاب ہے۔

تیسری جامع امام عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی کی تالیف ہے۔ یہ جامع مصنف عبدالرزاق کے نام
 سے مشہور ہے..... گیارہ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

چوتھی جامع امام ابو عبد اللہ الدارمی کی ہے..... یہ جامع شروع سے متداول اور رائج ہے۔

پانچویں جامع امام بخاری کی ہے..... جسے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

چھٹی جامع امام ترمذی کی ہے۔ امام ترمذی کی کتاب بھی شروع سے طلبہ اور علماء کے ہاں مقبول چلی
 آرہی ہے۔

ساتویں جامع امام مسلم کی ہے..... امام مسلم کی کتاب کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ جامع کی
 تعریف میں آتی ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اس میں کتاب التفسیر مختصر ہے..... بہر حال جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ

جامع ہے..... امام مسلم کی کتاب میں کتاب التفسیر اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن دوسرے ابواب کے تحت تفسیری روایات کی اچھی خاصی تعداد اس میں موجود ہے..... علاوہ ازیں جامع ہونے کے لئے کسی کتاب کا مفصل ہونا ضروری نہیں محض اس کا وجود ہی کافی ہے۔

2.2 السنن

”سنن“ حدیث کی اُس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں احادیث کو ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مرتب کیا گیا ہو اس نوع کو ابتداء میں ”ابواب“ کہتے تھے۔ بعد میں اس کا نام تبدیل ہو کر ”مصنف“ ہو گیا۔ اور آخر میں اس کو ”سنن“ کہا جانے لگا۔ اس نوع کی سب سے پہلی کتاب حضرت عامر بن شراحیل الشعمیؓ نے لکھی۔ جو ”ابواب الشعمی“ کے نام سے مشہور ہے..... کتب سنن میں امام نسائی کی کتاب امام ابوداؤد کی کتاب امام ترمذی کی کتاب اور امام ابن ماجہ کی کتاب سنن ہیں۔ چنانچہ سنن اربعہ کا لفظ بول کر یہی چار کتب مراد لی جاتی ہیں..... سنن اربعہ کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں اس نوع میں شہرت کی حامل ہیں۔

- | | | |
|----------------------|-------------------|----------------------|
| ۱- سنن بیہقی | ۲- سنن دارمی | ۳- سنن دارقطنی |
| ۴- سنن سعید بن منصور | ۵- مصنف عبدالرزاق | ۶- مصنف ابن ابی شیبہ |

2.3 المسانید

مسانید، مسند کی جمع ہے۔ مسند اصطلاح میں حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں صحابہ کرام کی ترتیب کے مطابق روایات کو جمع کیا گیا ہو۔ یعنی ایک صحابی کی تمام مرویات ایک مرتبہ میں ذکر کر دی جائیں خواہ وہ کسی باب سے متعلق ہوں..... پھر دوسرے صحابی کی۔ پھر تیسرے پھر چوتھے صحابی کی وہلم جوا..... پھر ان میں بعض اوقات حروف تہجی کی ترتیب کا اعتبار ہوتا ہے بعض اوقات سابقیت فی الاسلام کا اعتبار کر کے ایسے صحابی کی حدیث کو پہلے رکھا جاتا ہے۔ نیز طبقات مہاجرین اور انصار کی ترتیب پر بھی مسانید کو مرتب کیا جاتا



2.5 کتب الجمع

ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں ایک سے زائد کتب حدیث کی روایتوں کو بہ حذف تکرار جمع کر دیا جائے۔ اس نوع کی سب سے پہلی کتاب امام حمیدی کی ”الجمع بین الصحیحین“ ہے ان کے بعد حافظ رزین بن معاویہ نے ”تجرید الصحاح السنہ“ لکھی۔ جن میں صحاح ستہ کی تمام احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔ البتہ ان کی اصطلاح میں سنن ابن ماجہ کی بجائے مؤطا امام مالک صحاح ستہ میں شامل تھی اس لئے انہوں نے اپنی کتاب میں سنن ابن ماجہ کی بجائے مؤطا امام مالک کی احادیث کو جمع کیا۔ ان کے بعد حافظ ابن اثیر الجزری نے ”جامع الاصول“ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں صحاح ستہ کی احادیث کو جمع کیا اور حافظ رزین بن معاویہ سے جو احادیث چھوٹ گئی تھیں ان کو بھی شامل کر لیا لیکن ان کی اصطلاح میں بھی مؤطا امام مالک صحاح ستہ میں شامل تھی نہ کہ سنن ابن ماجہ..... ان کے بعد علامہ نور الدین مینشی تشریف لائے۔ اور انہوں نے ”مجمع الزوائد و منبع الفوائد“ کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی اور اس میں مسند امام احمد، مسند ابو یعلیٰ موصلی اور امام طبرانی کی معاجم ثلاثہ کی ان زائد احادیث کو یکجا کر دیا جو صحاح ستہ میں نہیں آئیں۔ لیکن علامہ مینشی کی اصطلاح میں بھی سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے ”مجمع الزوائد“ میں سنن ابن ماجہ کی احادیث نہیں لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنن ابن ماجہ کی احادیث نہ ”جامع الاصول“ میں جمع ہو سکیں۔ نہ ”تجرید الصحاح السنہ“ میں اور نہ ہی ”مجمع الزوائد“ میں..... ان کے بعد علامہ محمد بن سلیمان نے ”مجمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد“ کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ جس میں ایک طرف تو ”جامع الاصول“ اور مجمع الزوائد“ کی تمام احادیث کو بحذف تکرار جمع کر دیا۔ اور ساتھ ہی سنن ابن ماجہ اور سنن داری کی روایات بھی جمع کر دیں۔ اس طرح یہ کتاب چودہ کتب حدیث کا مجموعہ بن گئی۔ بلاشبہ ”جمع الفوائد“ اپنے اختصار کے باوجود احادیث کا بڑا جامع مجموعہ ہے..... لیکن پھر بھی اس میں بہت سی احادیث چھوٹ گئی ہیں.....

اب تک جن کتابوں کا تذکرہ ہوا یہ ساری کتابیں ابواب کی ترتیب پر لکھی گئی ہیں..... بعض حضرات نے

احادیث کو حروف تہجی کی ترتیب سے بھی جمع کیا ہے اس نوع کی سب سے پہلی کتاب ’فردوس الدیلمی‘ ہے۔ لیکن یہ کتاب نایاب ہے۔

اس کے بعد علامہ جلال الدین سیوطی نے ’’جمع الجوامع‘‘ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں پورے ذخیرہ احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں انہوں نے قولی احادیث کو حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کیا ہے اور فعلی احادیث کو صحابہ کرامؓ کی ترتیب سے پھر علامہ سیوطیؒ ہی نے اس کتاب کی تلخیص کی۔ اور اس کا نام ’’الجامع الصغیر فی احادیث البشیر النذیر‘‘ رکھا۔ اس کتاب میں تمام موجود کتب حدیث میں سے قولی احادیث کو حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کر دیا ہے۔ ’’جمع الجوامع‘‘ کے مقابلہ میں ’’الجامع الصغیر‘‘ کو زیادہ تداول حاصل رہا۔ الجامع الصغیر کی متعدد شروح بھی لکھی گئی ہیں۔ جن میں سے علامہ منادی کی ’’فیض القدیور‘‘ اور علامہ عزیزی کی ’’السراج المنیر‘‘ مشہور و معروف اور تداول میں ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل قدر اور جامع کام علامہ علی المتقی نے کیا۔ ان کی کتاب ’’کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال‘‘ جسے بلاشبہ احادیث نبویہ کی جامع ترین کتاب کہنا چاہئے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب کو علامہ سیوطی کی ’’جمع الجوامع‘‘ پر مبنی کیا ہے یعنی پہلے ہر باب کی وہ قولی احادیث جمع کیں۔ جو ’’جمع الجوامع‘‘ میں موجود تھیں۔ اس کے بعد وہ قولی احادیث جمع کیں جو علامہ سیوطی سے چھوٹ گئی تھیں۔ اور ان کا نام ’’الإکمال فی سنن الاقوال رکھا۔ پھر جمع الجوامع کی فعلی احادیث کو جو صحابہ کرامؓ کی ترتیب پر مرتب تھیں ابولب کی ترتیب پر مرتب کیں اور اس مجموعہ کا نام ’’کنز العمال‘‘ رکھا۔ اس میں ہر حدیث کے ساتھ اس کے مآخذ کا حوالہ رموز میں دیا ہے۔ جیسے بخاری کے لئے ’’خ‘‘۔ مستدرک حاکم کے لئے ’’ک‘‘ وغیرہ۔ علامہ علی المتقی نے اپنی کتاب میں تقریباً تیس کتب حدیث کو جمع کر دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب کسی حدیث کی تحقیق کیلئے ایک عمدہ رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

2.6 المستدرک

مستدرک اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی دوسری کتاب حدیث کی ان چھٹی ہوئی احادیث کو جمع کیا گیا ہو جو مذکورہ کتاب کی شرائط کے مطابق ہوں..... صحیحین پر متعدد علماء نے مستدرک لکھی ہے۔ جن میں ”کتاب الالتزامات للامام الدارقطنی اور المستدرک علی الصحیحین للحافظ ابی زرعہ“ مشہور ہیں..... لیکن مشہور ترین کتاب امام ابو عبد اللہ حاکم نیشاپوری کی ”المستدرک علی الصحیحین“ ہے جو سب سے زیادہ رائج رہی ہے۔ اس میں انہوں نے وہ احادیث نقل کی ہیں جو صحیحین میں موجود نہیں۔ لیکن ان کے خیال میں بخاری یا مسلم کی شرائط پر پوری اترتی ہیں..... لیکن امام حاکم صحیح احادیث کے معاملے میں بہت متساہل ہیں چنانچہ انہوں نے بہت سی حسن، ضعیف، منکر بلکہ موضوع احادیث کو بھی صحیح علی شرط الشیخین قرار دے کر مستدرک میں داخل کر دیا ہے۔ اس لئے حافظ ذہبیؒ نے اس کی تلخیص کر کے امام حاکم کی غلطیوں پر تنبیہ کیا ہے..... یہ تلخیص امام حاکم کی مستدرک کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ جب تک حدیث کے بارے میں وہ صحت کی تصدیق نہ کر دے اس وقت تک محض حاکم کی تصحیح کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

2.7 التخریج

تخریج اصطلاح میں اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی دوسری کتاب کی معلق یا بے حوالہ احادیث کی سند اور اس کا حوالہ بیان کیا جائے..... مثلاً ”ہدایہ“ میں ساری حدیثیں بلا حوالہ ہیں..... ان احادیث کی سند اور حوالہ تلاش کرنے کی غرض سے جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ وہ ہدایہ کی تخریج کہلائیں گئی..... مثلاً ”نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ“ جسے امام جمال الدین ذیلی نے تالیف کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی ”الدراۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ“..... اس طرح ”التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر“ جو حافظ ابن حجر کی مشہور تالیف ہے اور ”رافعی“ کی احادیث کی تخریج پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ”الکاف الشاف فی تخریج احادیث الکشاف“ جو علامہ زحشری کی تفسیر میں منقول روایات کی تخریج ہے..... حافظ زین الدین عبد الرحیم العراقی کی ”تخریج احیاء علوم الدین“ بھی اس

فن میں ایک بہت مفید اور مثالی تالیف ہے۔ اس میں حافظ عراقی نے امام غزالی کی ”احیاء العلوم“ کی احادیث کی تخریج کی ہے۔

2.8 الفہارس

وہ کتاب حدیث جس میں ایک یا زائد کتابوں کی احادیث کی فہرست جمع کر دی گئی ہو..... مثلاً فہرس صحیح البخاری..... فہرس سنن ابی داؤد..... وغیرہ..... ان فہارس کی وجہ سے اب مآخذ سے حدیث نکالنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اس سلسلے کا جامع اور مفید کام اللہ تعالیٰ نے مستشرقین کی ایک جماعت سے لیا۔ جس نے ڈاکٹر وینسٹن کی سربراہی میں سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک مفصل کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ”المعجم المفہرس لألفاظ الحدیث النبوی“ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے صحیحین، سنن اربعہ، مؤطا امام مالک، سنن داری اور مسند امام احمد کی احادیث کی فہرست مرتب کی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ حروف تہجی کے حساب سے انہوں نے ہر لفظ کے تحت یہ بیان کیا ہے۔ کہ یہ لفظ کون کونسی حدیث میں آیا ہے اور وہ حدیث کہاں کہاں مذکور ہے..... البتہ اس کتاب میں بالاستیعاب احادیث نہیں آسکی ہیں۔ بہت ساری روایات ان سے چھوٹ گئی ہیں اس کتاب کی بنیاد پر ڈاکٹر وینسٹن نے ایک اور کتاب مرتب کی ہے۔ جس کا نام ”مفتاح کنوز السنۃ“ ہے اس میں چودہ مآخذ کی روایات جمع کی گئی ہیں..... جن میں سیرت کے مصادر بھی شامل ہیں۔

2.9 الأطراف

وہ کتب حدیث ہیں جن میں احادیث کے صرف اول و آخر الفاظ ذکر کئے گئے ہوں۔ جن سے پوری حدیث کو پہچانا جاسکے اور آخر میں اس حدیث کا حوالہ ذکر کر دیا گیا ہو کہ فلاں فلاں کتب حدیث سے یہ احادیث لی گئی ہیں۔..... اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایک شخص کو کسی حدیث کے اول یا آخر الفاظ یاد ہوتے ہیں لیکن نہ پوری حدیث ذہن میں ہوتی ہے اور نہ اس کی اسنادی حیثیت کا علم ہوتا ہے..... ایسے موقع پر

اطراف کی کتب بے حد کام دیتی ہیں..... اس موضوع پر سب سے پہلے حافظ ابن عساکر دمشقی نے کتاب لکھی جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اس کا نام ”الاشراف فی معرفة الاطراف“ ہے۔ جس میں حافظ ابن عساکر نے سنن ابوداؤد، سنن النسائی اور سنن ترمذی کے اطراف ذکر کئے ہیں اس کتاب کو حافظ ابن عساکر نے حروف معجم پر مرتب کیا ہے۔

ان کے بعد حافظ عبدالغنی مقدسیؒ نے ”اطراف الکتب الستة“ تحریر فرمائی..... آج کل اس نوع کی سب سے زیادہ متداول اور مقبول کتاب حافظ مزی کی ”تحفة الاشراف فی معرفة الاطراف“ ہے..... ”المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوی“ اور ”مفتاح كنوز السنة“ بھی اس نوع کے تحت آتی ہیں اس لئے کہ ان دونوں کتابوں میں تفصیلی متون ذکر نہیں کئے گئے ہیں۔

2.10 الموضوعات

”موضوعات“ سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں موضوع احادیث کو جمع کر دیا گیا ہو یا مہتمم بالوضع احادیث کی تحقیق کی گئی ہو..... شروع میں کتب موضوع اس انداز پر لکھی جاتی تھیں کہ ضعیف راویوں کا تذکرہ کیا جاتا تھا اور ان سے جو موضوع یا ضعیف احادیث مروی ہیں ان کی نشاندہی کی جاتی تھی۔ حافظ ابن عدی کی ”الکامل“..... امام عقیلی کی ”الضعفاء“ اور امام جوزقانی کی ”الاباطیل“ اس انداز پر ہیں..... بعد میں موضوعات کا طریقہ یہ ہو گیا کہ موضوع یا مہتمم بالوضع احادیث کو ابواب کی ترتیب سے یا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کو کس نے روایت کیا ہے اور اس میں سند کیا ناقص ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے علامہ ابن الجوزی نے قلم اٹھایا۔ ان کی دو کتابیں ہیں ایک ”العلل المتناہیة فی الأخبار الواہیة“ اور دوسری ”الموضوعات الکبری“..... ان میں سے دوسری کتاب متداول ہے..... لیکن علماء حدیث کا کہنا ہے کہ علامہ ابن الجوزی احادیث پر وضع کا حکم لگانے میں محتاط نہیں ہیں۔ اور انہوں نے بہت سی صحیح روایات پر کلام کیا ہے۔ علماء نے ان کی کتابوں پر تنقیدیں لکھیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کی تردید میں ”القول المسدد فی الذب عن مسند احمد“ میں ان کی بہت عمدہ تردید کی ہے۔

اس کتاب میں حافظ ابن حجر نے مسند احمد کی ان احادیث کی تحقیق کی ہے جنہیں حافظ ابن الجوزی نے موضوع قرار دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جن احادیث پر حافظ ابن الجوزی نے موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے ان میں سے ایک حدیث صحیح مسلم میں بھی موجود ہے اور ایک حدیث صحیح بخاری کے احمد شاہ کراچی کے نسخہ میں بھی ہے اور ایسی احادیث تو بہت سی ہیں جو امام بخاری نے تعلیقاً روایت کی ہیں۔ اور امام ابن الجوزی نے انہیں موضوع قرار دے دیا ہے پھر علامہ جلال الدین سیوطی نے ابن الجوزی کی موضوعات پر ایک مفصل تنقید لکھی جس کا نام ”النکت البدیعات علی الموضوعات“ رکھا۔ بعد میں اس کی تلخیص کی اور اس میں کچھ اضافے کئے جو ”اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعه“ کے نام سے معروف ہے اور شائع ہو چکی ہے۔۔۔۔۔

علامہ ابن الجوزی کے بعد حافظ صنعانی کی موضوعات بھی بہت مقبول ہوئیں۔ علامہ ابن الجوزی اور علامہ سیوطی کے بعد بہت سے حضرات نے موضوعات پر کتابیں لکھیں جن میں ملا علی قاری کی ”الموضوعات الکبیر“ نہایت مقبول و معروف ہے۔۔۔۔۔ آخری دور میں قاضی شوکانی کی ”الفوائد المجموعه فی الأحادیث الموضوعه“ اور علامہ طاہر ثقفی کی ”تذکرۃ الموضوعات“ مختصر مگر مفید کتابیں ہیں۔

اس نوع کا جامع ترین کام علامہ ابن عراق نے انجام دیا۔ انہوں نے اپنی کتاب ”تنزیہ الشریعة المرفوعه عن الاحادیث الشنیعة الموضوعه“ میں علامہ ابن الجوزی جو زقانی ^{معنی} حافظ ابن عدی حافظ ابن حجر، علامہ السیوطی اور ملا علی قاری کی تمام کتابوں کو جمع کر دیا ہے اور ہر حدیث کی خوب تحقیق کی ہے۔ اس طرح ان کی کتاب جامع ترین بھی ہے اور محقق ترین بھی جو بسا اوقات پچھلی تمام کتابوں سے مستغنی کر دیتی ہے اس کتاب میں علامہ ابن عراق نے حافظ ابن الجوزی، جو زقانی اور امام سیوطی کی بیان کردہ احادیث میں صرف ان احادیث کو جمع کیا ہے جو فی الواقع موضوع ہیں۔

2.11 کتب الأحادیث المشتهرة

اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں ان احادیث کی تحقیق کی گئی ہو جو عام طور سے مشہور اور زبان زد عام ہوتی ہیں لیکن ان کی سند کا علم عام طور سے نہیں ہوتا اس موضوع پر سب سے پہلے علامہ زرکشی نے

”التذكرة في الاحاديث المشتهرة“ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ان کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”اللائحة المنشورة في الاحاديث المشهورة“ لکھی۔ بعد میں علامہ جلال الدین سیوطی نے ”الدرر المنتشرة في الاحاديث المشتهرة“ مرتب کی۔ علامہ ابن درویش نے ”اثناء المطالب في احاديث مختلفة المراتب“ لکھی جو اپنے اختصار کے باوجود کافی مشہور ہوئی۔ لیکن اس نوع کی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور اور متداول کتاب حافظ شمس الدین سخاوی کی ”المقاصد الحسنة في الاحاديث المشتهرة“ ہے جسے انہوں نے حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کیا ہے اور ہر ایک حدیث کی خوب تحقیق کی ہے۔

2.12 مشکل الحدیث

اس نوع کو ”شرح الآثار“ اور ”مختلف الحدیث“ بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ کتب حدیث ہیں جن میں حدیث کے مواقع اور محل کی تعیین کی گئی ہو ان میں کوئی خاص ترتیب نہیں ہوتی بلکہ مؤلف کیف ما اتفق احادیث کو ذکر کر کے ان کی تشریح کرتا ہے۔ اس نوع کی بہت سی کتب لکھی گئی ہیں ابام شافعی وہ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اپنی کتاب ”الامم“ کے بعض حصوں میں اس پہلو سے کام کیا ہے امام ابن قتیبہ کی ”مشکل الآثار“ اور علامہ ابوبکر بن الفورک کی ”مشکل الحدیث“ بھی اس نوع کی اہم ترین اور مقبول ترین کتب ہیں۔

2.13 اسباب الحدیث

حدیث میں ان کی وہی حیثیت ہے جو تفسیر میں اسباب النزول کی ہے۔ یعنی اس میں قولی احادیث کا سبب ورد بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کون سا ارشاد کن حالات میں فرمایا۔ اس نوع میں بہت کم کتابیں لکھی گئیں اس میں سب سے پہلی تصنیف امام ابو حفص العکمری کی ہے۔ اس کے بعد حامد بن کزنی اور علامہ سیوطی نے بھی اس پر قلم اٹھایا ہے۔ حاجی خلیفہ لکھتے ہیں: ہمارے دور میں اس نوع کی صرف ایک

کتاب باقی رہ گئی ہے جس کا نام ”البيان والتعريف في اسباب ورود الحديث الشريف“ ہے۔ اور وہ علامہ ابراہیم بن محمد الشہیر بابن حمزہ الحسینی الدمشقی الحنفی کی تالیف ہے۔ یہ کتاب علماء کے ہاں متداول رہی کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

2.14 الاجزاء

”جزء“ اس کتاب کو کہتے ہیں۔ جس میں کسی ایک جزوی مسئلہ سے متعلق تمام احادیث یکجا کر دی گئی ہوں جیسے ”جزء القراءة للامام البخاری“..... جزو القرآن للامام البيهقي..... جزء رفع اليدين للامام البخاری..... جزء الجهر بيسم الله للامام الدارقطني..... جزء الجهر بيسم الله للخطيب البغدادي..... اور کتاب القراءة للامام البيهقي..... متاخرين میں علامہ انور شاہ کشمیری کی ”التصريح بما تواتر في نزول المسيح“ بھی اس نوع میں شامل ہے۔ اس جزء میں علامہ کشمیری نے نزول مسیح سے متعلق ساری احادیث و آثار جمع کئے ہیں۔

2.15 غریب الحدیث

اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں متون حدیث میں وارد شدہ مشکل، مبہم اور پیچیدہ الفاظ کی تشریح و توضیح کی گئی ہو..... علم غریب الحدیث بہت اہم علوم میں سے ہے..... امام نووی اس ضمن میں لکھتے ہیں: ”فن مهم يقبح جهله بأهل الحديث، والخوض فيه صعب، حقيق بالتحري، جدير بالتوقي، وكان السلف يشبتون فيه أشد تثبت فقد روينا عن احمد بن حنبل انه سئل عن حرف منه، فقال: سلوا اصحاب الغريب، فاني اكره أن اتكلم في قول رسول الله ﷺ بالظن (تدريب الراوي. ص: ۳۹)۔“

یہ فن بہت ہی اہم ہے..... جو حضرات اس سے ناواقف ہوتے ہیں ان کی تنقیص کی جاتی ہے..... اس کا مطالعہ دقت طلب ہے، تلاش، جستجو اور انہماک کا متقاضی ہے..... علمائے سلف اس فن کے حصول کا بہت

اہتمام کرتے تھے اور اس کی قدر و احترام کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل سے ایک مرتبہ کچھ الفاظ و کلمات کی وضاحت پوچھی گئی۔ تو آپؑ نے فرمایا: اس بارے میں غریب الحدیث کے ماہرین سے رجوع کرنا چاہئے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنی طرف سے متن حدیث کے الفاظ کی تشریح کروں..... امام احمد کے بارے امام خلال کی روایت ہے کہ آپ ابو عبیدہ قاسم بن سلام کے پاس ”غریب الحدیث“ کے سلسلے میں حاضر ہوتے تھے۔

علماء حدیث نے اس فن کی اہمیت کے پیش نظر دو رد وین و تصنیف کا آغاز ہوتے ہی اس پر قلم اٹھایا..... دوسری صدی ہجری کے آخر اور تیسری صدی کے اوائل میں اس فن نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی سب سے پہلے ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ (م: ۲۱۰ھ) نے غریب الحدیث میں کتاب تیار کی، پھر ابو عدنان السلمی اور عبد الرحمن بن عبد الاعلیٰ نے غریب الحدیث کے موضوع پر کام کیا..... ابن درستیہ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: ”ذکر فیہ الأسانید وصنّفہ، علی ابواب السنن والفقہ إلا أنه لیس بالکبیر“ (مقدمہ النہایۃ فی غریب الحدیث)

اس کتاب میں اسانید اور سنن کی ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن کتاب کی ضخامت زیادہ نہیں ہے..... اس دور میں نصر بن شمیل (م: ۲۰۳ھ) اور محمد بن المستنیر قطرب۔ (م: ۲۰۶ھ) نے بھی غریب الحدیث میں کتابیں لکھیں۔ قطرب کی کتاب کا نام ”غریب الآثار“ ہے..... ابو عمر و الشیبانی اور اسحاق بن خزار (۲۱۰ھ) نے بھی اس موضوع پر کام کیا۔ اس دور میں ابو زید الانصاری، سعید بن اوس بن ثابت (۲۱۷ھ) عبد الملک بن قریب الاصمعی (۲۱۶ھ)، حسن بن محبوب السراء اور امام ابو عبیدہ القاسم بن سلام نے بھی اس فن کی طرف توجہ دی..... امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام کی کتاب اس موضوع پر سب سے جامع اور مفصل کتاب ہے..... یہ کتاب حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے البتہ اس سے کسی لفظ کے معنی تلاش کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس میں حروف تہجی کی ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں ہے..... امام اصمعی اور علام ابن قتیبہ دینوری نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا جن کے کام کو علامہ خطابی نے آکر یکجا کر دیا۔

چوتھی صدی ہجری میں امام ابو عبیدہ احمد بن محمد الہروی (۴۰۱ھ) نے اپنی مشہور کتاب ”الغریبین“ کے

نام سے مرتب کردی..... اس کتاب میں آپ نے قرآن مجید اور حدیث کے مشکل اور غریب الفاظ و کلمات کو حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق جمع کر دیا اور ان کی تشریح و توضیح کردی..... اس کے بعد آپ نے ابو عبید قاسم بن سلام اور امام ابن قتیبہ دینوری کی کتابوں کو جمع کر دیا اس پر مزید اضافے کر دیئے..... اس کتاب کو اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی کہ علم حدیث کے ہر مرکز اور حلقہ تک اس کے نسخے پہنچ گئے اور علماء نے اس کو مآخذ کے طور پر تسلیم کر لیا.....

اس کے بعد حب علامہ ابو القاسم محمود بن عمر الزمخشری (۵۳۸ھ) کا دور آیا۔ تو آپ نے اپنے فطری ذوق اور مناسبت کی وجہ سے اس فن کی طرف توجہ دی اور بہت عمدہ کتاب ”الائق فی غریب الحدیث“ کے نام سے مرتب کردی..... اس کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اسم بامسمیٰ ہے..... کتاب کی ترتیب اور کلمات کا انتخاب بہت مفید ہے..... یہ کتاب ۱۳۲۲ھ میں پہلی مرتبہ حیدر آباد دکن سے چھپی۔ بعد میں ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۵ھ) میں مصر سے محمد ابو الفضل ابراہیم کی تحقیق کے ساتھ طبع ہوئی۔ اس کے بعد حافظ ابو موسیٰ محمد بن

ابوبکر المدینی الاصفہانی (۵۸۱ھ) کا دور آیا۔ آپ نے امام ابو عبید الہروی کی کتاب الغررین کا تجزیہ کیا..... اور اس کے بعد ”المغیث فی غریب القرآن والحدیث“ کے نام سے کتاب مرتب کر لی..... اس کتاب میں آپ نے ان الفاظ و کلمات کا اضافہ کیا جو امام ہروی سے رہ گئے تھے..... کتاب کی ترتیب بہت خوبصورت ہے..... اپنی کتاب کے بارے میں آپ لکھتے ہیں: ”واعلم انه سببقی بعد کتابی اشیاء لم تقع لی ولا وقفت علیها، لأن کلام العرب لا ینحصر، قال ابن الاثیر: ولقد صدق رحمۃ اللہ فان الذی فاتہ من الغریب کثیر“.....

یہ بات ذہن میں رہے کہ عربی زبان بہت وسیع اور کثیر الجہات ہے۔ اس کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھ سے ایسے بہت سارے الفاظ چھوٹ گئے ہوں گے جو اہم اور بنیادی حیثیت کے حامل ہوں گے..... علامہ ابن اثیر الجزری کہتے ہیں: حافظ ابو موسیٰ نے جو کچھ کہا ہے درست کہا ہے واقعی ایسے بہت سارے کلمات آپ سے چھوٹ گئے ہیں جنہیں ذکر کرنا چاہئے تھا.....

حافظ ابن اثیر کہتے ہیں: ولما وقفت علی کتاب ابی موسی الذی جعله مکملا لکتاب الہروی وهو فی غایۃ الحسن والکمال، وكان الانسان إذا اراد کلمۃ غریبۃ یحتاج علی أن یتطلبها فی احد الکتابین، فان وجدها فیہ وإلا طلبها من الکتاب الآخر، وهما کتابان کبیران ذوا مجلدات عدۃ، ولا خفاء بما فی ذلک من الکلفۃ، رأیت ان اجمع ما فیہما من غریب الحدیث مجردا من غریب القرآن، واضیف کل کلمۃ، إلی أختها فی بابها تسهیلا لکلفه الطلب، (مقدمہ النہایۃ فی غریب الحدیث ج ۱ ص: ۸، ۹)

میں نے جب ابو موسیٰ کی کتاب کا مطالعہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کتاب بہت عمدہ اور مفید ہے..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی انداز ہوا کہ اس کتاب سے استفادہ کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہ ایک نہیں بلکہ دو کتابوں کا مجموعہ ہے اور دونوں کتابیں اچھی خاصی ضخیم ہیں..... اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ ”غریب الحدیث“ کو ”غریب القرآن“ سے الگ کر دوں..... اور اس کی ترتیب اس طریقہ پر رکھوں کہ اس سے استفادہ کرنے والے کو کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اس منصوبہ کے تحت کام شروع کر دیا..... وہ تمام غریب کلمات جن کا تعلق احادیث و آثار سے ہے میں نے ان کو بار بار تلاش کیا۔ اور ان کی تشریح و توضیح میں بھرپور محنت کی۔ ابن اثیر کہتے ہیں: میں امام خطابی اور ابو موسیٰ کے اس قول کو دہرانا چاہتا ہوں: لم یکون قد فانتی من الکلمات الغریبۃ التی تشتمل علیہا احادیث رسول اللہ ﷺ وتابعیہم (مقدمہ ج ۱ ص: ۲۲۸)

جہاں تک ممکن ہو سکا ہے میں نے احادیث رسول میں سے ان کلمات کو جمع کیا ہے جو ”غریب“ کے زمرہ میں آتے ہیں..... دسویں صدی ہجری میں برصغیر کے کئی علماء نے علم حدیث پر مختلف حوالوں سے کام کرنا شروع کر دیا ان حضرات میں جس شخصیت کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ علامہ علی المتقی الہندی (م ۹۷۵ھ) ہیں۔ آپ نے ”کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال“ کے نام سے ایک بہت ہی جامع، وسیع اور مفید کام کیا..... آپ کے شاگردوں میں بڑے بڑے شیوخ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے شیخ

کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علم حدیث کی آبیاری کی انہیں میں سے ایک شیخ محمد طاہر بنی نے جہاں اور بہت سی تالیفات کیں وہاں غریب الحدیث پر ایک بہت پایہ کی کتاب لکھی۔ اس کتاب کا نام ”مجمع بحار الأنوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار“ رکھا۔ یہ ایسی کتاب ہے جو ابن اثیر کی ”النہایہ“ کے بعد اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔

2.16 الضعفاء

اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں ضعیف رواۃ کے متعلق معلومات جمع کی گئی ہوں..... امام بخاری، امام نسائی اور حافظ ابن حبان بستی کی کتاب الضعفاء کو علماء کے ہاں تداول حاصل رہا..... ابن حبان کی کتاب الضعفاء پر امام دارقطنی نے حاشیہ لکھا..... اسی طرح ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن عبد الرحیم البرقی (م ۲۶۹ھ) نے ”کتاب الضعفاء“ مرتب کی..... حافظ برقی مصر میں رہتے تھے۔ اپنے عہد کے ممتاز محدث تھے۔ البرقی اس لئے کہلاتے تھے کہ لوگ آپ کی علمی وجاہت کی وجہ سے آپ کی قربت کو پسند کرتے تھے۔ ابو بشر محمد بن حماد الدولابی نے بھی کتاب الضعفاء تالیف کی..... اسی دور میں ابو جعفر محمد بن عمر موسیٰ بن حماد العقیلی (م ۳۲۲ھ) نے اپنی کتاب ”الضعفاء“ کے نام سے مرتب کی۔ حافظ عقیلی کی کتاب اس موضوع پر بڑی ضخیم کتاب ہے..... یہ کتاب پہلے نایاب تھی اب چھپ گئی ہے اور عام دستیاب ہے۔ اس پر ڈاکٹر عبد المعطی امین قلعجی نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے اور تحقیق و تعلیق میں انتہائی محنت سے کام لیا ہے..... حافظ عقیلی نے بعض ایسے رواۃ کو بھی ضعفاء میں شمار کیا ہے جن کی ثقاہت پر اتفاق ہے۔ ڈاکٹر قلعجی نے اس قسم کے مقامات کی نشاندہی کی ہے اور حافظ عقیلی پر استدراک کیا ہے..... اس موضوع پر بہت عمدہ اور مفید کام ابو نعیم عبد الملک بن محمد بن عدی بن زید الجرجانی (۳۲۳ھ) کا ہے۔ ان کی تالیف بھی اچھی خاصی ضخیم ہے اور دس اجزاء پر مشتمل ہے۔

ابو الفتح محمد بن حسین بن احمد الأزدی البغدادی (۳۷۴ھ) اپنے دور کے بہت بڑے شیخ تھے۔ حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک بڑی ضخیم کتاب ”الضعفاء“ کے نام سے مرتب کی۔

ابو احمد عبد اللہ بن عدی بن عبد اللہ الجرجانی (۳۶۵ھ) بہت بڑے حافظ اور ان ائمہ میں سے ہیں جن

کی طرف علل، رجال اور ضعفاء کی پہچان میں رجوع کیا جاتا ہے..... آپ کی کتاب ”الکامل“ کے نام سے مشہور ہے اس میں مؤلف نے ہر اس راوی کا ذکر کیا ہے جس کے بارے میں کلام کیا گیا ہو خواہ اس کا تعلق کسی بھی طبقہ سے ہو ہر ایک راوی کے ترجمہ اور حالات کے بیان میں اس کی ایک روایت بھی بیان کی ہے یہ کتاب پہلے غیر مطبوعہ تھی۔ اب طبع ہو گئی ہے اور مارکیٹ میں دستیاب ہے یہ ان تمام کتابوں میں کامل ترین کتاب ہے جو جرح کے موضوع پر لکھی گئی ہیں اور اس باب میں اس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اس میں مؤلف نے جو کچھ بیان کیا ہے، متقدمین اور متاخرین نے اس کی طرف رجوع کیا ہے۔ اس کتاب کی روایات کو ابن طاہر نے جمع کیا اور حروفِ معجم پر ترتیب دیا۔ اس پر بعد میں ابوالعباس احمد بن محمد الاموی الاندلسی نے حواشی لکھے۔ اور اس کا نام ”الحافل فی تکمة الکامل“ رکھا۔

حافظ شمس الدین الذہبی نے بھی ضعفاء پر کتاب لکھی جس کا نام ”میزان الاعتدال فی نقد الرجال“ ہے یہ کتاب علماء اور طلبہ کے ہاں رائج اور مقبول ہے مؤلف نے اس کتاب کی ترتیب میں وہی طرز اختیار کیا ہے جو حافظ ابن عدی نے ”الکامل“ میں اختیار کیا ہے حافظ ذہبی نے ان تمام رواۃ کو ضعفاء، میں شمار کر دیا ہے جن پر کسی طرح بھی جرح کی گئی ہو خواہ فی نفسہ وہ ثقہ ہی کیوں نہ ہوں۔ مؤلف سے کافی رواۃ کا ذکر چھوٹ گیا تھا جن کو حافظ زین الدین العراقي نے ایک جلد میں جمع کیا اور مذکورہ کتاب کا ضمیمہ بنا دیا..... حافظ ابن حجر نے ”لسان المیزان“ نامی کتاب لکھی جس کے ضمن میں میزان الاعتدال کو بھی رکھا اور اضافہ بھی کیا..... یہ کتاب مطبوعہ ہے اور عام دستیاب ہے۔ لسان المیزان کا خلاصہ ابوزید عبدالرحمان بن ابی العلاء العراقي (م: ۱۲۳۴ھ) نے کیا..... حافظ برہان الدین نے بھی میزان الاعتدال کا خلاصہ کیا لیکن حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ حلبی نے اس میں دقت نظر اور تحقیق سے کام نہیں لیا۔

2.17 کتب الثقات

اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں ثقہ رواۃ کے حالات و تراجم بیان کئے گئے ہوں۔ اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب حافظ ابن حبان بستی کی ”کتاب الثقات“ ہے..... ابن حبان کی یہ تالیف بہت عمدہ ہے

بخاری کی کتاب العلل اور امام ترمذی کی کتاب العلل ابتداء میں مقبول اور متداول رہیں..... امام ترمذی کی کتاب العلل پر حافظ زین الدین عبدالرحمن بن احمد البغدادی الدمشقی (م ۷۵۷ھ) نے بہت وقیع اور مفید کام کیا..... آپ ابن رجب الحنبلی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ شرح اتنی عمدہ اور خوبصورت ہے کہ اس کے مطالعہ سے اس فن کے ساتھ خود بخود دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام علی بن المدینی اور امام ابو بکر الاثرم نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ بعد میں آنے والے مؤلفین نے ان ہی کی تحقیق و تجزیہ کو مد نظر رکھا ہے..... اور ابو عبد اللہ حاکم نیشاپوری اور ابو بکر احمد بن محمد ہارون بغدادی کی تالیفات کو بھی مقبولیت حاصل رہی مؤخر الذکر حنبلی المذہب تھے اور ”الخلال“ کے نام سے معروف ہیں ان کی کتاب کئی جلدوں میں ہے..... ابو زکریا بن یحییٰ الضبی البصری (م ۳۰۷ھ) نے ”علل الحدیث“ کے نام سے کتاب لکھی۔ آپ بصرہ کے ممتاز شیخ اور محدث تھے۔ حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ ان کی یہ تالیف علل الحدیث میں جلیل القدر کتاب ہے اور اس فن میں مؤلف کے وسعت علم کی واضح دلیل ہے اس طرح امام دارقطنی کی ”علل الحدیث“ بھی ایک ضخیم کتاب ہے آپ نے اس کو مسانید کے انداز پر مرتب کیا ہے۔ یہ دراصل ان کی اپنی تالیف نہیں بلکہ آپ کے شاگرد حافظ ابو بکر البرقانی کی تالیف ہے جنہوں نے اپنے شیخ کے افادات کو مرتب کیا ہے..... حافظ ابن الجوزی کی ”العلل المتناہیة فی الاحادیث الواہیہ“ بھی اس سلسلہ کی اہم اور وقیع کتاب ہے۔

خود آزمائی ①

- ۱- جامع کی تعریف کیجئے۔ اور اس موضوع پر اہم کتب کا تذکرہ کیجئے۔
- ۲- ”سنن اربعہ“ سے کیا مراد ہے۔ کیا ان کے علاوہ بھی اس نوع کی اہم کتب پائی جاتی ہیں۔
- ۳- ”مسند“ اصطلاح میں حدیث کی کوئی کتاب کہلاتی ہے۔ مسانید میں سب سے اہم مسند کی نشاندہی کیجئے۔
- ۴- ”معجم“ کی تعریف کیجئے اور بتائیے کہ معاجم ثلاثہ سے کوئی کتب مراد لی جاتی ہیں۔
- ۵- کتب الجمع میں سے کسی ایک کتاب پر اجمالاً گفتگو کیجئے
- ۶- ”تخریج“ کی تعریف کرتے ہوئے اہم تالیفات کا ذکر کیجئے۔
- ۷- ”أطراف“ کی ابتدا کس دور میں ہوئی۔ اس نوع کی اہم کتب کا تعارف کیجئے۔

③ وحدانیات، ثنائیات، ثلاثیات وغیرہ

امام ابو حنیفہؒ کی واحدانیات پر مشتمل احادیث کا مجموعہ ابو معشر عبد الکریم بن عبد الصمد الطبری المقرئ الشافعی کی تالیف ہے یہ ایک جزء میں ہے..... امام مالک کی ثنائیات ان کے مؤطا میں موجود ہیں اور ان کے ہاں احادیث کا جو ذخیرہ ہے اس میں ان کی ثنائیات اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ امام بخاری کی تیس ثلاثیات صحیح بخاری میں موجود ہیں جنہیں حافظ ابن حجر نے علیحدہ بھی جمع کیا ہے اور علماء نے ان کی شرحیں بھی لکھی ہیں، امام بخاری کی طویل تر نو (9) سند رواۃ پر مکمل ہوتی ہے..... امام مسلم کی ثلاثیات تو ہیں مگر انہوں نے اپنی ثلاثیات کو اپنی صحیح میں نہیں رکھا کیونکہ وہ آپ کے معیار اور شرط پر نہیں اترتی ہیں..... امام ترمذی کی ”جامع“ میں صرف ایک حدیث ثلاثی ہے اور وہ حضرت انسؓ کی یہ روایت ہے: ”یأتی علی الناس زمان الصابر فیہم علی دینہ کالقابض علی الجمر“.....

امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں پانچ ثلاثیات ذکر کی ہیں جو ایک ہی سند کے ذریعہ حضرت انسؓ سے مروی ہیں..... جبارہ الحمائی الکوفی نے کثیر بن سلیم الضبی سے اور اس نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔ مگر یہ دونوں راوی ضعیف ہیں..... امام دارمی نے اپنی سنن میں پندرہ ثلاثیات ذکر کی ہیں..... امام شافعی نے کچھ اپنی مسند میں اور کچھ دیگر تالیفات میں ثلاثیات ذکر کی ہیں اور ان کی اکثر احادیث ثلاثی ہیں..... امام احمد کی ثلاثیات آپ کی مسند میں ہیں جن کی تعداد تین سو سونتیس کے لگ بھگ ہے جیسا کہ ”عقود اللالی فی الاسانید العوالی“ میں مذکور ہے..... عبد بن حمید نے اپنی مسند میں 51 ثلاثیات ذکر کی ہیں اور طبرانی نے معجم الصغیر میں تین ثلاثیات نقل کی ہیں.....

امام شافعی کی رباعیات میں سے بعض کو ابو احسین الدارقطنی نے تحریر کیا ہے اور اب یہ رباعیات

ابو بکر محمد بن عبد اللہ الشافعی کی ”فوائد“ میں داخل ہیں..... اسی طرح امام بخاری کی رباعیات ہیں جنہیں رباعیات ابی عبد اللہ البخاری کہا جاتا ہے..... امام مسلم کی رباعیات ان کی تالیف ”صحیح مسلم“ میں اور امام نسائی کی ان کی سنن میں ہیں..... ان دونوں ائمہ کی یہ رباعیات ان کی سندوں میں سے اعلیٰ اسناد پر مشتمل ہیں..... امام طبرانی کی چار رباعیات ان کی معاجم میں موجود ہیں..... امام ترمذی کی رباعیات جامع ترمذی میں ہیں جن کی تعداد ایک سو ستر (۱۷۰) ہے..... تابعین کی رباعیات جنہیں رباعیات التابعین کہا جاتا ہے۔ ابو محمد عبد الغنی بن سعد الأزدی نے جمع کی ہیں..... اسی طرح ابو المواہب حسن بن ابی العظام ہبہ اللہ بن محفوظ قصری الدمشقی نے رباعیات التابعین جمع کیں۔ آپ اپنے عہد کے بہت بڑے محدث اور شیخ تھے ۵۷۶ھ میں وفات پائی.....

حافظ ابو الحسین احمد بن محمد بن احمد البغدادی البزار (م ۴۷۰ھ) نے خماسیات جمع کیں..... دیار مصر کے مشہور و معروف شیخ ابو عبد اللہ محمد بن احمد ابراہیم الرازی (م ۵۶۵ھ) نے ”سداسیات“ لکھی..... ان کی کتاب کی تخریج ابو طاہر السلفی نے کی ہے..... اسی طرح السداسیات والخمسیات ابو القاسم زاہد بن طاہر بن محمد نیشاپوری کی مرویات ہیں..... آپ نیشاپور کے ممتاز محدثین میں سے ہیں۔ ۵۳۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا محدثین نے ”سداسیات التابعین“ پر بھی کام کیا جیسا کہ ابو موسیٰ محمد بن عمرو الأصفہانی نے سداسیات التابعین نامی کتاب لکھی..... آپ کئی کتابوں کے مؤلف ہیں۔ ۵۸۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

السباعیات، ابو موسیٰ المدینی، ابو جعفر الصیدلانی اور ابو القاسم بن عساکر نے جمع کیں۔ اسی طرح ابو الفرج النجیب عبد اللطیف بن عبد المنعم الحواری نے سبائی روایات کا مجموعہ تیار کیا..... آپ مصر کے کبار شیوخ میں سے تھے ۶۷۲ھ میں وفات پائی آپ کی جمع کردہ روایات کی تخریج سید شریف حافظ عز الدین احمد بن محمد الحسینی نے کی..... سید شریف حافظ عز الدین نے ”ثمانیات“ پر بھی کام کیا اس سلسلے میں آپ کی تالیف چار اجزاء پر مشتمل ہے اسی طرح ابو الحسین یحییٰ بن علی العطار نے ”ثمانیات“ لکھی..... حافظ ضیاء الدین المقدسی نے بھی ثمانیات کا ایک مجموعہ تیار کیا.....

”التساعیات“ رضی الدین ابراہیم بن محمد الطبری کی تالیف ہے۔ آپ ۶۲۲ھ میں فوت ہوئے۔ اپنے عہد کے کبار مشائخ میں سے تھے۔ اسی طرح قاضی القضاۃ عز الدین ابو عمر عبدالعزیز الکتانی الشافعی المصری (م ۷۶۷ھ) نے احادیث تساعیات جمع کیں..... اشیر الدین ابو حیان محمد بن یوسف الاندلسی الغرناطی نے بھی تساعیات کا ایک مجموعہ تیار کیا۔

العشاریات، امام ترمذی اور امام نسائی کی سنن میں موجود ہیں۔ اور ان کے ہاں یہ طویل تر اسانید ہیں..... برہان الدین ابوالسحاق ابراہیم بن احمد التوفی نے بھی عشاریات کا مجموعہ تیار کیا۔ آپ اصلاً بعلبک کے رہنے والے تھے دمشق میں پرورش پائی اور مصر میں شکوت پذیر ہوئے..... زین الدین عراقی کے پاس بھی عشاریات کا مجموعہ تھا..... حافظ شمس الدین سخاوی اور علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی ”عشاریات“ جمع کیں..... علامہ سیوطی کی کتاب کا نام ”النادرات من العشاریات“ ہے اس میں انہوں نے اپنی حاصل کردہ خصوصی عشاریات جمع کی ہیں.....

”الأربعینات“: اربعین سے مراد حدیث کی وہ کتاب ہے جس میں مؤلف نے ذخیرہء حدیث میں سے چالیس احادیث کا انتخاب کیا ہو۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی تالیف امام عبداللہ بن المبارک الحفظی کی ہے۔ ان کے بعد محمد بن اسلم الطوسی، حسن بن سفیان النسائی اور ابوبکر الأجرى نے ”اربعین“ کے نام سے مجموعے تیار کئے۔ ابوبکر محمد بن ابراہیم الاصبہانی جو ابن المقرئ کے نام سے معروف ہیں انہوں نے ”اربعین“ مرتب کی..... امام ابوبکر البیہقی، امام ابوالحسن الدارقطنی، امام ابو عبداللہ حاکم نیشاپوری، ابوطاہر السلفی، اور ابوالقاسم ابن عساکر نے بھی اس ضمن میں تالیفات کیں۔ ابن عساکر نے کئی اربعینات لکھیں جن میں ”الأربعون الطوال، الأربعون البلدانیہ، اور الأربعون فی الجہاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں..... بعد میں ابو سعد احمد بن عبد اللہ بن حفص بن الخلیل الانصارى المالینی (م ۵۱۲ھ) نے ”اربعین“ مرتب کی۔ آپ کبار محدثین اور صوفیہ میں سے ہیں..... ابو الفتوح محمد بن محمد بن علی الطائی البہدانی نے ”ارشاد السائرین إلى منازل المتقین“ کے نام سے چالیس روایات جمع کیں۔ اس کتاب میں آپ

نے چالیس احادیث اپنے شیوخ سے اخذ کی ہیں..... تاج الاسلام ابو بکر محمد بن اسحاق البخاری الکلابازی الحنفی (م ۳۸۰ھ) نے بھی اس ضمن میں ایک کتاب لکھی۔ آپ بخارا کے رہنے والے تھے اور اپنے عہد کے ممتاز شیوخ میں شمار ہوتے تھے۔ ابو محمد عبد القاہر بن عبد اللہ بن عبد الرحمن نے جدا جدا اسانید والی چالیس احادیث ایک ضخیم جلد میں جمع کیں۔ آپ کا لقب ”الرہاوی“ ہے موصل اور شام کے درمیان ”ربا“ نامی شہر کی طرف آپ کی نسبت ہے۔

آپ اپنے دور میں تنابلیہ کے امام اور الجزیرہ کے محدث تھے۔ ابو عبد اللہ اسماعیل بن عبد الغافر بن محمد بن عبد الغافر فارسی نے بھی ”اربعین“ مرتب کی..... تقی الدین محمد بن احمد بن عبد الرحمن الفاسی الحافظ (م ۸۸۲ھ) نے بھی اس سلسلہ میں تالیف کی..... ان کی ایک کتاب ”شفاء الغرام بأخبار بلاد اللہ الحرام“ ہے جو تین جلدوں میں ہے..... انہوں نے اسکا اختصار اور خلاصہ بھی کیا ہے جس کا نام ”تحفۃ الکرام“ ہے اور یہ ایک جلد میں ہے..... اربعینات میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت امام ابو زکریا النووی کی اربعین کو حاصل ہوئی..... امام نووی کی اربعین پر بعد کے کئی علماء نے شروح اور حواشی لکھے۔ مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے..... اس پر سب سے عمدہ اور خوب صورت کام حافظ ابن رجب حنبلی کا ہے۔ حافظ ابن رجب نے امام نووی کی چالیس احادیث میں دس مزید روایات کا اضافہ کیا ہے۔ اور اس کی بہت جامع اور علمی شرح لکھی ہے۔ آج کل حدیث کے طلبہ اور شیوخ زیادہ تر اس کو زیر مطالعہ رکھتے ہیں اور اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

خود آزمائی ②

- (۱) ”موضوعات“ اصطلاح میں کوئی کتب کہلاتی ہے۔ اس سلسلے کی اہم کتب کا تعارف کیجئے۔
- (۲) ”کتب الأحادیث المشتہرہ“ سے کیا مراد ہے۔ اس ضمن میں کونسے مؤلف نے زیادہ وقیع تالیف کی ہے؟
- (۳) ”أسباب الحديث“ پر سب سے اہم ماخذ کی نشاندہی کیجئے۔
- (۴) ”اجزاء“ کی نوع میں جو تالیفات اہمیت کی حامل ہیں ان پر نوٹ لکھئے۔
- (۵) ”غریب الحديث“ کی اہمیت بتاتے ہوئے اس ضمن میں بنیادی مآخذ پر بحث کیجئے۔
- (۶) ”الضعفاء“ پر سب سے اہم اور بنیادی کام کس مؤلف نے کیا ہے؟..... نشاندہی کیجئے۔
- (۷) ”العلل“ سے کیا مراد ہے۔ اس پہلو سے جو اہم مصادر دستیاب ہیں ان کا جائزہ لیں



یونٹ نمبر 13

اصول درایۃ

تحریر: ڈاکٹر علی اصغر چشتی
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی



فہرست

- 427 یونٹ کا تعارف
- 428 یونٹ کے مقاصد
- 429 اصول درایۃ ①
- 434 درایۃ کا لفظی مفہوم ②
- 434 درایۃ کی عام تعریف ③
- 435 3.1 درایۃ کی خاص تعریف
- 436 صحابہ کرام اور اصول درایۃ ④
- 441 درایۃ کے بنیادی اصول ⑤
- 441 5.1 روایت کتاب اللہ یا سنت کے خلاف نہ ہو
- 441 5.2 روایت اسلامی کلیات کے خلاف نہ ہو
- 444 5.3 روایت میں رکاکت نہ ہو
- 446 5.4 روایت میں پیشگوئی ماہ و سال کے تعیین کے ساتھ نہ ہو
- 447 5.5 روایت مقتضیات عقل کے خلاف نہ ہو
- 5.6 روایت میں چھوٹے کام پر بڑے ثواب
- 449 اور چھوٹی بات پر سخت وعید کی گئی ہو۔

- ⑥ اصول درایہ کے متعلق محدثین کے اقوال
- 450 6.1 ابواسحاق الشیرازی کا تجزیہ
- 450 6.2 امام ابن الجوزی کا تبصرہ
- 451 6.3 خطیب بغدادی، حافظ ابن عبدالبر اور ملا علی قاری کے اقوال
- 452 ⑦ اصول درایہ کا اطلاق
- 456 خود آزمائی
- 460

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ!

اس وقت آپ جس یونٹ کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کا تعلق ایک بہت ہی اہم اور بنیادی موضوع سے ہے۔ اس موضوع کو اصطلاح میں ’’اصول درایہ‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ علماء حدیث نے حدیث سے متعلق روایات کو محض سند کے لحاظ سے پرکھ کر ان کی حیثیت متعین کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے لوگ اب اسناد کے بجائے متون حدیث کی صحت اور حیثیت کے بارے میں سوال اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ متون حدیث پر تحقیق اور بحث و تمحیص کی کھلی گنجائش موجود ہے۔ جہاں تک متون پر بحث و تمحیص اور گفتگو کا تعلق ہے تو اس میں کوئی حرج والی بات نہیں۔ لیکن ان متون کے بارے میں یہ سمجھنا کہ ان پر اسلاف نے تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیا ہے اور یہ متون بغیر کسی تحقیق کے نقل ہوتے چلے آئے ہیں تو یہ لاعلمی اور کم فہمی کی بات ہے۔ علماء حدیث نے جس طرح اسناد پر بحث کی ہے اور ان کے جانچ پڑتال میں عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اسی طرح متون پر بھی انتہائی محنت اور کدو کاوش کے ساتھ کلام کیا ہے۔ اس یونٹ میں اس موضوع پر بنیادی نکات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابتداء میں علماء حدیث کی جدوجہد اور کوشش و کاوش پر بات کی گئی ہے بعد میں ان بنیادی اصولوں کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کی بنیاد پر علماء نے متون حدیث کو جانچا اور پرکھا ہے۔ آپ اس یونٹ کا پوری توجہ، انہماک اور خلوص کے ساتھ مطالعہ کریں گے تو ان شاء اللہ اسے اس موضوع پر مفید پائیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

- اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:
- ⇨ اصول درایت کی اہمیت اور افادیت پر گفتگو کر سکیں۔
 - ⇨ علماء حدیث نے متون حدیث کے اخذ و ضبط اور جانچ پڑتال کے لئے جو کد و کاوش کی ہے اس پر بحث کر سکیں۔
 - ⇨ صحابہ کرام اور اصول درایت کے موضوع پر بات کر سکیں۔
 - ⇨ درایت کے ان اصولوں کا تفصیلی جائزہ پیش کر سکیں۔ جن کی بنیاد پر علماء حدیث نے روایت کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔
 - ⇨ اصول درایت کے متعلق محدثین کے اقوال پر گفتگو کر سکیں۔
 - ⇨ اصول درایت کے اطلاق کے حوالہ سے روایات پر بحث کر سکیں۔

① اصول درایت

حدیث دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے اس کا پہلا حصہ اصطلاح میں ”سند“ کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ ”متن“ کہلاتا ہے..... ”سند“ ان روایات پر مشتمل ہوتی ہے جنہوں نے ترتیب کے ساتھ ”متن“ اپنے شیوخ سے اخذ کر کے اسے ضبط کر لیا..... اور ”متن“ ان الفاظ و کلمات کا مجموعہ ہوتا ہے جس کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے قول یا فعل سے ہوتا ہے.....

علماء حدیث جب کسی حدیث پر بحث کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس کی سند کو دیکھتے ہیں سند میں جتنے روایات ہوتے ہیں ہر ایک راوی کو جانچتے ہیں پرکھتے ہیں۔ اس کی حیثیت کو دیکھتے ہیں اور شروط صحت کے لحاظ سے اس کی حیثیت متعین کرتے ہیں۔ حدیث کی سند کو پرکھنے کے لئے علماء حدیث کے سامنے بہت سارے پہلو ہوتے ہیں..... اس لحاظ سے جانچ پڑتال اور چھان پھٹک کے لئے جو اصول و قواعد اور قوانین متداول ہیں انہیں اصطلاح میں اصول روایت کہا جاتا ہے..... سند کی چھان بین کے بعد دوسرا مرحلہ ”متن“ کی تحقیق اور تجزیہ کا ہوتا ہے..... محدثین نے جہاں اسناد کی تحقیق میں انتہائی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے وہاں متون کے تجزیہ اور مطالعہ میں بھی اپنی بھرپور صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے پاس لاکھوں کی تعداد میں جو اسانید اور متون مصادر حدیث میں موجود ہیں۔ ان میں ”روح“ اور ”اصل“ کے لحاظ سے کوئی تضاد اور تناقص نہیں۔ شکل و شبہات میں اختلاف ہے لیکن مہک اور خوشبو میں کوئی فرق نہیں..... علماء حدیث نے ”متن“ کو پرکھنے کیلئے جن قوانین اور اصول کو پیش نظر رکھا انہیں اصطلاح میں ”اصول درایت“ کا نام دیا.....

جس طرح ”اصول روایت“ کے بہت سارے اعتبارات اور گوشے ہیں اسی طرح ”اصول درایت“

کے بھی بہت سارے پہلو ہیں۔

آج کل وہ حضرات جو حدیث کے بارے میں خود شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں وہ احادیث کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیلا رہے ہیں کہ ان روایات کو اسناد کے لحاظ سے تو پرکھا گیا ہے لیکن ان کے متون قابلِ اعتماد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس گروہ کا زیادہ زور متون میں مین میکھ نکالنے پر ہے..... حقیقت یہ ہے کہ علماء حدیث نے اسناد اور متون دونوں پر کام کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ معترضین کو علماء حدیث کی علمی کدو کاوش اور تحقیق تک رسائی نہیں۔ اپنی کم علمی اور لاعلمی کی وجہ سے کبھی یہ لوگ صحابہ کرام اور رواۃ حدیث کی عدالت و ثقاہت پر بے بنیاد گفتگو کرتے ہیں اور کبھی مصادر حدیث کی تدوین و ترتیب کو زیر بحث لاتے ہیں۔ جب ہاتھ کچھ نہیں آتا تو متون کی طرف آ جاتے ہیں۔ یہ کوئی آج کا قضیہ نہیں بلکہ پہلی صدی سے لے کر آج تک کے ہر دور میں ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو موضوع اور کمزور روایات کا سہارا لے کر پورے ذخیرہ حدیث کو ناقابلِ اعتماد اور بے بنیاد قرار دینے کی ناکام کوشش میں مصروف رہے ہیں..... تیسری صدی ہجری کے معروف و مشہور محدث، محقق اور نقاد امام ابو محمد ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ”تاویل مختلف الحدیث“ میں اس دور کی مختلف جماعتوں، گروہوں، فرقوں اور فکری حلقوں کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے اور ایک دوسرے کے بارے میں ان کی آراء افکار کا بھی تذکرہ کیا ہے..... اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں۔

(اما اصحاب الحدیث فانهم التمسوا الحق من وجهته، وتتبعوه من مظانه، وتقربوا من الله تعالى، باتباعهم سنن رسول الله ﷺ، وطلبهم لاثارہ و اخبارہ، برا وبحرا، و شرقاً و غرباً۔ یرحل الواحد منهم راجلاً مقویاً فی طلب الخبر الواحد، او السنة الواحدة، حتی یأخذها من الناقل لها مشافهة، ثم لم یزالوا فی التفسیر عن الاخبار والبحث لها، حتی فهموا صحیحها وسقیمها، وناسخها ومنسوخها، وعرفوا من خالفها من الفقهاء الی الراى) (تاویل مختلف الحدیث: ص. ۷۴، ۷۵)

”جہاں تک علماء حدیث کا تعلق ہے تو ان حضرات نے حق کی پوری پوری جستجو کی اور ہر پہلو سے اس کی پیروی کی۔ ان لوگوں نے اللہ جل شانہ کی خوشنودی کے حصول کو اپنا مقصد بنائے رکھا اور رسول اللہ ﷺ کے طریقوں پر عمل پیرا رہے۔ آپ ﷺ کے آثار و اخبار (احادیث) کی تلاش میں نہ دشت و صحرا ان کے لئے رکاوٹ بنے اور نہ دریا ان کا راستہ روک سکے۔ مشرق اور مغرب دونوں سمت انہوں نے سفر کئے۔ ان میں ایسے کئی لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے ایک حدیث کے حصول کے لئے لقمہ و دق ریگستان طے کئے تاکہ اس راوی سے براہ راست وہ حدیث سنیں جو اس کا سامع یا یعنی شاہد ہے۔ ان حضرات نے محض اس پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ ان روایات کو مسلسل پرکھتے رہے یہاں تک کہ صحیح و ضعیف اور ناخ و منسوخ کو الگ الگ کر دیا اور جن فقہاء نے رائے کی بنیاد پر استدلال کیا تھا انہیں اس کی حیثیت کے بارے میں آگاہ کیا۔ آپ لکھتے ہیں:

(فتنہہوا عن ذلک حتی نجم الحق بعد ان کان عافياً، و بسق ان کان دارساً واجتمع بعد ان کان متفرقاً وانقاد للسنن من کان عنها معرضاً، وتنبهہ علیہا من کان عنها غافلاً، وحکم بقول رسول اللہ ﷺ بعد ان کان یحکم بقول فلان و فلان وإن کان فیہ خلاف علی رسول اللہ ﷺ) (تاویل مختلف الحدیث: ص ۷۵)

”محدثین کی کوششوں سے وہ حق جو نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا نمایاں ہو گیا۔ وہ حقیقت جو خاک و خس کے ذرات میں چھپ گئی تھی ظاہر ہو گئی۔ وہ معاشرہ جو بٹوارے کا شکار ہو گیا تھا پھر ایک پلیٹ فارم پر آ گیا۔ جن لوگوں نے سنت رسول ﷺ سے اعراض برتنا شروع کیا تھا وہ اس کی پیروی کرنے لگے۔ اور جنہوں نے سنت کو اہمیت دینا چھوڑ دیا تھا وہ اس کی اہمیت کا اعتراف کرنے لگے اور جو حضرات بعد کے شیوخ و اساتذہ کے اجتہادات پر فتویٰ دیتے تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اقوال کے مطابق فتویٰ دینا شروع کر دیا۔“

جس طرح موجودہ دور میں ذخیرہ حدیث پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ضعیف اور کمزور روایات

پائی جاتی ہیں..... اور ان روایات کی موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ علماء حدیث نے جمع روایات میں تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیا۔ بلکہ رطب و یابس جمع کر دیا ہے اسی طرح اس دور میں بھی بعض لوگوں کو یہ اعتراض تھا اور وہ کھلم کھلا اس کا اظہار کرتے تھے۔ امام ابن قتیبہ اس ضمن میں رقمطراز ہیں۔

(ولم يحملوا الضعيف والغريب، لأنهم رأوهما حقاً، بل جمعوا الغث والسمين، والصحيح والسقيم، ليميزوا بينهما، وبدلوا عليهما وقد فعلوا ذلك في الحديث المرفوع، شرب الماء على الريق يعقد الشحم، هو موضوع، وضعه عاصم الكوزي.

قالوا: وحديث الحسن أن رسول الله ﷺ، لم يجز طلاق المريض موضوع، وضعه سهل السراج. قالوا: وسهل كان يروى أنه رأى الحسن يصلي بين سطور القبور، وهذا باطل، لأن الحسن روى أن النبي ﷺ نهى عن الصلاة بين القبور) (تاویل مختلف الحدیث: ص ۷۵)

”علماء حدیث نے اپنے مجموعوں میں ضعیف اور غریب احادیث کو اس وجہ سے نہیں لیا کہ وہ ان روایات کو درست اور صحیح سمجھتے تھے بلکہ اس لئے رطب و یابس اور صحیح و ضعیف روایات کو جمع کیا تا کہ چھان بین کے بعد امت مسلمہ کے افراد کو ان روایات کی اصل حیثیت بتا سکیں..... جو صحیح ہیں ان کی صحت کے بارے میں بتا سکیں اور جو ضعیف ہیں ان کے سقم کی نشاندہی کر سکیں۔ ان حضرات نے اپنے اس ہدف کے مطابق کام کیا..... دیکھئے کتنی ایسی احادیث ہیں جو بظاہر مرفوع ہیں اور علماء حدیث نے تحقیق کے بعد انہیں موضوع قرار دیا ہے۔ مثلاً

(i) شرب الماء على الريق..... کی حدیث کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اس کو عاصم الکوزی نے وضع کیا ہے۔

(ii) حسن کی یہ روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے مریض کو طلاق دینے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اسے موضوع قرار دیا اور بتایا کہ سهل السراج نے اسے وضع کیا ہے۔

(iii) سہل السراج روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حسن کو قبور کے درمیان نماز پڑھتے دیکھا.....
 محدثین نے اس روایت کو اس بنیاد پر موضوع قرار دیا کہ حسن خود اس روایت کے راوی ہیں
 جس میں رسول اللہ ﷺ نے قبروں کے درمیان کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔
 (تاویل مختلف الحدیث: ص- ۷۵)

محدثین نے اس قسم کے ہزاروں متون کو تحقیق و تنقید کے بعد رد کر دیا ہے..... اور اس ضمن
 میں رواۃ اور رواۃ کے سلسلوں کی کوئی پرواہ نہیں کی ہے..... متون کی تنقید کو اصطلاح میں
 ”درایت“ کہا جاتا ہے..... اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اس پہلو سے علماء حدیث نے جو بنیادی
 اصول، قواعد اور قوانین و ضوابط مقرر کئے ہیں وہ کون کون سے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ
 اس موضوع پر بنیادی معلومات ہم آپ تک پہنچا سکیں۔

② درایت کا مفہوم

لغت میں درایت کے معنی ”معرفت“ کے ہیں۔ حدیث کی صحیح معرفت اسی صورت میں ممکن ہے جب راوی اور مروی دونوں سے متعلق پوری معلومات حاصل ہوں۔ یعنی راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا، اس کا حافظ قوی تھا یا کمزور، فقیہ تھا یا غیر فقیہ، عالم تھا یا غیر عالم، ذرائع معاش اور مشاغل کیا تھے۔ روایت کرنے میں محتاط تھا یا غیر سنجیدہ؟۔ اسی طرح مروی (متن) کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کے الفاظ و کلمات میں کسی قسم کی خامی و کمزوری یا مقررہ قواعد کی خلاف ورزی تو نہیں پائی جاتی ہے۔ معانی و مفہوم میں عقل، مشاہدہ، تجربہ، زمانہ کے طبعی تقاضے، تاریخی حقائق، کسی مسلمہ اصول اور قرآنی تصریحات کی خلاف ورزی تو نہیں لازم آتی جن سے کسی طرح بھی شان نبوت پر حرف آئے۔ یا ارشادات نبویؐ میں سطحیت ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔

تعریف :-

درایت کی اصطلاحی تعریف دو طرح منقول ہے: (i) عام (ii) خاص

”عام“ وہ ہے جس کا تعلق راوی اور مروی دونوں کی معرفت سے ہے۔

”خاص“ وہ ہے جس کا تعلق صرف ”متن“ کی معرفت سے ہے۔

درایت کی عام تعریف:

علامہ طاہر بن صالح الجزائری نے علم درایت کی تعریف ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

(علم يعرف به انواع الرواية واحكامها و شروط الرواة وأصناف المرويات

واستخراج معانیہا)

”وہ علم جس کے ذریعے روایہ کی شروط، روایت کی اقسام اور احکام تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ نیز مرویات کے انواع و اقسام اور ان کے معانی و مفاہیم کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔ یہ وہی تعریف ہے جو علامہ جلال الدین سیوطی نے تدریب الراوی میں علامہ ابن الآلانی سے نقل کی ہے۔ اس ضمن میں زین الدین بن علی لکھتے ہیں:

(درایۃ الحدیث: علم یبحث فیہ عن متن الحدیث وطرقہ من صحیحہا وسقیمہا و علمہا وما یحتاج الیہ)

”درایۃ حدیث وہ علم ہے جس میں حدیث کے متن اور اس کی سند سے بحث ہوتی ہے اور حدیث کی صحت و سقم کا پتہ چلتا ہے نیز جن چیزوں کی معرفت ضروری ہے ان کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔

درایۃ کی خاص تعریف

طاش کبریٰ زادہ نے ”درایۃ الحدیث“ کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے۔

(هو علم باحث عن المعنى المفهوم من الفاظ الحديث، وعن المراد منها مبنياً على قواعد العربية و ضوابط الشريعة و مطابقاً لأحوال النبی ﷺ)

”درایۃ حدیث وہ علم ہے جس میں الفاظ حدیث سے سمجھے گئے مفہوم و مراد سے بحث ہوتی ہے۔ جبکہ وہ عربی قواعد و شرعی ضوابط پر مبنی اور رسول اللہ ﷺ کے احوال کے مطابق ہوں۔

حاجی خلیفہ اور نواب صدیق حسن خان سے بھی یہی تعریف منقول ہے۔ اس کی تائید درایۃ کے موضوع سے بھی ہوتی ہے۔

و موضوعها : احادیث الرسول ﷺ من حيث دلالتها على المفهوم والمراد و درایۃ الحدیث کا موضوع احادیث رسول کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق مفہوم و مراد سے ہوتا ہے۔

اصول درایت کی بنیاد قرآن حکیم میں موجود ہے۔ حضرت عائشہؓ پر بعض منافقوں نے تہمت لگائی اور اس کا چرچا اس حد تک ہوا کہ بعض مسلمانوں کے دلوں میں بھی شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تو اللہ جل شانہ نے فرمایا:

﴿لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ﴾
جب تم نے اس خبر کو سنا تو کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہمارے لئے ایسی بات ہرگز مناسب نہیں۔ یہ تو بہت بڑے بہتان کی بات ہے۔ یہاں یہ اشارہ ہے کہ اس بے بنیاد خبر کو سننے کے بعد تمہیں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ یہ انتہائی نامعقول بات ہونے کے باعث درایت بالکل ساقط الاعتبار خبر تھی۔

صحابہ کرامؓ اور اصول درایت

صحابہ کرامؓ کے دور میں درایت کی ابتداء ہو چکی تھی۔ صحابہ کرامؓ کے اندر ایسا گروہ موجود تھا جو ہر قسم کی روایت کو قابل قبول نہیں سمجھتا تھا یہ حضرات روایت کو سننے کے بعد اسے درایت کے ترازو میں تولتے۔ اگر روایت صحیح ہوتی تو اسے قبول کرتے ورنہ رد کر دیتے اس جماعت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد تھا:

((إِذَا سَمِعْتُمُ الْحَدِيثَ تَعْرِفُهُ قُلُوبُكُمْ وَتَلِينَ لَهُ أَشْعَارُكُمْ وَأَبْشَارُكُمْ، وَتَرَوْنَهُ أَنَّهُ مِنْكُمْ قَرِيبٌ، فَأَنَا أَوْلَاكُمْ بِهِ، وَإِذَا سَمِعْتُمُ الْحَدِيثَ عَنِي تَنْكَرُهُ قُلُوبُكُمْ وَتَنْفَرُ مِنْهُ أَشْعَارُكُمْ وَأَبْشَارُكُمْ وَتَرَوْنَ أَنَّهُ مِنْكُمْ بَعِيدٌ فَأَنَا أْبَعَدُكُمْ مِنْهُ)) (مسند امام احمد . عن أبي اسيد الساعدي)

”جب تم کوئی ایسی حدیث سنو جس سے تمہارے دل کو انیسیت ہو اور تمہارے بال و کھال اس سے متاثر ہوں اور اپنے سے اس کو قریب سمجھو تو میں اس کا تم سے زیادہ حقدار ہوں۔ اور جب تم کوئی ایسی روایت سنو جس کو تمہارے دل قبول نہ کریں اور تمہارے جسم و جان اس سے متوحش ہوں اور اپنے سے اس کو دور سمجھو تو میں تمہارے مقابلہ میں اس سے زیادہ دور ہوں۔“

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((ماحدثتم عنی ماتنکرونہ فلا تأخذوا بہ ، فانی لا أقول المنکر و لست من اہلہ))
 ”جب تمہارے سامنے ایسی حدیث بیان کی جائے جس سے تمہارا دل مطمئن نہ ہو تو اس کو قبول نہ کرو
 کیونکہ نامناسب بات کرنا میرے منصب کے خلاف ہے۔“

امام بخاری نے اپنی صحیح میں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول نقل
 کیا ہے آپؐ فرماتے تھے:

(حدثوا الناس بما يعرفون ، ودعوا ما یبکرون ، أتحبون أن یکذب اللہ و رسولہ)
 ”لوگوں کے سامنے معروف اور معقول روایات بیان کرو۔ ایسی روایات ہرگز نہ بیان کرو جو غیر
 معقول ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ غیر معقول روایات سن کر لوگ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلائیں گے..... شیخ
 طاہر بن صالح الجزار نے اس ضمن میں لکھتے ہیں:

(قال شراح هذا الأثر: إنما قال الإمام ذلك، لأن الإنسان إذا سمع مالا يفهمه، أو ما
 لا يتصور إمكانه اعتقد استحالة، جهلاً، فلا یصدق بوجوده فإذا أسند إلى الله تعالى أو رسولہ
 لزم ذلك المحذور) (توجیہ النظر: ج. ۱، ص ۶۲، ۶۳)

امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ قول نقل کیا: آپؐ فرماتے تھے۔

(ما انت بمحدث قوماً حديثاً لا تبلغه عقولهم الا كان لبعضهم فتنة) (مقدمة الصحيح:

النهی عن الحدیث بكل ماسمع)

”آپ جب بھی لوگوں کے سامنے ایسی بات کریں گے جو ان کے ذہنی سطح اور عقل کے مطابق نہیں
 ہوگی تو اس سے ان کے اندر انتشار ہی پیدا ہوگا..... امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قول نقل
 کیا ہے آپؐ نے فرمایا:

حفظت عن رسول الله ﷺ وعاءين، فاما احدهما فبثته، واما الآخر فلو بثته قطع

هذا البلعوم (الصحيح للامام البخارى : كتاب العلم: باب حفظ العلم)

میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو گٹھریوں کے برابر روایات حاصل کیں سو ایک گٹھری کو تو میں نے کھول دیا لیکن دوسری کا منہ بند رکھا۔ اگر میں دوسری گٹھری کی روایات بھی بیان کرتا تو لوگ میرا ناطقہ بند کر لیتے..... مقصد یہ ہے کہ جو روایات لوگوں کے لئے قابل فہم اور معروف و معقول تھیں وہ میں روایت کرتا رہا اور جن کے بارے میں مجھے خدشہ تھا کہ لوگ ان کے معنی و مفہوم کے سمجھنے میں دقت محسوس کریں گے تو ان کو بیان کرنے سے میں نے اجتناب برتا۔

جب تک رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کے درمیان موجود رہے تب تک انہیں روایات خود جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اشکال کی صورت میں آپ ﷺ کی طرف مراجعت ہو سکتی تھی لیکن جب آپ ﷺ نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا تو اب ضروری تھا کہ آپ ﷺ کی طرف منسوب روایات کو آنکھیں بند کر کے نہ لیا جائے بلکہ راوی اور روایت کو دیکھ کر فیصلہ کیا جائے..... ایک حدیث میں ہے کہ میت کو اس کے پسماندگان کے نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ (ان الميت ليعذب ببكاء أهله)
حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث سنی تو اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا۔

(غفر الله لأبى عبد الرحمن أنه وهل ، ان الله تعالى يقول: لا تزر وازرة وزر اخرى،
انما قال رسول الله ﷺ ، ان هذا ليعذب الآن و أهله ييكون عليه)

”اللہ تعالیٰ ابو عبد الرحمن (عبداللہ بن عمر) کے حال پر رحم فرمائے آپؐ بات سمجھ نہیں..... یہ تو اللہ جل شانہ کے ارشاد ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى﴾ کے خلاف ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ ایک قبر کے قریب سے گزرے تو فرمایا: یہ قبر والا تکلیف میں مبتلا ہے اور اس کے گھروالے اب تک اس کے لئے رورہے ہیں“

ایک موقع پر عبداللہ بن عمرؓ نے یہ حدیث بیان کی۔

(الشہر تسع وعشرون) یعنی مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث سنی تو

فرمایا:

(غفر الله لأبى عبد الرحمن أنه وهل ، انما هجر رسول الله ﷺ نسائه شهرافنزل لتسع وعشرين ، فقالوا : يا رسول الله! انك نزلت لتسع وعشرين . فقال: إن الشهر يكون تسعا وعشرين)

”اللہ تعالیٰ ابو عبد الرحمن (عبداللہ بن عمر) کے حال پر رحم فرمائے وہ سمجھے نہیں بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مہینہ کے لئے ازواج مطہرات سے الگ رہے۔ جب انتیس دن پورے ہوئے تو آپ ﷺ بالا خانہ سے نیچے تشریف لائے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے تو ازواج مطہرات سے ایک مہینہ تک الگ رہنے کا فرمایا تھا اور مہینہ تو ابھی پورا نہیں ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے“..... ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جب یہ حدیث بیان کی۔ (الوضوء مما مست النار ولو من ثور أقط) ”جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے“ اگرچہ پیڑ کا ایک ٹکڑا ہی ہو..... تو ابن عباسؓ نے فرمایا: (انتوضاً من الدهن، انتوضاً من الحمیم) ”کیا ہم چکنا بٹ اور گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو کریں گے“

محمود بن الربیعؒ نے روایت بیان کی:

(إن الله قد حرم على النار من قال لا اله الا الله يبتغى بذلك وجه الله) ”جس شخص نے اللہ جل شانہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے لا اله الا اللہ کہا اللہ تعالیٰ نے اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دی“۔ تو ابو ایوب انصاریؓ نے فرمایا۔ (والله ما أظن رسول الله ﷺ قال ما قلت) ”میں نہیں سمجھتا کہ رسول اللہ نے ایسی بات کہی ہوگی جو تم کہہ رہے ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے قلیب بدر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

((هل وجدتم ما وعدكم ربكم حقاً..... ثم قال: انهم يسمعون الآن ما اقول))
 ”اے قلیب والو! کیا تم نے اپنے پروردگار کے وعدہ کو درست پایا؟ پھر فرمایا: اب یہ لوگ میری بات سن رہے ہیں“ جب حضرت عائشہؓ کے سامنے یہ روایت بیان کی گئی تو آپؓ نے فرمایا۔ (وہل ابن عمر، انما قال رسول الله ﷺ: انهم الآن ليعلمون ان الذی كنت اقول لهم لھو الحق) ابن عمرؓ صحیح نہیں سمجھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: قلیب والے اب جانتے ہیں کہ جو بات میں ان کے سامنے پیش کر رہا تھا وہ ٹھیک تھی..... اس قسم کی بہت ساری روایات ذخیرہ حدیث میں موجود ہیں جنہیں اگر یکجا کیا جائے تو ایک معقول ضخامت کی کتاب بن سکتی ہے۔

خود آزمائی ①

- ۱- متن حدیث کے تجزیہ کو اصطلاح میں کیا کہتے ہیں۔
- ۲- امام ابن قتیہ نے علماء حدیث کے بارے میں کیا تبصرہ کیا ہے۔
- ۳- درایہ کی عام تعریف سے کیا مراد ہے۔
- ۴- درایہ کی خاص تعریف علماء حدیث کی اصطلاح کو پیش نظر رکھ کیجئے۔
- ۵- صحابہ کرام نے اصول درایہ کا استعمال کس طرح کیا۔
- ۶- حافظ ذہبی نے حضرت علیؓ کا کونسا قول نقل کیا ہے۔
- ۷- امام مسلم نے عبد اللہ بن مسعود کے حوالہ سے کون سی روایت نقل کی ہے۔
- ۸- حضرت عائشہؓ نے ابن عمرؓ کی روایت سن کر کیا تبصرہ کیا۔
- ۹- محمود بن الربیع کی روایت پر حضرت ابوالیوب انصاریؓ نے ارشاد فرمایا۔

⑤ درایت کے بنیادی اصول

ذیل میں ہم درایت کے چند بنیادی اصولوں پر بحث کریں گے اور دیکھیں گے کہ محدثین حضرات روایت کے متن کو کن کن پہلوؤں سے دیکھ کر اس کے متعلق فیصلہ کرتے ہیں۔

5.1 روایت کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کے خلاف نہ ہو

جو روایت کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہو اسے اصولاً قبول نہیں کیا جاتا..... حضرات صحابہؓ کا اس اصول پر عمل رہا۔ مثلاً حضرت عمرؓ کے سامنے ایک خاتون نے کوئی حدیث بیان کی آپؐ نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم ایک عورت کے کہنے پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ (الصحيح للإمام مسلم. كتاب الطلاق في باب المطلقة البائن لا نفقة لها) اس حدیث میں جس خاتون کا تذکرہ ہے وہ فاطمہ بنت قیس ہے۔ روایت کا تعلق طلاق شدہ خاتون کے اخراجات اور رہائش سے ہے۔ اسی طرح حدیث معراج میں آتا ہے حضور اکرم ﷺ رویت باری تعالیٰ سے مشرف ہوئے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث سنی تو اسکی صحت سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ قرآن کی آیت ﴿لَا تَدْرِكُهُ الْبَصَارُ﴾ کے خلاف ہے۔ (الصحيح للإمام البخاري - كتاب التفسير)

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے سامنے فال کے متعلق روایت بیان کی گئی تو آپؐ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ یہ ارشاد کس طرح فرما سکتے تھے جبکہ قرآن صراحتہً کہتا ہے۔ ﴿إِنَّ الْأُمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ﴾

5.2 روایت اسلامی کلیات کے خلاف نہ ہو

جو روایت اسلامی کلیات اور اسلامی تعلیم کی روح کے خلاف ہو محدثین کے نزدیک قابل قبول نہیں۔

حافظ ذہبی حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں جو آپؐ لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کرتے تھے۔

(حدثوا الناس بما يعرفون، ودعوا ما ينكرون)

”انہی روایات کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کرو جنہیں جانتے پہچانتے ہو اور جنہیں نہیں پہچانتے انہیں چھوڑ دو“

حضرت علیؓ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ موضوع روایات کی نقل و تحدیث کا جو سلسلہ جاری ہو گیا تھا ان جعلی روایات کو صحیح روایات سے جدا کرنے کیلئے آپؐ نے مسلمانوں کو یہ کسوٹی اختیار کرنے کا مشورہ دیا جس کا حاصل بظاہر یہی ہے کہ اسلامی کلیات اور اسلامی تعلیم کی روح سے جو روایات مطابقت رکھتی ہوں صرف انہیں کو قبول کرنا چاہیے اور قرآن جس عقل و دانش کو آدمی کے اندر پیدا کرتا ہے جو چیزیں اس کے مخالف ہوں ان کو ترک کر دینا چاہیے۔

روایات کے رد و قبول کا یہ وہی معیار ہے جس پر آخر وقت تک محدثین عمل کرتے رہے..... علامہ ابن الجوزی محدثین کا یہ اصول نقل کرتے ہیں۔ (کل حدیث رأیتہ، یخالف المعقول أو یناقض الأصول فاعلم أنه موضوع) ”جس روایت کو آپؐ معقول اور اصول (کلیات) کے خلاف پائیں تو سمجھ لیجئے کہ موضوع اور من گھڑت ہے..... اس کے بعد لکھتے ہیں۔“

(أو یكون مما يدفعه الحس والمشاهدة، أو مبائنًا لبعض الكتاب والسنة المتواترة أو الاجماع القطعی حیث لا یقبل من ذلك التأویل)

”یا روایت ایسی ہو کہ حواس و مشاہدہ اسے مسترد کر دے یا کتاب اللہ اور سنت متواترہ یا اجماع قطعی کے مخالف ہو اور کسی تاویل کی گنجائش اس میں باقی نہ رہے تو ایسی حدیث اصول کے لحاظ سے ساقط الاعتبار کہلائے گی۔“

مقدمہ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ آپؐ نے موضوع

روایات کے فتنہ کا تذکرہ کر کے فرمایا (لم نأخذ من الناس الا ما نعرف) ”ہم انہی حدیثوں کو قبول کریں گے جنہیں ہم جانتے پہچانتے ہیں۔“

علامہ شبیر احمد عثمانی اس کے تحت لکھتے ہیں:

(ای ما یوافق المعروف أو تعرف فيه امارات الصحة وسمات الصدق) یعنی مانوس اور معروف و مشہور روایات یا وہ جن میں صحت کی علامات اور صداقت کے دلائل پائے جاتے ہوں..... اور یہ دراصل درایت کے اسی اصول کی تفصیل ہے جو حضرت علیؓ نے پیش فرمایا تھا۔

بشیر عدوی نے جب ابن عباسؓ سے پوچھا:

(مالی لا اراک تسمع لحديثی، احدثک عن رسول الله ﷺ ولا تسمع؟ فقال ابن عباس: انا کنا مرة اذا سمعنا رجلاً يقول: قال رسول الله ﷺ ابتدرته ابصارنا، واصغينا اليه بأذاننا، فلما ركب الناس الصعب والذلول، لم نأخذ من الناس الا ما نعرف) (مقدمة الصحيح للإمام مسلم)

”آپ میری طرف متوجہ کیوں نہیں ہو رہے۔ میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات بیان کر رہا ہوں اور آپ دلچسپی لے نہیں رہے؟ تو ابن عباسؓ نے جواب دیا ہاں ایک وقت تھا جب ہمارے سامنے کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا تذکرہ کرتا تو ہماری نگاہیں اس پر جم جاتیں اور کان اس کی طرف لگ جاتے۔ لیکن جب لوگوں نے نشیب و فراز کو ایک کر دیا تو اب ہم صرف انہی روایات کو قبول کرتے ہیں جنہیں ہم جانتے پہچانتے ہیں۔“

بشیر عدوی ثقہ اور عادل رواۃ میں سے ہیں..... امام نسائی اور ابن سعد نے آپ کی توثیق کی ہے..... حضرت ابوذر غفاری اور ابو الدرداءؓ سے آپ نے کئی روایات اخذ کی ہیں جو مآخذ میں منقول ہیں۔

5.3 روایت میں رکاکت نہ ہو

روایت کیلئے ضروری ہے کہ اس میں رکاکت نہ پائی جائے..... اگر روایت میں کسی بھی پہلو سے رکاکت موجود ہو تو اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا بالکل جائز نہیں۔ اس ضمن میں شیخ زین الدین عراقی کہتے ہیں:

(وربما يعرف بالركاكة)

بسا اوقات حدیث کا من گھڑت ہونا اس کی رکاکت سے پہچانا جاتا ہے۔

اور ملا علی قاری کہتے ہیں:

(ومنها ركاكة الفاظ الحديث و سماجتها بحيث يسمجها السمع و يدفعها الطبع)
”حدیث کے من گھڑت ہونے کی پہچان اس کے الفاظ کی رکاکت اور نقص ہے جو سننے والے کو ناگوار ہو اور طبیعت اس کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہو۔

روایت میں رکاکت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک لفظی اور دوسری معنوی..... لفظی رکاکت سے مراد یہ ہے کہ روایت کے الفاظ و کلمات غیر معیاری ہوں۔ جملوں میں ترتیب و ترکیب کی کمی ہو اور زبان دان اسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس کریں کہ یہ کسی غیر معیاری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ و کلمات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ چونکہ فصیح و بلیغ العرب ہیں اور آپ ﷺ کے ارشادات و فرمودات فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ ﷺ کے ارشادات کے الفاظ اور جملے قواعد عربیہ کے خلاف اور فصاحت و بلاغت کے معیار سے گرے ہوئے ہوں۔ رکاکت معنوی کا مطلب یہ ہے کہ روایت کا مفہوم اور مضمون شان نبوت کے مطابق نہ ہو اور کلام معیار نبوت سے گرا ہوا ہو۔ حافظ ابن قیم کہتے ہیں: (ویسمج معناها للفظن) یعنی اہل دانش اس کے معنی و مفہوم کو ناگوار سمجھیں۔ مثلاً

(من فارق الدنيا وهو سكران، دخل القبر سكران و بعث من قبره سكران و امر به الى

النار سکران إلى جبل يقال له سکران)

”جس شخص کی موت نشہ کی حالت میں ہوئی وہ قبر میں نشہ کی حالت میں داخل ہوگا اسی حالت میں قیامت کے دن اٹھایا جائے گا اسی حالت میں آگ کی طرف جانے کا حکم ہوگا جس پہاڑ کی طرف اسے لے جایا جائے گا اس کا نام سکران ہے۔۔۔۔۔ یا مثلاً یہ روایت

(ان لله ملكا اسمه عمارة على فرس من حجارة الياقوت، طولہ مد بصرہ، يدور فی البلدان، ويقف فی الاسواق، فينادی ألا لیغل كذا و كذا، ألا لیرحض كذا او كذا)
”اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جس کا نام عمارہ ہے وہ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے تا حد نظر اس کی لمبائی ہے وہ بستیوں میں گھومتا اور بازاروں میں آواز سنا لگاتا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں اتنی بڑھاؤ، اشیاء کی قیمتیں اتنی گھٹاؤ۔“

رکات لفظی اور معنوی کی وجہ سے علماء حدیث نے روایات کی ایک معقول تعداد کو رد کر دیا ہے۔ جن حضرات کا تعلق تحدیث و روایت سے ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ مبارکہ کی کثرت استعمال کی وجہ سے ان کے اندر ایک خاص قسم کا ملکہ اور سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ موضوع روایت کو پہچان لیتے ہیں۔ حافظ ابن دقیق العید اس بارے میں لکھتے ہیں:

(حصلت لهم لكثرة محاولة الفاظ النبي ﷺ بيئة نفسانية وملكة قوية يعرفون بها ما يجوز أن يكون من ألفاظ النبوة وما لا يجوز)

”رسول اکرم ﷺ کے الفاظ مبارکہ کی کثرت استعمال اور ان کے بڑتنے میں مشغولیت کی شدت ان حضرات میں ایک خاص قسم کا سلیقہ پیدا کر دیتی ہے اور ایسی غیر معمولی حذاقت جس کی وجہ سے وہ اس کو پہچاننے لگتے ہیں کہ کون سے الفاظ کا انتساب رسول اللہ ﷺ کی طرف درست ہو سکتا ہے اور کن الفاظ کا انتساب درست نہ ہوگا۔“

امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

(أتى ابن عباس بكتاب فيه قضاء على فمحاء الا قدر وأشار سفيان بذراعه)

حضرت ابن عباسؓ کے سامنے ایک کتاب پیش ہوئی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ حضرت علیؓ کے فیصلوں پر مشتمل ہے۔ ابن عباسؓ نے اس کتاب کو لے کر مٹانا شروع کیا مگر اتنا باقی رکھا حضرت سفيان نے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا یعنی ایک ہاتھ کے برابر۔

علامہ بلقینی فنی ذوق کے بارے میں لکھتے ہیں:

(ان انسان لو خدم انسان سنين و عرف ما يحب وما يكره، فادعى انسان انه كان يكره،

شئاً يعلم ذلك انه يحبه، وبمجرد سماعه يبادر إلى تكذيبه)

”اگر ایک شخص کسی کی برسوں خدمت کر کے اس کی پسند و ناپسند سے واقفیت حاصل کرے اور پھر کوئی اس کی پسندیدہ شے کے بارے میں کہہ دے کہ وہ اس کو ناپسند کرتا ہے تو سننے کے ساتھ ہی یہ اس کو جھوٹ قرار دے دے گا اور مزید تحقیق کی ضرورت نہ سمجھے گا۔

5.4 روایت میں پیشگوئی ماہ و سال کے تعین کے ساتھ ہو

اگر روایت میں کوئی پیشگوئی ماہ و سال کے تعین کے ساتھ ہو تو ایسی روایت کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کرنا محدثین کے نزدیک درست نہیں۔ حافظ ابن قیم کہتے ہیں:

(أن يكون في الحديث تاريخ كذا وكذا) ”متن میں تاریخ کا تعین ہو۔“

ملا علی قاری کہتے ہیں:

(ومنها احاديث التواريخ المتسلسلة، مثلاً عند رأس مائة يبعث الله ريحا باردة يقبض

الله فيها روح كل مؤمن)

”ہر سو سال کے بعد اللہ جل شانہ ٹھنڈی ہوا بھیجے گا جس کے ذریعہ ہر مومن کی روح کو قبض کر لے گا۔“ یا مثلاً (اصحابی اہل ایمان و علم إلى أربعين، وأهل برو تقوى إلى الثمانين، وأهل تواصل و تراحم إلى العشرين و مائة واهل تقاطع و تدابر إلى الستين و مائة ثم الهرج الهرج) ”میرے اصحاب چالیس سال تک ایمان و عمل والے ہوں گے۔ اسی (۸۰) سال تک نیکی اور تقویٰ والے ہوں گے۔ ایک سو بیس سال تک باہمی صلہ رحمی اور محبت والے ہوں گے۔ ایک سو ساٹھ سال تک قطع تعلقات اور نفرت والے ہوں گے اس کے بعد بے چینی اور اضطراب ہوگا۔“

5.5 روایت مقتضیات عقل کے خلاف نہ ہو

جو روایت مقتضیات عقل کے خلاف ہو اس کا باطل ہونا معلوم ہے علماء حدیث ایسی روایت کو قبول نہیں کرتے۔ علامہ شمس الدین سخاوی اس بارے میں کہتے ہیں:

(لا تعتبر رواته ولا تنظر في جرحهم) ”ایسی روایت کے راوی قابل اعتبار نہیں ان کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے..... مطلب یہ کہ رواۃ کی شہرت اور ثقاہت کی وجہ سے اس قسم کی روایت کو اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ علامہ ابن الجوزی اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(ألا ترى أنه لو اجتمع خلق من الثقات فاخبروا أن الجمل قد دخل في سم الخياط لما نفعنا ثقتهم ولا اثر في خبرهم لأنهم أخبروا المستحيل)

”کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اگر ثقہ لوگوں کی جم غفیر خبر دے کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو گیا اس صورت میں نہ ان کی ثقاہت ہمیں نفع دے گی اور نہ ان کی خبر ہمیں متاثر کرے گی اس لئے کہ انہوں نے جس واقعہ کی خبر دی ہے وہ ناممکن اور محال ہے“ علمائے حدیث نے اس اصول کے پیش نظر ذخیرہ حدیث میں منقول کئی روایات کو صحیح ماننے سے انکار کیا۔ مثلاً:

(الورد الأبيض خلق من عرقى ليلة المعراج، والورد الأحمر خلق من عرق جبرئيل،

والورد الأصفر خلق من عرق البراق)

”سفید گلاب معراج کی رات میرے پسینہ سے پیدا کیا گیا۔ سرخ گلاب جبریل کے پسینہ سے اور زرد گلاب براق کے پسینہ سے پیدا کیا گیا..... اس روایت کو رسول اللہ ﷺ کی طرف کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے جو کہ عقل عام کے بالکل خلاف ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے۔

(من قص اظفاره مخالفا لم يرفى عينيه رمداً) ”جس نے اپنے ناخن مخالف سمت سے کاٹے وہ آشوب چشم سے محفوظ رہے گا۔

روایت اگر مقتضائے عقل کے خلاف ہو اور اس میں تاویل صحیح نہ ہو سکے تو محدثین کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ شیخ عبدالعزیز البخاری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

”إعلم ان الخبر إذا ورد مخالفا لمقتضى العقل فإن امكن تاويله من غير تعسف يقبل التأويل الصحيح وإن لم يمكن تاويله إلا بتعسف لم يقبل ، لأنه لو جاز التأويل مع التعسف لبطل التناقض من الكلام كله ، ويجب فيما لا يمكن تاويله القطع على ان النبى ﷺ لم يقله وإلا حكاية عن الغير أو مع زيادة أو نقصان ، وإن كان مخالف لنص الكتاب والسنة المتواترة ، أو للإجماع فكذلك ، لان هذه الأدلة قطعية ، والخبر ظنى ، ولا تعارض بين القطعى والظنى بوجه ، بل الظن يسقط بمقابلة القطعى“

”روایت اگر مقتضائے عقل کے خلاف ہو تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں بغیر کسی تکلف یا تردد کے تاویل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر تاویل صحیح ہو سکے تو اس خبر کو قبول کر لینا چاہئے ورنہ اسے رد کر دینا چاہیے۔ اس طرح جو خبر نص کتاب، سنت متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو اسے بھی رد کر دینا ضروری ہے اس لئے کہ یہ تمام دلیلیں قطعی ہیں اور خبر ظنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قطعی اور ظنی میں کوئی تعارض نہیں ہوتا بلکہ قطعی کے مقابلہ میں ظن ساقط ہو جاتا ہے۔

5.6 روایت میں چھوٹے کام پر بڑے بھاری

ثواب کی بشارت ہو یا چھوٹی بات پر سخت وعید کی گئی ہے

جس روایت میں کسی چھوٹے اور معمولی کام پر بڑے ثواب کی بشارت ہو یا چھوٹی سی بات پر سخت وعید ومبالغہ ہو ایسی روایت کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا درست نہیں مثلاً (من اغتسل يوم الجمعة بنية وحسبة كتب الله له بكل شعرة نورا يوم القيامة، ورفع الله بكل قطرة درجته في الجنة من در وياقوت وزبرجد بين كل درجتين مسيرة مائة عام)

”جس نے جمعہ کے دن اچھی نیت کے ساتھ غسل کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے بدن کے ہر بال کے بدلے قیامت کے دن اس کیلئے نور لکھے گا اور ہر قطرہ کے عوض جنت میں موتی، یاقوت اور زمرّد کے درجات بلند کرے گا جس کے ہر دو درجہ کے درمیان سو سال کی مسافت ہوگی“

یا جیسے: (من تواضع لغني لاجل غناه، ذهب ثلثا دينه) ”جس نے کسی مالدار کے مال و دولت کی وجہ سے اس کے سامنے تواضع کی اس کا دو تہائی دین چلا گیا۔“

⑥ اصول درایہ کے متعلق محدثین کے اقوال

6.1 ابواسحاق الشیرازی کا تجزیہ

شیخ ابواسحاق شیرازی اپنی مشہور کتاب ”اللمع“ میں لکھتے ہیں۔

وہ امور جن کی وجہ سے ثقہ راوی کی خبر کو بھی رد کر دیا جاتا ہے حسب ذیل ہیں:

- ۱- وہ روایت جو مقتضیات عقل کے خلاف ہو۔ ایسی روایت کا باطل ہونا ظاہر ہے اس لئے کہ شرع تو مجوزات عقل کے مطابق ہے نہ کہ اس کے خلاف۔
- ۲- روایت کتاب اللہ کی کسی نص، یا سنت متواترہ کے خلاف ہو تو سمجھا جائے گا کہ اس کی کوئی اصل نہیں یا وہ منسوخ ہے۔
- ۳- اجماع امت کے خلاف ہو تو سمجھا جائے گا کہ بے بنیاد اور منسوخ ہے اس لئے کہ پوری امت کا عمل صحیح روایت کے خلاف نہیں ہو سکتا۔
- ۴- ایک ہی شخص تنہا کوئی ایسی روایت بیان کرے جس کا علم لوگوں کی بڑی جماعت کو ہونا ضروری ہو۔
- ۵- راوی تنہا ایسی روایت بیان کرے جس کو عادیۃً تواتر کے ذریعہ مروی ہونا چاہیے اس لئے کہ اس قسم کی روایت میں وہ منفر و نہیں رہ سکتا۔ ہاں اگر روایت قیاس یا متداول عمل کے خلاف ہو تو اس صورت میں قابل لحاظ ہے۔

حضرت علقمہ جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حلقہ کے مشہور رکن ہیں، کہتے ہیں۔ (ان من الحدیث

حدیثاً لہ، ضوء كضوء النهار تعرفه، وان من الحدیث حدیثاً لہ ظلمة كظلمة اللیل تنكره)

”حضرت ربیع بن یثیم کا قول بھی اس سے ملتا جلتا ہے جس کے راوی خطیب بغدادی ہیں۔ (ان للحدیث

ضوء كضوء النهار يعرف، ثم ظلمه كظلمة الليل تنكر)

حدیثوں میں بعض حدیثیں ایسی ہیں کہ ان کی روشنی دن کی روشنی کی مانند پہچانی جاتی ہے اور بعض حدیثیں ایسی بھی ہیں جن کی تاریکی رات کی تاریکی جیسی ہے۔ جس سے تم مانوس نہ ہو گے۔

6.2 امام ابن الجوزی کا تجزیہ

علامہ ابن الجوزی کہتے ہیں:

(الحديث المنكر يقشعر منه جلد طالب علم وينفر منه قلبه في الغالب وعنى بذلك

الممارس لألفاظ الشارع الخبير بها وبرونقها وبهجتها)

”موضوع اور منکر روایت کے پڑھنے سے پڑھنے والے کے جسم اور دل پر ایک خاص قسم کا اثر ہو جاتا ہے جس سے وہ سمجھ جاتا ہے کہ روایت صحیح نہیں۔ لیکن یہ اثر اس شخص پر ہوتا ہے جسے الفاظ حدیث کے استعمال کی اچھی خاصی مشق بیانیہ کر چکا ہو ان الفاظ و کلمات کی رونق اور خوبصورتی سے واقف ہو گیا ہو۔

(قال ابو الحسن بن الحضار في تقريب المدارك على موطأ مالك، قد يعلم الفقيه

صحة الحديث إذا لم يكن في سنده كذاب، بموافقة آية من كتاب الله تعالى أو بعض أصول

الشريعة فيحمله ذلك على قبوله والعمل به)

”شیخ ابوالحسن بن حضار کہتے ہیں: مجتہد حدیث کی صحت کیلئے مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ہے:

- ۱- اس کی سند میں کوئی راوی جھوٹا نہ ہو۔
 - ۲- کتاب اللہ کی کسی آیت سے اس کی مناسبت نہ ہو۔
 - ۳- اصول شریعت میں سے کسی اصول کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔
- جب روایت اس قسم کی ہوتی ہے تو مجتہد اسے قبول کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔

علامہ شمس الدین سخاوی اپنی مشہور کتاب ”فتح المغیث“ میں لکھتے ہیں:

(قال ابن الجوزی: کل حدیث رائیته یخالف المعقول أو یناقض الأصول فاعلم انه

موضوع..... الخ)

”علامہ ابن الجوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو آپ دیکھیں کہ عقل یا اصول کے خلاف ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ من گھڑت ہے اس کے متعلق اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر اسی طرح وہ حدیث قابل اعتبار نہیں ہے جو حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔ اور وہ حدیث بھی ساقط الاعتبار ہے جو کتاب اللہ کی نص، سنت متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور پھر کسی قسم کی تاویل کی گنجائش بھی اس میں نہ ہو..... اسی طرح وہ حدیث جس میں ایک ذرا سی بات پر سخت وعید کی گئی ہو یا اس کے برعکس معمولی سے فعل پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا گیا ہو اس قسم کی حدیثیں قصہ گو اور بازاری لوگوں کے کلام میں بکثرت پائی جاتی ہیں..... وہ حدیث بھی قابل لحاظ نہیں جس میں لغویت پائی جائے مثلاً یہ کہ کدو کو ذبح کئے بغیر نہ کھاؤ۔ اس کو دیکھ کر بعض حضرات نے کہا کہ اس کا راوی جھوٹا ہے۔ یہ تمام قریب بزدہ ہیں جو روایت میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ..... جبکہ کوئی راوی تنہا ایسے سس سے روایت کرے جس سے وہ ملا بھی نہ ہو یا تنہا کوئی ایسی بات بیان کرے جس کا علم اور لوگوں کو بھی ہونا ضروری تھا جیسے کہ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ”الکفایۃ فی علم الروایۃ“ کی ابتدا میں اس کی وضاحت کی ہے یا وہ واقعہ اتنا اہم ہو کہ اس کے نقل کے اسباب وافر ہوں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے لوگوں کو حج کرنے سے روک دیا۔

6.3 خطیب بغدادی، حافظ ابن عبد البر

اور ملا علی قاری کے اقوال

خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

(الأخبار علی ثلاثة أضرب، فضرِب منها یعلم صحته..... وضرِب منها یعلم

فساده..... وضرِب منها لاسبیل إلی العلم بكونه علی واحد من الأمرین دون الآخر،

(الکفایۃ فی علم الروایۃ: ص ۱۷۰)

یعنی ”منقول روایات تین قسم کی ہوتی ہیں:

..... ایک وہ جن کی صحت معلوم ہوتی ہے۔

..... دوسری وہ جن کا سقم معلوم ہوتا ہے۔

..... اور تیسری وہ جن کی صحت اور سقم کے بارے میں فوری طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مقصد یہ کہ تحقیق طلب ہوتی ہیں۔

اس کے بعد ان اقسام پر گفتگو کرتے ہوئے آپ رقمطراز ہیں:

جہاں تک دوسری قسم کی روایات کا تعلق ہے تو اس زمرہ میں وہ متون آتے ہیں جن کا سقم اور نقص معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی روایات کے نقص کو معلوم کرنے کیلئے مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے:

۱- متن کا مضمون اور مفہوم عقل کے خلاف ہو مثلاً اجسام کی قدامت اور صانع کے وجود کی نفی اس میں بیان کی گئی ہو۔

۲- نص کتاب یا سنت متواترہ کے خلاف ہو۔

۳- جمہور امت نے اس کو رد کر دیا ہو۔

۴- خبر کا تعلق دین کے ایسے امور سے ہو جن کا جاننا ہر مکلف کیلئے ضروری ہو لیکن اس کے باوجود خبر کی روایت راوی تک محدود رہی ہو..... خطیب بغدادی نے اس پر مزید گفتگو کی ہے۔

ہم نے محض اصولی نکات پر اکتفا کی ہے..... مذکورہ اقوال کو مد نظر رکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت قابل اعتبار نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں یا غیر ثقہ؟

۱- جو روایت عقل کے خلاف ہو۔

۲- جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

- ۳- جو روایت محسوس اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔
 - ۴- قرآن مجید، سنت متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش بھی نہ ہو۔
 - ۵- جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔
 - ۶- معمولی عمل پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔
 - ۷- روایت میں رکاکت لفظی یا رکاکت معنوی ہو۔
 - ۸- راوی کسی ایسے شخص سے ایسی روایت کرے کہ کسی اور نے نہ کی ہو اور یہ راوی اس شخص سے ملا نہ ہو۔
 - ۹- روایت ایسی ہو کہ لوگوں کی بڑی تعداد کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو بایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔
 - ۱۰- جس روایت میں ایسا اہم واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وہ وقوع پذیر ہوتا تو سینکڑوں راوی اس کو بیان کرتے اس کے باوجود صرف ایک ہی راوی اس کو بیان کرے۔
- ملا علی قاری لہروی اپنی کتاب ”الموضوعات الکبیر“ کے خاتمہ پر روایات کے نامعتبر ہونے کے چند اصول بیان کرتے ہیں..... آپ نے اس سلسلے میں مثالیں بھی دیں ہیں اور ساتھ ساتھ مختصر بحث بھی کی ہے۔ ہم صرف ان اصولوں کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔
- ۱- جس روایت میں ایسی فضول باتیں ہوں جو رسول اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ جو شخص ”لا الہ الا اللہ“ کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی ستر (۷۰) زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان میں ستر لغت ہوتے ہیں۔
 - ۲- وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ بیٹنگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔
 - ۳- جو روایت صریح حدیثوں کے خلاف ہو مثلاً جس کا نام احمد یا محمد ہو وہ دوزخ میں نہیں جائے گا حالانکہ حدیث سے ثابت ہے کہ دوزخ سے نجات کا نام سے تعلق نہیں، عمل سے ہے۔

۴- جو حدیث واقعہ کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔

۵- جو حدیث انبیائے کرام علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، ہنرہ زار، آب رواں، اور خوبصورت چہرہ کا دیکھنا۔

۶- وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشگوئی تاریخ کی قید کے ساتھ مذکور ہو مثلاً یہ کہ فلاں سن اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

۷- وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے زیادہ ملتی جلتی ہوں۔ مثلاً ”ہر یہ کھانے سے قوت آتی ہے۔“

۸- وہ حدیثیں جن کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں، مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز تھا۔

۹- وہ حدیث جو صراحۃً قرآن کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس ہوگی اگر یہ روایت مان لی جائے تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کب آئے گی حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

۱۰- بعض وہ روایات جو حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

۱۱- جس حدیث میں رکیک الفاظ پائے جاتے ہوں۔ مثلاً (اربع لایشبع من اربع، انشی من ذکرو ارض من مطرو عین من نظر و اذن من خبر.....)

۱۲- بعض وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں۔

⑦ اصول درایت کا اطلاق

محدثین میں ایک ایسا گروہ ہمیشہ موجود رہا عقلی یا نقلی وجوہ کی بنا پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا گو ان کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوتے تھے۔

۱..... ایک ضعیف حدیث ہے کہ ”جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور وفات پائی وہ شہید ہوا“..... حافظ ابن قیم اس حدیث کو دلائل عقلی سے باطل ثابت کر کے لکھتے ہیں (فلو کان اسناد هذا الحديث كالشمس كان غلطا و وهما) ”اس حدیث کی سند اگر آفتاب کی طرح نمایاں ہوتی تب بھی غلط اور وہم ہوتی۔“

۲..... صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا: (اقض بینی و بین هذا الکاذب الائم الغادر ، الخائن.....) ”میرے اور اس جھوٹے، مجرم، دھوکے باز، خائن کے درمیان فیصلہ کیجئے چونکہ حضرت علیؓ کی شان میں یہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے اس لئے بعض محدثین نے اپنے نسخہ سے یہ الفاظ نکال دیئے۔ علامہ مازری اس حدیث کی نسبت لکھتے ہیں۔“

(إذا انسدت طرق تاويلها نسبنا الكذب إلى رواها).....

جب اس کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔

۳..... صحیح بخاری میں روایت ہے کہ اللہ جل شانہ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کا قد ساٹھ گز تھا.....

حافظ ابن حجر اس کے تحت لکھتے ہیں:

(ویشکل علی هذا ما يوجد الآن من آثار الامم السالفة كديار ثمود ، فان مساكنهم تدل علی ان قاماتهم لم تكن مفرطة الطول علی حسبها يقتضيه الترتيب السابق ولم يظهر الآن ما يزيل هذا الاشكال)

”اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں مثلاً قوم ثمود کے مکانات، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے جیسا کہ ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے اور اس وقت تک مجھے اس اشکال کا جواب نہیں معلوم، وا۔

۴..... صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ سے کہیں گے کہ اے اللہ! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو روانہ کرے گا۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

(وقد استشكل الإسماعيلي هذا الحديث من أصله و طعن في صحته) ”اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے۔

۵..... عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر دیکھا جس نے زنا کیا تھا، اس پر اور بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا۔

حافظ ابن عبد اللہ نے اس بنا پر اس حدیث کی صحت میں تامل کیا کہ جانور مکلف نہیں اس لئے ان کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ اس بنا پر ان کو سزا دی جاسکتی ہے۔

۶..... صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ عبد اللہ بن ابی کے طرف داروں اور حضور اکرم ﷺ کے صحابہؓ میں جھگڑا ہو گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا﴾ ”اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان میں صلح کرادو“

روایات سے ثابت ہے کہ اس وقت تک عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا۔ اس بناء پر ابن بطلال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیت قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں اور یہاں عبداللہ بن ابی کا گروہ علانیہ کافر تھا۔

۷..... ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا۔ ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں:

یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

- ۱- اس معاہدہ پر سعد بن معاذ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوہ خندق میں وفات پا چکے تھے۔
- ۲- دستاویز میں کاتب کا نام معاویہؓ ہے حالانکہ وہ فتح مکہ کے وقت اسلام لائے۔
- ۳- اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا۔ جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

۴- دستاویز میں تحریر ہے کہ یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

۵- ان کے ساتھ کوئی ایسا لازمی معاہدہ ہوا نہیں تھا، انہیں تو بتایا گیا تھا کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ پھر ان کو جزیہ معاف کر دینا کیسے ہو سکتا ہے جو باقاعدہ معاہدہ کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔

۶- یہ ایسا واقعہ ہے جس کے نقل کرنے کے خاطر خواہ اسباب موجود تھے پھر صحابہ کرامؓ، تابعین اور ائمہ حدیث اس سے بے خبر کیسے رہے؟

۷- اہل خیبر نے کوئی ایسا اچھا کام نہیں کیا تھا جس کی بنا پر ان کا جزیہ معاف کر دیا جاتا انہوں نے تو اللہ جل شانہؓ اسکے رسول اور صحابہ کے خلاف اپنی تلواریں سونت لی تھیں۔

۸- عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا جیسے یمن، اور نجران، حالانکہ ان

لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی تو خیبر والوں کا جزیہ کیوں کر معاف ہو سکتا تھا۔

۹۔ اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے خیر خواہ، دوست اور واجب الرعایت ہیں حالانکہ چند روز کے بعد وہ جلا وطن کر دیئے گئے۔ جو حضرات علم حدیث سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث کا جو ذخیرہ اس وقت ہزاروں روایات اور سینکڑوں مؤلفات کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے یہ قرون اولیٰ کے علماء حدیث تک نقل درنقل پہنچ کر محفوظ ہوا ہے۔ اس میں رطب و یابس کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ذخیرہ پر نظر ثانی کر کے اس میں سے ان روایات کو نکال دیا جائے جن میں سقم اور نقص پایا جاتا ہے۔ اور محض ان روایات کو یکجا کر دیا جائے جو بالکل صحیح ہوں اور جو امت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکیں۔

اس قسم کی باتیں عام طور پر کی جاتی ہیں بلکہ اس قسم کے موضوعات پر طویل بحثیں اور مذاکرے ہوتے رہتے ہیں۔ بد قسمتی سے بعض وہ علماء جو علم حدیث کا رتبہ کم کرنا چاہتے ہیں وہ بیمار ذہنوں کو غذا مہیا کرتے ہیں بعض مواقع پر ان کی زبانوں سے حدیث کے متعلق ایسی باتیں نکلتی ہیں جنہیں سن کر حیرت ہوتی ہے کہ اس مقدس علم کے خلاف ان کے سینوں میں اتنا غیظ و غضب کیوں پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں جو بات زیادہ قابل فہم نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان حضرات کی ذاتی رسائی علم حدیث کے اصول اور مصادر تک نہیں ہوتی بلکہ اکثر و بیشتر انہیں مصادر حدیث کے صحیح نام تک نہیں آتے۔ انہیں اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ علماء حدیث نے جس طرح اس علم کی خدمت کی ہے اور اس کی خدمت کیلئے اپنی پوری زندگیوں کی قربانی دی ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ علم حدیث کی کتنی شاخیں اور ہر ایک شاخ پر کتنا کام ہوا ہے..... وہ نہیں جانتے کہ علماء حدیث نے روایات کو کتنا پرکھا اور کیسے پرکھا؟..... ان کے پیش نظر وہ مصادر نہیں ہوتے جن میں موضوع اور مردود روایات کو الگ کر کے جمع کیا گیا ہے اور جن کی ضخیم جلدیں کتب خانوں میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے اس علم کی جو خدمت کی ہے وہ عبادت سمجھ کر کی ہے..... درایت کے جو اصول یہاں ذکر

کئے گئے ہیں ان کے مرتبہ مجموعوں اور مؤلفات کو پرکھنے کیلئے بھی طویل عرصہ درکا ہے..... اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے اسلاف کی طرح اس علم کی خدمت کرنے کی توفیق اور صلاحیت سے نوازے..... آمین)

خود آزمائی ②

- ۱- حضرت عمرؓ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت پر عمل کرنے سے کیوں انکار کیا۔ اور اس موقع پر کیا کہا
- ۲- جو روایت معقول اور اصول کے خلاف ہو اس کے بارے میں علماء حدیث کا اصول کیا ہے۔
- ۳- رکاکت سے کیا مراد ہے اس کی اقسام کی نشاندہی کیجئے۔
- ۴- روایت اگر مقتضائے عقل کے خلاف ہو اور اس میں تاویل صحیح نہ ہو سکے تو اس صورت میں اس کو کیا حیثیت دی جائے گی۔
- ۵- امام ابو اسحاق شیرازی نے کی روایت کو رد کرنے کیلئے کون کون سے اسباب بتائے ہیں۔
- ۶- علامہ ابن الجوزی نے موضوع اور منکر روایت کے بارے میں کیا بتایا ہے۔
- ۷- ملا علی قاری نے روایات کے نامعتبر ہونے کے جو اصول بتائے ہیں ان کی نشاندہی کیجئے۔



یونٹ نمبر 14

ناسخ و منسوخ فی الحدیث

تحریر: معین الدین ہاشمی
نظر ثانی: ڈاکٹر علی اصغر چشتی



فہرست موضوعات

- 465 یونٹ کا تعارف
- 466 یونٹ کے مقاصد
- 467 ① ناخ و منسوخ
- 467 1.1 نسخ کا لغوی مفہوم
- 467 1.2 مختلف علماء کے نزدیک نسخ کے معانی
- 468 1.3 نسخ کی اصطلاحی تعریف
- 468 1.4 نسخ کی ضرورت
- 470 1.5 معرفت ناخ و منسوخ کی اہمیت
- 472 ② نسخ کی اقسام
- 472 2.1 قرآن سے سنت کا نسخ
- 472 2.2 سنت سے قرآن کا نسخ
- 474 2.3 قرآن سے قرآن کا نسخ
- 474 2.4 سنت سے سنت کا نسخ
- 475 ③ حدیث میں ناخ و منسوخ
- 475 3.1 حدیث میں ناخ و منسوخ کی معرفت
- 475 3.2 حدیث میں ناخ و منسوخ کی معرفت کے طریقے

- 476 3.3 نسخ بذریعہ نص
- 477 3.4 صحابی کی تصریح سے نسخ
- 479 3.5 تاریخی ثبوت کے ذریعہ نسخ
- 482 3.6 دلالت اجماع کے ذریعہ نسخ
- 483 خود آزمائی

یونٹ کا تعارف

نسخ کی اصطلاح سنتے ہی عام آدمی کے ذہن میں یہ تصور ابھرتا ہے کہ ایک شے درست نہیں تھی اس لیے اسے منسوخ کر دیا گیا اور درست چیز کو اس کی جگہ پیش کیا گیا۔ حالانکہ شریعت میں ناسخ و منسوخ کے حوالے سے یہ تصور سرے سے غلط ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں شارع کا ایک حکم شرعی کی جگہ دوسرے حکم شرعی کا نافذ کر دینا نسخ کہلاتا ہے۔ پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے حکم کو ناسخ کہتے ہیں۔ حقیقت میں نہ تو پہلا حکم غیر مناسب اور غلط ہوتا ہے اور نہ دوسرا۔ پہلے حکم کی مدت ختم ہو جانے کی وجہ سے دوسرا حکم بھیجا جاتا ہے۔ البتہ اس مدت کی تعیین عام طور پر آدمی کے سامنے نہیں ہوتی۔ گویا اللہ یا اس کے رسول کا کسی حکم کو منسوخ کرنے اور دوسرا حکم نافذ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک حکم مفید تھا اب اس کے افادہ کی مدت پوری ہو گئی ہے اس لیے دوسرا حکم بھیج دیا گیا۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ جیسے کوئی ماہر طبیب مریض کے حالات کے پیش نظر پہلے ایک نسخہ تجویز کر دیتا ہے پھر اس مریض کے احوال و حالات تبدیل ہو جانے پر دوسرا نسخہ تجویز کر کے پہلے نسخہ کو منسوخ کر دیتا ہے۔

اس یونٹ میں 'نسخ' کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ نسخ کے لغوی و اصطلاحی مفاہیم، نسخ کی ضرورت، معرفت ناسخ و منسوخ کی اہمیت، نسخ کی اقسام اور حدیث میں ناسخ و منسوخ کی معرفت کے طریقوں پر مع امثلہ بحث کی گئی ہے۔

یونٹ کے اغراض و مقاصد

- اس یونٹ کا مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:
- ⇨ علم النسخ و المنسوخ کا تعارف بیان کر سکیں۔
- ⇨ مختلف علماء کے نزدیک نسخ کے معانی بیان کر سکیں۔
- ⇨ نسخ کی اقسام کی وضاحت کر سکیں۔
- ⇨ حدیث میں ناسخ و منسوخ کی معرفت کی اہمیت اور اس کے طریقوں سے متعلق بحث کر سکیں۔

① ناسخ و منسوخ

1.1 نسخ کا مفہوم:

لغت میں نسخ دو معروف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ ایک معنی ہیں 'ابطال' یعنی زائل کرنا، مٹانا، چنانچہ عربی کا محاورہ ہے: نسخت الشمس الظل یعنی: "سورج نے سایہ کو زائل کر دیا یعنی مٹا دیا"۔ اسی طرح عربی میں کہا جاتا ہے: نسخ الشیب الشب (۱) یعنی بڑھاپے نے جوانی کو زائل کر دیا۔ نیز "نسخت الريح الآثار" یعنی ہوائے قدموں کے نشانات کو مٹا دیا۔ تقریباً یہی معنی قرآن مجید کی اس آیت میں بھی موجود ہیں: ﴿فینسخ الله ما یلقى الشیطان﴾ (۲) یعنی "شیطان جو الٹا کرتا ہے اللہ اس کو مٹا دیتا ہے"۔

ب۔ نسخ کے دوسرے معروف معنی ہیں محض کرنا بعینہ منتقل کرنا، جیسے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ نسخت الكتاب میں نے کتاب نقل کر دی یعنی جو کچھ اصل کتاب میں تھا اسے بعینہ دوسری کتاب میں نقل (Transfer) کر دیا یہ معنی قرآن مجید کی اس آیت میں بھی پائے جاتے ہیں: ﴿انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون﴾ (۳) یعنی جو کام تم کرتے تھے ہم ان کو لکھتے جاتے تھے۔

1.2 مختلف علماء کے نزدیک نسخ کے معانی

- ۱۔ ابن کثیر کے قول کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابن مسعود کے شاگرد ادب العالیہ اور محمد بن کعب قرظی کے نزدیک نسخ کے معنی 'بدل' کے ہیں۔ (۴)
- ۲۔ ضحاک کے نزدیک 'بھلا دینے'۔

۳- عطا کے نزدیک 'چھوڑ دینے' اور 'اٹھا دینے' کے ہیں۔ (۵)

۵- طبری کے نزدیک نسخ کا معنی ہیں 'نقل کرنا'۔ (۶)

۶- ابو جعفر النحاس کے نزدیک نسخ کے معنی 'زائل کرنے' اور 'نقل کرنے' کے ہیں۔ (۷)

۷- ہبۃ اللہ بن سلامہ کے نزدیک نسخ کے معنی اٹھا دینے کے ہیں۔ (۸)

۸- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک نسخ کا معنی 'ایک چیز کا دوسری چیز سے ازالہ کے ہیں'۔ (۹)

1.3 نسخ کی اصطلاحی تعریف:-

شارع کا کسی مقدم (پہلے) حکم کو کسی متاخر (آخری) حکم کے ذریعہ ختم یا زائل کر دینا اصطلاحاً نسخ کہلاتا ہے۔ (۱۰)

چنانچہ حافظ ابن صلاح لکھتے ہیں کہ "وہو عبارة عن رفع الشارع حکما منه متقدما بحکم منہ متاخر"۔ (۱۱) یعنی یہ نسخ عبارت ہے شارع کے متاخر حکم سے متقدم حکم کو ختم کرنے سے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نسخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'النسخ' رفع تعلق حکم شرعی بدلیل شرعی متاخر عنہ (۱۲) یعنی ایک حکم شرعی کے تعلق کو متاخر شرعی دلیل سے اٹھا دینا (Withdraw) نسخ کہلاتا ہے۔

مختصراً یہ کہ شارع کا ایک حکم شرعی کو دوسری دلیل شرعی سے ساقط کر دینا نسخ کہلائے گا۔

1.4 نسخ کی ضرورت

نسخ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف دیکھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ، نسخ کی ضرورت کیونکر پیش آئی یعنی پہلے

حکم کو ختم کر کے دوسرا حکم کیوں بھیجا گیا؟ اور اگر دوسرا حکم ہی درست اور زیادہ مناسب تھا تو اسے پہلے ہی کیوں نہ نازل کیا گیا غرض اس طرح کے کئی مزید سوال ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہ سوال اس لئے ابھرتے ہے کہ ”نسخ کا لفظ جو نبی ہمارے سامنے آتا ہے تو ذہن میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ جس حکم کو منسوخ کیا گیا وہ درست نہ تھا یا زیادہ مناسب نہیں تھا یا اس کے اچھے نتائج سامنے نہ آئے چنانچہ اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا اور دوسرا حکم (ناسخ) نافذ کر دیا گیا۔ لیکن اس بات کو حقیقت تسلیم کرنا درست نہیں حقیقت یہ ہے کہ قرآن و سنت میں نسخ کی کئی حکمتیں ہیں۔

اس میں سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ تعلیمات دین (اسلام) ایک دم نہیں بلکہ بتدریج بھیجی گئیں ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام احکام پر مشتمل ایک مجموعہ یک دم نبی کے حوالے کر دیا ہو بلکہ بتدریج ضرورت حال کے مطابق احکام نازل ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تغیر و تبدل بھی ہوتا رہا۔ مثلاً شراب کے برتنوں کا استعمال، کہ جب عرب قوم شراب کی عادی تھی تو اس کی رسم و عادت مٹانے کے لئے نہ صرف شراب کو حرام قرار دیا بلکہ اس شے کا استعمال بھی حرام قرار دیا گیا جس سے شراب کی یاد آئے۔ چنانچہ شراب کے برتنوں کا استعمال حرام کر دیا گیا۔ بعد میں جب قوم کی عادت ختم ہو گئی تو سہولت کی خاطر ان برتنوں کا استعمال جائز کر دیا گیا۔ (۱۳)

گویا کہ اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ کا کسی حکم کو منسوخ کرنا اور دوسرا حکم نافذ کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک حکم مفید تھا اب اس کے افادہ کی مدت تمام ہو گئی اس لئے دوسرا حکم بھیج دیا۔ چنانچہ کئی علماء نے نسخ کی ایسے انداز میں تعریف کی ہے کہ یہ مفہوم کھل کر سامنے آتا ہے۔

مثلاً بصاص کے نزدیک نسخ کی تعریف یہ ہے کہ بیان مدة الحكم (۱۴) ”حکم کے مدت کی وضاحت“، یعنی حکم کی مدت کا ایسا بیان جس سے ظاہر ہو کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہوگا مگر دوسرا حکم آتے ہی یہ واضح ہو کہ پہلا حکم ایک خاص مدت کے لئے تھا۔

گویا نسخ کے دور رخ ہیں ایک وہ رخ جو ہمارے سامنے ہے وہ یہ کہ پہلا حکم ختم ہوا اور دوسرا حکم نافذ ہو گیا دوسرا رخ وہ ہے جو خود شارع کے سامنے ہے وہ یہ کہ پہلے حکم کی مدت ختم ہوتی ہے اور دوسرا حکم جاری کیا جاتا ہے۔ (۱۵)

مشہور مفسر و مورخ طبری نے نسخ کا جو معنی بیان کیا ہے اس سے بھی مندرجہ بالا بحث کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ نسخ کا معنی یہ ہے کہ ”ایک شے حلال ہو کچھ عرصہ بعد اسکو حرام کر دیا جائے یا اس کے برعکس“ (۱۶) یعنی اس حکم کی حلت و حرمت ایک خاص مدت تک تھی جس کا علم ہمیں نہ تھا۔ علامہ ابن خزم ظاہری کے قول سے بھی اسی بات کی وضاحت ہوتی ہے آپ لکھتے ہیں کہ نسخ کی حقیقت بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی چیز کسی خاص مدت کے لئے حرام کرتا ہے (اگرچہ وہ مدت ہم کو نہیں بتائی جاتی لیکن وہ اللہ کے علم میں ہوتی ہے) پھر وہ اس کو مباح (جائز، حلال) کر دیتا ہے یا اس کے برعکس کوئی چیز کچھ مدت کے لئے مباح ہوتی ہے پھر اس کی مدت گزارنے پر اس کو حرام کر دیا جاتا ہے۔ اس کو یوں کہنا چاہئے کہ ایک حکم کے بعد دوسرا حکم نازل ہوا۔ (۱۷)

مندرجہ بالا بحث کی مزید وضاحت شاہ ولی اللہ کے بیان سے ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ: ”امور منسوخہ میں علماء یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اصلی حکم میں تبدیلی ہو جایا کرتی ہے حقیقت میں یہ تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ حکم کے ختم ہونے سے وہ حکم بھی ختم ہو جایا کرتا ہے یا اس علت میں مقصود اصلی کا احتمال باقی نہیں رہا کرتا یا علت کے ظاہر ہونے سے کوئی امر مانع پیش آ جایا کرتا ہے۔“ (۱۸)

1.5 معرفت ناسخ و منسوخ کی اہمیت

جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ احکام شرعیہ یک دم نازل نہیں ہوئے بلکہ جوں جوں نئے حالات اور واقعات سامنے آتے گئے اس کے مطابق وحی الہی قرآن و سنت کی صورت میں نازل ہوتی گئی۔ بعض دفعہ پہلے حالات کے مطابق نازل شدہ احکام منسوخ بھی ہوئے اور ان کی جگہ نئے احکام نازل کیے گئے۔

چنانچہ اول درمیان اور آخر میں نازل شدہ احکام کی معرفت کے لئے ایسے علم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ان کے تاریخی ادوار پر روشنی ڈالتا ہو وہی علم 'علم الناسخ و المنسوخ' ہے۔

اس علم سے عدم واقفیت کی صورت میں آدمی شرعی احکام میں ترتیب اور اس کی حکمت علاوہ ازیں احکام میں رد و بدل اس کے عموم و خصوص اور اس میں مضر حکمتوں کے متعلق مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حازمی نے حضرت علیؑ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ ایک قاضی کے پاس سے گزرے تو پوچھا: تعرف الناسخ من المنسوخ؟ قال لا، قال هلکت و اهلکت (۱۹) یعنی: ”تم ناسخ کو منسوخ کے تعلق سے پہچانتے ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا، تو ہلاک ہوا اور لوگوں کو بھی ہلاک کیا۔“

② نسخ کی اقسام

نسخ کی چار اقسام ہیں: (۲۰)

۱- قرآن سے سنت کا نسخ

۲- سنت سے قرآن کا نسخ

۳- قرآن سے قرآن کا نسخ

۴- سنت سے سنت کا نسخ

2.1 قرآن سے سنت کا نسخ

اکثر علماء کے نزدیک قرآن سے سنت کا نسخ ثابت ہے اسکی مثال تحویل قبلہ کی آیت ہے۔ کہ حضور اکرم ﷺ نے جب مدینہ ہجرت کی تو آپ پہلے چھ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے لیکن قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے یہ حکم منسوخ ہو گیا: ﴿فَوَلَّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۲۱) یعنی ”(اے نبی) اب نماز میں منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر لو“۔

2.2 سنت سے قرآن کا نسخ

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ ایسا حکم جو کتاب اللہ سے ثابت ہو سنت اسے ساقط العمل نہیں کر سکتی۔ درج ذیل آیت کریمہ کی روشنی میں یہ ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کا باطل قرار دیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِذَا تَنَلَّى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا انْتِ بَقَرَانٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدَّلْهُ. قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَبَدِّلَهُ مِنْ تَلَقَّاءِ نَفْسِي أَنْ اتَّبِعَ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ. إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابٌ يَوْمَ عَظِيمٍ﴾ (۲۲) ”اور جس وقت ہماری روشن آیات پڑھی جاتی

ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات (بروز قیامت) کا یقین نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں (یا رسول اللہ) اس کے بغیر کوئی اور قرآن لائیے (جو ہماری مرضی کے مطابق ہو) یا اسے (ہماری مرضی کے مطابق) تبدیل کر دیجئے۔ (اے محمد ﷺ) آپ فرمائیے مجھے تو اپنی طرف سے قرآن کے بدلنے کا کوئی حق نہیں۔ میں تو وہی مانتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے مجھے تو خوف ہے بڑے دن کے عذاب کا اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں۔

لیکن چونکہ کتاب اللہ مجمل اور سنت رسول اللہ اسکی مفسر (تفسیر کرنے والی) ہے اس لئے فقہاء کرام قرآن کے عام حکم کو سنت کے ذریعہ خاص کرنا۔ اسی طرح ”مطلق“ حکم کو ”مقید“ کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں آتا ہے: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ الْإُنثَىٰ﴾ (۲۳)

یہ حکم عام ہے کہ جو آدمی بھی فوت ہوگا اس کی اولاد کو مندرجہ بالا حساب سے حصہ ملے گا۔ لیکن نبی ﷺ نے اس عام حکم کی تفسیر کرتے ہوئے اس میں تخصیص کردی اور فرمایا: ((لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم)) یعنی کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا چنانچہ اگر کوئی مسلمان فوت ہوا تو اس کی اولاد اگر کافر ہو تو اسے مسلمان باپ کی میراث نہیں ملے گی اسی طرح آیت وصیت (۲۴) عام تھی کتب علیکم إذا حکم الموت إن ترک خیر الوصیة للوالدین والأقربین بالمعروف (تم پر فرض ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے تو اگر وہ مال چھوڑ جائے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے) لیکن حدیث نبوی: ((لا وصیة لوارث)) ”وارث کے حق میں وصیت کرنی جائز نہیں“ نے مندرجہ بالا آیت وصیت کو خاص کر دیا یہی وجہ ہے کہ شریعت میں اپنے وارث کے حق میں وصیت کرنی جائز نہیں۔ (۲۵)

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ فقہاء میں اس بات کا اختلاف ہے کہ سنت سے قرآن کے عموم میں تخصیص اور مطلق میں تقید کو نسخ کہیں گے یا یہ نسخ کے زمرے میں نہیں آتا۔

2.3 قرآن سے قرآن کا نسخ:

اکثر علماء امت کے نزدیک قرآن کا نسخ قرآن سے ممکن ہے البتہ قدیم علماء کے نزدیک ناسخ و منسوخ آیات کی تعداد زیادہ اور متاخرین علماء کے نزدیک کم ہے۔ (۲۶)

2.4 سنت سے سنت کا نسخ:

اکثر علماء کے نزدیک سنت سے سنت کا نسخ ممکن ہے۔ ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((ان احادیثی ینسخ بعضها بعضا)) (۲۷) یعنی: ”میری احادیث ایک دوسرے کو منسوخ کرتی ہیں۔“ اس طرح کئی صحابہ کی تصریح بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کئی مرتبہ اپنی احادیث کو منسوخ ٹھہراتے تھے۔ (۲۸)

حافظ ابن حجر عسقلانی ناسخ و منسوخ احادیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ: (وان لم یکن الجمع فلا یحلوا إما ان يعرف التاریخ اولا فان عرف وثبت المتأخر به او بأصرح منه فهو الناسخ، والآخر المنسوخ) (۲۹) یعنی: ”اگر دو حدیثوں میں تطبیق ممکن نہ ہو تو پھر دو صورتوں میں سے ایک ہوگی۔ یا تو تاریخ کا پتہ ہوگا یا تاریخ معلوم نہ ہوگی اگر تاریخ معلوم ہو اور ایک کا دوسرے سے متاخر ہونا ثابت ہو جائے یا ایک زیادہ صریح ہو تو متاخر اور زیادہ صریح ناسخ ہوگی اور مقدم و غیر صریح منسوخ۔“

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ گویا دو حدیثوں کے تعارض کی شکل میں جہاں تطبیق بھی ناممکن ہو ناسخ اور منسوخ کی پہچان کی جاتی ہے۔

③ حدیث میں ناسخ و منسوخ

3.1 حدیث میں ناسخ و منسوخ کی معرفت

علوم حدیث میں ناسخ و منسوخ کی معرفت کی اہمیت کا اندازہ حضرت علیؓ کے مذکورہ قول سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ایک قاضی کے لئے کہا تھا۔ امام حاکم معرفت ناسخ و منسوخ کی اہمیت کے حوالے سے امام احمد بن حنبل اور اسحق راہویہ سے نقل کرتے ہیں کہ ((ان العالم اذا لم يعرف الصحيح والسقيم والناسخ والمنسوخ من الحديث لا يسمى عالماً)) (۳۰) یعنی: ”اگر کوئی عالم صحیح و سقیم اور ناسخ و منسوخ حدیث کی معرفت نہیں رکھتا تو وہ عالم نہیں کہلائے گا۔“

علماء کے خیال میں علوم حدیث میں ناسخ و منسوخ کی معرفت (پہچان) دشوار ترین فن ہے۔ امام زہری کہتے ہیں کہ ناسخ احادیث کو منسوخ سے الگ کرنے کے عمل نے فقہاء کو عاجز و بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔ امام شافعیؒ کو اس سلسلہ میں بڑی مہارت حاصل تھی چنانچہ انہوں نے اس فن کے اسرار و رموز کو خوب واضح کیا ہے۔ امام احمد نے محمد بن مسلم ابن وارہ سے جب وہ مصر سے لوٹے تو پوچھا۔ ”کیا امام شافعیؒ کی تمام کتابیں تم نے قلم بند کر لی ہیں“ محمد بن مسلم نے نفی میں جواب دیا۔ یہ سن کر امام احمد نے فرمایا کہ تم سے کوئی اور ہو گئی، ہمیں تو مفسر و مجمل احکام اور ناسخ و منسوخ احادیث کا علم امام شافعیؒ کی مجلس میں ہی بیٹھ کر حاصل ہوا ہے۔ (۳۱)

3.2 حدیث میں ناسخ و منسوخ کی معرفت کے طریقے:

حدیث میں ناسخ و منسوخ کی معرفت کے بنیادی طور پر چار بڑے طریقے ہیں:

۱- نسخ بذریعہ نص

۲- صحابی کی تصریح کے ذریعہ نسخ

۳- تاریخ سے ثبوت کی بنا پر نسخ

۴- نسخ بذریعہ اجماع امت

3.3 نسخ بذریعہ نص:

نسخ کی یہ قسم سب سے زیادہ واضح ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی اپنی تصریح (وضاحت) موجود ہوتی ہے کہ فلاں حدیث منسوخ ہے اور فلاں ناخ۔ جیسے کہ:

الف) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فانها تذكروا الاخرة)) (۳۲) یعنی: ”میں نے تمہیں زیارت قبور سے منع کیا تھا اب زیارت کرو اس لیے کہ یہ آخرت کی یاد دلاتی ہے۔“

اس روایت میں ((نہیتکم عن زیارة القبور)) یعنی: ”میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا“ کے الفاظ کیلئے ”فزوروها“ (پس زیارت کرو) کا لفظ ناخ ہے۔

ب) قربانی کے گوشت کا تین دن سے زیادہ کھانے کی حرمت کا حکم: ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ((لا يأكل احدكم من لحم اضحية فوق ثلاثة ايام)) (۳۳) یعنی: ”تم میں کوئی شخص قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ کھائے۔“ ترمذی لکھتے کہ ابتدا میں یہ حکم دیا گیا تھا بعد میں رخصت دی گئی۔ (۳۴) چنانچہ اس حدیث کی ناخ سلیمان بن بریدہ کی روایت ہے وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كنت نهيتكم عن لحوم الاضاحی فوق ثلاث لیتسع ذوالطول علی من لا طول له. فكلوا ما بدا لکم واطعموا وادخروا)) (۳۵) یعنی: ”میں تم کو منع کرتا تھا قربانیوں کے گوشت سے کہ تین دن سے زیادہ نہ رکھو اس لئے کہ کشادگی کریں طاقت والے (صاحب وسعت

لوگ) بے طاقت والوں (غریب) پر سواب کھاؤ تم جس طرح چاہو اور کھلاؤ اور جمع کرو۔
رسول اللہ ﷺ کی اپنی تصریح سے پہلی حدیث کا حکم منسوخ اور دوسری کا ناخ ہے۔

(ج) شراب کے برتنوں کے استعمال کی ممانعت: شروع اسلام میں شراب کی حرمت کے ساتھ شراب کے برتنوں کو استعمال کرنے کی ممانعت بھی تھی (۳۶) لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا چنانچہ حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ((نهيتكم عن النبيذ الا في سقاء فاشربوا في الاسقية كلها)) (۳۷) یعنی: ”میں نے تم کو مشک کے سوا (دوسرے برتنوں میں) نبیذ بنانے سے منع کیا تھا اب جس برتن میں چاہو..... پیو۔“

3.4 صحابی کی تصریح سے نسخ:

نسخ کی معرفت کا دوسرا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ سنت سے ثابت دو متعارض حکموں میں ایک حکم کے لیے صحابی یقین سے کہہ دے کہ یہ متاخر ہے تو وہ حکم ناخ ہوگا اور پہلا منسوخ۔

(الف) حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”آگ سے پکی ہوئی چیز (کھانے کے بعد) سے وضو کیا کرو۔“ اسی طرح کی احادیث حضرت زید بن ثابتؓ اور دیگر کئی صحابہ سے مروی ہیں۔ (۳۸) لیکن حضرت جابرؓ کی تصریح ہے کہ ((كان آخر الامور من رسول الله ﷺ ترك الوضوء مما مسته النار)) (۳۹) یعنی ”رسول ﷺ کے دو معمولات میں سے آخری عمل آگ پر پکی ہوئی چیز کے بعد وضوء کا ترک کرنا ہے۔“ چنانچہ پہلی حدیث کا حکم منسوخ اور دوسری حدیث کا حکم ناخ کہلائے گا اور ناخ حکم پر ہی عمل کیا جائے گا۔

(ب) جنازہ کے احترام میں کھڑے ہونے کا حکم: شروع میں رسول اللہ ﷺ کا عمل یہ تھا کہ آپ ﷺ جنازہ کے احترام میں کھڑے ہو جاتے تھے لیکن بعد میں یہ عمل منسوخ ہو گیا چنانچہ حضرت علیؓ

کی تصریح ہے: ((قام رسول اللہ ﷺ ثم قعد)) (۴۰) یعنی ”پہلے رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوتے تھے پھر بیٹھنے لگے۔“ اسی طرح حضرت علیؓ کی ایک دوسری روایت ہے کہ: ((كان رسول الله ﷺ امرنا بالقيام في الجنابة ثم جلس بعد ذلك وامرنا بالجلوس)) (۴۱) یعنی ”رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جنابہ (سامنے آنے) کے وقت کھڑے ہونے کا حکم کیا تھا پھر آپ ﷺ بھی بیٹھے تھے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔“

یعنی ابتدا میں جنابہ سامنے آجاتا تو رسول اللہ ﷺ بھی احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے اور اسی طرح کا حکم آپ علیہ السلام نے صحابہ کو بھی دیا۔ (۴۲) صحابی کی تصریح سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا اور آپ ﷺ نے خود بھی جنابہ سامنے آنے کے وقت کھڑے ہونے کا عمل ترک کر دیا اور دوسروں کو بھی یہی حکم دیا۔

نماز میں کلام کرنا: اسی طرح نماز میں بعض کلام ابتدا میں جائز تھا۔ صحابہ کی تصریح ہے کہ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا (۴۳) اس حکم کی منسوخ روایات درج ذیل ہیں:

۱- عثمان بن مظعونؓ سے روایت ہے کہ ((مر على رسول الله وهو جالس في الصلاة فسلم عليه فرد عليه)) (۴۴) یعنی: ”میرا رسول اللہ ﷺ پر اس حالت میں گزر ہوا کہ آپ ﷺ نماز میں بیٹھے تھے میں نے سلام کیا تو انہوں نے سلام کا جواب دیا۔“

۲- ((عن ابن عمار عن عمار انه سلم على النبي ﷺ وهو يصلي فرد عليه)) (۴۵) یعنی: ”ابن عمار اپنے والد عمار سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو نماز کی حالت میں سلام کیا تو انہوں نے (سلام کا) جواب دیا۔“

مندرجہ بالا احادیث کی ناسخ روایات میں اہم بخاری کی روایت ہے کہ صحابی رسول فرماتے ہیں:

۱- ہم رسول اللہ ﷺ کو سلام کرتے تھے اس وقت جبکہ وہ نماز کی حالت میں ہوتے تھے آپ ہمیں

سلام کا جواب لوٹاتے تھے جب ہم نجاشی (حبشہ) سے واپس ہوئے تو ہم نے آپ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے (نماز کی حالت میں ہونے کی وجہ سے) سلام کا جواب نہیں لوٹایا اور (بعد از نماز) ارشاد فرمایا کہ نماز میں مشغولیت ہوتی ہے۔ (۴۶)

۲- حضرت زید بن ارقم کی روایت سے بھی اس نسخ کا پتہ چلتا ہے وہ فرماتے ہیں: ((کننا نکتلم فی الصلاة علی عهد النبی ﷺ یکلم احدا صاحبہ بحاجتہ حتی نزل حافظوا علی الصلوات والصلات الوسطی وقوموا للہ قانتین^(۴۷)) فامرنا بالسکوت)) یعنی: ”نبی ﷺ کے عہد میں نماز پڑھنے کے دوران ہم سے کوئی بھی اپنے ساتھ والے نمازی سے بقدر ضرورت بات کر لیا کرتا تھا پھر آیت ﴿حافظوا علی الصلوات﴾ نازل ہوئی اور ہمیں (نماز میں) خاموش رہنے کا حکم ہوا۔

علاوہ ازیں ترمذی اور ابوداؤد نے بھی ایسی کئی روایات نقل کی ہیں جن سے نماز میں کلام کا منسوخ ہونا صراحتاً معلوم ہوتا ہے۔ (۴۹)

3.5 تاریخی ثبوت کے ذریعہ نسخ

اگر دو حدیثوں کے درمیان باہم تعارض ہو اور تطبیق ممکن نہ ہو تو حدیث کے تقدم و تاخر کی تاریخ معلوم کی جائے گی اور مقدم حدیث کو منسوخ اور متاخر کو ناسخ سمجھ لیا جائے گا۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی کے مطابق اگر دو حدیثوں میں تطبیق ممکن نہ ہو تو پھر دو صورتوں میں سے ایک ہوگی یا تو تاریخ کا پتہ ہوگا یا تاریخ معلوم نہ ہوگی۔ اگر تاریخ معلوم ہو اور ایک کا دوسرے سے متاخر ہونا ثابت ہو جائے تو متاخر ناسخ ہوگی اور مقدم منسوخ۔ (۵۰) مثلاً

(الف) مثلاً حضرت شداد بن اوس کی حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((افطر الحاجم

والمحجوم)) (۵۱) یعنی: ”پیچھے (سنگی) لگوانے والا اور جو لگائے دونوں کا روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔“ اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے کہ ((ان النبی اجتجم وهو صائم)) (۵۲) یعنی رسول اللہ ﷺ نے روزے کی حالت میں سنگی لگوائی۔ یہاں دوسری حدیث پہلی کی ناخ ہے کیونکہ حضرت شدا کی روایت بعض دوسرے طرق کے مطابق فتح مکہ کے دور کی ہے جو کہ ۸ھ میں واقع ہوا۔ جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت حجتہ الوداع ۱۰ھ کی ہے۔ (۵۳)

ب) اس کی دوسری مثال حضرت انسؓ کی روایت ہے: ((ان النبی ﷺ کان يتوضا لكل صلوٰۃ طاهر او غير طاهر)) یعنی: ”نبی ﷺ ہر نماز کے لئے وضوء فرماتے تھے خواہ وہ باضوء ہوں یا بے وضوء۔“ امام حازمی اور ترمذی کے شارح عبدالرحمن مبارکپوری نے اس حدیث پر تفصیلی بحث کی ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ (۵۴) ترمذی کہتے ہیں کہ بعض اہل علم کے نزدیک ہر نماز کے لئے وضوء کرنے کا حکم استحباباً ہے وجوباً نہیں۔ (۵۵) کتاب الطہارۃ میں اس طرح کی روایت سلیمان بن بریدہ سے بھی ہے۔ فرماتے ہیں ((ان النبی ﷺ کان يتوضا لكل صلاة)) یعنی ”نبی ﷺ نماز کے لئے وضوء کیا کرتے تھے“ (۵۶) اسی باب میں سلیمان بن بریدہ کی دوسری روایت بھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمل فتح مکہ سے قبل کا ہے جو بعد میں منسوخ ہو گیا۔ (۵۷) حضرت سلیمان بن بریدہ فرماتے ہیں کہ: ((کان النبی ﷺ يتوضا لكل صلاة فلما کان عام الفتح صلی الصلوات کلها بوضوء واحد ومسح علی خفيه فقال عمر انک فعلت شیاً لم تکن فعلته؟ قال: عمداً فعلته)) یعنی: ”نبی ہر نماز کے لئے وضوء فرماتے تھے۔ یوم الفتح (فتح مکہ کے دن) میں آپ نے ایک ہی وضوء سے کئی نمازیں ادا کیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ (یا رسول اللہ ﷺ) آپ نے وہ عمل کیا ہے جو اس سے پہلے نہیں کیا (یعنی اس سے قبل آپ

نے ایک وضوء سے کئی نمازیں ادا نہیں کیں) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔

(ج) ۱۰۔ اس کی تیسری مثال یزید بن عمران کی روایت ہے جس کے مطابق گدھے کے نمازی کے سامنے سے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ (۵۸) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ: ((يقطع الصلوة المرأة والحصار، والكلب)) (۵۹) یعنی: ”عورت گدھے اور کتے کے (نمازی کے) سامنے سے گزر جانے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے“۔ مندرجہ بالا احادیث کی ناسخ ابن عباس کی روایت ہے: ((انه اقبل يسير على حمار ورسول الله ﷺ قائم يصلي بمنى في حجة الوداع يصلي بالناس قال فसार الحمار بين يدي بعض الصف ثم نزل عنه فصف مع الناس)) (۶۰) یعنی حجة الوداع میں مٹی کے مقام پر رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا ہے تھے کہ میں گرھے پر سوار آگے سے گزرا اور نماز میں شامل ہو گیا..... مذکورہ بالا احادیث میں یزید بن عمران کی روایت غزوہ تبوک کی ہے جبکہ ابن عباس کی روایت حجة الوداع کے موقع کی ہے جو کہ پہلی روایت سے بعد کی ہے لہذا اول حدیث منسوخ اور ثانی اس کے لئے ناسخ ہے۔ (۶۱)

تاریخ سے نسخ کے سلسلہ میں یہ بات یاد رہے کہ متاخر الاسلام صحابی کی روایت اگر متقدم الاسلام صحابی کی روایت سے متعارض ہو تو یہ نسخ کے لئے دلیل نہیں بن سکتی اس لئے کہ اس بات کا امکان ہے کہ متاخر الاسلام صحابی نے کسی متقدم الاسلام صحابی سے حدیث سنی ہو اور اس کو نام کی فروگزاشت کو وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی طرف براہ راست منسوب کر دیا ہو۔ تاہم اگر متاخر الاسلام صحابی نے یہ تصریح کی ہو کہ اس نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے تو پھر اس کی روایت کردہ حدیث ناسخ ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس صحابی کے پاس کوئی ایسی حدیث محفوظ نہ ہو جس کا تعلق اس کے اسلام لانے سے پہلے کا ہو۔ (۶۲)

3.6 دلالت اجماع کے ذریعہ نسخ

نسخ فی الحدیث کی معرفت کی چوتھی صورت یہ ہے کہ کسی حدیث کے منسوخ ہونے پر علماء امت کا اجماع ہو گیا ہو جیسے کہ اصحاب سنن، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نے حضرت معاویہؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((من شرب الخمر فاجلدوه فان عاد فی الرابعة فاقتلوه)) (۶۳) یعنی: ”جو شخص شراب نوشی کرے اس کو کوڑے مارو اگر چوتھی بار اعادہ کرے تو اس کو قتل کرو“۔

امام ترمذی اور امام نووی کہتے ہیں کہ امت کا اجماع ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ (۶۴) علاوہ ازیں سنت سے بھی اس کا نسخ ثابت ہے کہ ایک مرتبہ ایک ایسے آدمی کو نبی ﷺ کے سامنے لایا گیا جس نے چوتھی مرتبہ شراب پی تھی اس کو سزا دی گئی لیکن قتل نہیں کیا گیا۔ (۶۵)

یاد رہے کہ اجماع بنفسہ حدیث کا نسخ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ’اجماع‘ امت میں ہوتا ہے اور امت رسول اللہ ﷺ کے حکم کو منسوخ کرنے کی مجاز نہیں نیز اجماع نبی ﷺ کی موجودگی میں نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد ہو سکتا ہے جبکہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد ان کے کسی عمل کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔ رہی یہ بات کہ اجماع سے کس طرح نسخ ثابت ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اجماع بنفسہ حدیث کا نسخ نہیں ہو سکتا لیکن وہ اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ فلاں منسوخ حدیث کے لئے ناسخ حدیث کا وجود موجود ہے۔

3.7 خود آزمائی ①

- ۱- نسخ کا لغوی مفہوم واضح کیجئے۔
- ۲- نسخ کی اصطلاحی تعریف کیجئے۔
- ۳- مختلف علماء کے نزدیک نسخ کے مختلف معانی ہیں کوئی سی تین آراء لکھئے۔
- ۴- معرفت ناسخ و منسوخ کی اہمیت میں حضرت علیؓ کا قول تحریر کیجئے۔
- ۵- نسخ کی تین اقسام ہیں تحریر کیجئے۔
- ۶- حدیث میں ناسخ و منسوخ کی معرفت کے کتنے طریقے ہیں تحریر کیجئے۔

حوالہ جات

- ۱- اساس البلاغۃ ۴۵۴
- ۲- الحج: ۵۲ نیز لسان العرب: مادہ ن س ج
- ۳- الجاثیہ: ۲۹
- ۴- قرآن مجید میں آتا ہے ”واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ“ یعنی جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت کو رکھ دیتے ہیں (النحل - ۱۰۱)
- ۵- ابن کثیر، تفسیر، البقرۃ آیت ﴿ما ننسخ من آیۃ او ننسها نأت بخیر منها او مثلها﴾: آیت نمبر ۱۰۶
- ۶- الطبری ابو جعفر محمد بن جریر، جامع البیان، مطبعہ دار المعارف، قاہرہ: ۱۹۶۰ء/۲، ۴۷۲
- ۷- ابو جعفر النحاس، کتاب النسخ و المنسوخ، طبع قاہرہ ص: ۸
- ۸- ہبۃ اللہ، ابوالقاسم بن سلامہ، کتاب النسخ و المنسوخ، مطبع مصطفیٰ الحلیمی قاہرہ کا مقدمہ
- ۹- شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر ص: ۳۲
- ۱۰- محمد عبد العظیم الزرقانی، المنہل الحدیث فی علوم الحدیث، طبعہ قاہرہ، ص: ۱۱ نیز ملاحظہ ہو محمد بن جعفر کتانی، الرسالۃ المستطرفۃ، طبعہ بیروت، ص: ۶۰
- ۱۱- ابن صلاح ابوہم رعثمان بن عبد الرحمن الشہزوری، علوم الحدیث، ص: ۲۷۷
- ۱۲- نزہۃ النظر، مطبوعہ فرینڈز اون پریس راولپنڈی ص: ۵۸
- ۱۳- صحیح مسلم بشرح نووی دار احیاء التراث العربی بیروت، کتاب الاثریہ۔ نیز عبد الرحمن مبارکپوری، تحفۃ الاخوانی
- ۱۴- الجصاص، اصول الفقہ، دار الکتب المصریۃ ص: ۱۱۵

- ۱۵- قاضی ابوزید، کتاب التحقیق، باب النسخ
- ۱۶- طبری جامع البیان ۴/۲۷۲
- ۱۷- ابن حزم، الاحکام فی اصول الاحکام ۴/۱۵۹
- ۱۸- حجة الله البالغة باب ۸۱
- ۱۹- حازمی، ابو بکر محمد بن موسی بن عثمان بن حازم، کتاب الاعتبار مطبعة داوۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۹ھ: ص ۴، ۵
- ۲۰- ایضاً۔ ابن صلاح، علوم الحدیث، تحقیق نور الدین عمر، دار الفکر بیروت: ص ۶: ۲۷
- ۲۱- البقرہ: ۱۲۴
- ۲۲- یونس۔ ۱۵
- ۲۳- البقرہ: ۱۲۴، ۱۲۹
- ۲۴- البقرہ: ۱۸۰
- ۲۵- تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی۔ نیز ڈاکٹر صبحی صالح اور محمد تقی عثمانی کی کتاب علوم القرآن۔
- ۲۶- کتاب الاعتبار ص: ۱۶، ۲۳
- ۲۷- ایضاً
- ۲۸- نزہۃ النظر: ۵۸
- ۲۹- معرفۃ علوم الحدیث، امام حاکم۔ ص: ۶۰
- ۳۰- کتاب الاعتبار۔ ص: ۳
- ۳۱- مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، کتاب الجنائز
- ۳۲- ترمذی، ابواب الاضاحی، باب فی کراہیۃ کل الاضحیۃ فوق ثلاثۃ یام حدیث نمبر ۱۵۴۵۔
- ۳۳- ایضاً

۳۴- ایضاً، باب فی الرخصة فی اكلها بعد ثلاث۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عبد الرحمن مبارکپوری، تحفة الأخوذی۔ ۵/۹۹، ۱۰۰۔

۳۵- ترمذی، ابواب الاثریہ، باب ماجاء فی كراهية أن ينبذ فی الدباء والنقیير والخنتم۔

۳۶- صحیح مسلم بشرح نووی کتاب الاثریہ، باب النهی عن الانتباذ فی المزفت والدباء والخنتم والنقر: ۱۳/۱۶۷ نیز ترمذی، ابواب الاثریہ، باب ماجاء فی الرخصة۔

۳۷- الطحاوی، شرح معانی الآثار، کتاب الطهارة باب اكل مما غیرت النار هل یوجب الوضوء ام لا،

نیز نسائی، کتاب الطهارة، باب ترك الوضوء فما غیرت النار، ابوداؤد کتاب الطهارة، باب ترك الوضوء مما مست النار۔

۳۸- طحاوی، شرح معانی الآثار، کتاب الطهارة باب اكل مما غیرت النار۔

۳۹- ترمذی، ابواب الجنائز باب فی الرخصة فی ترك القيام لہا۔

۴۰- عن احمد، تحفة الأخوذی، ابواب الجنائز باب فی الرخصة فی ترك القيام لہا، ۴/۱۴۲ نیز ملاحظہ ہو مسلم بشرح نووی ۷/۲۶ نیز کتاب الاعتبار، ص: ۶۰۔

۴۱- ترمذی، ابواب الجنائز، باب ماجاء فی القيام للجنائز۔

۴۲- تحفة الأخوذی، باب فی نسخ الکلام فی الصلاة: ۲/۴۳۹۔

۴۳- ایضاً

۴۴- بخاری، کتاب العمل فی الصلاة، باب ما ینہی من الکلام فی الصلاة، تحفة الاحوذی باب فی نسخ الکلام فی الصلاة: ۲/۴۳۹۔ نیز ملاحظہ ہو کتاب الاعتبار للحامی ص: ۵۰۔

۴۵- البقرة: ۲۳۸

۴۶- صحیح بخاری کتاب العمل فی الصلاة، باب ما ینہی من الکلام فی الصلاة۔

۴۷- ترمذی، ابواب الصلاة، باب فی نسخ الکلام فی الصلاة، ابو داؤد، کتاب الصلاة، باب

- رد السلام فی الصلوة فی کتاب الاعتبار: ص ۴۹
- ۴۸- نزہۃ النظر ۵۸- مطبوعہ فرینڈز پریس راولپنڈی، ۱۹۸۷۔
- ۴۹- ترمذی، کتاب الصوم، باب ماجاء فی کراهۃ الحجامۃ للصائم نیز ملاحظہ، تحفۃ الاخوانی ۳/۴۸۴۔
- ۵۰- ترمذی، کتاب الصوم، باب ماجاء الرخصة فی ذلک۔
- ۵۱- تحفۃ الاخوانی ۳/۴۸۸ نیز ملاحظہ، کتاب الاعتبار، ص: ۱۳۹
- ۵۲- تحفۃ الاخوانی ۱/۱۹۰ تا ۱۹۳ کتاب الاعتبار، ص: ۳۵
- ۵۳- ترمذی کتاب الطہارۃ، باب الوضو لکل صلاۃ
- ۵۴- ایضاً
- ۵۵- ایضاً
- ۵۶- کتاب الاعتبار، ص: ۵۲
- ۵۷- صحیح مسلم کتاب الصلاۃ، باب الصلوة الی سترۃ والنہی عن المرور بین یدی المصلی
- ۵۸- ترمذی، ابواب الصلوة، باب ماجاء انہ لا یقطع الصلوة شیء نیز مسلم باب فی مرور الحمار
- قدام المصلی، نیز کتاب الاعتبار ۵۲
- ۵۹- کتاب الاعتبار: ۵۸
- ۶۰- نزہۃ النظر: ۵۸
- ۶۱- ابو داود، ترمذی ابن ماجہ، کتاب الحدود۔ نسائی کتاب الاشراب، تفصیل کے لئے ملاحظہ، تحفۃ الاخوانی کتاب الحدود، باب ماجاء من شرب الخمر فاجلدہ فان عاد فی الرابعۃ فاقتلہ۔ ۳/۷۲۲، ۷۲۳
- ۶۲- ایضاً ۳/۷۲۳، ۷۲۴ نیز ملاحظہ، صحیح مسلم بشرح النووی، ۱۱/۲۱۷
- ۶۵- ترمذی، کتاب الحدود



یونٹ نمبر 15

1. اختلاف الحدیث

2. غریب الحدیث

تحریر: ڈاکٹر تاج الدین الازہری

نظر ثانی: ڈاکٹر علی اصغر چشتی



فہرست موضوعات

493	یونٹ کا تعارف
494	یونٹ کے مقاصد
495	① اختلاف الحدیث
495	1.1 لغوی و اصطلاحی مفہوم
497	1.2 خود آزمائی ۱
498	② اختلاف کے بنیادی اصول
498	2.1 الجمع (دونوں کی آپس میں جمع و تطبیق)
502	2.2 النسخ (ناسخ و منسوخ کی معرفت)
504	2.3 الترجیح (ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا)
513	2.4 التوقف (رک جانا)
515	خود آزمائی ۲
516	③ اختلاف الحدیث کے موضوع پر لکھی جانے والی مشہور کتابیں
518	خود آزمائی ۳
519	④ غریب الحدیث
522	خود آزمائی ۴
523	⑤ اسباب غرابت
524	5.1 داخلی اسباب
532	5.2 خارجی اسباب
535	خود آزمائی ۵

یونٹ کا تعارف

یہ یونٹ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ اختلاف الحدیث کے بارے میں ہے اور دوسرا حصہ غریب الحدیث کے بارے میں۔

اختلاف الحدیث دراصل دو صحیح مگر متعارض حدیثوں کے درمیان مختلف طریقوں کے ذریعے ان کے متعارض کو کرنے کا نام ہے۔ تیسری صدی میں جب علم حدیث کو شہرت حاصل ہوئی تو منکرین حدیث نے محدثین پر الزام لگایا کہ وہ مختلف مسائل میں متعارض احادیث کو بیان کرتے ہیں۔ ایسی ہی احادیث انہوں نے اپنی کتابوں میں بھی جمع کی ہیں۔ اس پر علماء نے ایسی تمام احادیث کو اکٹھا کر کے جمع کیا اور ان کے درمیان سے تعارض کا ازالہ کیا۔ انہوں نے اس پر بس نہیں کی بلکہ ہمیشہ کے لئے اس قسم کے مسائل کے حل کے لئے کچھ قوانین بھی وضع کئے جن کا تفصیل سے اس یونٹ میں مطالعہ کیا جائے گا۔

دوسرا حصہ غریب الحدیث پر مشتمل ہے۔ محدثین کرام نے حدیث رسول کا مطالعہ دو جہتوں سے کیا۔ سند کے حوالے سے اور متن کے حوالے سے۔ چنانچہ جس حدیث کی سند میں غرابت پائی گئی اسے انہوں نے عزیز اور مشہور کی طرح ایک قسم بنا دیا۔ جسے انہوں نے ”الغریب من الحدیث“ کے نام سے موسوم کیا یعنی وہ حدیث جس کو روایت کرنے والا ہر طبقے میں ایک ہی راوی ہو۔ جس حدیث کے متن میں غرابت پائی گئی اسے انہوں نے ”غریب الحدیث“ کے نام سے موسوم کیا۔ متن حدیث میں واردان تمام غریب الفاظ کی انہوں نے تشریح کی۔ اس طرح غریب الحدیث کی کتابیں وجود میں آئیں۔ انہوں نے کتابیں لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بتایا کہ آخر غرابت واقع کیوں ہوتی ہے؟ اور اس کے کیا اسباب ہیں؟ ان اسباب کے بارے میں اس یونٹ کے دوسرے حصے میں آپ کو معلومات حاصل ہوں گی۔

یونٹ کے اغراض و مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇐ دو متعارض روایات میں جمع و تطبیق کر سکیں۔
- ⇐ تطبیق کے بنیادی اصول بیان کر سکیں۔
- ⇐ ترجیح کے قواعد پر گفتگو کر سکیں۔
- ⇐ غرابت کی اقسام کے بارے میں بات کر سکیں۔
- ⇐ غرابت کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کر سکیں۔
- ⇐ غریب الحدیث کے مصادر اور ان کا منہج بتا سکیں۔

① اختلاف الحدیث

1.1 لغوی مفہوم:

لفظ اختلاف اتفاق کی ضد ہے اور اختلاف الحدیث سے مراد احادیث کا وہ اختلاف ہے جس کے ہوتے ہوئے احادیث ہم تک ایسی صورت میں پہنچتی ہیں کہ معنی کے اعتبار سے ان میں اختلاف ہوتا ہے یعنی ان میں باہم تضاد پایا جاتا ہے۔

اصطلاحی مفہوم:

علماء حدیث کی اصطلاح میں یہ وہ مقبول حدیث ہے جو اپنی جیسی دوسری حدیث کے معارض ہو لیکن اس کے باوجود ان کے جمع ہونے کا امکان موجود ہو۔

یعنی ایسی صحیح یا حسن حدیث جس کے مد مقابل اسی قوت اور مرتبہ میں اس طرح کی ایک اور دوسری حدیث آتی ہے جو بظاہر معنی کے لحاظ سے اس کے مخالف ہو لیکن مخالفت کے باوجود اہل علم و فہم کے لئے ممکن ہو کہ ان دونوں احادیث کے مدلول کو قابل قبول شکل میں تطبیق دے دیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اس بارے میں کہتے ہیں: فان امکن الجمع فهو النوع المسمى مختلف الحدیث یعنی: اگر جمع ممکن ہو تو اس قسم کو مختلف الحدیث کہا جائے گا۔

حافظ ابن الصلاح نے اس کی تعریف یوں کی ہے: ان یمکن الجمع بین الحدیثین ولا یتعذر ابداء وجه بنفی تنافیہما فیتعین حیث الذالمصیر الی ذلک والقول بہما معاً یعنی: ”اگر دو حدیثوں کو اس طرح جمع کرنا ممکن ہو کہ ان کی آپس کی مخالفت ایسا کرنے کو ناممکن نہ بنادے تو ایسی صورت میں دونوں کو جمع کر کے بات کی جائے گی۔“

اختلاف الحدیث کی مثال:

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((لا عدوی ولا طیر ولا هامة ولا صفر)) یعنی: ”اسلام میں چھوت چھات، بدشگونی، ہامہ اور صفر کی کوئی حیثیت نہیں“۔

آپ ﷺ ہی کا دوسرا ارشاد ہے ((فر من المجدوم کفرارک من الاسد)) یعنی: ”کوڑھ والے شخص سے اس طرح دور بھاگو جس طرح تم شیر سے دور بھاگتے ہو“۔

یہ دونوں صحیح حدیثیں ہیں بظاہر ان میں تعارض نظر آتا ہے۔ پہلی حدیث کسی بیماری کے متعدی ہونے کی نفی کرتی ہے اور دوسری حدیث بیماری کے متعدی ہونے کو ثابت کرتی ہے علماء نے ان دونوں حدیثوں کے درمیان متعدد طریقوں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کے بقول دیگر علماء کی طرح حافظ ابن الصلاح نے ان دو حدیثوں میں یوں تطبیق دی ہے کہ: جذام یا اس طرح کی کوئی بھی بیماری طبعی طور پر متعدی نہیں ہوتی۔ تاہم ایسی بیماری والا شخص جب تندرست سے میل جول رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس اختلاط کو تعدی کا سبب بنا دیتا ہے۔ لیکن دیگر اسباب کی طرح کبھی یہ سبب بھی کام نہیں کرتا اور میل جول سے بیماری نہیں لگتی۔ غرض پہلی حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی بیماری بالطبع متعدی نہیں ہوتی اور دوسری حدیث میں اس امر کا اثبات ہے کہ کبھی اختلاط تعدی کا سبب بن بھی جاتا ہے۔ جب نفی و اثبات کا تعلق مختلف امور سے ٹھہرا تو پھر دونوں حدیثوں میں تعارض کیسے ہوا؟

حافظ ابن حجر عسقلانی کے بقول اس سے بھی عمدہ تطبیق یہ ہے کہ پہلی حدیث میں جس تعدی کی نفی کی گئی ہے وہ اپنے عموم پر باقی ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((لا یعدی شیء شینا)) یعنی ”کوئی بھی شیء کسی دوسری شیء کو بیماری نہیں پہنچا سکتی“۔ اس کی تائید ایک اور حدیث رسول سے بھی ہوتی ہے جس میں وارد ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت سے گزارش کی کہ جب خارش والا اونٹ تندرست اونٹ کے

ساتھ ملتا ہے تو تندرست اونٹ کو بھی خارش ہو جاتی ہے تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ((فمن اعدی الاول)) یعنی: ”پہلے اونٹ کو خارش کس نے لگائی“۔

یہ جواب واضح دلیل ہے کہ بیماری متعدی نہیں ہوتی نہ بالطبع اور نہ بوجہ اختلاط۔ جس طرح خداوند کریم نے پہلے فرد میں ابتدائی طور پر یہ بیماری پیدا کی اسی طرح دوسرے میں پیدا کر دی۔ اب سوال یہ ہے کہ حضور نے کوڑھے شخص سے دور بھاگنے کا حکم کیوں دیا؟ تو اس کا سبب یہ تھا کہ اگر کسی نے کوڑھے سے میل جول رکھا اور تقدیر الہی سے اسے بھی کوڑھا ہو گیا تو اسے یہ وہم ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب اس کوڑھے شخص سے اس کا اختلاط تھا اور یہ نظریہ فاسد ہے۔ چنانچہ اس وہم کو ختم کرنے کے ساتھ بطور سد ذریعہ آنحضرت نے ایسی صورت سے اجتناب کا حکم دیا۔

خود آزمائی ①

- ۱۔ اختلاف الحدیث کے لغوی معنی کیا ہیں؟
- ۲۔ اختلاف الحدیث کے اصطلاحی معنی کیا ہیں؟
- ۳۔ ابن حجر نے اختلاف الحدیث کی کیا تعریف کی ہے؟
- ۴۔ ابن الصلاح نے اختلاف الحدیث کے بارے میں کیا کہا ہے؟
- ۵۔ آپ ﷺ کے دوا ایسے ارشادات بیان کریں جن میں سے علماء نے اختلاف کو کیا ہو؟

② اختلاف کے بنیادی اصول

دو مقبول مگر باہم متعارض حدیثوں کے اختلاف کو کرنے کے بنیادی اصول درج ذیل ہیں:

2.1 الجمع (دونوں کی آپس میں جمع و تطبیق)

لغوی طور پر دو متفرق چیزوں کو یا ان کے اجزاء کے آپس میں ضم کرنے کو جمع کہتے ہیں۔ اصطلاح میں دو متعارض حدیثوں کو ایک ہی وقت میں عمل کرنے کی خاطر اکٹھا کرنے کو جمع کرنا کہلاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس میں تعسف نہ پایا جائے یعنی زبردستی انہیں جمع نہ کیا جائے بلکہ واقعی ان کے مدلول میں جمع ہونے کی گنجائش ہو۔ اگر یہ اس طرح جمع ہو جائیں تو ان دونوں پر بہ یک وقت عمل ہو جائے گا۔

اس اصول کے تحت علماء نے متعارض احادیث کی ایک بڑی تعداد کو جمع کر کے ان کے درمیان تطبیق دے دی ہے۔ بلکہ بعض علماء کا تو یہ دعویٰ بھی ہے کہ ”کوئی دو صحیح احادیث ایسی نہیں ہیں کہ ان کے درمیان جمع و تطبیق نہ ہو سکے۔“

حافظ ابن الصلاحؒ نے ابن خزیمہ کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ”اگر کسی شخص کے پاس نبی اکرم ﷺ سے مروی صحیح دو متعارض احادیث ہوں تو میرے پاس لائے تاکہ میں ان میں جمع و تطبیق پیدا کر دوں۔“

اس اصول کے تحت دو ہفتائیں ملاحظہ ہوں:

۱- آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ((ائما اھاب دبغ فقد طھر)) یعنی: ”ہر وہ چیز جس کی دباغت ہو جائے وہ پاک ہے۔“

اس سے متعارض آپ کا دوسرا ارشاد بھی منقول ہے جو یوں ہے: ((لا تنتفعوا من المیتة یاھاب

ولا عصب)) یعنی: ”مردہ جانور کا نہ گوشت استعمال کرو اور نہ چمڑا پہلی حدیث سے مردہ جانور کے دباغت شدہ چمڑے کی طہارت ثابت ہوتی ہے۔“ جبکہ دوسری حدیث مردہ جانور کی جلد کی نجاست پر دلالت کرتی ہے خواہ دباغت شدہ ہو یا نہ ہو۔

امام ابن قتیبہ ان دونوں حدیثوں میں جمع و تطبیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”الحمد لله ان دونوں حدیثوں میں نہ کوئی تناقض ہے اور نہ اختلاف۔ اہاب لغت میں اس چمڑے کو کہتے ہیں جس کی دباغت نہ ہوئی ہو جب اس کی دباغت ہو جائے تو اس کی نجاست دور ہو جاتی ہے۔“

حدیث میں وارد ہے کہ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے ہاں گئے تو گھر میں ایسے چمڑے پائے جن کی دباغت نہ کی گئی تھی۔ انہوں نے انہیں حاصل کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ: ”مردہ جانور کا نہ گوشت استعمال کرو اور نہ چمڑا“ یعنی اس کا چمڑا اس وقت تک استعمال نہ کرو جب تک اس کی دباغت نہ ہو جائے۔ دباغت ہو جائے گی تو وہ پاک ہو جائے گا اور یہ مفہوم دوسری حدیث کے مفہوم سے متعارض نہ ہوگا کہ ”ہر وہ چمڑا جس کی دباغت ہو جائے وہ پاک ہے۔“

امام ابن قتیبہ لکھتے ہیں کہ دونوں حدیثوں کا مفہوم یہ ہے کہ ”مردہ جانور کے دباغت شدہ چمڑے کو استعمال کرو اور دباغت نہ کئے ہوئے کو استعمال نہ کرو۔“

۲۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ((لا یزنی الزانی حین یزنی وهو مؤمن ولا یسرق السارق حین یسرق وهو مؤمن)) یعنی: ”کوئی زانی مؤمن ہوتے ہوئے زانی نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی چور مؤمن ہوتے ہوئے چوری کرتا ہے۔“

آپ ﷺ کا ارشاد اس کے برعکس یوں بھی ہے: ((من قال لا اله الا الله دخل الجنة وإن زنی وإن سرق)) یعنی: ”جس نے صدق دل سے لا اله الا الله کہہ دیا وہ جنت میں داخل ہوگا چاہے زانی ہو یا چور۔“

بظاہر ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہے۔ پہلی حدیث میں زانی اور چور کے ایمان کی نفی کی گئی ہے

اور جس کے ایمان کی نفی ہو جائے اس کا جنت میں جانا ناممکن ہو جاتا ہے مگر دوسری حدیث میں اس کے برعکس زانی اور چور دونوں کو لا الہ الا اللہ کہنے پر جنت میں داخلے کی ضمانت دی گئی ہے جو بظاہر پہلی حدیث کے ساتھ متناقض ہے۔

امام ابن قتیبہ ان دونوں حدیثوں کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان میں نہ کوئی تناقض ہے اور نہ اختلاف، کیونکہ ایمان لغوی طور پر تصدیق کا نام ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ﴾ یعنی ”تم ہمارے تصدیق نہیں کرو گے اگرچہ ہم سچے ہی کیوں نہ ہوں“۔ اس طرح کا ایک مشہور قول ہے ”ما اؤمن بشیء“ میں کسی چیز کی تصدیق نہیں کروں گا۔

اس طرح ایمان کی تین قسمیں ہوئیں:

- ۱۔ منافقین کا ایمان: جو زبان سے تصدیق کرتے ہیں مگر دل سے انکار کرتے ہیں۔ انہی کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا﴾ ”وہ پہلے ایمان لائے پھر کفر کیا“۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَى﴾ ”بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے یا صابی یا نصرانی“۔ پھر اس کے بعد یوں فرمایا: ﴿مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ ”ان میں سے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا“۔ اب اگر یہاں ایمان لانے والوں سے مراد مسلمان ہوتے تو ﴿مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ﴾ نہ کہا جاتا بلکہ یہاں ایمان لانے والوں سے مراد منافقین ہیں جو زبان سے تصدیق تو کرتے ہیں مگر دل سے انکار کرتے ہیں۔ یہ دراصل نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یومِ آخرت پر چنانچہ ہم منافقین کو مؤمن نہیں کہتے کیونکہ ان کا ایمان صدقِ دل سے نہیں۔ ایسے ہی ہم انبیاء علیہ السلام کی نافرمانیوں پر عصیان کا اطلاق کرتے ہیں اور کہتے ہیں عصی و غوی۔ (اس نے نافرمانی کی اور وہ بہک گیا) حالانکہ اس کا گناہ اللہ کے دشمنوں کے گناہ کی طرح نہیں ہے۔ یعنی جس طرح منافقوں پر لفظ ایمان کا اطلاق لغوی ہے ایسے ہی

انبیاء کی نافرمانیوں پر عصیان کا اطلاق لغوی ہے حقیقی نہیں ہے اور یہ ان کے ایمان کی نفی نہیں کرتا۔

۲- گناہگاروں کا ایمان: ایسا آدمی جو صدق دل سے ایمان لائے اور زبان سے اقرار بھی کرے لیکن گناہوں میں ملوث ہو جائے اور یوں اس سے مکمل طور پر اطاعت نہ ہو سکے مگر اسے ان گناہوں پر اصرار نہ ہو۔ ایسا آدمی مؤمن ہے لیکن جب وہ گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے تو اس حالت میں صاحب ایمان نہیں ہوتا۔ وہ اس حالت سے پہلے بھی صاحب ایمان ہوتا ہے اور بعد میں بھی۔ اگر مُصر نہ ہو تو تائب ہو کر صاحب ایمان ہی ہوتا ہے۔ اور اس حالت ارتکاب گناہ میں نفی ایمان سے مراد نفی کامل ہے۔ یعنی اگر اس کا ایمان کامل ہوتا تو گناہ کا ارتکاب نہ کرتا۔ ایک حدیث میں اس کی وضاحت یوں بھی کی گئی ہے کہ: ”زانی جب زنا کرتا ہے تو ایسے وقت میں اس کا ایمان سلب کر لیا جاتا ہے اس کے بعد توبہ کرنے پر ایمان واپس آ جاتا ہے“۔ پہلی تعبیر کے مطابق وہ ناقص الایمان لوٹ آتا ہے۔ دونوں کے مطابق وہ صاحب ایمان ہی رہتا ہے اس کی مکمل نفی نہیں ہوتی۔

۳- مطیع و فرمانبرداروں کا ایمان: ایسا آدمی جو صدق دل سے ایمان لائے۔ زبان سے اقرار کرے اور گناہوں سے بچے وہی سچا مؤمن ہے جس نے ایمان کی شرطیں پوری کیں چنانچہ ارشاد نبوی ہے: ((لَمْ يُؤْمِنْ مِنْ لَمْ يَأْمَنْ جَارَهُ بِوَأَقْنَهُ)) ”وہ شخص ایمان دار نہیں جس کی زیادتیوں سے اس کا ہمسایہ محفوظ نہیں“۔ ایک اور ارشاد نبوی ہے: ((لَمْ يُؤْمِنْ مِنْ لَمْ يَأْمَنْ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَبِدِهِ)) ”وہ شخص ایمان دار نہیں جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ نہیں“۔

ان دونوں اور اس طرح کی حدیثوں میں کمال ایمان کی نفی ہے نہ کہ مطلق ایمان کی۔

چنانچہ اس حدیث کا دوسری حدیث سے جس میں کہا گیا ہے کہ جس نے صدق دل سے لا الہ الا اللہ

کہا وہ جنت میں داخل ہوگا خواہ وہ زانی ہو یا چور۔ کوئی معارض نہیں۔ کیونکہ زنا اور چوری سے اس کے کمال ایمان کی نفی ہوتی ہے نہ کہ مطلق ایمان کی۔ اور لا الہ الا اللہ سے مطلق ایمان مراد ہے۔ لہذا دونوں میں کوئی تناقض نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسری حدیث میں دخول جنت سے مراد اس کا آخری انجام ہو یعنی وہ آدمی اپنے زنا اور چوری کی سزا بھگت کر بلا آخر جنت میں جائے گا اور اللہ کی رحمت اس کے شامل حال ہوگی کیونکہ اس نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا ہے پھر زنا اور چوری سے لا الہ الا اللہ کی کلی نفی نہیں ہوتی اس لحاظ سے بھی پہلی حدیث کا دوسری سے کوئی تعارض نہیں ہے۔

2.2 النسخ (ناسخ و منسوخ کی معرفت)

اگر دو متعارض حدیثوں کے درمیان جمع و تطبیق ناممکن ہو تو پھر نسخ کی طرف دیکھا جائے گا یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ دونوں روایتوں میں کون سی روایت متقدم ہے اور کون متاخر؟

نسخ کے لغوی معنی کسی چیز کے ختم کرنے یا کسی چیز کے تعدیل کرنے کے ہیں جیسے عربی زبان میں کہا جاتا ہے: نسخت الشمس الظل اذا اظلمت ”دھوپ نے سایے کو ختم کر دیا“۔ اسی طرح کا ایک اور قول ہے جیسے کہا جاتا ہے۔ نسخت الكتاب اذا نقلت ما فيه مع ابقائك على الاصل ”تم نے کتاب کو اس کے اصل پر باقی چھوڑتے ہوئے اس میں سے سب کچھ اتار لیا (نقل کر لیا) گویا کہ اس کے ساتھ ایک اور کتاب تیار ہو گئی“۔

اصطلاح میں نسخ کسی متاخر شرعی حکم کے ذریعے کسی متقدم شرعی حکم کو ختم کرنے کا نام ہے۔ نسخ پر عمل کرنے کے لئے چار شرطیں ضروری ہیں۔

- ۱- ضروری ہے کہ دونوں روایتیں رسول اللہ ﷺ سے صحیح طور پر ثابت ہوں۔
- ۲- ضروری ہے کہ ان میں سے ایک متقدم اور دوسری متاخر ہو۔
- ۳- ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان حقیقی تعارض پایا جائے۔

۴۔ دونوں کے درمیان کسی بھی طرح جمع و تطبیق ممکن نہ ہو۔

ان امور سے نسخ کی پہچان ممکن ہے:

۱۔ کسی روایت میں وارد متن (نص) ہی میں اس کی صراحت موجود ہو۔ جیسے حضور کا یہ فرمان: ((كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فانها تذكروا الآخرة)) یعنی: ”میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا لیکن اب ان کی زیارت کر لیا کرو یہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔“

ب۔ کسی صحابی کا یقین کے ساتھ اس کا اظہار کہ یہ روایت متاخر ہے جیسے حضرت جابر بن عبد اللہ کی یہ روایت کہ ((كان آخر الامرین من رسول الله ﷺ ترك الوضوء مما مست النار)) ”رسول اکرم ﷺ کا آخری حکم یہ تھا کہ ہم آگ پر پکائی گئی چیز کھا کر وضو نہ کریں۔“

یہ روایت ابویوب انصاریؓ کی اس روایت کو منسوخ کرتی ہے جو اس سے متقدم ہے اور یوں ہے۔ ((توضؤا مما غیرت النار)) ”آگ پر پکی ہوئی چیز کھا کر وضو کر لیا کرو۔“

ج۔ تاریخ سے پتہ چل جائے کہ ایک روایت منسوخ ہے اور دوسری نسخ ہے جیسے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت کہ: ((ان النبی ﷺ احتجم وهو صائم)) ”بے شک نبی اکرم ﷺ نے روزے کی حالت میں سینگی لگوائی۔“ یہ روایت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو منسوخ کرتی ہے جو یوں ہے: ((افطر الحاجم والمحجوم)) ”سینگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ افطار ہو گیا۔“ پہلی روایت حضور کے حجۃ الوداع کے موقع کا فرمان ہے جو آپ کی آخری تعلیمات ہیں جبکہ دوسری روایت اس سے پہلے کی ہے۔

د- اجماع امت کسی روایت کے نسخ پر دلالت کرے

جیسے یہ حدیث کہ اگر کوئی چوتھی مرتبہ شراب پی لے تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ اس حدیث کو ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں: ((عن ابی ہریرہ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا سکر فاجلدوه، فان عاد فاجلدوه، فان عاد فاجلدوه، ثم قال فی الرابعة، فان عاد فی الرابعة فاضربوا عنقه)) ”حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شراب پی لے تو اسے کوڑے لگاؤ، دوبارہ پئے تو پھر کوڑے لگاؤ۔ تیسری مرتبہ پئے تو پھر سے کوڑے لگاؤ اگر چوتھی مرتبہ بھی پینے سے باز نہ آئے تو اسے قتل کر دو۔“

امت کا اجماع ہے کہ اس حدیث پر عمل منسوخ ہے۔ یعنی امت میں کبھی کوئی شخص شراب پینے کی وجہ سے قتل نہیں کیا گیا چاہے کتنی ہی مرتبہ اس کا ارتکاب کرے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کا کہنا ہے کہ اجماع بذات خود منسوخ نہیں کرتا بلکہ وہ منسوخ ہونے کی خبر دیتا ہے۔ یعنی امت کے اس روایت پر عمل نہ کرنے کی خبر۔

حافظ ابن الصلاح کی رائے بھی یہی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں والاجماع لا ینسخ ولا ینسخ ولكن بدل علی وجہہ صاسخ ”اجماع میں خود منسوخ کرنے کی طاقت نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی اور ذریعے سے منسوخ ہو سکتا ہے (یعنی اجماع کی حیثیت کو ختم نہیں کیا جاسکتا) بلکہ وہ روایت کو امت کی طرف سے منسوخ کرنے پر دلالت کرتا ہے۔“

ان چار طریقوں سے نسخ کی معرفت ممکن ہے لیکن اس پر عمل کیلئے ان چار شرطوں کا پورا کرنا لازمی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی۔ ان کے بغیر نسخ کا تحقق ممکن نہیں ہوگا۔

2.3 التریج (ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا)

ترجیح کے لغوی معنی کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا ہیں۔ اصطلاح میں دو حدیثوں میں سے کسی

ایک میں ایسی علامت کا پایا جانا ہے جس کی بنا پر وہ اپنی مخالف حدیث پر فوقیت حاصل کرے۔

دو متعارض حدیثوں میں اگر نہ تو جمع و تطبیق ہو سکے اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکے کہ ان میں متقدم کونسی ہے اور متاخر کون سی تو پھر ان میں سے کسی کو دوسری پر ترجیح دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو ترجیح پا جائے اس پر عمل کیا جاتا ہے اور دوسری کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ترجیحات کے لئے بے شمار اسباب ہیں۔ حافظ ابو بکر حازمیؒ نے ان کی تعداد پچاس بتائی تھی ان کے بعد حافظ ابن الصلاحؒ نے انہیں ایک سو دس تک پہنچا دیا۔ لیکن حافظ سیوطیؒ نے ان سب کو سات بڑی اقسام میں تقسیم کر کے باقی کو ان کے تابع کر دیا ہے۔ انہی کی تقسیم کو یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) راوی کے احوال کی وجہ سے ترجیح:

یہ ان وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے۔

- ۱- کثرت رواۃ: کیونکہ جھوٹ کا احتمال قلت کی بجائے کثرت سے زیادہ بعید اور کم ہے۔
- ۲- قلت وسائل: یعنی علو اسناد۔ سند کے آدمی جتنے کم ہوں گے ان سے جھوٹ اور وہم کا احتمال اتنا ہی کم ہوگا۔
- ۳- فقہ راوی: روایت باللفظ ہو یا بالمعنی۔ ایک عام راوی کی بجائے فقیہ راوی اسے کبھی بھی ظاہری معنی پر محمول نہیں کرے گا۔
- ۴- نحو کا علم: نحو کا علم رکھنے والے سے یہ علم نہ رکھنے والے کے مقابلے میں غلطی کا امکان کم ہے۔
- ۵- لغت کا علم: کیونکہ فہم حدیث میں اس کی بڑی ضرورت ہے۔
- ۶- حافظ حدیث ہونا: اس کے مقابلے میں، جو صرف کتابت پر اعتماد کرے۔
- ۷- افضلیت اس اعتبار سے ہو کہ اس کی شخصیت ان تین میں سے دو میں شمار ہوتی ہو:

(۱) فقہاء (۲) نحاۃ

(۳) حفاظ یعنی اس کا شمار فقیہ و نحوی یا نحوی و حافظ یا فقیہ و حافظ میں ہوتا ہو۔

- ۸- اس میں ضبط کا زیادہ پایا جانا۔
- ۹- شہرت: کیونکہ یہ بھی آدمی کو جھوٹ بولنے سے روکتی ہے۔
- ۱۰- صاحب ورع ہونا یعنی وہ امر جس میں شبہ ہو اسے چھوڑ دے۔
- ۱۱- اچھے عقیدے کا حامل ہونا۔
- ۱۲- صاحب بدعت نہ ہونا۔
- ۱۳- محدثین کی صحبت میں رہنے والا ہونا۔
- ۱۴- دیگر علماء کی صحبت میں رہنے والا ہونا۔
- ۱۵- مرد ہونا۔
- ۱۶- آزاد ہونا۔
- ۱۷- مشہور و معروف نسب والا ہونا۔
- ۱۸- اس کا نام بالکل واضح ہوتا کہ کوئی ضعیف راوی اس کے نام میں شریک نہ ہو سکے اور یوں دونوں میں تمیز مشکل ہو جائے۔
- ۱۹- اس کا ایک ہی نام ہو جو اسے دوسروں کے ساتھ اختلاط سے بچا سکے۔
- ۲۰- اس کی لکھی ہوئی کتاب (مجموعہ حدیث) ہو جس کی طرف بوقت ضرورت رجوع کیا جاسکے۔
- ۲۱- اس کی بدالت بذریعہ روایات ثابت ہو نہ کہ کسی قسم کے تزکیے کے ذریعے یا اس کی یا روایت پر عمل کے ذریعے۔ یا اس سے روایت کے ذریعے۔
- ۲۲- اس کا مرتبہ بھی اس کی روایت پر عمل کرتا ہو۔
- ۲۳- اس کا مرتبہ بھی اس کے مخالف کی روایت پر عمل نہ کرتا ہو۔
- ۲۴- لوگوں کا اس کی عدالت پر اتفاق ہو۔
- ۲۵- اس کی تعدیل کا سبب بیان کیا گیا ہو۔

- ۲۶- اس کے مرتکبین کی تعداد بہت بڑی ہو۔
- ۲۷- ان کا تعلق علماء سے ہو اور وہ لوگوں کے احوال کی چھان بین کرنے والے ہوں۔
- ۲۸- وہ خود صاحب قصہ ہو جیسے نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے ام سلمہؓ کی روایت کی فضیلت ابن عباسؓ کی روایت پر کیونکہ وہ اس میں خود صاحب قصہ ہیں اور ابن عباسؓ صاحب قصہ نہیں ہیں۔ ام سلمہؓ کی روایت یہ ہے کہ نبی اکرم نے اس شخص کو جو جنابت کی حالت میں حج کرے روزہ رکھنے کی اجازت دی جبکہ ابن عباسؓ اس سے منع کرتے ہیں ظاہر ہے ام سلمہؓ اس معاملے کو ابن عباسؓ سے زیادہ جانتے والی ہیں۔
- ۲۹- جو روایت کرے اس پر عمل پیرا بھی ہو۔
- ۳۰- اس کا اسلام متاخر ہو۔ اس کے برعکس بھی قول مذکور ہے یعنی اس کا اسلام متقدم ہو۔ اگر اسلام متاخر ہوگا تو حضور کے آخری فرامین کا اسے علم زیادہ ہوگا اور اگر متقدم ہوگا تو ناخ اور منسوخ دونوں کو جانتا ہوگا۔
- ۳۱- اس نے اپنی مرویات کو اچھے طریقے سے رکھا ہو۔
- ۳۲- یہ مرویات اس سے قریب ترین جگہ پر ہوں۔
- ۳۳- اس کو اپنی مرویات کی تعداد معلوم ہو۔
- ۳۴- اس نے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے مشائخ کی صحبت میں گزارا ہو۔
- ۳۵- اس نے اپنے بلد (شہر) کے مشائخ سے حدیث سنی ہو۔
- ۳۶- روایت حاصل کرتے وقت اس نے خود اپنے شیخ کے زبان سے یہ روایت سنی ہو۔
- ۳۷- وہ روایت بالمعنی کو جائز نہ سمجھتا ہو۔
- ۳۸- اکابرین صحابہ میں کوئی اس کا راوی ہو جیسے علیؓ قضاء سے متعلق روایات میں، معاذ حلال و حرام سے متعلق روایات میں، اور زیدؓ وراثت سے متعلق روایات میں۔
- ۳۹- اس کی روایت کی سند جازی ہو۔

۳۰- اس کی سند رواۃ کا تعلق اس شہر سے ہو جو تہذیب کو درست نہ سمجھتے ہوں۔

(ب) راوی کے تحمل (روایت حاصل کرنے کے) کی وجہ سے ترجیح:

یہ ان وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے:

۱- وقت: جس نے بلوغت کے بعد حدیث کا تحمل کیا اسکی ترجیح اس شخص پر جس نے بعض مرویات کا تحمل بلوغت سے پہلے کیا اور بعض کا بلوغت کے بعد۔ اس بنیاد پر کہ اس میں اختلاط کا اندیشہ ہے اور بلوغت کے بعد کا تحمل ضبط کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔

۲- ایک راوی کا تحمل حدیث اگر ”حدثاً“ سے ہو اور دوسرے کا ”عرض“ سے تو حدثاً والا قابل ترجیح ہوگا۔ یا ایک کا تحمل حدیث ”عرض“ سے ہو اور دوسرے کا ”کتابت“ سے تو عرض والا کتابت والے پر ترجیح پائے گا۔

۳- ایک کا تحمل حدیث مناولہ سے ہو اور دوسرے کا وجاہدہ سے تو مناولہ والا وجاہدہ والے پر ترجیح پائے گا۔

(ج) کیفیت روایت کے لحاظ سے ترجیح

یہ ان وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے

۱- روایت باللفظ کی ترجیح روایت بالمعنی پر کیونکہ روایت بالمعنی میں روایت باللفظ کے مقابلے میں شک کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔

۲- جس میں سبب ورود ذکر کیا گیا ہو اس کی ترجیح اس پر جس میں یہ نہ ہو کیونکہ راوی کا سبب جاننا اس کے اہتمام پر دلالت کرتا ہے۔

۳- راوی کو نہ تو اس میں شک ہو اور نہ وہ اس کا انکار کرے۔

۴- راوی کے الفاظ روایت کے متصل ہونے پر دلالت کرتے ہوں جیسے ”حدثاً“ اور ”سمعت“

- ۵- اس کے مرفوع ہونے پر اتفاق ہو۔
- ۶- اس کے موصول ہونے پر اتفاق ہو۔
- ۷- اس کی روایت کی اسناد میں اختلاف نہ ہو۔
- ۸- اس کی روایت کے الفاظ میں اضطراب نہ ہو۔
- ۹- ایسا نہ ہو کہ اس کی اسناد سے روایت کرنے کے بعد اس کی نسبت کسی معروف کتاب سے کردی گئی ہو۔
- ۱۰- اسے عزیز یا مشہور نہ بنا دیا گیا ہو۔

(د) روایت کے وقت ورود کے لحاظ سے ترجیح
یہ ان وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے:

- ۱- مدنی کی مکی پر ترجیح۔ اس کی وجہ نبی اکرم کی اعلیٰ شان ہے۔ پھر اسلام کے میں ضعیف تھا اور مدینے میں طاقت ور۔
- ۲- شہرت۔ یہ اس کے متاخر ”علو“ پر دلالت کرتی ہے۔
- ۳- جس میں تخفیف (مکی یا آسانی) پائی جائے اس کی ترجیح اس پر جس میں یہ نہ ہو کیونکہ یہ اس کے متاخر ہونے پر دلالت کرتی ہے شروع شروع میں نبی اکرم ﷺ جاہلیت کی عادات پر ڈانٹ ڈپٹ فرمایا کرتے تھے پھر آپ نے اسے ترک فرمایا اور تخفیف کی طرف مائل ہو گئے۔ آمدی، ابن ماجہ اور صاحب منہاج کی یہی رائے ہے۔
- بعض نے اس کے برعکس تغلیظ (ڈانٹ ڈپٹ) کو ترجیح دی ہے کہ وہی حق ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ سب سے پہلے اسلام کی دعوت لے کر اٹھے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ عبادات مقرر ہوئیں۔
- ۴- اسلام لانے کے بعد جس کا تحمل کیا ہے اس کی ترجیح اس پر جس کا اسلام لانے سے پہلے تحمل

کیا ہے۔ کیونکہ اسلام لانے کے بعد والا زیادہ واضح ہے۔

- ۵۔ جس کی تاریخ معلوم نہ ہو اس کی ترجیح اس پر جس کی تاریخ بھی معلوم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ وہ مقدم ہے۔
- ۶۔ جو روایت آپ ﷺ کی وفات سے قریب تر زمانے کی ہو اس کی ترجیح اس پر جس کا زمانہ معلوم نہ ہو۔

ھ) روایت کے الفاظ کے لحاظ سے ترجیح

یہ ترجیح ان وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے۔

- ۱۔ خاص کی عام پر ترجیح
- ۲۔ عام جو خاص نہ کیا گیا ہو اس کی ترجیح جو خاص کر دیا گیا ہو کیونکہ خاص ہونے کے بعد اس کی دلالت باقی افراد پر کمزور ہو جاتی ہے۔
- ۳۔ مطلق کی ترجیح اس پر جو کسی خاص سبب کی وجہ سے وارد ہو۔
- ۴۔ حقیقت کی ترجیح مجاز پر۔
- ۵۔ حقیقت سے مشابہ مجاز کی ترجیح حقیقت غیر مشابہ پر۔
- ۶۔ قانونی کی ترجیح غیر قانونی پر۔
- ۷۔ عرف کی ترجیح لغت پر۔
- ۸۔ مستغنی کی ترجیح مضمیر پر۔
- ۹۔ جس میں ابہام ہو اس کی ترجیح اس پر جس میں ابہام زیادہ ہو۔
- ۱۰۔ جس کے کسی اسم کے لئے وضع ہونے پر اتفاق ہو اس کی ترجیح اس پر جس کے لئے کوئی اتفاق نہ پایا جائے۔
- ۱۱۔ جس میں کوئی اشارہ پایا جائے اس کی ترجیح اس پر جس میں کوئی علت پائی جائے۔

- ۱۲- منطوق کی ترجیح غیر منطوق پر۔
- ۱۳- موافق مفہوم کی ترجیح غیر موافق پر۔
- ۱۴- جس کے حکم کے لئے نص موجود ہو اور اس کی کسی اور جگہ سے بھی مشابہت ہوگی ترجیح اس پر جس میں یہ دونوں نہ پائے جائیں۔
- ۱۵- وہ مستفاد جس کا عموم اسی کی شرط سے منسلک ہو کی ترجیح اس پر جس میں یہ نہ ہو۔
- ۱۶- جزاء کی ترجیح منفی نکرے پر۔
- ۱۷- جمع المعروف (بالالف واللام) کی ترجیح من و ما پر۔
- ۱۸- جمع المعروف (بالالف واللام) کی ترجیح من پر جس کا اطلاق کل پر ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی معرف بالالف واللام کی جنس سے ہے۔
- ۱۹- خطاب تکلفی کی ترجیح وضعی پر۔
- ۲۰- معقول المعنی حکم کی ترجیح غیر معقول المعنی پر۔
- ۲۱- جس میں علت ذکر کی گئی ہو اس کی ترجیح اس پر جس میں علت مذکور نہ ہو۔
- ۲۲- جس کے حکم پر اس کا اشتقاق دلالت کرے اس کی ترجیح اس پر جس میں یہ نہ ہو۔
- ۲۳- جس میں کوئی دھمکی پائی جائے اس کی ترجیح اس پر جس میں دھمکی نہ ہو۔
- ۲۴- جس میں دھمکی زیادہ سخت ہو اس کی ترجیح اس پر جس میں یہ زیادہ سخت نہ ہو۔
- ۲۵- تکرار کے ساتھ تاکید والے اور فصیح کی ترجیح غیر مکرر اور غیر فصیح پر۔
- ۲۶- لغت قریش کی ترجیح غیر لغت قریش پر۔
- ۲۷- جو اپنے معنی مطلوب پر دو یا اس سے زیادہ وجوہات سے دلالت کرے اس کی ترجیح اس پر جس میں یہ نہ ہو۔
- ۲۸- جو کسی واسطے سے نہ ہو اس کی ترجیح جو کسی واسطے (توسط) سے ہو۔
- ۲۹- جس کے ساتھ اس کا معارض (مخالف) بھی مذکور ہو اس کی ترجیح اس پر جس کے ساتھ یہ نہ

ہو۔ جس کی مثال یہ حدیث ہے: ”میں نے تمہیں زیارت قبور سے منع کیا تھا لیکن اب تم ان کی زیارت کر لیا کرو کیونکہ یہ آخرت کو یاد دلاتی ہیں۔“

۳۰۔ جس میں ساتھ نص مذکور ہو اس کی ترجیح اس پر جس کے ساتھ کوئی نص نہ ہو۔

۳۱۔ جس کے ساتھ کوئی قول ہو اس کی ترجیح اس پر جس کے ساتھ کوئی قول نہ ہو۔

۳۲۔ جس کے قول کے ساتھ اس کا عمل بھی ہو کی ترجیح اس پر جس کے قول کے ساتھ اس کا عمل نہ ہو۔

۳۳۔ جس راوی کی روایت کے ساتھ اس کی تفسیر بھی ہو اس کی ترجیح اس پر جس کی روایت کے ساتھ تفسیر نہ ہو۔

۳۴۔ جس کا حکم کسی صفت کیساتھ مذکور ہو لیکن اس میں نام بھی پایا جائے اس کی ترجیح اس پر جس میں صرف صفت ہی ہو۔

۳۵۔ جس میں زیادہ صفات پائی جائیں اس کی ترجیح اس پر جس میں کم ہوں۔

(و) حکم کی وجہ سے ترجیح:

یہ ان وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے

۱۔ اپنے اوپر واجب الادا ذمہ داری کو ادا کرنے کے بعد روایت نقل کرنے والے کی ترجیح اس پر جس نے یہ ادا نہ کی ہوں۔

۲۔ جس میں حرمت ذکر کی گئی ہو اس کی ترجیح اس پر جس میں مباح ہونا یا واجب ہونا ذکر کیا گیا ہو۔

۳۔ جس روایت میں زیادہ احتیاط برتی گئی ہو اس کی ترجیح اس پر جس میں احتیاط نہ ہو۔

۴۔ جس میں کسی حد کی نفی کی گئی ہو اس کی ترجیح اس پر جس میں نفی نہ ہو۔

(ز) کسی خارجی امر کی وجہ سے ترجیح

یہ ان وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے:

- ۱- ظاہر قرآن اس کے موافق ہو۔
 - ۲- کوئی اور سنت اس کی موید ہو۔
 - ۳- پہلے لوگوں کی شریعت یا قیاس یا امت کا عمل اس کا موید ہو۔
 - ۴- خلفاء راشدین کا کوئی عمل اس کا موید ہو۔
 - ۵- اسے کسی اور مرسل یا منقطع کی تائید حاصل ہو۔
 - ۶- اس سے صحابہ کرام کے لئے کسی قسم کی تشنیع محسوس نہ ہوتی ہو۔
 - ۷- اس کے حکم پر کوئی متفق علیہ نظیر ہو۔
 - ۸- اس کے اخراج پر شیخین (بخاری و مسلم) کا اتفاق ہو۔
- سات مختلف عناوین کے تحت یہ تقریباً ایک سوزاند ترجیح کی وجوہ ہیں اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے زیادہ ذکر کی ہیں۔

2.4 التوقف (رک جانا)

توقف عربی زبان میں رک جانے کو کہتے ہیں مشہور مقولہ ہے: ”توقف عن الامرای امسک عنه“ وہ حکم جاری کرنے سے رک گیا۔ یعنی اس نے وہ کام چھوڑ دیا۔

اصطلاح میں توقف دو متعارض حدیثوں میں سے کسی ایک پر بھی عمل نہ کرنے کا نام ہے۔ توقف دو متعارض حدیثوں پر عمل کرنے کے لئے ترتیب کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر آتا ہے۔ نہ تو اس پر عمل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس پر عمل کرنے کیلئے کہا جاسکتا ہے جب تک اس سے پہلے تین مذکورہ قاعدوں پر عمل ناممکن نہ ہو جائے اور وہ یہ ہیں: جمع، النسخ، اور الترجیح۔

جب ان پر عمل ممکن نہ رہے تو پھر توقف کی باری آئے گی اور توقف پر عمل اس وقت تک ہوگا جب تک وجوہ ترجیح میں کوئی ترجیح ظاہر نہ جائے۔

حافظ سخاوی کہتے ہیں: ”اگر مجتہد کے لئے کوئی وجہ ترجیح ظاہر نہ ہو تو وہ دونوں حدیثوں پر عمل کرنے سے رک جائے یہاں تک کہ اسے یا کسی اور عالم کو کوئی وجہ ترجیح مل جائے۔“ کیونکہ جو چیز اس پر مخفی ہے ضروری نہیں کہ وہ دیگر علماء پر بھی مخفی ہی رہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ”کسی ایک حدیث کے دوسری پر ترجیح پانے کی وجہ جو صرف ان مشکل حالات میں اس عالم پر مخفی ہے کل دوسروں پر ظاہر ہو جائے اور یوں دو حدیثوں میں کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دینا ممکن ہو جائے۔“

بعض علماء کی یہ رائے بھی ہے کہ اگر کوئی وجہ ترجیح نہ ملے تو عالم جس حدیث پر چاہے عمل کر سکتا ہے۔ اب چاہے تو ہمیشہ اس پر عمل کرتا رہے۔ یا کچھ وقت کے لئے اس پر عمل کرے اور پھر چھوڑ دے اور کچھ وقت کے لئے دوسری پر عمل کرے۔

خود آزمائی ②

- ۱- اختلافات کے بنیادی اصول کیا ہیں؟
- ۲- کوئی سی دو متعارض حدیثوں کے درمیان جمع و تطبیق کریں۔
- ۳- نسخ کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں؟
- ۴- نسخ پر عمل کرنے کے لئے چار شرطیں کونسی ہیں؟
- ۵- ناسخ اور منسوخ کے ذریعے اختلاف الحدیث دور کرنے کی غرض سے کوئی ایک مثال دیں؟
- ۶- حافظ ابوبکر حازمی نے ترجیح کے کتنے اسباب ذکر کئے ہیں؟
- ۷- حافظ ابن الصلاح نے ان کی تعداد کتنی بتائی ہے۔
- ۸- حافظ سیوطی نے ان سب کو کتنے عناوین میں تقسیم کیا ہے؟
- ۹- حافظ سیوطی کے بیان کردہ اسباب ترجیح کو بیان کریں؟
- ۱۰- توقف کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں؟

③ اختلاف الحدیث کے موضوع پر لکھی جانے والی مشہور کتابیں

اختلاف الحدیث کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے بہت سے ائمہ کرام نے قلم اٹھایا۔ بعض نے سب مختلف احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی، بعض نے جو احادیث انہیں ملیں انہی کے درمیان سے اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی اور بعض نے اپنے تصور کے مطابق جن احادیث کو معارض سمجھا ان کے درمیان سے اختلاف کا ازالہ کیا اور ان کے مقصود کو بیان کیا۔

اختلاف الحدیث مصنفہ امام شافعی

یہ اس فن میں پہلی تصنیف ہے جسے امام شافعی متوفی ۲۰۲ ہجری نے لکھا اس سے پہلے کی لکھی ہوئی کوئی تصنیف آج تک ہمیں نہیں مل سکی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس کتاب میں اس موضوع پر تمام احادیث کو جمع نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس فن کی بعض احادیث کو اپنی کتاب میں ذکر کر کے ان کے درمیان جمع و تطبیق دے دی اور ان کے تعارض کو دور کیا تاکہ علماء کے لئے ایک مثال قائم ہو جائے۔

تاویل مختلف الحدیث مصنفہ ابن قتیبہ

امام شافعی کے بعد اس فن میں مشہور کتاب حافظ عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ ہجری کی کتاب تاویل مختلف الحدیث ہے۔ انہوں نے یہ کتاب مخالفین حدیث کے رد میں لکھی جنہوں نے محدثین پر یہ الزام لگایا تھا کہ انہوں نے متناقض روایات جمع کی ہیں اور یوں احادیث رسول سے استفادہ کو ناممکن بنا دیا ہے۔ اس کتاب میں ابن قتیبہ نے مخالفین کے اعتراضات کا ایک ایک کر کے جواب دیا۔ اسی وجہ سے اس کتاب کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور آج تک علماء کے لئے استفادے کا باعث ہے یہ کتاب اپنے وقت کی

ثقافت کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ اور بار بار طبع ہو چکی ہے۔

مشکل الآثار مصنفہ امام طحاوی

ابن قتیبہ کے بعد لکھی جانے والی مشہور کتاب مشکل الآثار ہے۔ اس کے مصنف ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ طحاوی ہیں جن کی وفات ۳۲۱ ہجری میں ہوئی۔ یہ اپنے وقت کے بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ انہوں نے بہت سے فقہاء اور محدثین کا زمانہ پایا اور ان میں سے بہت سی شخصیات سے استفادہ بھی کیا۔ اس فن پر ایک جامع کتاب مرتب کی جس سے اب تک علماء مستفید ہوتے آرہے ہیں یہ کتاب کئی مقامات سے کئی بار چھپ چکی ہے۔

مشکل الحدیث و بیانہ مصنفہ ابن فورک

یہ کتاب ابو بکر محمد بن حسن بن فورک انصاری اصفہانی متوفی ۴۰۶ ہجری کی تصنیف ہے جو ابن فورک کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانہ کی ان مشہور حدیثوں کو جمع کیا جن سے بظاہر تشبیہ یا تجسیم یا تعارض ثابت ہوتا تھا۔ اور ملحد (بے دین) لوگ ان احادیث کو دین اسلام پر طعن و تشنیع کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ ان احادیث کو جمع کر کے ابن فورک نے ان حدیثوں کا اصل مقصود بیان کیا۔ ان کے درمیان مختلف ذرائع سے تطبیق دی اور مخالفین اسلام اور مخالفین حدیث و سنت کو تمام اعتراضات کا جواب دے کر ان کو باطل ثابت کر دیا۔ یہ کتاب احادیث رسول کے بارے میں بہت سی عقلی اور نقلی دلائل اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ کتاب عرب دنیا اور ہندوستان سے کئی بار طبع ہو چکی ہے اور علماء اس سے مسلسل استفادہ کر رہے ہیں۔

خود آزمائی ③

- ۱- اختلاف الحدیث میں سب سے پہلی کتاب کس نے لکھی؟
- ۲- ابن قتیہ کی کتاب کا پورا نام لکھیں؟
- ۳- مشکل الآثار کس کی تصنیف ہے؟
- ۴- ابن فورک کی کتاب کا پورا نام کیا ہے؟
- ۵- ابن قتیہ اور ابن فورک کی کتابیں کیوں زیادہ مشہور ہوئیں؟

④ غرابت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

’غرابت‘ کے لغوی معنی

غرابت کو عربی زبان کے اعتبار سے الغرابة لکھا جاتا ہے۔ اس لفظ کے اصلی مادے میں تین حروف غ۔ر۔ب۔ پائے جاتے ہیں۔ گویا کہ لفظ الغرابة یا غرابت ان سے مشتق ہے۔ اسی طرح ان حروف سے نکلنے والے دیگر مشتقات بھی ہیں مگر سب کے سب میں بعد کا معنی پایا جاتا ہے جو ان مثالوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے:

- ۱- الغربة ای البعد عن الوطن..... غربت یعنی وطن سے دوری۔
- ۲- غربت الدار..... گھر دور رہ گیا۔
- ۳- غرب فلان ای تنحى..... فلان بہت دور چلا گیا۔
- ۴- غربت الکلاب ای ذھبت وراء الصيد بعیدا..... کتے شکار کے پیچھے بہت دور تک چلے گئے۔
- ۵- غروب الشمس - بُعدھا عن وجه الارض..... سورج کا زمین سے بہت دور چلے جانا۔
- ۶- هل من مغربة خبر - ای خبر اتی من بعید..... کیا دور سے کوئی خبر آئی ہے۔
- ۷- الرجل الغریب - الذی لا یكون من الاقارب..... وہ آدمی جو رشتے داروں میں سے نہ ہو۔
- ۸- اغترب فلان - اذا تزوج فی غیر اقاربه..... جب کوئی اپنے رشتے داروں

سے باہر کہیں شادی کر لے۔

۹- التغریب - النفی عن البلد..... اپنے وطن سے دور کہیں اور بھیج دیا جانا۔

۱۰- الغریب من الکلام- الغامض - خفی المعنی، بعید عن الفہم- غیر واضح..... جس کے معنی ظاہر نہ ہو۔ سمجھ سے دور ہو۔

گویا ہر مشتق میں دوری کے معنی ہیں خواہ اس کا تعلق کسی بھی چیز سے کیوں نہ ہو۔

غرائب کا مفہوم علماء لغت کی نظر میں:

جا حظ بڑے مشہور لغوی ہیں ان کی نظر میں: ”غرائب ان الفاظ کا استعمال ہے جن کے معنی غامض ہوں اور ان میں سے بعض تو علماء لغت سے بھی مخفی ہوں۔ ان سے قبل ابوطیب لغوی نے بھی اس سے ملتی جلتی تعریف کی تھی۔ ان کے نزدیک بھی ”غریب وہ الفاظ ہیں جن کا معنی ظاہر نہ ہو اور وہ اس کے متقاضی ہوں کہ کوئی ان کا معنی ظاہر کرے“۔ گویا کہ وہ الفاظ ہیں جو اپنی تفسیر کے متقاضی ہوں۔

غرائب کا مفہوم علماء اصول حدیث کی نظر میں

محدثین نے غریب کو دو اعتبار سے لیا:

۱- روایت حدیث کی اصطلاح کے اعتبار سے جس کا تعلق سند سے ہے۔

۲- متن حدیث کے اعتبار سے جس کا تعلق نص سے ہے اس کیلئے انہوں نے بڑی باریک بینی کا مظاہرہ کیا اور اس کے لیے الگ الگ علامت مقرر کی۔

وہ غرائب جس کا تعلق سند سے ہو اسے الف لام سے معرف کر دیتے ہیں یعنی ”الغریب من الحدیث“ گویا یہ اسی طرح روایت حدیث کی ایک قسم بن جاتی ہے جس طرح کہا جائے گا الغریب من الحدیث۔ یہ وہ روایت ہے جس کا روایت کرنے والا ہر طبقے میں ایک ہی فرد پایا جائے۔

جس غرائب کا تعلق متن سے تھا اسے انہوں نے بغیر الف اور لام کے بیان کیا اور اس کی اضافت

لفظ حدیث کی طرف کردی تاکہ واضح ہو جائے۔ جب محدثین کہتے ہیں کہ یہ غریب الحدیث میں سے ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس حدیث کے متن میں غریب الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور یہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جو شرح یا تفسیر کے محتاج ہوتے ہیں غریب کے معانی پر اہل لغت اور محدثین دونوں کا اتفاق ہے کہ اس کا اطلاق غامض الفاظ پر ہی ہوتا ہے۔

محدثین میں سے سب سے پہلے امام ابو عبد اللہ الحاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب میں اس غریب کا ذکر کیا۔ وہ لکھتے ہیں: وانا ذاكر في هذا الموضوع من الحديث ما لم يذكره واحد منهم أي من مصنفی غریب الحدیث 'ليستدل به على شواهد' ”اب میں حدیث کے موضوعات میں سے ایک ایسے موضوع کا ذکر کروں گا جس کا پہلے مصنفین میں سے کسی نے بھی ذکر نہیں کیا تاکہ اس کے شواہد سے استدلال کیا جاسکے“۔ اسکے بعد انہوں نے بعض غریب الفاظ ذکر کئے جیسے 'الحذیا'، 'بغیش' وغیرہ۔ اسے انہوں نے متن حدیث کے غریب الفاظ کی معرفت کا نام دیا۔

ان کی اس عبارت سے جو چیز واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ غریب الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جو غیر واضح ہونے کی وجہ سے تفسیر یا شرح کے محتاج ہوں۔

حافظ ابن الصلاح نے ان کے لئے یہ عنوان تجویز کیا: عبارة عما وقع في متون الاحاديث من الالفاظ الغامضة البعيد عن الفهم لقللة استعمالها ”متون احادیث میں وارد وہ الفاظ جو غامض اور قلت استعمال کی وجہ سے سمجھ سے دور ہیں“۔ انہوں نے لکھا کہ ان کی معرفت بڑی اہم ہے ان محدثین کے لئے ان سے ناواقفیت ایک عیب ہے۔ ان میں ماہر ہونا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ لیکن اس میں مہارت قابل تعریف ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ امام احمد بن حنبل سے کسی نے غریب لفظ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا: ”علماء غریب سے اس کے بارے میں پوچھ لو۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اللہ کے رسول کے کلام میں اپنی رائے سے بات کروں (یعنی علم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی مرضی سے بات کروں) اور غلطی کر

جاؤں۔“

امام احمد کے کلام میں علماء غریب سے مراد ”وہ علماء ہیں جن کی علم غریب میں تصنیفات ہیں خواہ ان کا تعلق علماء لغت سے ہے یا محدثین سے۔“

خود آزمائی ④

- ۱۔ لفظ غرابت کے لغوی معنی بیان کریں؟
- ۲۔ ابو طیب لغوی نے غرابت کی تعریف کیا کی ہے۔
- ۳۔ علماء اصول الحدیث کے ہاں غرابت کی کون سے دو قسمیں ہیں؟
- ۴۔ الغریب من الحدیث سے کیا مراد ہے؟
- ۵۔ غریب الحدیث کا کیا مطلب ہے؟

⑤ اسباب غرابت

اسباب غرابت پر بات کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ غریب الفاظ کا مفہوم یہ طے پایا تھا کہ وہ مبہم، غیر واضح یا شرح کے محتاج الفاظ ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ تو فصیح العرب تھے۔ آپ نے ایسے الفاظ کا استعمال کیوں فرمایا؟ تو اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ آپ ہر طبقے کے افراد سے مخاطب ہوتے تھے اور اس کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو فرماتے تھے تو اس طرح جب آپ اعلیٰ طبقہ کی ثقافت کو سامنے رکھتے تو یہ چیزیں وہ تو سمجھ جاتے لیکن دوسروں کی سمجھ میں کبھی نہ بھی آئیں۔ وہ کبھی تو اس وقت آپ سے رجوع کرتے تو آپ وضاحت فرما دیتے اور کبھی بعد میں رفتہ رفتہ خود بخود ان کی سمجھ میں آ جاتیں۔ اس کی مزید وضاحت اس قصبے سے ہو جاتی ہے۔

طہفہ بن ابی زبیر نہدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے اس سے گفتگو فرمائی۔ اور اس کے ہاتھ اس کے قبیلے کی طرف ایک خط بھی روانہ فرمایا جس میں آپ ﷺ نے ایسی فصیح و بلیغ زبان استعمال فرمائی کہ آپ کے بعض رفقاء بھی حیران رہ گئے جس پر حضرت علیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ وفود عرب سے کبھی کبھار ایسی گفتگو فرماتے ہیں کہ اس میں اکثر ہماری سمجھ میں نہیں آتی جبکہ ہم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں یعنی ہمارا قبیلہ ایک ہی ہے اور ہماری ثقافت بھی یہیں کی ہے۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: ((أَدْنَى رِبِّي فَاحْسَن تَادِيْبِي)) ”میرے رب نے مجھے ادب سکھایا ہے اس لئے میری ادبی تربیت بڑی اچھی ہوئی ہے۔“

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ غرابت کا تعلق حضور کی ذات سے نہیں بلکہ سامعین کی ثقافت کے مختلف درجات سے ہے یہ صرف حدیث میں نہیں بلکہ عربی زبان میں بھی پائی جاتی ہے اور دنیا کی تمام زبانوں کا حصہ ہے کوئی بھی زبان اس سے خالی نہیں۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مفہوم ایک زمانے میں تو واضح ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ان الفاظ کا استعمال کم ہو جاتا ہے اور یہی واضح الفاظ دوسرے زمانے میں غریب نظر آنے لگتے ہیں۔ محدثین نے غریب الحدیث کے ضمن میں کتب غریب میں جو الفاظ جمع کئے ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق اسی سے ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ان الفاظ کا استعمال کم ہو گیا اور یوں وہ بعد والوں کو غریب نظر آنے لگے۔

اس کے علاوہ ماہرین لغت نے غرابت کے کچھ اور بھی اسباب بیان کئے ہیں جنہیں انہوں نے دوحصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱- داخلی اسباب

۲- خارجی اسباب

5.1 داخلی اسباب

۱- مشترک

کسی لفظ میں ایک سے زائد معانی پائے جائیں تو ماہرین لغت کی اصطلاح میں یہ لفظ ”مشترک“ کہلاتا ہے۔ مشترک کا استعمال انسانی کلام کا خاصا ہے چنانچہ بعض ماہرین لغت نے اس کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے: ”ایک لفظ کے ذریعے متعدد دلالات کی تعبیر انسانی کلام کی خصوصیت ہے کسی بھی معجم یا قاموس پر ڈالی گئی ہماری ایک نظر ہی اس کی تائید کر دیتی ہے۔“ ماہرین لغت کی نظر میں مشترک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک لفظ متعدد معانی کے لئے استعمال اس زبان کے بولنے والوں کے لئے بہت سی راہیں کھولتا ہے اور وہ حسب ضرورت اس لفظ کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے زبان کو ترقی ملتی ہے اور اس سے ادب اور شعرو وجود میں آتے ہیں اور ہر زبان پر اس کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

(۱) مشہور حدیث ہے: ((لیس منا من لم یغن بالقروآن)) ”جو آدمی قرآن کو اچھی آواز

سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔“ اس حدیث میں لفظ تغنی اہل لغت اور اہل فقہ و حدیث میں محل بحث ہے۔ اور بحث کی وجہ اس لفظ میں ایک سے زائد معنی کا پایا جانا ہے۔ فقہاء میں امام شافعی اور ان کے بعد محدثین میں امام خطابی کے ہاں تغنی بالقرآن کا مفہوم یہی ہے کہ انسان جس قدر ممکن ہو اپنی آواز کو خوبصورت بنا کر قرآن پڑھے۔ لیکن اہل لغت وائمہ غریب حدیث میں سے ابو عبیدہ قاسم بن سلام اس طرف گئے ہیں کہ یہاں تغنی بالقرآن سے مراد قرآن کے ذریعے استغناء یعنی قناعت حاصل کرنا ہے نہ کہ غناء (گانا گانے والی آواز) ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ۔ عبد اللہ بن نہیک روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حضرت سعد کے پاس گیا تو اس کے پاس بڑا پرانا گھریلو سامان دیکھا جس سے ان کی غربت عیاں تھی۔ میرے ان کی غربت پر ترس کھانے پر انہوں نے مجھے حضور ﷺ کی یہ حدیث سنائی: ((لیس منّا من لم یتغن بالقرآن)) ”وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ذریعے قناعت حاصل نہ کرے۔“ اس کی وضاحت وہ ایک اور حدیث سے بھی کرتے ہیں۔ جو یہ ہے: ”جس نے سورۃ آل عمران پڑھی تو وہ غنی ہو گیا۔“ یہاں غنی سے مراد استغناء یعنی قناعت ہے۔ اس طرح سابقہ حدیث میں تغنی سے مراد قرآن کی تلاوت کے ذریعے استغناء یعنی قناعت حاصل کرنا ہے۔ درحقیقت دونوں معنی صحیح ہیں اور اس لفظ میں دونوں پائے جاتے ہیں یہ لفظ مشترک کی قبیل سے ہے۔

(۲) نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((ان منبری هذا علی ترع من ترع الجنة)) ”بے شک میرا یہ منبر جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہے۔“ لفظ ترع تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

۱- دروازہ

۲- درجہ

۳- باغ

(۳) آپ کا ایک اور فرمان ہے: ((لا یتروک فی الاسلام مفرج)) ”اسلام میں مقتول کو یونہی نہیں چھوڑ دیا جاتا“ (بلکہ اس کے قاتل کو سزا دی جاتی ہے)۔ لفظ مفرج بھی چار مختلف معانی میں مستعمل ہے۔

- ۱- ایسا مقتول جو گاؤں کے قریب پائے جانے کے بجائے کسی صحراء میں پایا جائے۔
- ۲- ایسا آدمی جو ایمان تو لے آئے مگر جس ہاتھ پر ایمان لائے اس کی طرف اپنی ولاء (نسبت) نہ کرے۔
- ۳- جس کے گھر کا دیوان (یعنی بڑا صحن) نہ ہو۔
- ۴- کسی قوم میں کسی دوسری قوم کا فرد موجود ہو تو ضروری ہے کہ وہ اس سے استفادہ کریں۔

(۴) مشہور حدیث ہے: ((الشیب یعرب عنها لسانها)) ”شیبہ (رندوی) اپنی زبان سے قبول کرنے کا اظہار کرے“۔ اس حدیث میں لفظ عرب (شد کے ساتھ) تین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

- ۱- کسی قوم کی نمائندگی میں بات کرنا اور ان کے حق میں دلائل دینا۔
- ۲- کسی کام کو خراب کر دینا۔
- ۳- خراب زبان استعمال کرنا۔

۲- اختلاف لہجات

اختلاف لہجہ بھی غرابت کا ایک سبب ہے۔ امام خطابی نے اسے بھی غرابت کے اسباب میں سے قرار دیا ہے اور اس سے مراد کسی ایسے شخص کا لہجہ لیا ہے جو بہت دور کا رہنے والا ہو اور ایسا لفظ استعمال کرتا ہو جو ان مخاطبین کے لئے دوری کی وجہ سے غیر معروف ہو۔

جہاں تک نبی اکرم ﷺ کی ذات کا تعلق ہے تو آپ عرب دنیا سے آنے والے مختلف افراد سے گفتگو کرتے تھے۔ ان وفود سے مخاطب ہوتے ہوئے ان کے معیار ثقافت پر گفتگو ہی شان نبوی تھی جیسا کہ طہرہ بن ابی زبیر نہدی کے ساتھ آپ کی گفتگو کا قصہ گزر چکا ہے۔

اس کے علاوہ آپ اکثر بدو حضرات سے ان کے معیار کے مطابق ان کے لہجوں میں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح معاشرے کے دیگر مختلف طبقات سے گفتگو میں ان کے مرتبہ و منزلت اور ثقافت ہمیشہ آپ کے پیش نظر ہوتی تھی۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک رئیس قبیلہ اور ایک بدو کی ثقافت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس ضمن میں خود آپ کا اپنا ہی فرمان بھی موجود ہے: ((كَلِمَةُ النَّاسِ بِقَدْرِ عَقُولِهِمْ)) ”لوگوں سے ان کی عقلوں (یعنی علم و ثقافت) کو سامنے رکھ کر گفتگو کرو“۔

اگر ایسا نہ کیا جائے تو لوگ بات سمجھ نہیں پاتے۔ اگر ان کے معیار سے کم ہو تو مذاق اڑاتے ہیں اور معیار سے بلند ہو تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر گفتگو کرنے کی وجہ سے غریب الفاظ کا وجود میں آنا یقینی بات تھی۔ آپ ﷺ کے سامنے ان مختلف قبائل کے لہجات کو استعمال کرنے کی دو وجوہات تھیں۔

۱۔ بعض اوقات وہ لوگ قریشی لہجہ اچھی طرح سمجھتے ہی نہ تھے۔ جیسے بدو وغیرہ جو باہر سے آتے تھے اور دین کی بات ان کو سمجھانا آپ کا مقصد ہوتا تھا۔

۲۔ کچھ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہوتے تھے جب آپ ﷺ ان کا لہجہ استعمال فرماتے تھے تو یہ ان کی خوشی اور تالیف قلب کا باعث ہوتا تھا۔

آپ ﷺ کے دوسرے قبائل کے لہجات کی استعمال کرنے کی چند مثالیں یہ ہیں:

۱۔ ((لَيْسَ فِي الْجَبْهَةِ وَلَا فِي النَّخْخَةِ)) ”نہ میدان جہاد میں اور نہ اس سے باہر“۔ یہ

اہل حجاز اور اہل یمن کے ہاں مستعمل ہے جسے آپ نے استعمال فرمایا۔ جو دراصل ان معنوں میں استعمال ہوتی تھی کہ اصل بہادری کسی کو میدان جہاد اور اس سے باہر چت کرنے میں نہیں بلکہ اصل بہادری اپنے نفس پر قابو پانے میں ہے۔

۲- ((وفی البیت سہوہ)) ”گھر میں ایک سہوہ (چھوٹا سا گھر بھی ہے یہ اہل یمن کی زبان ہے جو چھوٹے گھر کو سہوہ کہتے تھے)۔“

۳- ((المربد)) ”ہر وہ چیز جس سے اونٹ باندھا جائے“۔ یہ دراصل حجاز کا لہجہ ہے۔ بحرین والے بھی یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اہل شام اسی کو ”اندر“ اور اہل عراق اسی لفظ کو ’البیدر‘ سے بدل لیتے ہیں معنی وہی رہتا ہے۔

۴- آپ کا فرمان ہے: ((وفی المركاز الخمس)) ”معدنیات میں خمس دیا جائے“۔ یہ اصل میں عراق کا لہجہ ہے۔ وہ چھپے ہوئے خزانوں پر رکاز کا لفظ بولتے تھے اور معدنیات بھی مستور چیزیں ہوتی ہیں گویا آپ ﷺ کا اس لفظ کو استعمال کرنا عراقی لہجہ کو استعمال کرنا تھا۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کسی خاص قبیلے کے لئے نبی نہیں بنائے گئے تھے۔

۳- الفاظ معربہ

معرب الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کی اصل کسی غیر عربی زبان سے ہو لیکن عربوں نے ان الفاظ کو اپنے استعمال کے ذریعے اپنا لیا ہو۔ لیکن تعریب کیلئے شرط یہ ہے کہ عربوں نے ان الفاظ کو اپنے طریقے کے مطابق ڈھال لیا ہو۔ اب ایسے اکثر الفاظ جن کا تعلق دوسری زبانوں سے ہے عربی اوزان کے مطابق ڈھل چکے ہیں۔

عربی زبان بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح ایک زبان ہے اور ہر زندہ زبان دوسری زبانوں سے استفادہ کرتی ہے۔ دوسری زبانوں کو الفاظ دینا اور دوسری زبانوں سے الفاظ لینا ہر زندہ زبان کی صفت

ہے۔ اسی سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

قرون اولیٰ ہی سے بحث جاری ہے کہ کیا قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ ہیں یا نہیں۔ اس سلسلے میں علماء و دھرموں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَنَا جَعَلْنَا قُرْآنًا عَرَبِيًّا﴾ ”ہم نے اس قرآن کو عربی بنا دیا ہے“۔ یعنی قرآن سارے کا سارا عربی زبان میں ہے اس لئے اس میں غیر عربی الفاظ کا کوئی وجود نہیں۔ یہاں تک کہ ابو عبیدہ نے یہ کہہ دیا ”جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن میں کوئی غیر عربی لفظ ہے وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے“۔

اس کے برعکس مفسر قرآن ابن عباس، عکرمہ وغیرہ کی رائے تھی کہ قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ موجود ہیں جیسے بحیل، مشکاة، اباریق اور استبرق وغیرہ۔ ابو عبیدہ قاسم بن سلام کا کہنا ہے کہ ان میں ہر گروہ اپنی جگہ سچا ہے کیونکہ یہ الفاظ اپنی اصل کے اعتبار سے غیر عربی ہیں۔ جو دوسرے فریق کی رائے ہے مگر اب کثرت استعمال سے عربی بن چکے ہیں۔ اور کسی کے تصور میں نہیں کہ یہ غیر عربی ہیں اور یہی اس آیت کا مفہوم ہے کہ قرآن سارے کا سارا مستعمل عربی الفاظ پر مشتمل ہے۔ یہ فریق اول کی رائے ہے۔

جب قرآن میں اپنی اصل کے اعتبار سے غیر عربی اور استعمال کے اعتبار سے عربی الفاظ کا ثبوت مل گیا تو حدیث رسول اس سے دور کیسے رہ سکتی ہے جبکہ ہمارا دعویٰ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نہ تو کسی خاص قبیلے کے لئے نبی ہیں اور نہ کسی خاص علاقے کے لئے اور نہ کسی خاص وقت کے لئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام دنیا کے لئے قیامت تک نبی و رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اسی حقیقت کے ثبوت میں پہلے بھی یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ نے قریش کے علاوہ دیگر قبائل کے لہجات کا استعمال فرمایا اور آئندہ مثالوں سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ آپ نے ایسے الفاظ استعمال فرمائے جن کو عرب استعمال کرتے تھے مگر وہ اپنی اصل کے اعتبار سے غیر عربی الفاظ ہیں۔ جو آپ کی عالمی نبوت کی دلیل بھی ہے ایسے الفاظ پر مشتمل چند احادیث درج ذیل ہیں۔

۱۔ آپ نے اہل جنت کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ((وَمَجَامِرُهُمُ الْاَلْوَةُ)) ”ان کی

انگلیٹھیں بھی خوشبودار ہوں گی۔ ابو عبیدہ اور اصمعی کا کہنا ہے الا لوه اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے خوشبو آئے اور ان کے خیال میں یہ لفظ فارسی الاصل ہے جو لیتی کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ لفظ فارسی ہے یا ہندی۔ محبی کو بھی اس کے ہندی اور فارسی ہونے میں شک ہے کیونکہ اس کے نزدیک فارس میں اس لفظ کی اصل نہیں ہے ہو سکتا ہے اہل فارس نے اسے آرامی زبان سے لیا ہو یا پھر یونانی زبان سے۔ یہ احتمال زیادہ قوی بھی ہے کیونکہ یہیں سے یہ یورپی زبانوں میں نقل ہوا ہوگا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس کے آخر میں وارد الف آرامی زبان میں تعریف کی علامت ہے۔ فارسی میں بھی اس کے آخر میں الف ہے یہی اس کا اصلی صیغہ بھی ہے جسے عربوں نے تا سے بدل دیا کیونکہ ان کے ہاں مجامر مونث ہے لہذا اس کی صفت بھی مونث آنی چاہئے۔

۲۔ آپ کی حدیث ہے: ((ازدھر لہذا فان له شانا)) ”اسی کے ساتھ بلندی حاصل کر کیونکہ اس کی پہلے ہی بلند شان ہے“۔ ابو عبیدہ کا خیال ہے کہ ازدھر عربی نہیں بلکہ اصل میں نبطی لفظ ہے۔ فرنکل نے بھی اسے آرامی زبان سے لئے جانے والے عربی الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

۳۔ آپ کا ارشاد ہے: ((یوتی بابن آدم یوم القيامة كانه بذج من الذل)) ”قیامت کے دن ابن آدم کو جب حاضر کیا جائے تو شرمساری و ذلت سے بکری کے بچے کی طرح (سکڑا) ہوا ہوگا“۔ لغوی حضرات کا کہنا ہے کہ یہ لفظ بھی فارسی سے عربی میں داخل ہوا ہے اور پھر عربی بن گیا۔ اس کی اصل فارسی ہے۔

۴۔ آپ کا ارشاد یوں بھی نقل کیا گیا ہے: ((نہی رسول اللہ ﷺ عن لبس القسی)) ”رسول اکرم ﷺ قسی (ریشمی کپڑے کی ایک قسم) کپڑے کے پہننے سے منع فرمایا“۔ قسی کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ ریشمی کپڑا ہے جو مصر سے عرب علاقوں میں

لایا جاتا تھا۔ کپڑے کے نام کی نسبت وہاں کے ایک شہر کی طرف ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ لفظ بھی غیر عربی لفظ ہے اور ہو سکتا ہے قبلی ہو۔

۵۔ آپ کا ارشاد ہے: ((الزبیر بن عمتی وحواری من امتی)) ”زبیر رشتے میں پھوپھی زاد بھائی اور امت میں سے میرا حواری (ساتھی) ہے“۔ حواری دراصل عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھی تھے انہیں حواری اس لئے کہا گیا کہ وہ کپڑوں کو دھو کر صاف کرتے تھے۔ محبی کا کہنا ہے کہ یہ لفظ بھی اصل میں نبطی ہے سیوطی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ فرنکل کا کہنا ہے کہ یہ آرامی ہے۔

۴۔ مجازی استعمال:

بعض اوقات الفاظ کا مجازی استعمال بھی اس میں غرابت پیدا کر دیتا ہے۔ مجازی معنی چونکہ حقیقی نہیں ہوتا اس لئے اس تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ الفاظ کا سادہ سا استعمال تو ہر انسان جانتا ہے لیکن ادباء اور فصحاء انہی الفاظ کے ہیر پھیر سے کتنی شاندار عبارتیں بنا لیتے تھے اور بعض خطباء انہی الفاظ سے لوگوں پر گویا کہ جادو کر دیتے ہیں۔ اسی چیز کو آپ ﷺ نے بھی ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: ((ان من البیان لسحرا)) ”بے شک بیان (خطابت) میں جادو کا اثر ہے یہ مجاز عام ہوتا ہے“۔ یعنی لغوی، عقلی، اشارہ یا تشبیہ ان میں کوئی بھی ہو سکتا ہے اور استعمال مجازی کے ضمن میں آتا ہے۔

آپ کے ارشادات میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہے جن میں چند درج ذیل ہیں:

۱۔ آپ کا ارشاد ہے: ((مات حتف انفه)) ”طبعی موت مر گیا“۔ ابو عبیدہ کا کہنا ہے کہ جس نے اسے نبی اکرم کی زبان مہارک سے سنا اس نے یہی کہا کہ ہم نے ایسی بلیغ عبارت اس سے پہلے عربوں سے کبھی نہیں سنی۔

- ۲- کل الصيد فی جوف الفراء ”ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں“
- ۳- ان من البیان لسحرا ”بے شک بیان (خطابت) میں جادو کا اثر ہے۔“
- ۴- هدنة علی دخن وجماعة علی اقداء ”فریب پر صلح اور اوباش لوگوں کی جماعت سے دوستی“۔
- ۵- ایاکم وخضراء الدمن ”ظاہر روشن اور باطن سیاہ صفت سے بچو۔“

5.2 خارجی اسباب

خارجی اسباب سے مراد ایسے اسباب ہیں جو لفظ کو غرابت کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ اسباب اجتماعی بھی ہوتے ہیں اور تاریخی بھی۔ ان اسباب میں ایک اہم ترین سبب دین اسلام کا عربی زبان پر اثر ہے دین اسلام نے عربی زبان پر دو طرح سے اثر ڈالا۔

(۱) الفاظ کو نئے معانی عطا کرنا

رسول اکرم ﷺ نے نئے اسلامی معاشرے کی بنیاد ڈالی تو ضروری تھا کہ لوگوں کے افکار بھی تبدیل کریں تاکہ معاشرہ ان افکار پر پروان چڑھ سکے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے انہیں ان کے پرانے الفاظ کے نئے معانی بتائے جو انہوں نے برضا و رغبت قبول کر لئے اور یوں یہ جدید معانی قدیم معانی کی جگہ لوگوں میں رواج پا گئے جس کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

- (۱) آپ ﷺ سے لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ سب سے افضل آدمی کونسا ہے آپ نے جواب میں فرمایا: ((الصادق اللسان الخموم القلب)) ”زبان کا سچا اور دل کا صاف“۔ انہوں نے نے فوراً کہا یا رسول اللہ صادق اللسان کو تو ہم جانتے ہیں لیکن ”خموم القلب“ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ((هو النقی الذی لا غل فیہ ولا حسد)) ”وہ صاف دل والا ہے جس میں کسی کے لئے کوئی کینہ اور حسد ہے ہی نہیں“۔ ابو عبیدہ کا کہنا ہے کہ لفظ کی تفسیر

خود حدیث میں موجود ہے اور وہ نیا معنی ہے۔ اب چونکہ اکثر لوگ حدیث کے سیاق و سباق کے حافظ نہیں ہوتے۔ اس لئے ان کے لئے یہ لفظ غریب ہو جاتا ہے۔

(۲) آپ کا ایک فرمان یوں ہے: ((نہی رسول اللہ عن کسب الزمارة)) ”رسول اللہ نے فاشی کے ذریعہ کمانے سے منع فرمایا“۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں زمارة زانیہ کو کہتے ہیں۔ لفظ کی تفصیل خود حدیث میں بیان کر دی گئی ہے۔ یہ لفظ آپ کی بعثت سے پہلے اس معنی میں کبھی کسی نے استعمال ہی نہیں کیا۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ سے اکثر مختلف الفاظ کے معانی پوچھتے رہتے تھے جب وہ قدیم معانی ذکر کرتے تو آپ انہیں ان کی جگہ نئے معانی عطا فرماتے اور یوں یہ الفاظ اپنے پرانے معانی میں استعمال نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں غرابت کا سبب بن گئے۔

۲۔ الفاظ کو لغوی معانی سے شرعی معانی

(شرعی اصطلاحات) میں منتقل کرنا:

آپ نے بہت سارے ایسے الفاظ امت کو عطا کئے جن کا لغوی معنی اب بہت کم لوگ جانتے ہیں بلکہ وہ الفاظ اب مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی اپنے اصطلاحی معنوں میں ہی جانے جاتے ہیں جیسے الوضوء، الاذان، الصلاة، الزکاة، الصیام وغیرہ۔

اسی طرح الایمان، النفاق اور الکفر جیسی اصطلاحات۔ آپ کی بعثت سے پہلے لوگ اللہ کی نعمتوں کے شکر نہ کرنے والوں کو کافر کہتے تھے اور آج مسلمان لفظ کافر جس معنی میں استعمال کرتے ہیں اس معنی میں استعمال کسی کو بھی معلوم نہ تھا اسی طرح وضو کے لفظ سے مراد ہاتھ دھونا لیتے تھے مگر آج مسلمانوں کی خاص اصطلاح ہے اور دھونے کا خاص طریقہ۔

الصلاة: دعا کے معنی میں مستعمل تھا۔ لیکن اصطلاحی معنی آپ نے رائج فرمائے اور خاص طریقہ بھی بتایا۔

الاذان: اسی طرح اذان کو کسی خبر کو عام کرنے یعنی اعلام کے معنی میں جانتے تھے آپ نے اذان کا خاص طریقہ اور کلمات امت کو دیئے۔

زکوٰۃ: طہارت و صفائی کے معنی میں تھا لیکن آپ نے اسے مال کی صفائی کے ساتھ خاص کر دیا۔

۳- جاہلی الفاظ کا خاتمہ

آپ نے اسلامی معاشرے کی ترویج کے لئے اس امر کا بھی اہتمام فرمایا کہ جاہلی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں تاکہ معاشرے میں اچھے مفاہیم پروان چڑھیں۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ایسے الفاظ استعمال نہ کریں جو یہودی کرتے ہیں کیونکہ ان سے غلط معنی نکلتے ہیں۔ فرمان الہی ہے: ﴿لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا﴾ ”تم راعنا نہ کہو بلکہ انظرنا کہا کرو“۔ راعنا کو راعینا کہنے سے اس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہو جاتے ہیں جو آپ کی تنقیص تھی۔

جس طرح مسلمانوں نے اس لفظ کو چھوڑ دیا اسی طرح انہوں نے بے شمار جاہلی الفاظ کا استعمال ترک کر دیا آپ نے بے شمار جاہلی عادات سے بھی منع فرمایا۔ یہ الفاظ احادیث رسول میں تو موجود ہیں جیسے: الہامۃ، الصفر، وأد البنات، النباحۃ، ذبائح الجن، الانواء، وغیرہ۔ مگر ان کلمات کے معانی رفتہ رفتہ مسلمانوں کے ذہن سے دور ہوتے چلے گئے اور بالآخر یہ الفاظ ان کے لئے غریب ہو کر غرابت میں داخل ہو گئے حالانکہ اپنے جاہلی معاشرے میں یہ الفاظ ہرگز غرابت میں شمار نہ ہوتے تھے۔

۴- زبان کی ترقی:

عربی زبان کی ترقی نے بھی بہت سارے الفاظ کو غریب بنا دیا کیونکہ نئے الفاظ آتے گئے اور لوگ پرانے الفاظ چھوڑتے گئے۔ آج حدیث میں وارد بہت سے الفاظ کے معانی صرف محدثین و اہل علم ہی جانتے ہیں۔ جبکہ دوسرے لوگوں کے لئے یہ الفاظ غرابت میں داخل ہیں۔

خود آزمائی ④

- ۱- ((ادبى ربى فاحسن قادىبى)) ترجمہ کریں۔
- ۲- مشترک کسے کہتے ہیں؟
- ۳- مشترک کی کوئی دو مثالیں بیان کریں۔
- ۴- کوئی سے دو لفظ بتائیں جن کا تعلق قریش کے علاوہ عرب کے دیگر قبائل سے ہو۔
- ۵- معرب کی تعریف کریں اور ایک مثال دیں۔
- ۶- کیا قرآن میں الفاظ معربہ ہیں؟ علماء کی کیا رائے ہے؟
- ۷- الفاظ معربہ کی دو مثالیں بیان کریں۔
- ۸- استعمال مجازی کیا ہے؟ کوئی ایک مثال دیں۔
- ۹- غرابت کے خارجی اسباب کتنے ہیں؟
- ۱۰- حضور نے کس طرح الفاظ کو نئے معانی عطا کئے۔ ایک مثال دیں۔



یونٹ نمبر 16

علم الجرح والتعديل

تحریر: معین الدین ہاشمی
نظر ثانی: ڈاکٹر علی اصغر چشتی



فہرست موضوعات

- 543 یونٹ کا تعارف
- 544 یونٹ کے مقاصد
- 545 ① الجرح والتعديل
- 545 1.1 جرح و تعديل کا مفہوم
- 546 1.2 علم جرح و تعديل کی تعریف
- 546 1.3 علم جرح و تعديل کی ضرورت
- 549 1.4 جرح و تعديل کی شرعی حیثیت
- 550 1.5 رواۃ حدیث پر جرح و قدح کی صورتیں
- 551 1.6 رواۃ حدیث کے لیے مقبولیت کی شرائط
- 552 خود آزمائی ۱
- 553 ② مشہور علماء جرح و تعديل
- 554 2.1 مشہور علماء جرح و تعديل (آغاز و ارتقاء)
- 554 2.2 علماء جرح و تعديل (عہد صحابہؓ و تابعینؓ)
- 555 2.3 دوسری صدی کے مشہور علماء جرح و تعديل
- 555 2.4 تیسری صدی

555 2.5 چوتھی صدی

555 2.6 پانچویں صدی

555 2.7 چھٹی اور ساتویں صدی

556 2.8 آٹھویں تا دسویں صدی

557 ③ اہم کتب جرح و تعدیل

557 3.1 کتب جرح و تعدیل کی اقسام

560 ④ جرح و تعدیل کے مراتب

560 4.1 تعدیل کے لیے استعمال ہونے والے معروف الفاظ

562 4.2 تعدیل کے مراتب اور ان کے الفاظ

563 4.3 مراتب تعدیل کے احکام

563 4.4 جرح کے لیے استعمال ہونے والے معروف الفاظ

565 4.5 جرح کے مراتب اور ان کے الفاظ

567 4.6 مراتب جرح کے احکام

568 ⑤ اجتماع جرح و تعدیل

568 5.1 جرح و تعدیل کے اجتماع اور باہم تعارض کی صورتیں

569 5.2 علماء جرح و تعدیل کے اختلاف کا سبب

- ⑥ مقبول جرح و تعدیل کی شروط 570
- 6.1 قبول جرح کی شرائط 570
- 6.2 قبول تعدیل کی شرائط 570
- 6.3 تشدد آئمہ کی جرح و تعدیل 571
- 6.4 صحابہؓ پر جرح 571
- خود آزمائی ۲ 573

یونٹ کا تعارف

امام ابو حاتم رازی کا قول ہے ”چونکہ دین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے راویوں کے نقل کے ذریعہ سے ہی ہم تک پہنچا ہے لہذا اب ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم راویوں کے احوال و حالات کی معرفت حاصل کریں۔“

چنانچہ دین میں جعل سازی کے تحفظ کے لئے حضرات صحابہؓ اور بعد میں آنے والے محدثین نے راویان حدیث کی مقبولیت کے لیے ایسی کڑی شرائط متعین کیں اور جرح و تعدیل کے ایسے لازوال اور بے مثال اصول وضع کئے، جن کی وجہ سے ثقہ، اور غیر ثقہ ضعیف اور قوی راویوں میں امتیاز ممکن ہوا۔ حدیث کے ذخیرے کو ہر طرح کی ملاوٹ و جعل سازی سے محفوظ رکھنے کے لیے ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں صرف کر ڈالیں، دور دراز علاقوں کے سفر کیے اور ایک ایک راوی کے حالات انتہائی عرق ریزی سے جمع کیے۔ اس طرح مسلمانوں کو معرفت رواۃ میں وہ امتیازی شان حاصل ہوئی کہ غیر مسلم بھی اس کا اقرار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر نے الاصابہ فی احوال الصحابہؓ (حافظ ابن حجر) کے انگریزی مقدمہ میں لکھا کہ ”کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصیات کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔“

اس یونٹ میں ”علم الجرح والتعديل“ کا تعارف، اس کی ضرورت و اہمیت، روایت حدیث پر جرح و قدح کی صورتیں اور ان کی مقبولیت کی شرائط، علماء جرح و تعدیل کا تعارف، اہم کتب جرح و تعدیل، مراتب جرح و تعدیل اور ان کے احکام، اجتماع جرح و تعدیل کی صورتیں اور ان کے احکام جیسے اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

یونٹ کے اغراض و مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

⇨ علم الجرح والتعديل کا لغوی و اصطلاحی مفہوم بیان کر سکیں۔

⇨ اس علم کی ضرورت اور اس کی شرعی حیثیت پر بحث کر سکیں۔

⇨ رواقہ حدیث پر جرح و قدح کی صورتیں اور ان رواقہ کی مقبولیت کی شرائط جان سکیں۔

⇨ مشہور علماء اور کتب جرح و تعديل کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔

⇨ جرح و تعديل کے الفاظ، مراتب اور احکام پتہ لگا سکیں۔ نیز جرح و تعديل کی مقبولیت سے

متعلق بحث کر سکیں۔

① جرح و تعدیل

1.1 جرح و تعدیل کا لغوی مفہوم

۱۔ جرح: یہ لفظ جیم کی فتح کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اس کی جمع جراحات ہے۔ جرحاً کے معنی ہیں زخمی کرنا انہیں معنوں میں یہ لفظ درج ذیل شعر میں استعمال ہوا ہے۔

جراحات السنان لها التیام

ولا یلتام ما جرح اللسان

تلوار کے زخم تو بھر جاتے ہیں مگر زبان کے زخم نہیں بھرتے۔

کسی کا عیب و نقص بیان کرنے کے لیے بھی جرحاً کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے جرح الشہادۃ یعنی شہادت کو رد یا باطل کرنا۔ اسی طرح زخموں کا علاج کرنے والے ان کو چیرنے پھاڑنے والے یعنی سرجن کو ”جراح“ کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں لفظ ”جرح“ کے استعمال کے متعلق ابن منظور ایک مقولہ نقل کرتے ہیں: ویقال جرح الحاكم الشاهد اذا عثر منه على ما تسقط به عدالته من كذب (۱) ”کہا جاتا ہے کہ حاکم نے گواہ پر جرح کی جب کہ حاکم کو گواہ کے متعلق کوئی اطلاع ملی ہو تاکہ اس جرح سے اس کی جھوٹ وغیرہ سے برأت ثابت ہو جائے۔“

معلوم ہوا کہ کلام عرب میں تفتیش و جستجو کر کے کسی شخص کے احوال جاننے اور اس کی خبر یا گواہی پر تنقید کرنے یا کسی شخص کے نقائص بیان کرنے کو جرح کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی راوی یا شاہد (گواہ) کے اوصاف و خصائل کی تحقیق و جستجو کے بعد اس کے عیوب کو بیان کرنا جو راوی کی روایت اور شاہد کی شہادت کے قبول کرنے میں رکاوٹ ہوں، ”جرح“ کہلاتا ہے۔

ب۔ تعدیل: یہ عدل سے مشتق ہے اور ظلم کی ضد ہے عربی میں ”عدل السهم“ تیر کو سیدھا کرنے کو

کہتے ہیں اسی طرح کہا جاتا ہے ”عدل الشاہد“ یعنی گواہ کو معتبر جانا۔

گویا عدل سے مراد کسی شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا اور تعدیل سے مراد کسی کو معتبر یا عادل قرار دینا ہے۔ دوسرے لفظوں میں راوی یا شاہد کے اخلاق و احوال کی تحقیق و جستجو کے بعد یہ بتانا کہ راوی ثقہ ہے یا شاہد (گواہ) معتبر ہے ”تعدیل“ کہلاتا ہے۔

جرح و تعدیل کا اصطلاحی مفہوم

کسی روایت کے راوی کو عادل و معتبر قرار دینا ”تعدیل“ اور کسی راوی کے قوت حافظہ یا اس کے کردار پر ماہرین کا اعتراض ”جرح“ کہلاتا ہے۔ (۲) دوسرے لفظوں میں راویوں کے نقائص بیان کرنے کو ”جرح“ اور ان کی صفائی پیش کرنے کو ”تعدیل“ کہتے ہیں۔

1.2 علم جرح و تعدیل کی تعریف

حاکم نیشاپوری اور خطیب بغدادی کے مطابق یہ وہ علم ہے جو خاص الفاظ کے ذریعے راویوں کی عدالت و ثقاہت یا ان کے عیب و ضعف سے بحث کرتا ہے۔ (۳) بعض محدثین اس کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ یہ وہ علم ہے جس میں راویوں کی جرح و تعدیل ایسے مخصوص الفاظ سے کی جاتی ہے جس سے راویوں کے مراتب کا پتہ چل جاتا ہے۔ نواب صدیق حسن خان قنوجی لکھتے ہیں کہ: ”علم جرح و تعدیل وہ علم ہے کہ جس میں راویوں کی جرح اور ان کی تعدیل پر مخصوص الفاظ (اصطلاحات) کے ساتھ بحث کی جائے اور الفاظ کے اس فرق کی بنیاد پر (راویوں کے) مراتب مرتب کیے جائیں“۔ (۴)

1.3 علم جرح و تعدیل کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں محمد رسول اللہ ﷺ کی حیثیت کو مختلف انداز میں بیان فرمایا ہے۔ جن سے آپ ﷺ کی ذات، اقوال و افعال کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ ارشادات باری تعالیٰ ہیں۔

- ۱۔ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۵)
 ”یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔“
 - ۲۔ ﴿مَنْ يَطْعِ الرُّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللَّهَ﴾ (۶)
 ”جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“
 - ۳۔ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (۷)
 ”آپ ﷺ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے بلکہ وہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو آپ ﷺ پر نازل کی جاتی ہے۔“
 - ۴۔ ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يَحْكُمُوا بِمَا شَجَرِ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ
 - انفسهم حرجاً مما قضيت ويسلموا تسليماً﴾ (۸)
 ”پس قسم ہے آپ کے رب کی کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ ﷺ سے تصفیہ کرادیں پھر آپ ﷺ کے اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورا پورا تسلیم کر لیں۔“
 - ۵۔ ﴿وَإِنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (۹)
 ”اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (قرآن) اتاری تاکہ تو لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔“
 - ۶۔ ﴿مَا آتَاكُمُ الرُّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (۱۰)
 ”جو کچھ رسول تم کو دے وہ لے لو اور جس شے سے تم کو روک دے رک جاؤ۔“
- قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں جن میں اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اللہ نے آپ ﷺ کو شارع قرار دیا ہے اور آپ کو تشرعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کئے ہیں۔ چنانچہ امت مسلمہ اس بات پر متفق ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات، قرآن مجید کے بعد دوسرا قانونی مآخذ ہے۔ اسی بات کے پیش نظر صحابہ گرام نے آپ ﷺ کی زندگی کا

ایک ایک گوشہ محفوظ کرنے کا اہتمام شروع کر دیا۔ اسی اہتمام کے سلسلہ میں جرح و تعدیل کا علم بھی وجود میں آیا جس کی رو سے حدیث بیان کرنے والوں کے حالات کی چھان پھٹک کر نا ضروری خیال کیا گیا۔ اس وقت اس علم کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی جب دشمنان اسلام نے اسلام میں عیب جوئی کرنے اور اس کے مفہوم اور معانی کو بدلنے کی خاطر احادیث گھڑ کر ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کرنی شروع کر دی اور اسلام میں شکوک و شبہات کے بیج پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس علم کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں ابو حاتم رازی لکھتے ہیں کہ ”کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی معرفت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم ناقلمین و راویان حدیث میں عادل و ثابت، ثقہ راویوں اور غافل و بی، کمزور حافظہ اور جھوٹے راویوں کے درمیان فرق و امتیاز کر لیں۔ چونکہ دین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے راویوں کے نقل کے ذریعہ سے ہی ہم تک پہنچا ہے لہذا اب ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم راویوں کے احوال و حالات کی معرفت حاصل کر لیں۔ (۱۱)

علماء جرح و تعدیل نے اس علم کی ضرورت و اہمیت کو دیکھتے ہوئے راویوں کی جانچ پرکھ کا نہایت اہتمام کیا محدثین نے حدیث بیان کرنے والوں کے حالات اتنے باریک انداز میں جمع کئے کہ ثقہ (قابل اعتماد) اور غیر ثقہ راویوں کو بالکل الگ کر دکھایا۔ محدثین نے حدیث کے حوالے سے رجال پر نقد و جرح کے اصول و ضوابط مقرر کئے اور تعدیل و تخرج رجال (Soundness of naraters) کے معیارات قائم کئے۔ خبر دینے والے کی ثقاہت اور غیر جانبداری (Authenticity and natralety) اور اس کے انداز کی معروضیت (Objectivity) کے اصول متعارف کرائے چنانچہ مسلمان، دنیا کی اولین قوم قرار پائے جنہوں نے تحقیق کے حوالے سے یہ معیارات قائم کئے۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے کہ ”کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصیات کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ (۱۲)

1.4 جرح و تعدیل کی شرعی حیثیت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ راویوں کے عیوب معلوم کرنا اور انہیں آگے بیان کرنا کیا تجسس اور غیبت کے زمرے میں نہیں آتا؟

اس بات پر علماء امت متفق ہیں کہ حدیث کی صحت و ضعف کا پتہ لگانے کی خاطر روایان حدیث کے عیوب و نقائص کو واضح کرنا تجسس اور غیبت کے زمرے میں نہیں آتا۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں اس کے واضح دلائل موجود ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ (۱۳) اے ایمان والو جب تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی چھان پھنگ کر لیا کرو۔

علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ نے ایک ضرر رساں شخص کے متعلق فرمایا (بئس اخو العشیرہ) (۱۴) ”یہ اپنے قبیلہ کا برا آدمی ہے۔“ یہ اس لیے فرمایا تا کہ مسلمان اس سے واقف ہو کر اس کی ضرر رسانی سے محفوظ رہیں جب عام لوگوں کو کسی برے شخص کی ضرر رسانی سے بچانے کے لیے اس کی برائی کو برملا بیان کیا جاسکتا ہے تو دین کو بچانے کی خاطر ضرر رساں لوگوں کی برائی کو اعلانیہ بیان کرنا تو بدرجہ اولیٰ جائز ہے بلکہ یہ ایک اہم دینی فریضہ ہے۔ چنانچہ محدثین لکھتے ہیں کہ ”آدمیوں کی جرح و تعدیل کے متعلق گفتگو کرنا رسول اللہ ﷺ اور بہت سے صحابہؓ و تابعینؓ سے اور ان کے بعد والوں سے ثابت ہے اور اس کو شریعت کی حفاظت اور شبہات سے بچانے کی خاطر جائز رکھا گیا ہے۔ لوگوں پر طعن اور تنقیص اس کا مقصد نہیں۔ جس طرح گواہوں پر جرح جائز ہے اسی طرح روایت میں راویوں پر جرح بھی جائز ہے کیونکہ معاملہ دین و شریعت کا ہے اور امر دین میں ثابت قدم رہنا حقوق و اموال میں ثابت قدم رہنے سے کہیں زیادہ ضروری اور اولیٰ ہے اس لیے ائمہ حدیث نے اس باب میں اپنے اوپر بحث و نظر کو لازم قرار دیا ہے۔“ (۱۵)

1.5 حدیث کے راویوں پر جرح و قدح کی صورتیں

حافظ ابن حجر کے نزدیک دس اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے کسی راوی پر جرح و قدح کی جاتی ہے درج ذیل میں وہ اسباب ذکر کیے جاتے ہیں۔ ان دس اسباب میں سے پہلے پانچ کا تعلق راوی کی عدالت سے ہے اور دیگر پانچ کا اس کے ضبط سے۔

- ۱- کذب فی الحدیث یعنی راوی حدیث میں جھوٹ بولتا ہے مثلاً رسول اللہ ﷺ نے ایک بات نہیں کہی مگر وہ قصداً کہہ رہا ہے۔
- ۲- متهم ہو: یعنی راوی پر کذب کی تہمت لگی ہو۔ مثلاً ایک حدیث جو قواعد مشہور کے مخالف ہے، اکیلے ایک اسی راوی سے روایت کی گئی ہو اسی طرح اس شخص کو بھی اہل فن مجروح سمجھتے ہیں جو باتیں کرنے میں جھوٹ بولتا ہو مگر حدیث میں اس کا جھوٹ ثابت نہ ہو۔ یاد رہے کہ یہ جرح پہلی قسم سے کم درجہ میں ہے
- ۳- اس راوی کے قول و فعل سے فسق ظاہر ہوتا ہو (جو کفر کی حد تک نہ پہنچتا ہو)۔
- ۴- راوی کی جہالت ثابت ہو۔
- ۵- راوی بدعتی ہو۔ یعنی ایسی چیزوں کو دین کا حصہ سمجھے جو ثابت نہ ہوں۔
- ۶- راوی سے فاش اغلاط بکثرت سرزد ہوتی ہوں۔
- ۷- راوی میں غفلت کی کثرت ہو۔
- ۸- وہ راوی جو بر سبیل وہم روایت کرتا ہو۔
- ۹- راوی دوسرے ثقہ راویوں کی مخالفت کرتا ہو۔
- ۱۰- راوی کے حافظہ میں خرابی ہو۔ (۱۶)

یہ تھیں وہ صورتیں جن کی موجودگی میں راوی پر جرح و قدح کی جاتی ہے۔ اب ہم ان شرائط کا ذکر کریں گے۔ جو کسی راوی میں موجود ہوں تو اس کی روایت قبول کی جاتی ہے۔

1.6 حدیث کے راویوں لیے مقبولیت کی شرائط

محدثین کے نزدیک راویان حدیث کی مقبولیت کے لیے چار بنیادی شرائط ہیں۔ یعنی کسی راوی کی روایت قبول کرنے کے لئے اس میں چار شرائط دیکھی جائیں گی۔

۱- عقل

۲- ضبط

۳- عدالت

۴- اسلام

۱- عقل

عقل سے تمیز و شعور مراد ہے جو کہ بالغ ہونے پر ہی ہو سکتا ہے چنانچہ حدیث کے راوی کا اخذ روایت اور انتقال روایت (روایت کو آگے پہنچانے) کے وقت بالغ ہونا ضروری ہے البتہ جو بچہ باشعور اور خوب ہوشیار ہو تو وہ حدیث اخذ کر سکتا ہے۔ مگر یہاں یہ بات یاد رہے کہ محدثین کے نزدیک اس بچے سے انتقال روایت نہیں ہو سکتا۔ (۱۷)

۲- ضبط

ضبط سے مراد یہ ہے کہ راوی کا حافظہ قوی ہو اور اس میں سوچنے سمجھنے کی اچھی صلاحیت ہو۔ بے خبر، سادہ لوح اور وہمی بھی نہ ہو۔ (۱۸)

۳- عدالت

عادل وہ آدمی ہے جو فرائض و اوامر کی تعمیل کرتا ہو اور فواحش و منکرات سے بچتا ہو اور معاملات میں غیر شرعی امور سے احتراز کرتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں فسق و فجور سے پاک ہونا اور متقی و پرہیزگار ہونے کا نام عدالت راوی ہے۔ (۱۹)

۴- اسلام

غیر مسلم چونکہ اسلامی اقدار و روایات کا پابند نہیں ہوتا لہذا اخذ حدیث کے سلسلے میں اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

خود آزمائی ①

- ۱- جرح و تعدیل کا لغوی معنی تحریر کیجئے۔
- ۲- جرح و تعدیل کا اصطلاحی مفہوم تحریر کیجئے۔
- ۳- محدثین نے علم جرح و تعدیل کی کیا تعریف کی ہے؟
- ۴- علم جرح و تعدیل کی ضرورت کیوں کر پیش آئی؟
- ۵- علماء جرح و تعدیل نے کس انداز سے اس علم کی خدمت کی؟
- ۶- مشروعیت جرح و تعدیل کی دو دلیلیں تحریر کیجئے۔
- ۷- حافظ ابن حجر نے روایت حدیث پر جرح و قدح کی کون سی صورتیں لکھی ہیں؟
- ۸- روایت حدیث کے لیے مقبولیت کی کیا شرائط ہیں؟
- ۹- راوی کے ضابطہ ہونے سے کیا مراد ہے؟
- ۱۰- عدالت راوی کی تفصیل تحریر کیجئے۔

② مشہور علماء جرح و تعدیل

2.1 آغاز و ارتقاء

اس یونٹ کے گزشتہ صفحات میں علم جرح و تعدیل کے حوالہ سے تعارفی بحث کی گئی اب آپ اس علم کی خدمت کرنے والے مشہور علماء کے اسماء گرامی اور ان کے آغاز و ارتقاء پر بحث ملاحظہ کریں گے۔

یاد رہے کہ حدیث کے راویوں کی چھان بھنک کا سلسلہ صحابہؓ کے عہد سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت ابو بکر صدیقؓ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے احادیث نبویؐ کی حفاظت کی خاطر اس کی ابتدا کی۔ (۲۰) کبار صحابہؓ گرام میں حضرت عمرؓ بھی خبر واحد کو قبول کرنے میں توقف سے کام لیتے اور تحقیق کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ جب فاطمہ بنت قیسؓ نے حضرت عمرؓ سے حدیث بیان کی کہ میرے شوہر نے مجھ کو طلاق دے دی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو سکنی (رہائش) سے محروم کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم اللہ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ کو ایسی عورت کے کہنے پر نہیں چھوڑ سکتے جس کے متعلق ہمیں معلوم نہیں کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔ (۲۱)

شہادت عثمانؓ کے بعد راویان حدیث کی جرح و تعدیل کے سلسلہ میں مزید اہتمام کیا جانے لگا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مبتدعین اور فتنہ باز لوگوں نے احادیث گھڑنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امام مسلم لکھتے ہیں کہ پہلے زمانے میں کوئی حدیث بیان کرتا تو اس سے سند نہ پوچھتے پھر جب فتنہ پھیلا تو لوگوں نے کہا کہ اپنی اپنی سندیں بیان کر دو دیکھیں گے اگر راوی اہل سنت ہیں تو ان کی روایت قبول کریں گے اور اگر راوی بدعتی ہیں تو قبول نہیں کریں گے۔ (۲۲) چنانچہ علماء اسی وقت سے اخذ حدیث کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ان هذا العلم دین فانظرو عمن تاحذون دینکم (۲۳) ”یہ علم، دین ہی تو ہے پس دیکھو کس شخص سے تم دین حاصل کرتے ہو

یعنی جس شخص سے روایت لیتے ہو اس کی خوب چھان پھٹک کر لو۔

2.2 علماء جرح و تعدیل (عہد صحابہؓ و تابعینؓ)

جرح و تعدیل سے کام لینے والے صحابہؓ میں مشہور حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن ثابتؓ ہیں۔ امام حاکم نے انہیں علماء جرح و تعدیل کے طبقہ اولیٰ میں شمار کیا ہے۔ (۴۴)

مندرجہ بالا کبار صحابہؓ (بڑے اور سینئر صحابہؓ) کے بعد صغار صحابہؓ (جونیئر صحابہؓ) میں عبد اللہ بن عباس (۶۸ھ)، عبادہ بن الصامت (۳۴ھ)، انس بن مالک (۹۳ھ) جیسے حضرات ہیں جنہوں نے اخذ حدیث کے سلسلہ میں جرح و تعدیل سے کام لیا۔ اسی زمانہ میں کبار تابعینؓ مثلاً سعید بن المسیب (۹۳ھ)، شعبی (۱۰۴ھ)، اور ابن سیرین (۱۱۰ھ) نے بھی حدیث کے اخذ کرنے میں جرح و تعدیل کو مد نظر رکھا۔

2.3 دوسری صدی کے مشہور علماء جرح و تعدیل

صحابہؓ و تابعینؓ کے بعد دوسری صدی میں معمر بن راشد (۱۵۳ھ)، ہشام دستوائی (۱۵۴ھ)، امام اوزاعی (۱۵۶ھ)، شعبہ بن الحجاج (۱۶۰ھ)، امام سفیان ثوری (۱۶۱ھ)، حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ)، لیث بن سعد (۱۷۵ھ)، امام مالک (۱۷۹ھ) نے روایت حدیث پر جرح و تعدیل کا اہتمام کیا اور صرف ثقہ راویوں کی احادیث بیان کیں۔

ان حضرات کے بعد دوسری صدی ہجری کی آخری دو دہائیوں میں علماء جرح و تعدیل کا دوسرا طبقہ منظر عام پر آیا ان میں مشہور علماء کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک (۱۸۱ھ)، فزاری (۱۸۵ھ)، یحییٰ بن سعید القطان (۱۸۹ھ)، سفیان بن عیینہ (۱۹۷ھ)، وکیع بن الجراح (۱۹۷ھ) اور عبد الرحمن بن مہدی (۱۹۸ھ) وغیرہ۔ دوسری صدی کے مشہور علماء جرح و تعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان (۱۸۹ھ) اور عبد الرحمن بن مہدی (۱۹۸ھ) ایسی شخصیات ہیں جنہیں اس فن میں امامت و استناد کا درجہ حاصل ہے۔

2.4 تیسری صدی کے مشہور علماء جرح و تعديل

تیسری صدی کے علماء جرح و تعديل میں ابو داؤد طیالسی (۲۰۶ھ)، عبد الرزاق بن ہمام (۲۱۱ھ)، یزید بن ہارون (۲۱۱ھ)، ابو عاصم بن مغلہ (۲۱۲ھ) مشہور ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ تیسری صدی میں ہی علم جرح و تعديل کے فن پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں چنانچہ سب سے پہلے یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) نے جرح و تعديل روایت حدیث پر کلام کیا اسی طرح امام احمد بن حنبل (۲۹۰ھ)، محمد بن سعد (۲۳۰ھ) علی بن مدینی (۲۳۴ھ) نے کتب تالیف کیں ان آئمہ کے بعد امام بخاری (۲۵۶ھ)، امام مسلم (۲۶۱ھ)، احمد بن عبد اللہ العیسیٰ (۲۶۱ھ)، ابو زرہ رازی (۲۶۳ھ)، ابو داؤد سجستانی (۲۷۵ھ) نے علم جرح و تعديل واسماء الرجال پر کتب تصنیف کیں۔

2.5 چوتھی صدی

چوتھی صدی ہجری میں ابو جعفر محمد بن عمرو عقیلی (۳۲۲ھ) ابو حاتم رازی (۳۲۷ھ) ابن حبان (۳۵۴ھ) عبد الرحمن بن خلاد رامہرمزی (۳۶۰ھ) عبد اللہ بن عدی جرجانی (المعروف ابن عدی) (۳۶۵ھ) دارقطنی ابن شاہین الواعظ (۳۸۵ھ) نے جرح و تعديل پر کتب تصنیف کیں۔ (۲۵)

2.6 پانچویں صدی

پانچویں صدی ہجری میں ابو عبد اللہ الحاکم (۴۰۵ھ) امام بیہقی (۴۵۸ھ) خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) ابن عبد البر (۴۶۳ھ) نے اس فن کی خاطر خواہ خدمت کی۔

2.7 چھٹی اور ساتویں صدی

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں راویوں کی جرح و تعديل اور اسناد کے اتصال و انتفاع کی بحیثیت خوب رہیں اس صدی کے علماء جرح و تعديل میں ابو الحسن رزین (۵۲۵ھ) ابن جوزی (۵۹۷ھ) محمد بن اثیر جزری (۶۰۶ھ) مشہور ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اس صدی میں محدثین کی زیادہ توجہ پچھلے ذخائر کی طرف ہی

رہی۔

2.8 آٹھویں تا دسویں صدی

اس علم پر آٹھویں صدی میں اہم اور مشہور نام امام ذہبی (۷۴۸ھ) کا ہے۔ نویں صدی میں ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) نے اس علم کی خوب خدمت کی دسویں صدی میں اس فن کی خدمت کرنے والوں میں سرفہرست جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) ہیں۔

③ اہم کتب جرح و تعدیل کا تعارف

جیسا کہ آپ گزشتہ صفحات میں مطالعہ کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں صحت کا التزام رکھنے کی خاطر محدثین نے جرح و تعدیل کے فن پر غیر معمولی توجہ دی اور راویوں کے احوال پر بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔ اس سلسلہ میں ضعیف، مجہول اور ثقہ راویوں کو الگ الگ کر کے دکھا دیا۔ راویوں پر جرح و تعدیل کا اہتمام تو صحابہؓ کے دور سے ہی شروع ہو چکا تھا البتہ باقاعدہ کتب جرح و تعدیل تیسری اور چوتھی صدی، ہجری میں لکھی گئیں۔ بعض کتب میں صرف ضعیف راویوں پر اسی طرح بعض کتب میں صرف ثقہ راویوں پر بحث کی گئی۔ بعض کتب ایسی بھی ہیں جو جامع انداز میں لکھی گئی ہیں اور ان میں ضعیف و ثقہ ہر دو راویوں پر بحث کی گئی ہے

ذیل میں چند مشہور کتب کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

3.1 کتب جرح و تعدیل کی اقسام

جرح و تعدیل پر لکھی جانے والی کتب کی تین بڑی اقسام ہیں۔

(الف) صرف ضعیف راویوں پر لکھی جانے والی کتب۔

(ب) صرف ثقہ راویوں پر لکھی جانے والی کتب۔

(ج) ضعیف اور ثقہ ہر دو راویوں پر مشتمل کتب

(الف) ضعیف راویوں سے متعلق کتب

اس سلسلہ کی مشہور کتب یہ ہیں۔

۱۔ الضعفاء الصغیر: محمد بن اسماعیل البخاری (۲۵۶ھ) کی کتاب ہے۔

- ۲- الضعفاء الكبير: ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسى بن حماد العقيلي (۳۲۲ھ) کی کتاب ہے۔ یہ امام عقيلي کے نام سے مشہور ہیں جرح و تعديل کے معاملہ میں بہت شدت سے کام لیتے ہیں۔
- ۳- معرفة المجروحين من المحدثين: محمد بن احمد بن حبان البستي (۳۵۴ھ) کی کتاب ہے۔ یہ ابن حبان کے نام سے معروف ہیں۔ جرح کے معاملہ میں یہ بھی بہت شدت سے کام لیتے ہیں۔

۴- الكامل في ضعفاء الرجال: اس کے مصنف عبد اللہ بن عدی بن عبد اللہ الجرجانی (۳۶۵ھ) ہیں یہ ابن عدی کے نام سے مشہور ہیں۔ اس فن پر ان کی کتاب کا شمار نہایت اہم اور مشہور کتب میں سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کا نقص یہ ہے کہ انہوں نے اس میں ہر ایسے راوی کو ضعفاء میں شمار کر لیا جس کے متعلق کوئی ایک روایت بھی ملی اور اگرچہ کسی مجہول راوی نے کسی کی طرف کذب یا ضعف کی نسبت کی وہ روایت بھی انہوں نے جمع کر دی ہے جس کی وجہ سے کئی صحابہؓ اور اجل تابعینؒ کو ضعیف شمار کیا گیا۔ ان کی کتاب میں بعض ثقہ راویوں کے تذکرے بھی مل جاتے ہیں۔ (۲۶)

- ۵- میزان الاعتدال في نقد الرجال: اس کتاب کو حافظ شمس الدین الذہبی (۷۴۸ھ) نے تالیف کیا ہے اس میں گیارہ ہزار سے زیادہ روایات کے حالات ہیں۔ ضعفاء سے متعلق لکھی جانے والی کتب میں یہ اہم ترین کتاب ہے۔

(ب) کتب ثقات:

- ۱- کتاب الثقات: ابوالحسن احمد بن عبد اللہ بن صالح العیسیٰ (۲۶۱ھ) کی کتاب ہے۔
- ۲- مشاہیر علماء الامصار: محمد بن احمد بن حبان البستي (۳۵۴ھ) کی کتاب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ ابن حبان کے نام سے مشہور ہیں۔

- ۳- الثقات: محمد بن احمد بن حبان البستی (ابن حبان) کی یہ کتاب طبقات پر مرتب ہے
- ۴- تاریخ اسماء الثقات ممن نقل عنهم العلم: ابن شاپین الواعظ (۳۸۵ھ) کی تالیف ہے۔ یہ کتاب حروف معجم پر مرتب کی گئی ہے۔

ج) کتب الجمع بین الثقات والضعفاء

- ۱- التاریخ والعلل سبکی بن معین (۲۳۳ھ) یہ کتاب جرح و تعذیل میں ان کے اقوال کا مجموعہ ہے جس کے راوی ان کے شاگرد ابو الفضل عباس بن محمد الدوری ہیں۔ ان کے شاگرد عباس الدوری نے اپنے استاد کی کتاب پر کئی اضافے بھی کئے ہیں۔
- ۲- التاریخ الكبير، التاریخ الاوسط، التاریخ الصغير یہ محمد بن اسمعیل البخاری (۲۵۶ھ) کی کتب ہیں ان کی یہ تینوں کتب ضعفاء اور ثقافت راویوں سے متعلق ہیں۔
- ۳- الجرح والتعديل عبدالرحمن بن ابی حاتم الرازی (۳۲۷ھ) ابن ابی حاتم کے نام سے معروف ہیں ان کی یہ کتاب جرح و تعذیل میں سب سے جامع کتاب ہے انہوں نے اپنی اس کتاب کا نہایت مفید اور طویل تر مقدمہ ”تقدمة المعرفة لكتاب الجرح والتعديل“ کے نام سے پیش کیا ہے۔
- ۴- تهذيب التهذيب: یہ حافظ ابن حجر العسقلانی کی کتاب ہے۔ یہ اصحاب الکتاب السنہ کے حالات پر مشتمل ہے انہوں نے خود ہی اس کتاب کی تلخیص بھی کی ہے جس کا نام تقریب التهذيب رکھا ہے۔ یہ کتاب جرح و تعذیل کی کتب کے سلسلہ کی نہایت ہی اہم کڑی ہے۔

④ جرح و تعذیل کے مراتب

جرح و تعذیل کے مراتب سے مراد درجات جرح و تعذیل ہے۔ جرح کے بعض درجات یا مراتب ہلکی یا معمولی اور بعض مراتب و درجات انتہائی سخت جرح میں شمار ہوتے ہیں اسی طرح بعض اوسط درجہ کی جرح میں شمار کئے جاتے ہیں یہی حال تعذیل کے مراتب کا ہے یعنی کسی مرتبہ میں اعلیٰ درجہ کی تعذیل اور کسی میں ادنیٰ اور کسی مرتبہ میں اوسط درجہ کی تعذیل ہوتی ہے۔

ذیل میں ہم جرح اور تعذیل کے مختلف مراتب کا الگ الگ تذکرہ کریں گے لیکن مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے ان معروف و مشہور الفاظ کا جائزہ لے لیں جو تعذیل یا جرح کے لئے استعمال ہوتے ہیں یہاں ہم مشہور الفاظ تعذیل ذکر کرتے ہیں جرح کے الفاظ انشاء اللہ آگے اپنے مقام پر ملاحظہ کئے جاسکیں گے۔

4.1 تعذیل کے لیے استعمال ہونے والے مشہور الفاظ (اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف)

او ثق	سب سے زیادہ و معتبر و محکم
اثبت	سب سے زیادہ پختہ کار اور عادل و ضابط
اضبط	سب سے زیادہ با اعتماد اور قوی الحافظہ اور بہت با صلاحیت
ثقة ثقة	بہت ثقہ یعنی بہت با اعتماد
ثقة ثبت	ثقة اور پختہ کار

ثبت حجة

پختہ کار اور قابل اعتماد

ثبت متقن

پختہ کار اور منضبط

ثقة

قابل اعتماد

حجة

قابل اعتماد - دلیل

ثبت

پختہ کار

متقن

منضبط

صدوق

سچا

محلة الصدق

سچائی پر قائم

مامون

امانت والا

جيد الحديث

حدیث روایت کرنے میں اچھا ہے۔

لا باس به

اس میں کوئی خرابی یا کوئی جرح کی بات نہیں۔

شیخ

استاذ

روى عنه الناس

اس سے لوگوں نے روایت کی ہے۔

صالح الحديث

روایت کی صلاحیت رکھتا ہے

يكتب حديثه

اس کی احادیث لکھی جاتی ہیں

جرح وتعديل کے مراتب

بنیادی طور پر جرح و تعدیل کے چار مراتب ہیں۔ ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب 'الجرح والتعديل' میں بھی جرح و تعدیل کو چار مراتب میں ہی تقسیم کیا ہے البتہ بعد کے محدثین نے جرح و تعدیل کے ان چار مراتب پر دو کا مزید اضافہ کر دیا اس طرح کل چھ مراتب ہو گئے۔ (۲۷)

4.2 تعديل کے مراتب اور ان کے الفاظ

۱- مرتبہ اول: مراتبِ تعديل میں سب سے اعلیٰ و ارفع درجہ اس تعديل کا ہے جو مبالغہ پر مشتمل لفظ سے کی جائے یا فعل التفضیل کے صیغہ کے ساتھ بیان کی گئی ہو جیسے فلان اوثق الناس (فلاں شخص لوگوں میں سب سے زیادہ ثقہ و معتبر ہے) اسی طرح ”فلان اثبت الناس“ (فلاں شخص لوگوں میں سب سے زیادہ مثبت اور پختہ رو ہے) اسی طرح کسی کے لیے ”اضبط الناس“ یا ”لیس له نظیر“ کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

۲- دوسرا مرتبہ: تعديل کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ کسی راوی کے بارے میں ایک ہی صفت کی تکرار کی جائے مثلاً ”ثقة ثقة“ (ثقة ہے ثقة ہے یعنی بہت ہی ثقہ ہے) کہا جائے۔ یا دو صفات استعمال کر کے اس میں تاکید پیدا کی جائے مثلاً ”ثقة ثبت“ ((ثقة اور پختہ کار ہے)) کہا جائے یا ”ثبت حجة“ (پختہ کار اور قابل اعتماد ہے) کہا جائے وغیرہ۔

۳- تیسرا مرتبہ: ایسے صیغہ سے راوی کی ثقاہت بیان کی جائے جو مبالغہ (Superlative) پر دلالت نہ کرتا ہو یعنی اس میں تاکید نہ ہو جیسے کہا جائے ”ثقة“ (ثقة ہے) یا ”حجة“ (قابل اعتماد ہے)۔

۴- چوتھا مرتبہ: ایسے الفاظ سے راوی کی توثیق کی جائے جس میں ضبط یعنی قوت حافظہ کی طرف کوئی اشارہ نہ ہو البتہ وہ لفظ راوی کی تعديل ضرور ظاہر کرتا ہو مثلاً کہا جاتا ہے ”صدوق“ (سچا ہے) یا ”محلة الصدق“ (سچائی پر قائم ہے) یا ”لا باس به“ (اس میں کوئی خرابی نہیں) یا ما مون (امانت والا ہے)۔

۵- پانچواں مرتبہ: راوی کے بارے میں ایسے الفاظ بیان کئے جائیں جو نہ توثیق و تعديل کرتے ہوں اور نہ ہی جرح جیسے کہا جائے ”فلان شیخ“ (فلاں استاذ ہے) یا ”روی عنه الناس“ (اس سے لوگوں نے روایت کی ہے)۔

۶۔ چھٹا مرتبہ: یہ تعدیل کا آخری درجہ ہے اس میں راوی کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو جرح کے قریب محسوس ہوتے ہیں مثلاً کہا جائے ”فلان صالح الحدیث“ (فلاں شخص حدیث روایت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے) یا ”فلان یکتب حدیث“ ”فلاں شخص احادیث لکھ لیتا ہے“ وغیرہ۔ (۲۸)

4.3 مراتب تعدیل کے احکام

(الف) مذکورہ مراتب تعدیل میں پہلے تین مراتب پر فائز راوی قابل اعتماد ہیں یعنی ان کی روایت حجت (قابل اعتماد) ہوگی اگرچہ ان میں پہلے والے راوی کو دوسرے پر اور دوسرے کو تیسرے مرتبہ والے پر ضرور فوقیت حاصل ہوگی۔

(ب) چوتھے اور پانچویں مرتبہ پر فائز راویوں کی حدیث حجت نہیں ہوگی البتہ ان کی احادیث لکھ لی جائیں گی اور آزمائش و امتحان کے لیے ان کا جائزہ لیا جائے گا کہ راوی کا حافظہ کس درجہ کا ہے اگر دوسرے ثقہ راوی ان کی موافقت کریں تو ان کی روایت حجت ہوگی ورنہ نہیں۔

(ج) چھٹے مرتبہ پر فائز راویوں کی حدیث حجت نہیں ہوگی البتہ انہیں لکھ لیا جائے گا۔ ان کی روایات صرف تائید میں استعمال کی جاسکتی ہیں۔ (۲۹)

4.4 جرح کے لیے استعمال ہونے والے مشہور الفاظ

اکذب الناس	بہت بڑے درجے کا جھوٹا یا سب سے بڑھ کر جھوٹا
الیہ المنتہی فی الکذب	اس کی ذات پر جھوٹ کی انتہا ہوتی ہے۔
رکن الکذب	جھوٹ کا رکن رکین۔
کذاب	بہت جھوٹا
ذجال	سخت دھوکہ باز بہت فریبی

بڑا جلسا زیا بڑا حدیثیں گھڑنے والا	وضاع
(حدیثیں) گھڑتا ہے۔	یضع
حدیث گھڑتا ہے۔	یضع الحدیث
جھوٹ بولتا رہتا ہے	یکذب
غلط بیانی کے حوالہ سے تہمت زدہ ہے یعنی اس (راوی) پر غلط	متهم بالكذب
بیانی کا الزام ہے۔	
حدیثیں گھڑنے کے حوالہ سے تہمت زدہ ہے یعنی حدیثیں گھڑنے	متهم بالوضع
کا الزام ہے۔	
حدیثیں چراتا ہے۔	سرق الحدیث
نظر انداز کر دیا گیا ہے۔	ساقط متروک
ثقة نہیں / قابل بھروسہ نہیں۔	لیس بثقة
نا قابل اعتبار ہے۔	لا يعتبر به
اس سے کوئی روایت نہ لی جائے۔	لا یحدث عنه شیء
اس کے ترک پر آئمہ کا اتفاق ہے۔	متفق علی ترکہ
حدیث ضائع کرنے والا ہے	ذاهب الحدیث
(آئمہ) اس سے خاموش ہیں۔	سکتوا عنه
اس کی حدیثیں ترک کی گئی ہیں یا نظر انداز کی گئی ہیں	متروک الحدیث
کمزور حدیثیں نقل کرنے والا۔ یا کہنے والا	واہ الحدیث
اپنی حدیث کو لکھتا نہیں۔	لا یکتب حدیثہ
اس سے روایت لینا ہی درست نہیں	لا تحل الراویۃ عنه
بہت ہی کمزور ہے	ضعیف جدا

واہ	کمزور ہے یا فضول ہے
واہ بالمرة	بالکل ہی کمزور ہے۔
فیہ نظر	اس میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔
ضعفہ	اس کو کمزور ٹھہرایا ہے
لیس بذاک لیس بشی	ٹھیک نہیں
لا یحتج بع	حجت نہیں
لیس بحجة	قابل حجت نہیں
ضعیف	(روایت میں) کمزور ہے۔
لیس بقوی	(روایت میں) پختہ نہیں۔
لہ مناکیر	اس کی روایات منکر ہیں یعنی غفلت سے لکھی گئی ہیں اور غلط ہیں۔
هذا من مناکیرہ	یہ اس کی منکر روایات میں سے ہے۔
منکر الحدیث	حدیث میں غفلت کا مرتکب۔ غلط احادیث بیان کرنے والا
مضطرب الحدیث	حدیث میں مضطرب
لین الحدیث	حدیث کے معاملہ میں نرم رویہ اختیار کرنے والا
فیہ مقال تکلم فیہ	اس (راوی) کے بارے میں باتیں کہی گئی ہیں۔
فیہ ادنیٰ مقال	اس (راوی) کے بارے میں بہت معمولی کہا گیا ہے۔
کتب حدیثہ	اس کی حدیثیں لکھی جائیں
سنی الحفظ	یادداشت اچھی نہیں۔
فی حدیثہ ادنیٰ ضعف	اس کی روایت میں کچھ ضعف ہے۔

4.5 جرح کے مراتب اور ان کے الفاظ

۱- مرتبہ اول

مراتب جرح کے پہلے مرتبہ میں سب سے ہلکی جرح ہوتی ہے اور اس کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ میں سب سے نرمی ہوتی ہے مثلاً کسی راوی کے بارے میں یوں جرح کی جائے کہ فلان لین الحدیث ”فلان شخص حدیث میں نرم رویہ اختیار کرتا ہے“ یا کہا جائے فیہ مقال ”یعنی اس راوی کے متعلق باتیں کہی گئی ہیں“ یا فیہ ادنی مقال ”اس راوی کے بارے میں بہت معمولی کہا گیا ہے“ یا فی حدیثہ ادنی ضعف ”اس کی روایت میں کچھ ضعف ہے“ وغیرہ۔

۲- دوسرا مرتبہ

ایسے الفاظ جو راوی کے ناقابل حجت (ناقابل اعتماد) ہونے کی طرف اشارہ کر رہے ہوں جیسے کہا جائے فلان لا یحتج بہ ”فلان قابل حجت نہیں“۔ یا فلان ضعیف ”فلان ضعیف ہے“ یا لہ مناکیر ”اس کی مرویات منکر ہیں“ یا مضطرب الحدیث ”حدیث میں مضطرب“ یا هذا من مناکیرہ ”یہ اس کی مناکیر (منکر روایات) میں سے ہے“۔

۳- تیسرا مرتبہ

ایسے الفاظ جن میں راوی کی روایات کی عدم کتابت کی صراحت ہوتی ہو جیسے فلان لا یکتب حدیثہ ”فلان تو اپنی حدیث کو لکھتا ہی نہیں“ یا لا تحل الروایۃ عنہ ”اس سے روایت لینا ہی درست نہیں“ یا ضعیف جداً ”بہت زیادہ ضعیف ہے“ یا واہ بالمرۃ ”بالکل ہی کمزور ہے“ یا لیس بشیء وغیرہ۔

۴- چوتھا مرتبہ

ایسے الفاظ جن سے کسی راوی پر جھوٹ کے الزام کی صراحت ہوتی ہو جیسے کسی راوی کے بارے میں کہا جائے فلان متهم بالكذب ”فلان آدمی پر جھوٹ کی تہمت لگی ہے“ یا فلان متهم بالوضع ”فلان آدمی

پروضع حدیث کا الزام ہے، یا سرق الحدث ”حدیثیں چراتا ہے“ یا ساقط یا متروک ”یعنی اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے“ یا لیس بثقة ”یقیناً نہیں“ وغیرہ۔

۵- پانچواں مرتبہ

ایسے الفاظ جو کسی راوی کو جھوٹا ثابت کرتے ہوں جیسے کذاب ”بہت جھوٹا“ یا دجال ”بہت فریبی“ یا وضاع ”بڑا جعل ساز“ یا یکذب ”جھوٹ بولتا ہے“ یا یضع ”جعل سازی کرتا ہے“ یضع الحديث ”حدیث گھڑتا ہے“ وغیرہ۔

۶- چھٹا مرتبہ

راوی کے بارے میں ایسی جرح کی جائے اور ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو مبالغہ پر دلالت کرتے ہوں مثلاً کہا جائے فلان اکذب الناس ”فلاں آدمی سب سے بڑھ کر جھوٹا ہے“ یا الیہ المنتھی ”فی الکذب“ ”فلاں آدمی کی ذات پر جھوٹ کی انتہا ہوتی ہے“ یا فلان رکن الکذب ”فلاں آدمی جھوٹ کا رکن رکین ہے“۔ (۳۰)

4.6 مراتب جرح کے احکام

الف) مذکورہ بالا مراتب جرح میں پہلے دو مرتبے والوں کی احادیث نا قابل احتجاج (نا قابل اعتماد) ہوں گی لیکن ان کی احادیث صرف اعتبار یعنی تحقیق و تفتیش بدر چھان پھانک کے لئے لکھی جائیں گی لیکن یہ بات مدنظر رہے کہ دوسرے مرتبے والے راوی پہلے والے راویوں سے کم درجہ کے ہوں گے۔

ب) آخری چار قسم کے اہل مراتب کا حکم یہ ہے کہ ان کی حدیثیں نا قابل حجت ہوں گی یعنی ان کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں لکھا جائے گا۔ (۳۱)

⑤ اجتماع جرح وتعديل

اجتماع جرح وتعديل یہ ہے کہ ایک راوی پر جرح بھی کی گئی ہو اور اس کی تعديل بھی بیان کی گئی ہو مثلاً جرح وتعديل کا کوئی عالم روای اس کے متعلق یوں کہے کہ انہ ثقہ ”وہ ثقہ ہے“ اور کوئی کہے کہ انہ ضعیف ”وہ تو ضعیف ہے“۔ ایسی صورت حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں جرح یا تعديل میں سے کس کو ترجیح دی جائے گی؟

مذکورہ بالا سوال کا جواب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اجتماع جرح وتعديل کی تفصیلی صورتیں بیان کریں اور پھر ہر صورت کا حکم بھی بتادیں۔

5.1 جرح وتعديل کے اجتماع اور باہم تعارض کی صورتیں

جرح وتعديل کے اجتماع اور باہم تعارض کی چار صورتیں ہیں:

- ۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ راوی کے بارے میں جرح تعديل دونوں ہی مبہم ہوں یعنی نہ تو اسباب جرح بیان کئے گئے ہوں اور نہ ہی تعديل کے اسباب ذکر کئے گئے ہوں۔ ایسی صورت حال میں تعديل کو ترجیح حاصل ہوتی ہے کیونکہ جرح کا مفسر (تفصیلی) ہونا بہر حال شرط ہے۔
- ۲۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جرح وتعديل دونوں ہی مفسر ہوں یعنی اسباب جرح یا اسباب تعديل دونوں واضح بیان کئے گئے ہوں تو ایسی صورت میں جرح مقبول ہوگی یا درہے کہ ایسی صورت میں جارح (جرح کرنے والے) کا متعصب اور تشدد نہ ہونا ضروری ہے۔
- ۳۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ راوی کے بارے میں تعديل مبہم ہو اور جرح مفسر (تفصیلی)۔ ایسی صورت میں جرح مقبول ہوگی کیونکہ جرح کی وجہ کے مفصل ہونے سے پتہ چل رہا ہے کہ جارح (جرح

کرنے والے) کے پاس معدل (تعدیل بیان کرنے والے) کی نسبت راوی سے متعلق علم زیادہ ہے۔

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ جرح مبہم ہو اور تعدیل مفسر ایسی صورت میں تعدیل مقبول ہوگی۔ (۳۲)

5.2 علماء جرح و تعدیل کے اختلاف کا سبب

کسی راوی کے صدق یا کذب، اس کی عدالت و ثقاہت یا فسق و بدیانتی، اس کے حفظ و ضبط یا وہم و نسیان کے بارے میں علماء جرح و تعدیل کی مختلف شرائط کی وجہ سے جرح و تعدیل راوی کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ جرح و تعدیل کے علماء راویان حدیث کے پرکھنے میں انتہائی درجہ محتاط اور پختہ کار ہوتے ہیں ان میں اس قسم کا اختلاف کبھی واقع نہیں ہوا کہ جو راوی (محدثین کے حلقہ میں) ضعیف مشہور ہو وہ (علماء جرح) اس کی توثیق کرنے لگیں یا جو راوی حافظہ کی پختگی یا راست گوئی میں مشہور و معروف ہو اس کی تضعیف کرنے لگیں۔ علماء جرح و تعدیل کا اختلاف تو صرف اسی راوی کی جرح و تعدیل میں ہوتا ہے جو (محدثین کے حلقہ میں) ضعیف یا ثقہ ہونے میں مشہور و معروف نہ ہو اور غیر مشہور ہونے کی وجہ سے تضعیف اور توثیق دونوں کا احتمال ہو، ورنہ جو راوی ضعیف یا حفظ و ضبط میں معروف ہوتے ہیں ان کے بارے میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ان کی تضعیف یا توثیق پر سب متفق ہوتے ہیں۔ (۳۳)

⑥ مقبول جرح و تعديل کی شرائط

6.1 قبول جرح کی شرائط۔

- ۱- جارج (جرح کرنے والا) عادل ہو۔ فاسق کی جرح مقبول نہ ہوگی۔
- ۲- جارج متیقظ ہو مغفل کی جرح مقبول نہیں ہوگی۔
- ۳- جارج اسباب جرح کا عارف (سمجھ رکھنے والا) ہو غیر عارف کی جرح مقبول نہیں ہوگی۔
- ۴- جارج اسباب اور وجوہ جرح کا بیان کرنے والا ہو، مبہم جرح قابل قبول نہیں۔ یہاں یہ بات یاد ہے کہ ابن حجر جرح مبہم کے قبول کے قائل ہیں۔ البتہ اگر کسی راوی کی عدالت معلوم ہو جائے تو پھر جرح مبہم ان کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں امام بخاری اور امام مسلم بھی اس کے قائل ہیں۔ (۳۳)
- ۵- جارج معتدل مزاج ہو متشد نہ ہو۔ (۳۵)
- ۶- جن ائمہ کی امامت لوگوں کے درمیان مشہور اور جن کی عدالت حد تو اتر کو پہنچی ہو ایسے اماموں پر واقع جرح غیر مقبول ہوگی جیسے نافع، شعبہ، مالک، ابو حنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری اور امام اوزاعی وغیرہ۔

6.2 قبول تعديل کی شرائط

قبول تعديل کے تین شروط ہیں۔

- ۱- معدل (تعديل کرنے والا) عادل ہو فاسق کی تعديل مقبول نہیں ہوگی۔
- ۲- معدل متیقظ ہو مغفل نہ ہو کہ راوی کے ظاہری حالات سے دھوکہ کھا جائے۔
- ۳- معدل اسباب تعديل کا عارف ہو جو آدمی قبول ورد کی صفات کو نہ جانتا ہو اس کی تعديل مقبول نہیں ہوگی۔

جرح و تعدیل کے آداب و شرائط میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جرح یا تعدیل کسی خاندانی، قبائلی، وطنی، مسلکی یا نظریاتی وابستگی یا عدم وابستگی کی بناء پر نہ ہو بلکہ اس قسم کے تمام تعصبات سے پاک ہو چنانچہ ایسے جارجین یا معدلین کی جرح یا تعدیل معتبر نہ ہوگی جن کا طریق کار یہ رہا ہو کہ وہ اپنے مسلک، نظریہ اور رائے کی حمایت میں روایت نقل کرنے والے راویوں کو عادل اور مخالف میں روایت نقل کرنے والے راویوں کو غیر ثقہ یا کذاب قرار دیتے ہوں۔ (۳۶)

6.3 تشدد آئمہ کی جرح و تعدیل

تشدد آئمہ سے مراد جرح و تعدیل کے وہ آئمہ ہیں جو کہ راویوں کے بارے میں نہایت سختی سے کام لیتے ہوں کسی راوی کے بارے میں ایسے آئمہ کی تعدیل بہت وزن رکھتی ہے لیکن کسی راوی پر ان کی جرح سے اس کے بارے میں ضعف کا فیصلہ نہیں دیا جائے گا۔ جس راوی پر کسی تشدد کی جرح ہو اس کی جرح کا حال دوسرے آئمہ جرح سے بھی معلوم کرنا چاہئے۔ آئمہ جرح میں زیادہ سختی کرنے والوں میں شعبہ، یحییٰ بن سعید القطان، یحییٰ بن معین، ابن حبان، حکم بن عتیہ وغیرہ مشہور ہیں۔ (۳۷) یہ آئمہ نہایت قلیل اور غیر اہم بات کو دیکھ کر بھی جرح کر لیتے ہیں مثلاً شعبہ جو کہ امیر المومنین فی الحدیث مانے جاتے ہیں لیکن قبول روایت میں ان کی سختی کا عالم یہ ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ فلاں راوی کی روایت آپ کیوں قبول نہیں کرتے تو کہنے لگے ”رایتہ یرکض علی ہر ذون“ (۳۸) (میں نے اسے ترکی گھوڑے پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا)۔ اسی طرح حکم بن عتیہ کا معاملہ ہے کہ ان سے ایک راوی زاذان کے بارے میں سوال کیا گیا کہ آپ زاذان سے روایت کیوں نہیں لیتے؟ تو انہوں نے وجہ یہ بتائی کہ ”کان کثیر الکلام“ (وہ باتیں بہت کرتا ہے)۔ (۳۹)

6.4 صحابہ پر جرح

صحابہ گرام سب کے سب عادل ہیں لہذا جب دوسرے راویوں کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھا جائیگا تو صحابہ کے گروہ کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے گا کیونکہ ان سب کے دل میں ایمان و یقین پوری طرح راسخ ہو چکا

تھا اور وہ تزکیہ و تعدیل پر فائز تھے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

اولئک کتب فی قلوبہم الایمان (۴۰) (یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ ایمان لکھ چکا ہے۔)

چنانچہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں: ان عدالتہ الصحابہ ثابتہ معلومتہ بتعدیل اللہ لہم واخبارہ عن طہارتہم واختیارہ لہم فی نص القرآن (۴۱) یعنی ”صحابہ کا عادل ہونا یقینی طور پر ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعدیل کی اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کی خبر دی ہے اور انہیں نص قرآن کے مطابق اس نے (اپنے نبی کی صحبت کے لیے) چن لیا ہوا تھا۔“

اسی طرح حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں: ان جمیعہم ثقات مامون عدل رضی فواجب قبول ما نقل کل واحد منهم وشہد بہ علی نبیہ ﷺ (۴۲) یعنی سب صحابہ ثقہ (قابل اعتماد) اور امانت دار ہیں عادل ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہوا، ان میں سے ہر ایک نے جو بات رسول اللہ ﷺ سے نقل کی وہ واجب القبول ہے۔ اس بات کی اس نے اپنے نبی ﷺ پر گواہی دی ہے۔“ چنانچہ حافظ ابن اثیر جزی لکھتے ہیں: لا یطرق الیہم الجرح لان اللہ عزوجل ورسولہ زکاہم وعدلاہم یعنی ”جرح ان کی طرف راہ نہیں پاتی کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان کا تزکیہ اور تعدیل کی ہے۔“

6.5 خود آزمائی ②

- ۱- اخذ حدیث کے سلسلہ میں جرح و تعدیل سے کام لینے والے مشہور صحابہ کون سے تھے؟
- ۲- صحیح مسلم کے مقدمے میں اسناد کے اہتمام کے بارے میں کیا تحریر کیا گیا ہے؟
- ۳- دوسری صدی ہجری کی وہ کون سی دو شخصیات ہیں جنہیں فن جرح و تعدیل میں امامت و استناد کا درجہ حاصل ہے۔
- ۴- جرح و تعدیل کے فن پر باقاعدہ کتب کی ابتدا کب سے شروع ہوئی؟
- ۵- فن جرح و تعدیل پر جن علماء نے کتب تحریر کی ہیں ان میں سے دو مشہور شخصیات کا تعارف پیش کیجئے۔
- ۶- کتاب ”الجرح والتعديل“ اور ”تهذيب التهذيب“ کا مختصر تعارف پیش کیجئے۔
- ۷- یونٹ میں جرح و تعدیل کے استعمال ہونے والے مشہور الفاظ تحریر کئے گئے ہیں دیگر کتب کی مدد سے جرح و تعدیل کے لیے استعمال ہونے والے کچھ مزید الفاظ تلاش کر کے ان کی معانی تحریر کیجئے۔
- ۸- جرح و تعدیل کے مراتب غور سے پڑھیے اور ان کے احکام الگ الگ تحریر کیجئے۔
- ۹- اجتماع جرح و تعدیل کی صورت میں محدثین نے کیا اصول اختیار کئے ہیں؟
- ۱۰- جارج و معدل سے کیا مراد ہے؟ محدثین نے ان کے لیے کیا شرائط مقرر کی ہیں؟

حوالہ جات

- ۱- ابن منظور، لسان العرب، مادہ جرح۔
- ۲- محمود الطحان، تیسیر مصطلح الحدیث، ص: ۱۳۹
- ۳- حاکم، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ نیشاپوری، معرفۃ علوم الحدیث - ص: نیز خطیب بغدادی، ابوبکر احمد، الکفایۃ فی علم الروایۃ، ۵۸۱، ۱۰۱
- ۴- قنوجی، صدیق بن حسن، نواب - ابجد العلوم، ۲/۲۱۱
- ۵- الاحزاب، ۲۱
- ۶- النساء، ۸۰
- ۷- النجم، ۳۰
- ۸- النساء، ۶۵
- ۹- النحل، ۴۴
- ۱۰- الحشر، ۷
- ۱۱- ابن ابی حاتم رازی، محمد عبد الرحمن، الجرح والتعديل، دار الکتب العلمیہ لبنان، ۵/۱
- ۱۲- ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، ۱/۹۸
- ۱۳- الحجرات، ۶
- ۱۴- ترمذی، کتاب الشمائل
- ۱۵- کشف الظنون
- ۱۶- نزہۃ النظر، ۸۲، ۸۵

- ۱۷- الکفایہ، باب ماجاء فی صحیح سماع الصغیر،
- ۱۸- مقدمہ فتح الملہم، ص: ۱۵ نیز ملاحظہ ہو تیسیر مصطلح الحدیث ص:
- ۱۹- الکفایہ ص: نیز تیسیر مصطلح الحدیث
- ۲۰- الذہبی، محمد بن احمد، تذکرۃ الحفاظ، مطبوعہ حیدرآباد دکن - ۲/۱
- ۲۱- البخاری،
- ۲۲- مقدمہ صحیح مسلم، باب الاسناد من الدین، ص ۱۱
- ۲۳- ایضاً مقدمہ مسلم
- ۲۴- معرفۃ علوم الحدیث
- ۲۵- السنۃ ومکانہا فی التشریع الاسلامی
- ۲۶- ابن عدی، ابوالاحمد عبداللہ جرجانی، الکامل فی الضعفاء ۱/۶۶ تا ۷۰
- ۲۷- کتاب الجرح والتعديل، ۱/۱۰، ۲/۳۷ نیز تدریب الراوی، ۱/۳۶۶، الکفایہ ۲۳
- ۲۸- کتاب مقدمہ ابن صلاح مع شرح التقييد والايضاح طبع مصر، ۱۳۶۳ تا ۱۳۶۴ نیز تیسیر مصطلح الحدیث، ۱۳۹
- ۲۹- الکفایہ، ۲۲، ۲۳ نیز تیسیر مصطلح الحدیث
- ۳۰- فتح المغیث للعراقی ۲/۴۲ نیز فتح المغیث للسخاوی، ۱۶۲-
- ۳۱- الکفایہ، ۲۲، ۲۳، تدریب الراوی ۱۲۶، ۱۲۷ فتح المغیث ۱/۴۱، ۴۲، تیسیر مصطلح الحدیث ۱۵۰
- ۳۲- تدریب الراوی، (طبع مصر) ص: ۱۱۳ نیز مقدمہ ابن صلاح (طبع مصر) ص: ۱۱۹، نور الدین عتر، منہج النقد فی علوم الحدیث (طبع دمشق) ص: ۱۰۰
- ۳۳- السنۃ ومکانہا فی التشریع الاسلامی
- ۳۴- ابن صلاح، علوم الحدیث بتحقیق ڈاکٹر نور الدین عتر، نیز طفر احمد عثمانی، مقدمہ اعلاء السنن ۱/۱۰۳، منہج النقد ص: ۹۵
- ۳۵- منہج النقد، ص: ۹۵

- ۳۶ - مقدمہ اعلاء السنن ۱/۱۰۳، منہج القدس: ۹۵
- ۳۷ - مقدمہ فتح الباری، ۲/۱۶۲، ۱۲۹/۲، میزان الاعتدال للذہبی، ۱/۲۳۶، ۱۸۵/۲
- ۳۸ - الکفایہ، ۱۸۲، ۱۸۳، تدریب، ۲۰۲
- ۳۹ - الکفایہ، نیز تدریب، ۱۱۱
- ۴۰ - الحجرات، ۱۴
- ۴۱ - الکفایہ (طبع دائرہ معارف عثمانیہ، حیدرآباد دکن) ص: ۴۶
- ۴۲ - کتاب التمهید لابن عبد البر، ۴/۲۶۳



یونٹ نمبر 17

تخریج حدیث اور اس کے اسالیب و مناج

تحریر: ڈاکٹر علی اصغر چشتی
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی



فہرست

- 581 یونٹ کا تعارف
- 582 یونٹ کے مقاصد
- 583 ① تخریج کا لفظی مفہوم
- 585 ② تخریج کے فوائد
- 585 2.1 مصدر حدیث کی پہچان
- 585 2.2 حدیث کی مختلف اسانید کی پہچان
- 585 2.3 تقابلی اسناد
- 585 2.4 حدیث کا درجہ استناد
- 586 2.5 اہمال کا ازالہ
- 586 2.6 ابہام کا ازالہ
- 586 2.7 سند معصن کی وضاحت
- 587 2.8 راوی کے سقم اور نقص کی پہچان
- 587 2.9 راوی کی تعیین
- 587 2.10 زیادتِ راوی کی پہچان
- 587 2.11 مشکل الفاظ کی وضاحت

588

2.12 روایت باللفظ کی پہچان

588

2.13 کتابت میں کمی بیشی

596

③ تخریج کے ضمن میں بنیادی نکات

601

④ تخریج کے طریقے

601

4.1 تخریج بذریعہ مطلع حدیث

608

4.2 تخریج بذریعہ الفاظ حدیث

610

4.3 تخریج بذریعہ راوی

615

4.4 تخریج باعتبار موضوع

618

خود آزمائی ۱

619

خود آزمائی ۲

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

اس وقت جو یونٹ آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کا تعلق ”تخریج حدیث کے اسالیب“ سے ہے۔ آپ اس سے پہلے کتب حدیث کے انواع و اقسام کے تحت پڑھ چکے ہیں کہ علماء حدیث نے حدیث کے ادب کی تدوین میں کس طرح مختلف پہلوؤں کو مد نظر رکھا اور تالیف و تصنیف کا کام کیا ہے۔ علماء حدیث کی شبانہ روز محنت اور جہد مسلسل کی وجہ سے روایات کے ذخائر ضخیم تالیفات کی شکل میں جمع ہو گئیں..... حدیث کے طالب علم کے سامنے جب کوئی روایت بغیر حوالہ کے آتی ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ اس روایت کی اصل کس طرح تلاش کی جائے۔ ہمارے ہاں مختلف موضوعات پر کئی کتب ایسی تالیف ہوئی ہیں جن میں روایات کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے لیکن روایات کی حیثیت اور مصادر کا علم نہیں۔ اس قسم کی کتب کا مطالعہ کرتے وقت یہ معلوم کرنا کہ کس روایت کی کیا حیثیت ہے ایک اچھا خاصا مشکل کام ہے..... حدیث کے طلبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ روایات کی اصل تک رسائی رکھتے ہوں..... اس لئے کہ روایت کی حیثیت کا تعین اصل مصدر تک رسائی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

اس یونٹ میں ”تخریج کے مختلف اسالیب“ پر گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ روایت کو اصل مصدر سے حاصل کرنے کے کیا کیا اسلوب اور طریقے استعمال جاسکتے ہیں..... تخریج کا تعلق چونکہ عمل سے ہے اس لئے محض نظریاتی طور پر مطالعہ کرنے سے اس فن میں مہارت حاصل نہیں ہو سکتی۔ آپ اس یونٹ کا مطالعہ کریں اور اس میں جو طریقے بتائے گئے ہیں ان کے مطابق مصادر اور مآخذ سے روایات حاصل کرنے کی عملی مشق بھی کریں۔ اس طرح جب آپ تھوڑی بہت محنت کریں گے تو آپ کو مناسبت اور دلچسپی پیدا ہو جائے گی اور رفتہ رفتہ آپ اس فن میں مہارت حاصل کر لیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇨ تخریج کا لفظی مفہوم بیان کر سکیں۔
- ⇨ تخریج کے اصطلاحی مفہوم پر بات کر سکیں۔
- ⇨ تخریج کے فوائد پر بحث کر سکیں۔
- ⇨ تخریج کے ضمن میں جن نکات کو پیش نظر رکھنا چاہیے ان پر گفتگو کر سکیں۔
- ⇨ تخریج کرتے وقت روایت کے جن اعتبارات کو مد نظر رکھنا چاہئے ان کی نشاندہی کر سکیں۔
- ⇨ ”تخریج بذریعہ مطلع حدیث“ کی تفصیل بتا سکیں۔
- ⇨ ”تخریج بذریعہ الفاظ حدیث“ کی افادیت اور اہمیت پر بات کر سکیں۔
- ⇨ ”تخریج بذریعہ راوی“ کی تعریف کر سکیں اور اس ضمن میں اہم مصادر کی نشاندہی کر سکیں۔

① تخریج

لفظی مفہوم:

لفظی اعتبار سے ”تخریج“ خَوَج سے ہے جس کے معنی ظہور اور کھل کر سامنے آنے کے ہیں۔ عربی محاورہ میں جب کسی شخص کی صلاحیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے تو کہتے ہیں ”خرجت خوارج فلان“ اسی طرح جب آسمان سے بادل چھٹ جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے ”خرجت السماء خروجا“ طالب علم جب تعلیمی مراحل طے کر کے ڈگری حاصل کرتا ہے تو کہا جاتا ہے۔ ”خرجہ فی العلم“

اصطلاحی مفہوم:

علمائے حدیث کے ہاں تخریج سے مراد کسی حدیث کا پوری سند کے ساتھ نقل کرنے کے ہیں۔ یہ حضرات جب کہتے ہیں۔ ”هذا الحديث أخرجه فلان“ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس حدیث کو فلاں شیخ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ شیخ جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں۔ (کثیرا ما يقولون بعد سوق الحديث، أخرجه فلان أو أخرجه، بمعنى ذكره..... فالمنخرج اسم فاعل هو ذاكر الرواية كالبخاری) (قواعد التحدیث: ص- ۲۱۹)

اکثر و بیشتر علماء حدیث جب روایت کرتے ہیں تو اس کے بعد کہتے ہیں: اس کی تخریج فلاں شیخ نے کی ہے۔ اس صورت میں ”تخریج“ سے مراد حدیث ذکر کرنے کے ہوتے ہیں۔ یہاں تخریج اسم فاعل ہے یعنی حدیث ذکر کرنے والا مثلاً اگر تخریج امام بخاری نے کی ہو تو وہ مخرج کہلائیں گے۔ امام مسلم نے کی ہو تو وہ مخرج کہلائیں گے۔ امام ترمذی نے کی ہو تو وہ مخرج کہلائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

تخریج کے معنی حدیث کو اس شیخ کی طرف منسوب کرنے کے بھی ہیں جس نے اپنے مجموعہ میں اس

حدیث کو پوری سند کے ساتھ اخذ کیا ہو..... محدثین حضرات جب کہتے ہیں (خرج احادیث کتاب کذا) تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ فلاں شیخ نے فلاں کتاب کی روایات کو اس کے اصل مؤلف کی طرف منسوب کیا اور ان کی حیثیت پر کلام کیا..... شیخ مناوی اپنی کتاب فیض القدر میں لکھتے ہیں (عزو الأحادیث إلى مخرجيها من أئمة الحديث من الجوامع والسنن والمسانيد) (فیض القدر: ج ۱- ۲۰۰)

تخریج کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ روایت کو ان ائمہ حدیث کی طرف منسوب کیا جائے جنہوں نے ان احادیث کو جوامع، سنن اور مسانید میں سنداً نقل کیا ہو اور ان احادیث پر اس پہلو سے کلام کیا جائے کہ ان کے درجہ استناد کی تعیین ہو سکے۔

تخریج کی غرض و غایت

تخریج کے ذریعہ حدیث کے مآخذ تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور قابل رد یا قابل قبول ہونے کے لحاظ سے اس کی حیثیت معلوم ہوتی ہے۔

② تخریج کے فوائد

تخریج کے فوائد ان گنت ہیں یہاں ان چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

2.1 مصدر حدیث کی پہچان

تخریج کے ذریعہ محقق بآسانی حدیث کے بنیادی مآخذ تک پہنچ جاتا ہے اسے مطلوبہ حدیث کا درجہ اور حیثیت معلوم ہو جاتی ہے اور وہ اطمینان کے ساتھ اس حدیث کو اپنے ہاں نقل کر لیتا ہے۔

2.2 حدیث کی مختلف اسانید کی پہچان

تخریج کے ذریعہ محقق کے سامنے حدیث کی وہ تمام اسانید آ جاتی ہیں جو مختلف کتب حدیث یا ایک کتاب میں مختلف مقامات پر موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح مطلوبہ حدیث کی اسانید کو مد نظر رکھ کر محقق اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر سکتا ہے۔

2.3 تقابل اسناد

تخریج کے ذریعہ محقق طالب علم حدیث کی مختلف اسناد کا تقابل کر سکتا ہے اور دیکھ سکتا ہے کہ کس سند کے رواۃ صحت کے لحاظ سے زیادہ معتمد ہیں اور کس سند کے رجال میں نقص یا سقم پایا جاتا ہے۔

2.4 حدیث کا درجہ استناد

تخریج کے ذریعہ روایت کی مختلف اسناد سامنے آ جاتی ہیں جس کی بنا پر حدیث کا درجہ استناد معلوم کرنے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ بعض مرتبہ حدیث کی ایک سند میں کہیں نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ

درجہء استناد سے گر جاتی ہے لیکن اس کی دوسری سند میں وہ نقص نہیں ہوتا..... یا ایک حدیث جب کئی اسناد سے مروی ہوتی ہے تو علماء حدیث کثرت طرق کی بناء پر اسے قبول کر لیتے ہیں اور اسے قابل اخذ و قابل استدلال ہونے کا درجہ دے دیتے ہیں۔

2.5 اہمال کا زالہ

بعض اسناد ایسی ہوتی ہیں جن کے راوی مہمل ہوتے ہیں مثلاً ”عن محمد“..... یا..... ”حدثنا خالد“ جس کی وجہ سے سند میں صراحت نہیں ہوتی۔ تخریج کے ذریعہ اس قسم کے اہمال کا ازالہ ہو جاتا ہے اور راوی کی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے۔

2.6 ابہام کا ازالہ

بعض مرتبہ سند میں ابہام ہوتا ہے۔ مثلاً ”عن رجل“ یا ”عن فلان“ یا جاء رجل إلى النبي ﷺ اس صورت میں ”رجل“ اور ”فلان“ سے کوئی اندازہ نہیں ہوتا تخریج کے ذریعہ جب مختلف اسانید جمع ہو جاتی ہیں تو سند میں اس قسم کے ابہام کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

2.7 سند معنعن کی وضاحت

جس سند میں راوی نے ”عن“ کا صیغہ استعمال کیا ہو تو اس صورت میں اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ راوی نے اپنے شیخ سے کس طرح استفادہ کیا ہے۔ سند معنعن میں چونکہ انقطاع کا احتمال ہوتا ہے اس لئے علماء حدیث ایسی سند کو تحقیق کے بغیر قبول نہیں کرتے..... تخریج کے ذریعہ جب حدیث معنعن کی مختلف اسناد جمع ہو جاتی ہیں تو عام طور پر کسی ایک سند میں صیغہ ”عن“ کی وضاحت مل جاتی ہے اور اس طرح انقطاع کا وہ احتمال ختم ہو جاتا ہے جو محض ایک سند کی بنا پر موجود ہوتا ہے۔

2.8 راوی کے سقم اور نقص کی پہچان

بعض رواۃ ایسے ہیں جن کے بارے میں علماء رجال نے وضاحت کی ہے کہ وہ عمر کے آخری حصہ میں بیماری یا ضعف کی وجہ سے ”ضابط“ نہیں رہے ایسے رواۃ کی روایات کے بارے میں یہ شبہ رہتا ہے کہ آیا اس نوع کے راوی کی روایت قابل قبول ہے یا قابل رد ہے..... تخریج کے ذریعہ چونکہ بہت ساری اسناد محقق کے سامنے آ جاتی ہیں اس لئے وہ ایسے رواۃ کی روایات کی بڑی آسانی کے ساتھ جانچ پڑتال کر سکتا ہے اور صحیح وضعیف روایات کو الگ الگ کر سکتا ہے۔

2.9 راوی کی تعیین

حدیث کے رواۃ میں بہت سارے راوی ایسے ہیں جو محض اپنی کنیت سے مشہور ہیں اور بہت سارے ایسے ہیں جن کی کنیت میں اشتراک ہے۔ کنیت میں اشتراک کی وجہ سے راوی کی تعیین مشکل ہو جاتی ہے۔ تخریج کے ذریعہ راوی کی کنیت، اس کا نام اور دیگر تفصیلات بھی سامنے آ جاتی ہیں اس لئے اس کی تعیین میں جو التباس ہوتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے۔

2.10 زیادۃ راوی کی پہچان

بعض مرتبہ حدیث کے ایک متن میں کمی ہوتی ہے اور دوسرے طریق سے وارد شدہ متن میں اضافہ ہوتا ہے اس صورت میں بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ متن کے ضبط میں کمی بیشی ہوئی ہے..... حالانکہ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک راوی نے متن میں وضاحت کی خاطر الفاظ و کلمات کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا ہو..... تخریج کے ذریعہ اس قسم کے اختلافات سامنے آ جاتے ہیں اور روایت کے متن کی اصل تصویر نمایاں ہو جاتی ہے۔

2.11 مشکل الفاظ کی وضاحت

ذخیرہ حدیث میں ایسے الفاظ و کلمات بھی موجود ہیں جن کے صحیح مفہوم تک رسائی میں دقت محسوس

ہوتی ہے۔ عام طور پر اس قسم کے الفاظ و کلمات اگر ایک سند کے متن میں آئے ہوں تو دوسری سند کے متن میں ان کی وضاحت بھی مل جاتی ہے..... تخریج کے ذریعہ ایک حدیث کی مختلف اسناد کے مطالعہ سے اس قسم کی دقتیں حل ہو جاتی ہیں اور محقق بآسانی اس متن کا مفہوم سمجھ لیتا ہے جس میں غریب کلمات استعمال ہوئے ہوں۔

2.12 روایت باللفظ کی پہچان

علماء حدیث کے ہاں چونکہ روایت باللفظ اور روایت بالمعنی دونوں جائز ہیں اس لئے ذخیرہ حدیث میں ایسی روایات موجود ہیں جنہیں رواۃ نے لفظاً اخذ کیا ہے۔ تخریج کے ذریعہ جب مختلف اسناد اور متون جمع ہو جاتے ہیں تو محقق بآسانی سمجھ لیتا ہے کہ کون سا متن لفظاً اخذ کیا گیا ہے اور کون سا معنی ضبط کیا گیا ہے۔

2.13 کتابت میں کمی بیشی

حدیث کی روایات مخطوطات کی شکل میں پھیلی ہیں ان مخطوطات کی کتابت اور ترتیب میں رواۃ حدیث نے انتہائی عرق ریزی اور دیانت سے کام لیا ہے۔ لیکن پھر بھی انسان خطا کا پتلا ہے بعض مرتبہ شیخ کے الفاظ کتابت سے بوجہ گر جاتے ہیں اور راوی کو انکے گرنے کا اندازہ نہیں ہوتا..... تخریج کے ذریعہ چونکہ ایک حدیث کے مختلف متون اور اسناد یکجا ہو جاتی ہیں اس لئے اگر کسی راوی سے کمی بیشی ہوئی ہو تو دوسرے راوی کی نقل کردہ متن سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

ان تمام فوائد کو مد نظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ تخریج کے ذریعہ کسی حدیث کے مندرجہ ذیل دونوں پہلو کھل کر سامنے آ جاتے ہیں.....

(۱) اسناد جمع ہونے کی وجہ سے اسنادی پہلو

(۲) متون جمع ہونے کی وجہ سے لفظی پہلو

حدیث چونکہ سند اور متن سے مرکب ہوتی ہے اس لئے حدیث کے جس طالب علم کی رسائی اسناد اور

متون تک ہو جائے تو اس کے لئے علم حدیث کے مراجع اور مآخذ سے استفادہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔
 ”تخریج“ ایک مستقل فن ہے اس کا تعلق چونکہ مشق اور ممارست سے ہے اس لئے طلبہ کو چاہیے کہ وہ ابتدا میں چند روایات لے کر ان کی تخریج کی کوشش کریں..... ابتداء میں تخریج کرتے وقت دقت اور گھٹن محسوس ہوتی ہے لیکن جب اس فن کے ساتھ مناسبت ہو جاتی ہے تو یہ بہت مفید اور دلچسپ فن ہے ذیل میں تخریج کے فوائد کی مزید وضاحت کے پیش نظر چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں..... ممکن ہے ان مثالوں کو پیش نظر رکھ کر طلبہ اپنی مطلوبہ روایات کی تخریج بہتر اور آسانی کے ساتھ کر سکیں..... امید ہے آپ ان مثالوں کا مطالعہ پوری توجہ اور انتہاک کے ساتھ کریں گے۔

مثال نمبر ۱:

(روى عن المغيرة بن شعبة قال: "وَضَّأْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، فَمَسَحَ أَعْلَى الْخَفَيْنِ وَأَسْفَلَهَا")

اس حدیث کو جب ہم نے تخریج کے پہلو سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اسے امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں اور امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے.....
 ذیل میں ہم ان تینوں مآخذ سے پوری سند کے ساتھ روایت نقل کریں گے اور پھر بتائیں گے کہ اس حدیث کی تخریج سے ہمیں کون سے فوائد حاصل ہوئے۔

امام ترمذی نے اپنی جامع میں حدیث کو اس طرح اخذ کیا ہے۔

(حدثنا ابو الوليد الدمشقي: حدثنا الوليد بن مسلم، أخبرني ثور بن يزيد عن رجاء بن حيوة، عن كاتب المغيرة، عن المغيرة بن شعبة: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ أَعْلَى الْخَفِ وَأَسْفَلَهُ) (اخرجه الترمذی فی الطهارة، باب ماجاء فی المسح علی الخفين اعلاه واسفله)
 (حدیث رقم ۶۷)

امام ابو داؤد جستانی نے اپنی سنن میں اس روایت کو یوں نقل کیا ہے۔

(حدثنا موسى بن مروان و محمود بن خالد الدمشقي، قالا حدثنا الوليد قال محمود قال اخبرنا ثور بن يزيد، عن رجاء ابن حيوة عن كاتب المغيرة بن شعبة، عن المغيرة بن شعبة قال: وَصَّاتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ فَمَسَحَ عَلَى الْخَفَيْنِ وَأَسْفَلَهُمَا) امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اس حدیث کو اس طرح ذکر کیا ہے: حدثنا حشام بن عمار، ثنا الوليد بن مسلم، حدثنا ثور بن يزيد، عن رجاء بن حيوة، عن وراد. كاتب المغيرة بن شعبة. عن المغيرة بن شعبة: ان رسول الله ﷺ مسح أعلى الخف وأسفله“

اس حدیث کی تخریج سے جو فوائد سامنے آئے انہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

- ۱- تخریج کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوا کہ اس حدیث کو تین ائمہ حدیث نے اپنے ہاں ذکر کیا ہے۔ امام ترمذی نے اپنی سنن میں۔ امام ابو داؤد نے اپنی ”سنن“ اور امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں۔
- ۲- سنن ابو داؤد میں یہ حدیث جس سند کے ساتھ وارد ہوئی ہے اس میں امام ابو داؤد کے دونوں شیوخ موسیٰ بن مروان اور محمود بن خالد دمشقی نے اپنے شیخ ”ولید“ سے روایت اخذ کی ہے۔ اس سند میں ”ولید“ کے بارے میں اہمال پایا جاتا ہے لیکن اس اہمال کا ازالہ امام ترمذی اور امام ابن ماجہ کی اسناد سے آسانی ہو جاتا ہے۔ ان دونوں ائمہ کے ہاں سند میں ”ولید“ کی وضاحت موجود ہے۔ یعنی ”ولید بن مسلم“۔

- ۳- امام ترمذی اور امام ابو داؤد کے ہاں ”کاتب المغیرۃ“ کی وضاحت موجود نہیں جس کی وجہ سے سند میں اس پوائنٹ پر ابہام پایا جاتا ہے..... یہ ابہام امام ابن ماجہ کی سند کے ذریعہ دور ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ امام ابن ماجہ کی سنن میں جس سند کے ساتھ یہ حدیث نقل ہوئی ہے اس میں کاتب المغیرۃ کا نام ”وراد“ بتایا گیا ہے..... وراد کو ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اور جمہور علماء رجال کے

نزدیک ثقہ و عادل ہیں۔

۴۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کر لینے کے بعد کہا ہے کہ یہ حدیث معلول ہے اس لئے کہ ولید بن مسلم کے علاوہ ثور بن یزید سے اسے سند کسی نے بھی اخذ نہیں کیا..... میں نے امام ابو زرہ اور امام محمد بن اسماعیل البخاری سے اس کی بابت معلوم کیا تو ان دونوں شیوخ نے بتایا کہ یہ حدیث صحیح نہیں کیونکہ ابن مبارک نے اسے ثور بن یزید اور انہوں نے رجاء بن حیوہ سے اخذ کیا ہے۔ رجاء بن حیوہ کو یہ حدیث وراد (کاتب المغیرۃ) سے ملی ہے۔ وراد نے اسے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے حالانکہ وراد کا تعلق طبقہ تابعین سے ہے۔

۵۔ امام ابو داؤد اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں ”میری معلومات کے مطابق ثور بن یزید نے یہ حدیث رجاء ابن حیوہ سے براہ راست اخذ نہیں کی ہے“۔

۶۔ امام ابو داؤد کی روایت میں اس حدیث کی تاریخ بھی آگئی ہے یعنی غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے موزوں پر اس طرح مسح فرمایا۔

۷۔ سنن ابو داؤد کے نسخے میں ”مسح علی الخفین واسفلھما“ کے الفاظ منقول ہیں لیکن جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں ”اعلی الخفین واسفلھما“ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنن ابو داؤد میں طباعت کی غلطی کی وجہ سے ”اعلی“ کے بجائے ”علی“ کا لفظ لکھا گیا ہے۔

دیکھئے! یہاں محض تین مآخذ کی بنیاد پر ہم نے ایک روایت کی تخریج کی ہے..... اگر ہم اس روایت کو دیگر مآخذ میں بھی تلاش کریں اور اس طرح اسانید اور متون کا موازنہ اور تقابل کریں تو بہت سارے مزید گوشے ہمارے سامنے آسکتے ہیں اور اس طرح ایک روایت کے بارے میں ہمیں بہت ساری معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ تخریج روایات کی تہہ تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

مثال نمبر ۲:

(إذا خطب أحدكم المرأة، فإن استطاع أن ينظر إلى ما يدعوه إلى نكاحها فليفعل)
یہ ایک مشہور حدیث ہے جب ہم نے اس کی تخریج کی تو معلوم ہوا کہ اسے امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں، امام حاکم نے اپنی مستدرک میں، امام احمد نے اپنی مسند میں اور امام عبد الرزاق صنعانی نے اپنی مصنف میں ذکر کیا ہے۔

ذیل میں ہم ان چاروں مآخذ سے مذکورہ روایت کو پوری سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں تاکہ تخریج کے ذریعہ جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کی کچھ مزید وضاحت ہو سکے۔

۱..... امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں اس حدیث کو اس طرح ذکر کیا ہے ((حدثنا مسدد، أخبرنا عبد الواحد بن زياد، أخبرنا محمد بن اسحاق، عن داود بن حصين، عن واقد بن عبد الرحمن..... يعني ابن سعد بن معاذ..... عن جابر بن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ: إذا خطب أحدكم المرأة، فإن استطاع أن ينظر إلى ما يدعوه إلى نكاحها فليفعل)) (اخرجه ابو داؤد في النكاح باب في الرجل ينظر الى المرأة وهو يريد تزويجها: ج. ۱، ص ۹۴، عون المعبود)

۲..... امام حاکم نے اپنی مستدرک میں اس روایت کو یوں اخذ کیا ہے۔ ((أخبرني ابو بكر محمد بن عبد الله بن قريش، ثنا الحسن بن سفيان، ثنا محمد بن ابي بكر المقدمي، أخبرني عمر بن علي بن مقدم، ثنا محمد اسحاق، عن داود بن الحصين، عن واقد بن عمرو بن سعد بن معاذ، عن جابر..... قال: قال رسول الله ﷺ إذا خطب أحدكم المرأة فإن استطاع أن ينظر إلى بعض ما يدعوه إلى نكاحها فليفعل)) (اخرجه الحاكم في المستدرک فی

النکاح: باب اذا خطب أحدکم المرأة فان استطاع ان ينظر إلى بعض مایدعوہ إلى نکاحها فلیفعل: ج. ۱، ص. ۱۶۵)

۳..... امام احمد بن محمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اس حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے ((حدثنا یونس بن محمد، ثنا عبد الواحد بن زیاد، ثنا محمد بن اسحاق عن داؤد بن الحصین، عن واقد بن عبد الرحمن بن سعد بن معاذ، عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ اذا خطب أحدکم المرأة، فإن استطاع ان ينظر منها مایدعوہ إلى نکاحها فلیفعل)) (اخرجه أحمد فی مسنده: ج. ۳، ص. ۳۳۲)

۸- امام احمد کی مسند میں یہ حدیث دوسری سند کے ساتھ اس طرح وارد ہوئی ہے۔

((حدثنا یعقوب، ثنا أبی، عن ابن اسحاق، حدثنی داؤد بن الحصین..... مولی عمرو بن عثمان..... عن واقد بن عمرو بن سعد بن معاذ، عن جابر بن عبد الله الانصاری قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: اذا خطب أحدکم المرأة فقد ر أن یری منها بعض مایدعوہ إلى نکاحها فلیفعل)) (رواه احمد فی مسنده: ج. ۳، ص. ۳۶۰)

امام عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں اس حدیث کو اس طرح نقل کیا ہے: عن یحیی بن العلاء "عن داؤد بن الحصین" عن واقد بن عمر بن سعد بن معاذ، عن جابر بن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ: "لا جناح علی أحدکم اذا أراد أن یخطب المرأة ان یغترها فینظر إليها، فان رضی نکح، وإن سخط ترک"

اس حدیث کے مختلف اسانید اور متون کو جمع کرنے کے بعد اس کے جو پہلو ہمارے سامنے آئے۔ ذیل میں ہم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔ تاکہ طلبہ تخریج کے فوائد سے مزید آگاہ ہو سکیں۔

(۱) تخریج کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوا کہ اس حدیث کو امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں اخذ کیا ہے۔

امام حاکم نے اپنی مستدرک میں، امام احمد نے اپنی مسند میں دو اسناد کے ساتھ اور امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں اسے ذکر کیا ہے..... ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان مصادر میں یہ حدیث کون کون سے باب کے تحت درج ہوئی ہے۔

(۲) اس حدیث کی سند کو جب ہم نے جانچا تو معلوم ہوا کہ ابن اسحاق نے اپنے شیخ داؤد بن حصین سے ”عن“ کہہ کر روایت اخذ کی ہے۔ ابن اسحاق چونکہ مدلس ہے اور مدلس جب ”عن“ کے ساتھ روایت کرے تو علماء حدیث کے ہاں اس کی سند اس وقت تک منقطع سمجھی جاتی ہے جب تک اس میں ”اتصال“ ثابت نہ ہو جائے..... امام ابو داؤد، امام حاکم اور امام حمد کلایاں پہلی سند میں ابن اسحاق نے ”صیغہ عن“ کے ساتھ داؤد بن حصین سے روایت لی ہے۔ لیکن امام احمد کے ہاں دوسری سند میں ابن اسحاق نے ”حدثنی داؤد“ کہہ کر روایت بیان کی ہے..... اس طرح امام احمد کی دوسری سند کے ذریعہ ابن اسحاق کی تالیس کی بنا پر انقطاع کا احتمال ختم ہو گیا اور سند میں اتصال ثابت ہو گیا۔

(۳) سنن ابو داؤد اور مسند احمد کی پہلی سند میں جابر بن عبد اللہ سے واقد بن عبد الرحمن بن سعد بن معاذ نے روایت اخذ کی ہے۔ امام ابن القطان نے ”واقد“ کی وجہ سے اس حدیث کو معلول قرار دیا اور کہا کہ یہاں ”واقد بن عمرو“ ہونا چاہیے اس لئے اس کہ طبقہ میں ”واقد بن عمرو“ کو شہرت حاصل ہے..... ہم نے جب دیگر اسانید کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ مستدرک حاکم اور مسند احمد کی دوسری سند میں ”واقد بن عمرو بن سعد بن معاذ“ کا نام آیا ہے..... اسی طرح امام عبدالرزاق نے جس سند کے ساتھ اس حدیث کو اخذ کیا ہے اس میں بھی ”واقد بن عمرو بن جابر“ آیا ہے..... تخریج کے ذریعہ ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ابن القطان نے ”واقد بن عبد الرحمن“ کی وجہ سے علت کی نشاندہی کی تھی اس کا ازالہ دیگر اسانید میں ”واقد بن عمرو بن سعد بن معاذ“ کا نام آنے کی وجہ سے ہو گیا اور حدیث معلول نہ رہی.....

(۴) امام احمد کی مسند میں یہ حدیث جس دوسری سند سے آتی ہے اس میں داؤد بن حصین کے

بارے میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ داؤد عمرو بن عثمان کے مولیٰ تھے۔

(۵) مصنف عبدالرزاق میں یہ حدیث جس متن کے ساتھ نقل ہوئی ہے اس میں دیگر متون کے مقابلہ میں تفصیل آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ خاتون کو اس حال میں دیکھا جائے کہ اسے معلوم نہ ہو..... اس لئے کہ دیکھنے کے بعد اگر اسے پسند نہ کیا گیا تو اس سے اسے دلی دکھ ہو سکتا ہے۔

(۶) بعض متون میں تعیم ہے مثلاً: ینظر الی یدعوہ “ اور بعض میں تھخیص ہے مثلاً: ینظر الی بعض ما یدعوہ “

(۷) طبقہ صحابہ میں اس حدیث کے راوی حضرت جابرؓ ہیں حضرت جابرؓ سے اسے واقد بن عمرو سے روایت کیا ہے اور واقد سے داؤد بن الحصین نے..... داؤد کے بعد اس کی سند میں پھیلاؤ شروع ہو جاتا ہے..... اور سند کئی طرق میں پھیل جاتی ہے۔

حدیث کی تخریج اگر توجہ، انہماک اور محنت سے کی جائے تو بہت سارے مخفی گوشے واضح ہو جاتے ہیں اور طالب علم کو اس کی سند اور متن کے لحاظ سے پوری طرح اطمینان ہو جاتا ہے..... حدیث کی جتنی زیادہ اسانید جمع ہوں گی اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوگا۔ اس لئے تخریج کرتے وقت کوشش کرنی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ مصادر اور مآخذ سے استفادہ ہو..... یہ بات درست ہے کہ تخریج ایک دقیق اور مشکل فن ہے۔ لیکن جب اس فن کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر یہ بہت دلچسپ، وقیع، مفید اور آسان معلوم ہوتا ہے۔ اب ہم اس ضمن میں چند بنیادی نکات آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ امید ہے آپ ان نکات کو ذہن میں رکھیں گے۔

③ تخریج کے ضمن میں چند بنیادی نکات

تخریج متن حدیث:

اگر آپ حدیث کے متن کی تخریج کر رہے ہوں تو اس صورت میں آپ کو مندرجہ ذیل پہلوؤں کی وضاحت کرنا ہوگی۔

مآخذ کی نشاندہی: آپ کو بتانا ہوگا کہ حدیث کن کن مآخذ میں وارد ہوئی ہے..... اس کے لئے علماء حدیث کے ہاں جو طریقہ رائج ہے وہ یہ ہے: مثلاً اگر صحیح بخاری میں زیر نظر روایت کتاب الصلاۃ میں آئی ہو تو آپ کہیں گے۔

(آخر جہ البخاری..... فی کتاب الصلاۃ) اس کے بعد جس باب کے تحت روایت آئی ہو اس کا عنوان لکھیں گے ”فی باب کذا“ پھر صفحہ کا نمبر دیں گے..... اگر حدیث کا نمبر موجود ہو تو وہ نمبر بتائیں گے۔ کتاب جہاں سے چھپی ہے اس مطبع کی نشاندہی کریں گے..... جس سال کتاب چھپی ہے اس سال کے بارے میں بتائیں گے..... اور کتاب کا ایڈیشن بھی بتائیں گے..... یہ سب کچھ کرنے کے بعد آپ اس حدیث کے بارے میں علماء حدیث کی رائے بتائیں گے..... اور باعتبار صحت حدیث کی جو حیثیت ہو اسکی نشاندہی کریں گے..... حدیث کی سند میں انقطاع، اتصال، ارسال وغیرہ ہو تو اسکا بھی ذکر کریں گے..... تخریج کرتے وقت آپ جتنی محنت کریں گے اور جتنی معلومات جمع کریں گے اتنا ہی آپ کا کام زیادہ وسیع شمار ہوگا۔

جب آپ ”مطلق متن“ کی تخریج کر رہے ہوں تو اس صورت میں آپ صرف ”متن“ کو مد نظر رکھیں

گے اور جب ”متن“ آپ کے سامنے آئے تو آپ اس کے بارے میں کہیں گے: ”هذا الحديث رواه الانمة عن فلان و فلان من الصحابة عن انس و جابر“ مثلاً..... یعنی اس حدیث کو انہ حدیث میں سے فلاں فلاں انہ نے اپنے ہاں نقل کیا ہے اور جس صحابی سے منقول ہوا اس کا نام دیں گے۔ مثلاً اگر حدیث حضرت انسؓ نے منقول ہو تو آپ ان کا حوالہ دیں گے اگر حضرت جابرؓ سے منقول ہو تو ان کا حوالہ دیں گے..... حدیث کی مختلف اسناد بیان کرنے کے بعد آپ متعلقہ کتاب کے باب، صفحہ اور حدیث نمبر کی نشاندہی کریں گے.....

اگر آپ کو کسی خاص صحابی سے منقول ”متن“ کی تخریج کرنی ہو تو اس صورت میں ضروری ہے کہ آپ اس حدیث کو تلاش کریں جو اس خاص صحابی سے مروی ہو۔ مثلاً اگر آپ کو حضرت عمر بن الخطاب سے مروی کسی متن کی تخریج کرنی ہو تو آپ اس خاص حدیث کو تلاش کریں گے۔ اس متن سے ملتی جلتی حدیث اگر حضرت عمر بن الخطابؓ کے علاوہ کسی اور صحابی سے منقول ہو تو آپ اس کو بھی درج کریں لیکن یہ مطلوب متن نہیں کہلائے گا بلکہ اس کے شاہد کے طور پر شمار ہوگا..... مطلوبہ حدیث مل جانے کے بعد آپ اس کی پوری سند بیان کریں گے اور پھر کہیں گے (لہ؛ شاهد عن فلان و فلان من الصحابة)

علماء حدیث تخریج کرتے وقت متون میں الفاظ کے اختلاف کو اہمیت نہیں دیتے۔ داروددار حدیث کے مفہوم پر رکھتے ہیں..... جب آپ کو حدیث کا بنیادی راوی اور متن کا پورا مفہوم مل جائے تو آپ سمجھ لیں کہ مطلوبہ حدیث آپ کو مل گئی ہے۔ الفاظ میں اگر تھوڑا بہت اختلاف ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... اس طرح اگر متن میں کمی بیشی ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ آپ اتنے حصہ کو لے سکتے ہیں جو آپ کو مطلوب ہے۔

امام زبیلی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

(وظيفة المحدث أن يبحث عن أصل الحديث فينظر من خرج، ولا يضربه تغير بعض

الفاظہ، ولا الزیادۃ فیہ أو النقص) (نصب الرایۃ : ج. ۱، ص. ۲۰۰)

محدث کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ حدیث کے متن کو دیکھے اور یہ بتائے کہ اس کی روایت کس نے کی ہے..... الفاظ میں ترمیم اور کمی بیشی کی چنداں اہمیت نہیں۔

امام سخاوی کہتے ہیں:

(ثم إن اصحاب المستخرجات غیر متفردين بصنیعهم، بل اکثر المخرجین للمشیخات والمعاجم، وكذا لأبواب یوردون الحدیث بأسانیدهم، ثم یصرحون بعد انتهاء سیاقه غالباً إلى البخاری أو مسلم أو الیہما معاً، مع اختلاف الألفاظ وغیرها یریدون أصله) (فتح المغیث : ج. ۱، ص. ۴۱)

وہ علماء جنہوں نے ”مستخرجات“ مرتب کی ہیں اور روایات اخذ کرنے میں متون کے صرف مفہوم کو مد نظر رکھا ہے یہ صرف ان کا اصول نہیں بلکہ ان تمام علماء کا اصول ہے جنہوں نے ”مشیخات“ ”معاجم“ اور ”ابواب“ کی روایات کی تخریج کی ہے۔ یہ حضرات حدیث کی مختلف اسانید کو جمع کر لینے کے بعد اسے پوری صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور پھر اسے امام بخاری یا امام مسلم یا ان دونوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ متون کے الفاظ میں اختلاف موجود ہوتا ہے..... ایسا کرتے وقت ان کے پیش نظر حدیث کا بنیادی مفہوم ہوتا ہے۔ ظاہری الفاظ نہیں ہوتے۔

حافظ عراقی اپنی کتاب ”المغنی عن حمل الاسفار فی الاسفار فی تخریج الاحیاء من الاخبار“ کے بعد لکھتے ہیں۔ (وحيث غزوت الحدیث لمن خرجہ من الانمة فلا ارید بذلك اللفظ بعینہ، بل قد یكون بلفظه وقد یكون لمعناه أو باختلاف علی قاعدة المستخرجات) (المغنی عن حمل الاسفار فی الاسفار : ج. ۱، ص. ۳)

جہاں میں نے حدیث کو ائمہ حدیث میں سے کسی کی طرف منسوب کیا ہے تو ایسا کرتے وقت میں نے

محض حدیث کے ہو بہو الفاظ کو مد نظر نہیں رکھا بلکہ حدیث کے بنیادی مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ وہی اصول ہے جو مستخرجات کی ترتیب میں علماء کے ہاں رائج اور متداول ہے۔

فن تخریج سے مناسبت پیدا کرنے اور اس کی بنیاد پر کام کرنے کیلئے ضروری ہے کہ آپ حدیث کے بنیادی مصادر اور مآخذ سے پوری طرح واقف ہوں..... ان مآخذ کے مناج کے بارے میں آپ جانتے ہوں..... ان کے مشتملات اور فہارس آپ کے پاس ہوں..... اس کے علاوہ بہتر ہوگا کہ آپ ان مآخذ کے مقدمات کا بالاستیعاب مطالعہ کریں اور ان مقدمات میں مؤلفین، مرتبین اور محققین نے جو معلومات دی ہیں ان کو اچھی طرح سمجھیں اور ذہن میں رکھیں..... ”مقدمہ“ کے مطالعہ سے بہت فائدہ ہوتا ہے بشرطیکہ سوچ سمجھ کر پورے انہماک اور توجہ کے ساتھ اس کو پڑھا جائے.....

فن تخریج کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بہت مفید ہوگا اگر آپ اس فن کے کسی استاذ کے ساتھ رابطہ رکھیں اور ان کی ہدایات اور رہنمائی کے مطابق چند روایات لے کر ان کی تخریج کر لیں.....

آپ خود تخریج کریں گے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ لائبریری کے ساتھ آپ کی مناسبت پیدا ہو جائے گی..... آپ مطلوبہ روایت تلاش کریں گے تو کئی دوسری روایات بھی پڑھ لیں گے..... آپ مطلوبہ روایت کا باب تلاش کریں گے تو کئی دوسرے ابواب بھی دیکھ لیں گے..... آپ مطلوبہ حدیث کی اسانید جمع کریں گے اور ان کے رواۃ پر بحث کریں گے تو علم رجال کی کئی کتابیں آپ کے سامنے آجائیں گی..... حدیث کے مشکل الفاظ تلاش کریں گے تو ”غریب الحدیث“ کے مآخذ دیکھ لیں گے..... غرضیکہ چند روایات کی تخریج کی وجہ سے کئی مآخذ اور مراجع تک آپ کی براہ راست رسائی ہو جائے گی.....

تخریج کرتے وقت عام طور پر دو چیزیں مد نظر رہتی ہیں ایک حدیث کی اسناد اور دوسرے حدیث کے متون..... لیکن تخریج کے دوران جن پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) متن حدیث..... (مآخذ کی نشاندہی)

(۲) رجال اسناد..... (ہر ایک راوی کی حیثیت)

(۳) مشکل الفاظ کی وضاحت (لفظی اور اصطلاحی)

(۴) تاریخی واقعات کی تفصیل (حسب ضرورت)

(۵) علاقوں اور شہروں کا تعارف (حسب ضرورت)

(۶) مؤلفات کا تعارف

اس ترتیب کے مطابق جب آپ کسی متن کی تحقیق و تخریج کریں گے..... تو آپ کا کام وزنی، وقیع اور مفید شمار ہوگا اس کی بنیاد پر دوسرے طلبہ اور محققین کام کر سکیں گے اور اسے اپنا مرجع بنا سکیں گے۔

④ محققین کے ہاں تخریج کے طریقے

محققین کے ہاں تخریج کے کئی طریقے رائج ہیں۔ یہاں ہم آپ کی سہولت کے لئے چند ایسے طریقے پیش کرتے ہیں جو آسان اور قابل استعمال ہیں..... جنہیں پیش نظر رکھ کر آپ حدیث کی مختلف اسانید اور متون تک بآسانی رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

4.1 تخریج بذریعہ مطلع حدیث:

مطلع حدیث سے مراد متن حدیث کا پہلا حرف ہے..... جن حضرات نے مطلع حدیث کی بنیاد پر روایات کو جمع کیا ہے انہوں نے پہلے حرف کو مد نظر رکھا ہے۔ مثلاً جن متون کی ابتداء میں ”الف“ ہے ان کو پہلے جمع کیا ہے۔ جن کی ابتداء ”با“ سے ہوتی ہے۔ ان کو اس کے بعد رکھا ہے پھر ”تا“ والی روایات جمع کی ہیں اور اس طرح ”ی“ تک حروف کی ترتیب کے ساتھ احادیث جمع کی ہیں.....

جب آپ اس قسم کے مصادر تخریج سے استفادہ کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ آپ کو مطلوب متن کا مطلع (پہلا حصہ) یاد ہو اگر آپ کو حدیث کا مطلع پوری طرح یاد نہ ہو تو پھر اس طریقہ کے مطابق آپ متن کے ابتدائی حروف کو پیش نظر رکھیں گے۔ مثلاً ”من غشنا لہلس مناً“ کی جب آپ تخریج کریں گے تو آپ اسے ”باب المیم“ اور ”میم مع النون“ کے تحت دیکھیں گے

تخریج کے سلسلے میں یہ طریقہ بہت عمدہ اور سہل ہے بشرطیکہ مطلع آپ کو یاد ہو۔

مطلع حدیث کی اہم کتب:

ابتدائی حروف کی بنیاد پر جن مصادر میں روایات جمع کی گئی ہیں ذیل میں ان میں سے چند بنیادی اور

معروف و مشہور مآخذ کا اجمال کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے..... مناسب ہوگا کہ آپ ان مآخذ کو لے کر خود ان کا باللائق التزام مطالعہ کریں اور ان کے منہج کو ذہن میں رکھ کر ان کی روایات کی ترتیب کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔

۱..... الجامع الصغیر من حدیث البشیر النذیر:

یہ امام جلال الدین عبدالرحمن ابوبکر السیوطی کی تالیف ہے..... امام سیوطی نے ”جمع الجوامع“ کے نام سے کتاب مرتب کی جسے ”الجامع الکبیر“ بھی کہتے ہیں..... بعد میں جمع الجوامع سے روایات کا انتخاب کیا اور کچھ مزید روایات کا اضافہ بھی کیا اس انتخاب کا نام ”الجامع الصغیر“ رکھا..... الجامع الصغیر میں امام سیوطی نے حروف ہجا کی ترتیب سے روایات جمع کی ہیں تاکہ حدیث کے متن تک رسائی میں آسانی ہو۔ اس کتاب سے استفادہ کرتے وقت آپ مندرجہ ذیل نکات ذہن میں رکھیں.....

۱- امام سیوطی نے حرف ”ن“ سے شروع ہونے والے متون کے بعد ”مناعی“ کے تحت پوری ترتیب کیساتھ روایات جمع کی ہیں۔ یہ احادیث ۹۳۲۸ سے ۹۵۷۶ تک تقریباً ڈھائی سو بنتی ہیں..... جب آپ نے مناعی کی روایات تلاش کرنی ہوں تو اس نکتہ کو پیش نظر رکھیں۔

۲- امام سیوطی نے ”حرف واو“ کے بعد حرف ”لا“ سے شروع ہونے والے متون کو جمع کیا ہے اس لئے جب آپ کو ”لا“ سے شروع ہونے والی روایت کی تلاش ہو تو اسے ”و“ کے بعد دیکھیں۔

۳- امام سیوطی نے ((انما الاعمال بالنیات)) کی روایت بالکل آغاز میں رکھی ہے۔ اس حدیث سے ائمہ حدیث قمر کا اپنی کتابوں کا آغاز کرتے ہیں۔

۴- امام سیوطی نے ہر ایک حدیث کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کا مصدر کیا ہے اور کون سے محدث نے اسے نقل کیا ہے۔

۵- ہر حدیث کے آخری راوی یعنی صحابی کا تذکرہ کیا ہے اگر روایت مرسل ہو تو ارسال کرنے

والے تابعی کی نشاندہی کی ہے۔

۶۔ ہر حدیث کا درجہ استناد بتایا ہے۔ مثلاً یہ روایت صحیح ہے۔ حسن ہے، ضعیف ہے وغیرہ۔

۲..... الفتح الکبیر فی ضم الزیادة إلی الجامع الصغیر

امام سیوطی نے جامع صغیر کی تالیف کے بعد اس پر ذیلی کام کیا۔ آپ چاہتے تھے کہ جامع صغیر کے نام سے ایک مستقل مجموعہ تیار کریں لیکن بعد میں ”جامع کبیر“ کی قوی روایات کے ساتھ دیگر مصادر سے منتخب ۴۴۴۰ احادیث جمع کر کے آپ نے اس تالیف کا نام ”الفتح الکبیر فی ضم الزیادة إلی الجامع الصغیر“ رکھا اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں آپ نے اسی منہج کو پیش نظر رکھا جو جامع صغیر کا ہے آپ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: هذا ذیل علی کتابی المسمى بالجامع الصغیر من حدیث البشیر النذیر سمیته زیادة الجامع رموزه کرموزه والترتیب کالترتیب.....

شروع میں ”جامع صغیر“ مستقل کتاب تھی اور ”زیادة الجامع“ الگ کتاب تھی..... شیخ یوسف بن اسماعیل بن یوسف البہانی (م ۱۹۳۲م) نے ان دونوں کو یکجا کر دیا..... آپ نے جامع صغیر اور زیادة الجامع کی روایات کو حسب ضرورت حروف ہما کی ترتیب کے مطابق مدون کر دیا اور اس طرح دونوں مجموعوں کی روایات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔ اس کتاب کا نام آپ نے ”الفتح الکبیر فی ضم الزیادة إلی الجامع الصغیر“ رکھا شیخ بہانی نے ”الفتح الکبیر“ کے نام سے جو کام کیا یہ بہت مفید اور عمدہ ہے۔ البتہ آپ نے روایات کی تصحیح و تحمین اور تضعیف کے رموز کو حذف کیا جس کے سبب اس پہلو سے کتاب میں کمی محسوس ہوتی ہے۔

۳..... ”جمع الجوامع“ یا ”الجامع الکبیر“

امام جلال الدین سیوطی نے ”جمع الجوامع“ کے نام سے ایک ایسی کتاب ترتیب دینا شروع کی جس میں حدیث کے بنیادی مصادر اور اصول میں وارد شدہ تمام روایات کو اپنے پیش نظر رکھا۔ مؤلف نے احادیث کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔

(۱)..... احادیث قولیہ (۲)..... احادیث فعلیہ

احادیث قولیہ کو آپ نے حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق جمع کیا اور احادیث فعلیہ میں صحابہ کرام کی ترتیب کو مدنظر رکھا۔ مثلاً پہلے ابو بکر صدیقؓ سے مروی جملہ فعلی احادیث جمع کیں پھر عمر فاروقؓ کی پھر حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ سعد بن ابی وقاصؓ، سعید بن زیدؓ، طلحہ بن عبید اللہؓ، زبیر بن العوامؓ عبدالرحمن بن عوفؓ اور ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث نقل کیں۔

مؤلف نے جن مصادر سے روایات لی ہیں ان کی نشاندہی رموز کے ذریعہ کی ہے مثلاً (خ) صحیح بخاری کے لئے..... (م) صحیح مسلم کے لئے..... اور (حب) صحیح ابن حبان کے لئے..... (ک) مستدرک امام حاکم کے لئے..... (ض) معارف ضیاء الدین المقدسی کے لئے..... (د) سنن ابوداؤد کے لئے..... (ت) جامع ترمذی کے لئے..... (ن) سنن نسائی کے لئے..... (ہ) سنن ابن ماجہ کے لئے..... (ط) مسند ابوداؤد طرابلسی کے لئے..... (حم) مسند امام احمد کے لئے..... (عب) مصنف عبدالرزاق کے لئے..... (ش) مصنف ابن ابی شیبہ کے لئے..... (طب) معجم طبرانی الکبیر کے لئے..... (طس) معجم طبرانی الاوسط کے لئے..... (ق) سنن بیہقی کے لئے..... (حق) الضعفاء للعلی کے لئے..... (عد) اکامل لابن عدی کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

مؤلف نے ہر ایک روایت کا استنادی درجہ بھی بتایا ہے اور بعض مقامات پر عمدہ اور تفصیلی گفتگو بھی کی ہے جس کی وجہ سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

امام سیوطی اپنی کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

(هذا كتاب شريف حافل ، ولباب منيف را فل بجميع الاحاديث الشريفة النبوية كافل ، قصدت فيه إلى استيفاء الاحاديث النبوية ، وأرصدته مفتاحاً لأبواب المسانيد العلية) ”یہ ایک بہت اہم اور وسیع کتاب ہے اور اس فن کے اہم مصادر کا لب لباب ہے۔ اس میں

احادیث کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ جتنی احادیث ہو سکتی ہیں وہ اس میں شامل ہوں یہ دراصل اسناد اور متون تک رسائی کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔

اس کتاب کی بنیاد پر جب آپ تخریج کرنا چاہیں تو پہلے یہ دیکھیں کہ جو حدیث آپ کے پاس ہے آیا وہ قوی ہے یا فعلی ہے۔ اگر حدیث قوی ہے تو احادیث قولیہ کے تحت اس کو تلاش کریں۔ بڑی سہولت کے ساتھ آپ کو مل جائے گی۔ اگر حدیث کا تعلق فعل سے ہے تو آپ کو اس کے آخری راوی صحابی کا نام معلوم ہونا چاہئے اس لئے کہ احادیث فعلیہ کو مؤلف نے صحابہ کرام کی ترتیب کے مطابق جمع کیا ہے۔

۴..... الجامع الأزهر من حدیث النبی الانور:

اس کتاب کے مؤلف حافظ عبدالرؤف بن تاج الدین علی بن الحدادی المنادی (۹۵۲ھ) ہیں۔

حافظ مناوی نے امام جلال الدین سیوطی کی ”جمع الجوامع“ کو بنیاد بنا کر روایات جمع کی ہیں اور ان روایات کو ”جمع الجوامع“ میں شامل کر دیا ہے۔ امام سیوطی نے جمع الجوامع کی تالیف کے ضمن میں بتایا ہے کہ مصادر حدیث کی اکثر روایات انکی کتاب میں آگئی ہیں..... لیکن حافظ مناوی کے بقول امام سیوطی کا یہ کہنا درست نہیں..... بہت ساری روایات ایسی ہیں جو حافظ سیوطی سے رہ گئی ہیں..... چونکہ ”جمع الجوامع“ کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ اصول کی جملہ روایات اس کتاب میں موجود ہیں اس لئے جب تخریج کے دوران کسی طالب علم کو اس میں مطلوب روایت نہ ملتی تو وہ سمجھتا کہ وہ روایت بے اصل ہے..... حافظ مناوی کہتے ہیں کہ اس عام تاثر اور طلبہ کی دقت کو مد نظر رکھ کر مجھے اس کتاب پر مزید کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اس لئے میں نے وہ روایات جو حافظ سیوطی سے رہ گئی تھیں انہیں جمع کیا اور انہیں اس کتاب میں شامل کیا۔ حافظ مناوی اس ضمن میں کہتے ہیں (ماکان من الحمزید لہبالمداد الاحمر، أو اجعل علیہ مدۃ حمراء.....) جامع کبیر کی روایات میں سیاہ روشنائی استعمال کروں گا یا ان کے اوپر سرخ لیکر کھینچوں گا تاکہ پڑھنے والے کو اندازہ ہو سکے کہ جمع الجوامع کی روایات کون سی ہیں اور زیادات کون سی ہیں.....

حافظ بناوی نے اپنی تالیف میں اس منہج کو اپنایا ہے جو امام سیوطی نے وضع کیا تھا..... البتہ ان کے ہاں رجال پر بحث بھی ملتی ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے.....

اس کتاب سے استفادہ کا طریقہ وہی ہے جو جمع الجوامع کا ہے..... رموز بھی وہی استعمال کئے گئے ہیں جو جمع الجوامع میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس منہج کے مطابق کئی کتابیں تالیف کی گئی ہیں ذیل میں چند کے نام دیئے جا رہے ہیں تاکہ جو طلبہ ان سے استفادہ کرنا چاہیں وہ ان کی طرف مراجعت کر سکیں۔

(۱) الحقائق فی حدیث خیر الخلائق:

اس کتاب کے مؤلف شیخ عبدالرؤف المناوی ہیں۔ تقریباً دس ہزار روایات پر مشتمل ہے مؤلف نے ہر حدیث کا مخرج بتایا ہے۔ کتاب کے آغاز میں رموز کے استعمال کا طریقہ بتایا ہے..... یہ کتاب مطبعہ عثمانیہ سے مستقلاً چھپی ہے اور ”الجامع الصغیر“ کے حاشیہ پر بھی طبع ہوئی ہے۔

(۲) المقاصد الحسنة فی بیان کثیر من الاحادیث المشتهرة علی اللسان:

حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی (م ۹۰۲ھ) کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے ان روایات کو جمع کیا ہے جو زبان زد خاص و عام ہیں..... امام سخاوی نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ ان روایات کی تخریج کی ہے جو روایات حدیث کے زمرہ میں آتی ہیں ان کو الگ کیا ہے اور جو روایات حدیث کے زمرہ میں نہیں آتی ان کو الگ کیا ہے۔ یہ کتاب مکتبۃ الخانجی مصر کی طرف سے ۱۹۵۶ء میں چھپ گئی ہے طباعت عمدہ ہے۔

(۳) تمییز الطیب من النخیث فیما یدور علی السنة الناس من الحدیث:

امام عبدالرحمن بن علی کی تالیف ہے۔ مؤلف نے اپنے شیخ حافظ سخاوی کی کتاب ”المقاصد الحسنة“ کی تلخیص کی ہے۔ کتاب مکتبۃ صبیح القاہرہ سے چھپ گئی ہے۔

(۴) أسنی المطالب فی احادیث مختلفة المراتب:

محمد بن درویش الموت الشامی (م ۱۲۷ھ) کی تالیف ہے مولف نے ”القاصد الحسین“ کا اختصار کیا ہے اور عبدالرؤف مناوی کی شرح جامع صغیر سے بھی استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب کمال یوسف الموت کی تحقیق کے ساتھ ”الاحادیث المشکلة فی الرتبة“ کے نام سے چھپ گئی ہے۔

(۵) البغیة فی ترتیب احادیث الحلیة

سید عبدالعزیز الغماری کی تالیف ہے۔ مولف نے ابو نعیم اصفہانی کی کتاب حلیۃ الاولیاء کی روایات کی تخریج کی ہے۔ حلیہ میں جو روایات اخذ کی گئی ہیں مولف نے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ قوی روایات اور فعلی روایات..... قوی روایات کو حروف تجہی کی ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے اور فعلی روایات کو رواۃ کی ترتیب کے مطابق..... اس کا منبج وہی ہے جو حافظ سیوطی نے جمع الجوامع میں اپنایا ہے کتاب مصر اور بیروت سے چھپ گئی ہے۔

(۶) فہرس معجم الطمرانی الصغیر

عبدالوزیر بن محمد السدحان کی تالیف ہے۔ مولف نے معجم الطمرانی کی روایات کو حروف تجہی کی ترتیب کے مطابق جمع کیا ہے۔ یہ کتاب دارالنصر، مکتبۃ السلفیۃ مدینہ منورہ اور دارالیقین، ریاض سے کئی بار چھپ چکی ہے۔

(۷) ایقاف الأخبار علی احادیث مشکل الآثار

شیخ نبیل بن منصور البصارة کی تالیف ہے..... مولف نے امام ابو جعفر طحاوی کی کتاب مشکل الآثار کی روایات کو حروف تجہی کی ترتیب کے مطابق جمع کیا ہے..... یہ کتاب دائرہ المعارف النظامیۃ ہند سے چھپی ہے۔

4.2 تخریج بذریعہ الفاظ حدیث

تخریج کے دوسرے طریقہ کی بنیاد ”لفظ حدیث“ پر رکھی گئی ہے۔ عام طور پر اس منہج کے مطابق جن مولفین نے روایات جمع کی ہیں انہوں نے ایسے الفاظ کو مد نظر رکھا ہے جن کے ذریعہ باسانی حدیث کے متن تک رسائی ہو سکے..... اس اسلوب کے تحت تخریج کرتے وقت آپ کے سامنے متن حدیث کا کوئی لفظ ہوتا چاہے اگر متن میں کوئی مشکل لفظ استعمال ہوا ہو تو آپ اس کو بنیاد بنا کر حدیث تلاش کریں..... اس اسلوب میں چونکہ حروف کو مد نظر نہیں رکھا جاتا اس لئے حروف کے تحت متن کی تلاش کا کوئی فائدہ نہیں..... یہ طریقہ پہلے طریقہ کے مقابلہ میں زیادہ آسان اور مفید ہے۔ آپ چند روایات کو لے کر اس منہج کے مطابق ان کی تخریج کریں گے تو آپ کا ذہن کھل جائے گا اور مناسبت پیدا ہو جائے گی۔ ذیل میں اس طریقہ کے مطابق جو کتابیں تیار کی گئی ہیں ان کا مختصر تعارف کیا جاتا ہے۔

(۱) المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی:

اس تالیف کی ابتداء لیدن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ونسک نے کی بعد میں کئی اور اساتذہ نے انکا ساتھ دیا اور اس طرح یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچا..... اس کتاب میں مندرجہ ذیل نو (۹) مصادر حدیث کے الفاظ کو بنیاد بنا کر روایات کو مدون کیا گیا ہے۔

(۱) صحیح بخاری..... (۲) صحیح مسلم..... (۳) سنن الترمذی

(۴) سنن ابوداؤد..... (۵) سنن النسائی..... (۶) سنن ابن ماجہ

(۷) سنن دارمی..... (۸) موطا امام مالک..... (۹) مسند امام احمد

طریقہ تخریج:

جب آپ اس طریقہ کے مطابق کسی حدیث کی تخریج کرنا چاہیں تو متن میں سے کوئی ایک لفظ منتخب کر لیں اگر متن میں کوئی مشکل لفظ استعمال ہوا ہو یا کوئی اصطلاح استعمال ہوئی ہو تو آپ اس کو بنیاد بنالیں اور

اس لفظ کے پہلے حرف کو ترتیب کے مطابق دیکھ لیں..... آپ کو حدیث مل جائے گی..... مثال کے طور پر۔

آپ (لا یؤمن أحدکم حتی یحب لا ینحیه ما یحب لنفسه) کی تخریج کرنا چاہیں تو آپ اس میں سے لفظ ”یحب“ لے لیں اسے ”حاء مع الباء“ میں تلاش کریں تو حدیث آپ کو ج۔ اس۔ ۴۰۷ پر مل جائے گی۔

رموز: کتاب میں جن مصادر کی روایات لی گئی ہیں ان کے رموز ابتدا میں دیئے گئے ہیں آپ ان کا توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں اور ان رموز کو زبانی یاد کر لیں۔

(۲) فہرس صحیح مسلم:

شیخ محمد فواد عبدالباقی کی تالیف ہے۔ شیخ نے صحیح مسلم کے فہرس کے ضمن میں چھٹی فہرست ”معجم المفہرس“ کے منہج کے مطابق ترتیب دی ہے..... اس فہرس میں آپ نے متون کے الفاظ و کلمات کو بنیاد بنا کر روایات کو جمع کیا ہے۔

طریقہ تخریج:

جب آپ اس فہرس کی بنیاد پر کسی حدیث کی تخریج کرنا چاہیں تو اس حدیث کے متن میں سے کوئی لفظ منتخب کر لیں پھر اس کے پہلے حرف کو مد نظر رکھ کر ترتیب کے مطابق اس کو تلاش کر لیں۔ حدیث آپ کو مل جائے گی۔ مثلاً

((لا یدخل الجنة قتات)) جب آپ اس حدیث کی تخریج کرنا چاہیں تو اس میں ”قتات“ کا لفظ لے لیں۔ اور ”قاف مع التاء“ کے تحت اس کو تلاش کر لیں روایت آپ کو مل جائے گی..... اسی طرح ((الطہور شطر الايمان)) میں سے آپ ”الطہور“ کو لے لیں اور ”طہر“ کے نیچے اس کو تلاش کر لیں۔ حدیث آپ کو مل جائے گی۔

(۳) فہرس سنن ابی داؤد:

شیخ مصطفیٰ بن علی محمد بن مصطفیٰ البیوی کی تالیف ہے۔ مؤلف نے شیخ محمود خطاب السبکی کی شرح سنن ابوداؤد، المنہل العذاب المورود پر کام کیا اور اس کی فہرست تیار کی..... اپنی ”فہرس“ کا نام آپ نے ”مفتاح المنہل العذاب المورود“ رکھا..... شیخ ابن بیوی کا کام اس حوالے سے بہت وزنی ہے کہ آپ نے المعجم المفہرس سے پہلے سنن ابوداؤد کی فہرس تیار کی جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر ونسک سے پہلے اس نوعیت کا کام نہیں ہوا تھا یہ انکی لاعلمی ہے۔ شیخ ابن بیوی نے سنن ابوداؤد کی جو فہرس تیار کی ہے وہ ڈاکٹر ونسک اور ان کی ٹیم کی فہارس کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور وسیع ہے۔ یوں لگتا ہے کہ متاخرین نے شیخ ابن بیوی کے کام سے متاثر ہو کر مصادر حدیث فی فہارس تیار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ بہر حال شیخ نے جو کام کیا ہے وہ سنن ابوداؤد کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بہت اہم اور بنیادی کام ہے۔

طریقہ تخریج:

شیخ ابن بیوی کی ”فہرس سنن ابوداؤد“ کی بنیاد پر تخریج کا طریقہ وہی ہے جو ”المعجم المفہرس لا لفاظ الحدیث“ کا ہے۔ آپ جس حدیث کی تخریج کرنا چاہیں اس میں سے ایک نمایاں کلمہ منتخب کر لیں اور اسے حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق تلاش کر لیں۔ حدیث آپ کو مل جائے گی۔ شیخ ابن بیوی نے جب فہارس کا کام مکمل کر لیا تو اسے شیخ امین خطاب کے حوالہ کر دیا۔ شیخ امین خطاب نے اسے بہت پسند کیا اور اعلیٰ طباعت کا انتظام کیا۔

4.3 تخریج بذریعہ راوی:

تخریج کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ سند میں آخری راوی یعنی صحابی کو دیکھا جائے..... اگر سند میں ارسال ہو تو تابعی کو دیکھا جائے۔ جن مؤلفین نے اس منہج کے تحت روایات جمع کی ہیں۔ انہوں نے صحابہ کرام کی ترتیب کو پیش نظر رکھا ہے..... ہر ایک صحابی سے جتنی روایات منقول ہیں انہیں متعلقہ صحابی کے عنوان کے تحت جمع کیا ہے۔ مثلاً ابو بکر صدیقؓ سے جتنی احادیث منقول ہیں انہیں ابو بکر صدیقؓ کے عنوان کے تحت، عمرؓ

فاروقؓ سے مروی احادیث کو ان کے نام کے تحت، عثمان بن عفانؓ کی مرویات کو ان کے عنوان کے تحت اور حضرت علیؓ سے منقول روایات کو ان کے نام کے ذیل میں درج کیا ہے..... اس منہج کے تحت جب آپ کسی حدیث کی تخریج کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ آپ کو آخری راوی یعنی صحابی یا ارسال کی صورت میں تابعی کا نام معلوم ہو..... اس اسلوب کے مطابق جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں وہ اس لحاظ سے بہت عمدہ اور مفید ہیں کہ ان کے ذریعہ مطلوبہ حدیث کی اسناد اور متن تک بہت آسانی کے ساتھ رسائی ہو جاتی ہے۔ جن جن مصادر میں حدیث وارد ہوئی ہوتی ہے ان کی تفصیلات بھی مل جاتی ہیں اور ہر ایک حدیث کا درجہ استناد بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اس اسلوب کے تحت جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) کتب الاطراف (۲) کتب المسانید

(۱) کتب الاطراف:

کتب الاطراف سے مراد حدیث کی وہ کتابیں ہیں جن میں مختلف مصادر حدیث کی روایات صحابہ کرام کی ترتیب کے مطابق جمع کی گئی ہوں اسانید مکمل دی گئی ہوں اور متن کا ایک حصہ دیا گیا ہو۔ اس اسلوب کے مطابق بہت ساری کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ ذیل میں چند معروف و مشہور کتب کا تعارف کیا جاتا ہے۔

(۱)..... تحفة الاشراف بمعرفة الاطراف:

جمال الدین الحماج یوسف بن الزکی عبدالرحمن بن یوسف المزنی (م ۷۴۲ھ) کی تالیف ہے۔ حافظ مزنی سے پہلے مختلف مصادر حدیث کے اطراف پر کام ہو چکا تھا۔ آپ نے ان مصادر کے علاوہ دیگر مآخذ کی روایات کو بھی اس میں شامل کر دیا اور روایات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا۔

مؤلف نے ان صحابہ کرام اور صحابیات کے اسماء جمع کئے جن کی مرویات مصادر حدیث میں منقول ہیں..... یہ تعداد تقریباً ۹۸۶ ہے ان تابعین کے نام جمع کئے جن کی مرویات مرسل اور مقطوع کی شکل میں مصادر میں موجود ہیں۔ یہ تعداد ۴۰۵ ہے۔

صحابہ کرام اور تابعین کے ناموں کو حروف کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا صحابی اور تابعی کے نام کے تحت ان تمام روایات کو جمع کیا جو اس سے منقول ہیں ان روایات کی مجموعی تعداد ۱۹۵۹۵ بنتی ہے۔

(۲)..... النکت انظراف علی الاطراف:

حافظ ابن حجر عسقلانی کی تالیف ہے حافظ ابن حجر نے فتح الباری کی تالیف کے دوران جہاں اور بہت سے مصادر حدیث سے استفادہ کیا وہاں حافظ مزنی کی تحفۃ الاشراف کو بھی مد نظر رکھا۔ حافظ مزنی کی تحفۃ الاشراف میں جہاں جہاں حافظ ابن حجر کو نقص اور سقم کا احساس ہوا انہوں نے اسکی نشاندہی کی۔ حافظ ابن حجر کی ”النکت انظراف“ اب تحفۃ الاشراف کے حاشیہ پر چھپ گئی ہے اس حاشیہ کی وجہ سے تحفۃ للاشراف کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے۔

(۳) ذخائر المواریت فی الدلالة علی موضع الحدیث

علامہ عبدالغنی بن اسماعیل النابلسی الدمشقی (۱۱۰۲ھ) کی تالیف ہے..... مولف نے صحیحین، سنن اربعہ اور مؤطا امام مالک کی روایات کے اطراف پر کام کیا ہے۔

طریقه تخریج:

جب آپ ”ذخائر المواریت“ کی مدد سے حدیث کی تخریج کرنا چاہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ اس حدیث کا آخری راوی صحابی ہے یا تابعی ہے..... اگر حدیث کا آخری راوی صحابی ہے تو صحابہ کرام کی ترتیب کے مطابق اس صحابی کا نام تلاش کر لیں۔ جب آپ کو اس صحابی کا نام مل جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اس نام کے ذیل میں اس صحابی سے جتنی روایات منقول ہیں ساری کی ساری ترتیب کے ساتھ جمع ہیں..... یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ”اطراف“ میں پورا متن نہیں دیا جاتا۔ متن کا ایک طرف ذکر ہوتا ہے۔ اس لئے مطلوبہ حدیث کے متن کا ابتدائی ٹکڑا آپ کے پاس ہونا چاہیے۔ جب مطلوبہ متن کا ٹکڑا آپ کو مل جائے تو آپ اس کے ساتھ دیئے گئے رموز کا پوری توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں..... حدیث کا مخرج اسکے شواہد، اسانید اور دیگر تفصیلات آپ رموز کے ذریعہ معلوم کر سکیں گے۔ مثلاً

جب آپ حدیث ((لا حسد الا فی اثنتین ! رجل اتاه الله القرآن فهو يتلوه آناء الليل وآناء النهار، ورجل اتاه الله مالا فهو ينفقه آناء الليل وآناء النهار)) کی تخریج ذخائر الموارث کی مدد سے کریں گے تو اس کے راوی چونکہ عبد اللہ بن عمر ہیں اس لئے آپ اسے ابن عمر کی مرویات میں تلاش کریں گے۔ عبد اللہ بن عمر کی مرویات ج-۲، ص-۷۶ سے شروع ہوتی ہیں۔ آپ اس حدیث کو تلاش کریں گے تو ص: ۱۰۴ پر آپ کو یہ حدیث مندرجہ ذیل صورت میں ملے گی۔

۳۸۶۲ (حدیث) ((لا حسد إلا في اثنتين رجل آتاه الله مالا (خ) في التوحيد عن علي بن عبد الله، وفي فضائل القرآن عن أبي اليمان (م) في الصلاة عن أبي بكر بن أبي شيبة، وعمر والنقاد، وزهير بن حرب وعن حرملة بن يحيى (د) في البر عن ابن عمر (ت) في فضائل القرآن عن قتبه))

اس عبارت کی بنیاد پر جب آپ تخریج کریں گے تو آپ یوں لکھیں گے:

(اخرجه البخاری فی صحیحہ فی کتاب التوحید، وفی کتاب فضائل القرآن، وأخرجه مسلم فی الصلاة. وأخرجه ابو داؤد فی البر وأخرجه الترمذی فی فضائل القرآن) کذا فی ذخائر الموارث ج. ۲، ص. ۱۰۴: حدیث رقم ۳۸۶۲

یہ اجمالی تخریج کہلاتی ہے۔ اگر آپ تفصیلی تخریج کرنا چاہیں تو صحیح بخاری کی کتاب التوحید کا مطالعہ کر کے اس کا حوالہ دے دیں۔ صحیح مسلم کی کتاب الصلاة میں سے اس حدیث کو لے کر تفصیلی حوالہ دے دیں۔ اسی طرح دیگر مصادر کا مطالعہ کر کے ہر ایک ماخذ کی تفصیلی نشاندہی کر لیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت مفید اور وسیع ہے لہذا النشر والتالیف الازہریہ کی طرف سے ۱۹۳۳ء میں چھپ گئی ہے۔ روایات پر نمبر لگے ہوئے ہیں۔ کل روایات ۱۲۳۰۲ ہیں۔

(۲) کتب المسانید

رواة کی ترتیب کے مطابق حدیث کی جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ ان میں دوسری قسم کو اصطلاح

میں ”مسانید“ کہا جاتا ہے..... مسند حدیث کی وہ کتاب کہلاتی ہے جس میں ہر ایک صحابی کی مرویات الگ الگ جمع کی گئی ہوں.....

مسند کی بنیاد پر تخریج کرتے وقت ضروری ہے کہ آپ کو آخری راوی یعنی صحابی کا نام معلوم ہو..... اس ترتیب کے مطابق جو مجموعے تیار ہوئے ان کی تعداد اچھی خاصی ہے ذیل میں ہم چند معروف و مشہور مسانید کا تعارف کرتے ہیں۔

(۱)..... مسند الامام احمد بن حنبل:

ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل کی تالیف ہے..... امام احمد نے اپنی مسند میں صحابہ کرام کی ترتیب کے مطابق روایات جمع کی ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے ابو بکر صدیقؓ کی مرویات، پھر عمر فاروقؓ کی مرویات، پھر عثمان بن عفانؓ، پھر حضرت علیؓ اور اس طرح دیگر صحابہ کی مرویات ترتیب کے ساتھ جمع کی ہیں۔ امام احمد نے ساڑھے سات لاکھ روایات سے انتخاب کر کے اپنی مسند کو مدون کیا ہے اس مسند میں تقریباً چالیس ہزار روایات جمع کی گئی ہیں۔

طریقہ تخریج:

جب آپ مسند احمد کی مدد سے کسی حدیث کی تخریج کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ آپ کو اس حدیث کے آخری راوی یعنی صحابی کا نام معلوم ہو..... جب آپ کے پاس صحابی کا نام موجود ہو تو آپ فہرست کی مدد سے اس صحابی کی مسند تلاش کر لیں جب اس صحابی کی مسند آپ کو مل جائے تو پھر مطلوبہ حدیث کی تلاش شروع کر دیں..... جب آپ کو حدیث مل جائے تو آپ مسند امام احمد کے حوالہ سے اس کو اپنے پاس نقل کر دیں۔ کتاب کی جلد، صفحہ نمبر اور مطبع بھی اپنے پاس نوٹ کر لیں.....

مثلاً: جب آپ حدیث ((أمر بلال أن يشفع الأذان ويؤثر الإقامة)) کی تخریج کرنا چاہیں تو اس حدیث کے آخری راوی چونکہ حضرت انسؓ ہیں اس لئے آپ مسند انس بن مالک کی طرف رجوع

کریں گے۔ مسند احمد میں انس بن مالک کی مسند تیسری جلد میں آتی ہے۔ اس لئے آپ تیسری جلد نکال کر اس میں ان مرویات کا مطالعہ شروع کریں گے جن کے راوی حضرت انسؓ ہیں..... جب آپ حضرت انسؓ کی مرویات کا مطالعہ کریں گے تو آپ اس حدیث کو ص-۱۰۴ پر موجود پائیں گے..... اب آپ اس حدیث کے بارے میں یوں لکھیں گے (اخر جہ احمد فی مسندہ : ج. ۲، ص ۱۰۳) مسند امام احمد کے علاوہ مشہور مسانید درج ذیل ہیں:

مسند ابو یعلیٰ موصلی..... مسند ابو داؤد الطیالسی۔

مسند الامام الحمیدی..... مسند نعیم بن حماد المروزی۔

مسند ابراہیم بن نصر الموطوعی مسند یحییٰ بن عبد الحمید الحمائی۔

ان تمام مسانید کی ترتیب و ترکیب وہی ہے جو مسند امام احمد کی ہے۔ آپ اگر ان سے استفادہ کرنا چاہیں تو اس طریقہ کو اپنائیں جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

4.4 تخریج باعتبار موضوع

تخریج کا چوتھا طریقہ باعتبار موضوع کہلاتا ہے..... اس اسلوب کے مطابق جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں ان میں روایات کو موضوع و مضمون کے لحاظ سے جمع کیا گیا ہے..... اس قسم کی کتابوں کی مدد سے حدیث کی تخریج کے لئے ضروری ہے کہ آپ کو حدیث کا مضمون و مفہوم معلوم ہو.....

اس اسلوب کے مطابق کئی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں ذیل میں چند معروف و مشہور کتب کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال:

شیخ علی بن حسام الدین عبد الملک بن قاضی خان الممتقی (م- ۹۷۵ھ) کی تالیف ہے..... مؤلف نے حافظ سیوطی کی ”الجامع الکبیر“ ”الجامع الصغیر“ اور ”زیادہ الجامع“ کی روایات کو یکجا کر دیا ہے۔ اس طرح ان

روایات کی تعداد چھیالیس ہزار بن جاتی ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے روایات کو حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق جمع کیا ہے جبکہ شیخ متقی نے ان روایات کو ابواب اور عناوین کے تحت جمع کیا ہے۔

ترتیب کتاب: حافظ متقی نے جہاں روایات کو ابواب اور مضامین کے تحت جمع کیا ہے وہاں ابواب کو حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق رکھا ہے۔ مثلاً وہ موضوعات جن کا آغاز ہمزہ سے ہوتا ہے ان کو پہلے رکھا ہے پھر جن کی ابتداء ”با“ سے ہوتی ہے ان کو رکھا ہے پھر ”تا“ اور ”ثا“ وغیرہ وغیرہ

طریقہ تخریج:

جب آپ کنز العمال کی مدد سے حدیث کی تخریج کرنا چاہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ مطلوبہ حدیث کس موضوع سے تعلق رکھتی ہے جب آپ کو حدیث کا موضوع معلوم ہو جائے تو کتاب کی فہرست دیکھ لیں۔ فہرست کے ذریعہ آپ متعلقہ باب تک پہنچ جائیں گے..... جب آپ تھوڑی دیر مطالعہ کریں گے تو مطلوبہ حدیث آپ کو مل جائے گی۔ اس کے بعد آپ رموز کے ذریعہ اس حدیث کی تفصیل بیان کر سکیں گے..... کنز العمال سب سے پہلے حیدر آباد دکن سے چھپی اس کے بعد حلب سے طبع ہوئی۔

(۲) مفتاح کنوز السنۃ:

ڈاکٹر ونسک نے یہ کتاب انگریزی میں مرتب کی اور اس کی تالیف میں بہت محنت اور عرق ریزی سے کام لیا..... شیخ محمد فواد عبدالباقی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۳۳ء میں قاہرہ سے اسے طبع کرایا۔

مؤلف نے حدیث و سیرت کے چودہ مصادر کی روایات اس کتاب میں موضوع کے اعتبار سے جمع کی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

- | | | |
|-----------------|-------------------|------------------|
| ۱- صحیح البخاری | ۲- صحیح مسلم | ۳- سنن ترمذی |
| ۴- سنن ابوداؤد | ۵- سنن نسائی | ۲- سنن ابن ماجہ |
| ۷- سنن دارمی | ۸- مؤطا امام مالک | ۱۰- مسند طرابلسی |

۱۳۔ سیرۃ ابن ہشام

۱۲۔ الطبقات الکبریٰ

۱۱۔ مسند زید بن علی

۱۴۔ المغازی لمحمد بن عمر الواقدی

طریقہ تخریج:

جب آپ مفتاح کنوز السنۃ کی مدد سے کسی حدیث کی تخریج کرنا چاہیں تو اس کتاب میں آپ کو مطلوبہ حدیث کے ضمن میں راہنمائی ملے گی کہ یہ حدیث کہاں کہاں مل سکتی ہے۔

اس کتاب سے استفادہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ آپ اس میں استعمال شدہ رموز کو اچھی طرح یاد کر لیں۔ مثلاً جب آپ حدیث (من سرہ انہ یبسط لہ ، فی رزقہ ، وان ینسالہ فی اثرہ فلیصل رحمۃ) (مفتاح کنوز السنۃ) کی مدد سے تخریج کرنا چاہیں تو اس حدیث کا موضوع چونکہ ”الارحام“ یا ”الرحم“ ہے اس لئے آپ ”الارحام“ کے تحت اس کو دیکھیں گے..... جب آپ مطالعہ کریں گے تو عنوان ”اجر صلوۃ الرحم“ کے ذیل میں آپ کو یہ تفصیل ملے گی۔

نخ..... ک ۸ ب ۷۸ ق ۱۳۔

مس..... ک ۲۵ ج ۱۶ و ۷ او ۲۰-۲۲

تر..... ک ۲۵ ب ۹-۲۸

حم..... خان ص: ۱۸۹ و ۲۸۴ ثالث ص: ۱۵۶ و ۲۲۹ و ۲۶۶ و ۲۷۹

ان رموز کا مقصد یہ ہے۔

راجع البخاری کتاب رقم ۷۸۔ باب رقم ۱۲ و قابل باب رقم ۱۳ و مسلم کتاب رقم ۴۵، حدیث رقم ۱۶، ۱۷، ۲۰ و ۲۲ و الترمذی کتاب رقم ۲۵ باب رقم ۹ و ۴۹ و احمد ۲ ص: ۱۸۹ و ۲۸۴ و ج ۳ ص: ۱۵۶ و ۲۲۹ و ۲۳۷: ۲۶۶ و ج ۵ ص: ۲۷۹۔ کتاب کے مقدمہ میں ہر کتاب کا نام اور اس کی تقسیم کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس مقدمہ کا مطالعہ اور رموز کے ساتھ مناسبت انتہائی ضروری ہے۔

خود آزمائی ①

- ۱- تخریج کا لفظی مفہوم کیا ہے؟
- ۲- تخریج کا اصطلاحی مفہوم اور غرض و غایت بتائیے۔
- ۳- تخریج کے فوائد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ترتیب کے ساتھ تحریر کریں۔
- ۴- اہمال کا مفہوم بتائیے اور تخریج کے ذریعہ ابہام کے ازالہ کی نشاندہی کیجئے۔
- ۵- تخریج کے ضمن میں بنیادی نکات پر بحث کیجئے۔
- ۶- تخریج بذریعہ مطلع حدیث سے کیا مراد ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت کریں۔
- ۷- الجامع الصغیر کس کی تالیف ہے اس کی ترکیب و ترتیب پر بحث کریں۔
- ۸- جمع الجوامع کس فن کی کتاب ہے اس سے استفادہ کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

خود آزمائی ②

- ۱- ”المعجم الفهرس لألفاظ الحدیث“ کس نوع کی کتاب ہے۔ تخریج کے ضمن میں اس سے استفادہ کرنے کا کیا طریقہ ہے۔
- ۲- ”صحیح مسلم“ سے روایت کی تخریج کیلئے کون سی کتاب زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔
- ۳- ”تحفۃ الأشراف“ کس کی تالیف ہے اس کتاب کی افادیت اور اہمیت بیان کریں۔
- ۴- ”ذخائر المواریث“ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔
- ۵- مسند امام احمد بن حنبل میں کتنی روایات ہیں۔ اس مسند کے ذریعہ کسی روایت تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔
- ۶- ”کنز العمال“ سے استفادہ کرنے کے لئے اس کی ترکیب و ترتیب کا مد نظر رکھنا کس حد تک ضروری ہے۔



یونٹ نمبر 18

قواعد وضع حدیث

تحریر: تاج الدین الازہری

نظر ثانی: ڈاکٹر علی اصغر چشتی



فہرست موضوعات

- 625 یونٹ کا تعارف
- 626 یونٹ کے مقاصد
- 627 ① وضع کے لغوی اور اصطلاحی معنی
- 629 ② وضع حدیث کی ابتدا
- 629 2.1 احمد امین کی رائے
- 631 2.2 ڈاکٹر اکرم ضیاء العری کی رائے
- 633 2.3 ابوشہبہ اور ابو زہو کی رائے
- 635 2.4 ڈاکٹر عمر فلانی کی رائے
- 637 خود آزمائی
- 638 ③ وضع حدیث کے اسباب و عوامل
- 638 3.1 واقعہ تحکیم اور اس کے اثرات
- 640 3.2 خوارج
- 642 3.3 شیعہ

645

3.4 اہل سنت

647

3.5 معتزلہ

649

خود آزمائی ۲

650

④ وضع حدیث کے اہداف و مقاصد

650

4.1 الحاد و بے دینی کا فروغ

651

4.2 امراء و ملوک کا قرب

653

4.3 تحصیل رزق

655

4.4 عصبیت

656

4.5 فقہی آراء کی تقویت

657

4.6 ترغیب و ترہیب

659

4.7 اشیاء کی ضرورت

659

4.8 ذاتی اغراض

660

4.9 اظہار علم

661

خود آزمائی ۳

یونٹ کا تعارف

اس یونٹ میں آپ وضع حدیث کے بارے میں پڑھیں گے۔ وضع حدیث رسول آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی بیان کردہ احادیث کے مقابلے میں لوگوں کی اپنی طرف سے مختلف باتیں گھڑ کر آپ ﷺ کی طرف منسوب کرنے کو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ کو اللہ نے دین اسلام دے کر قیامت تک کیلئے نبی و رسول مبعوث فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے اللہ کی آخری کتاب اور دین اسلام کے دائمی وابدی دستور قرآن مجید کی اپنے اقوال و افعال سے جو تشریح فرمائی صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا اور دن دو گنی رات چو گنی ترقی کرتے چلے گئے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں مسلمان امت دنیا کے بائیس لاکھ مربع میل پر حکمرانی کرتی تھی۔ یہ چیز ان لوگوں کے من کو ہرگز نہ بھاتی تھی جن کی ملتوں اور مذاہب کا اسلام نے خاتمہ کر دیا تھا اور ان کی شان و شوکت خاک میں ملا دی تھی۔ وہ ہر وقت اسلام کو نیچا دکھانے کی تدابیر کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ امت مسلمہ کی ساری ترقی کتاب الہی کی اس تشریح پر عمل کرنے میں مضمر ہے جو مسلمانوں کے ہاں حدیث یا سنت کے نام سے محفوظ ہے اور ہر مسلمان اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتا ہے کیونکہ اس کے سامنے اس کے نبی و رسول کا یہ فرمان ہے ((ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب اللہ و سنتی)) میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں جب تک انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے تم کبھی بھی گمراہ نہیں ہو گے۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت اب چونکہ کتاب اللہ کا تو وہ کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے تو انہوں نے ذخیرہ سنت یعنی احادیث رسول ﷺ کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس یونٹ میں روایات وضع کرنے کے اسباب و عوامل، اہداف و مقاصد اور ان کے دفاع میں محدثین کی ان جہود کی داستان ہے جو انہوں نے حدیث رسول کے دفاع میں سرانجام دیں۔

یونٹ کے اغراض و مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ⇨ وضع حدیث کا لفظی اور اصطلاحی مفہوم بیان کر سکیں۔
- ⇨ وضع حدیث کی ابتداء کے بارے میں مختلف نظریات پر بحث کر سکیں۔
- ⇨ وضع حدیث کے متعدد اسباب و عوامل سے متعلق گفتگو کر سکیں۔
- ⇨ موضوع روایات کی پہچان کے ضمن میں علامات بتا سکیں۔
- ⇨ وضع حدیث کے سبب کے لیے علماء حدیث کی خدمات کی نشاندہی کر سکیں۔

① وضع کے لغوی اور اصطلاحی معنی

عربی زبان میں وضع کا لفظ درج ذیل معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے:

۱- درجے سے گرا دینا۔ جیسے کہا جاتا ہے 'وضع منه فلانا' ای حط من درجته۔ اس کو درجے سے گرا دیا۔

۲- چھوڑ دینا۔ جیسے کہا جاتا ہے 'وضع الشيء من يده' إذا القاه۔ اس نے اس چیز کو چھوڑ دیا۔

۳- دوسرے کی طرف غلط منسوب کرنا۔ جیسے کہا جاتا ہے 'وضع فلان على فلان' فلاں نے فلاں کی طرف غلط منسوب کیا۔

۴- جھوٹ گھڑنا۔ فرمان الہی ہے: ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ﴾ "یا یہ کافر کہتے ہیں کہ اس (محمد ﷺ) نے اسے گھڑ لیا ہے۔"

اصطلاح میں وضع اس جھوٹ کو کہتے ہیں جسے اپنی طرف سے گھڑ لیا جائے اور پھر اس کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی طرف کر دی جائے۔ (نعوذ بالله من ذلك)

موضوع لفظ وضع کا مفعول ہے جس کا مطلب ہے گری ہوئی یا گھڑی گئی۔ موضوع حدیث کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ ایک تو اس کا مرتبہ گرا ہوا ہوتا ہے اور دوسرا وہ نبی اکرم کی بجائے کسی اور کی طرف سے گھڑی گئی ہوتی ہے۔

علماء اصول حدیث نے موضوع حدیث کی کئی ایک تعریفیں کیں ان میں چند ایک درج ذیل ہیں:

۱- ابن دقیق اور ابن جماعة کے نزدیک وہ 'الحديث المختلق' گھڑی ہوئی حدیث ہے۔

۲- ابن الصلاح کے نزدیک وہ "الحديث الموضوع" عھاوئی حدیث ہے۔

۳- محمد علی الاحمدین کے نزدیک وہ 'المکذوب المطعون منه بکذب الراوی' راوی کا وہ جھوٹ ہے جو اس نے نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

۴- علامہ نبھانی کا کہنا ہے کہ 'هو المکذوب علی رسول الله بان یروی عن النبی مالم یقله متعمدا ذاک' وہ نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب وہ جھوٹ ہے جو آپ کے نہ فرمانے کے باوجود جان بوجھ کر روایت کیا جائے۔

۵- ڈاکٹر محمود طحان نے بھی اسی سے ملتی جلتی تعریف کی ہے ان کا کہنا ہے کہ 'موضوع حدیث نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب وہ جھوٹ ہے جو آپ کے نہ فرمانے کے باوجود آپ کی طرف سے روایت کیا جائے۔'

لغوی اور اصطلاحی معنوں میں مناسبت

موضوع حدیث کی اصطلاحی تعریف میں لغوی معنی بھی پائے جاتے ہیں اور یوں اصطلاحی اور لغوی معنوں میں کلی مناسبت ہے۔

۱- موضوع حدیث اپنے درجے سے گری ہوئی اور ناقابل اعتبار ہے۔

۲- موضوع حدیث کو دوسروں نے گھڑا ہے

۳- اسے نبی اکرم ﷺ کی طرف غلط منسوب کیا جاتا ہے وہ نہ آپ کا قول ہے نہ فعل اور نہ اقرار۔

② وضع حدیث کی ابتدا

لفظ 'وضع' کی بغوی اور اصطلاحی تعریف سے معلوم ہوا کہ یہ ایک قبیح فعل ہے۔ کسی ایک عام انسان کی طرف بھی کسی ایسی بات کو منسوب کرنا جو اس نے نہ کہی ہو انتہائی برا فعل ہے چہ جائیکہ ایسا نبی آخر الزمان ﷺ کے ساتھ کیا جائے۔ اور اپنی طرف سے باتیں گھڑ کر آپ کی طرف منسوب کر دی جائیں۔ اس قبیح حرکت کا آغاز کب ہوا؟؟؟..... اس سلسلے میں علماء کی متعدد آراء ہیں۔

2.1 احمد امین کی رائے:

مشہور مصری مورخ و ادیب احمد امین اپنی کتاب ”فجر الاسلام“ میں لکھتے ہیں کہ وضع کا آغاز نبی اکرم ﷺ کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ وہ آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کو دلیل بناتے ہیں: ((من كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار)) ”جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں پائے۔“

وہ اس حدیث کے پس منظر میں ایک قصہ بیان کرتے ہیں جسے مورخ طبری نے مختلف سندوں سے روایت کیا ہے وہ قصہ یوں ہے۔

بنی لیث کا قبیلہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر رہتا تھا ان کے کسی آدمی نے زمانہ جاہلیت میں کسی کے ہاں منگنی کی لیکن بعد میں لوگوں نے لڑکی کا نکاح اس شخص سے کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ حله (عربی چونہ) پہنے ہوئے ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ حله مجھے پہنا کر آپ کے پاس بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ میں تمہارے مال و جان میں جس طرح چاہوں تصرف کروں اور اس طرح وہ اس عورت کے گھر چلا گیا جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ ان لوگوں نے تحقیق کے لئے آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس بھیجا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کے دشمن نے جھوٹ بولا ہے۔ اگر وہ تمہیں مل جائے تو اسے قتل کر دینا لیکن تم اسے زندہ نہ پاؤ گے۔ اب اگر وہ تمہیں مردہ حالت میں بھی مل جائے تو اس کو جلا دینا۔“ وہ آدمی واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ

اس آدمی کو سانپ نے ڈس لیا ہے سو اس نے اس کو جلا دیا اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ”جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں پائے۔“

اس روایت کی حقیقت

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے اس قصے کا دارودارد و مختلف روایتوں پر ہے۔ ایک روایت کی سند عبد اللہ بن بریدہ پر ختم ہوتی ہے اور دوسری روایت کی سند عبد اللہ بن زبیر پر عبد اللہ بن بریدہ والی روایت کی سند میں صالح بن حبان ایسا شخص ہے جس کی علماء حدیث میں سے کسی ایک نے بھی توثیق نہیں کی بلکہ سب نے اسے مجرد قرار دیا ہے۔

عبد اللہ بن زبیر والی روایت کی سند میں السری بن یزید اور محمد بن علی الغزالی دو ایسے راوی ہیں جن کا ذکر کتب رجال و تراجم میں بالکل نہیں ہے پھر محدث ابن جوزی نے ان دونوں روایتوں کو موضوع قرار دیا ہے۔

اگر کچھ وقت کے لئے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ روایت صحیح ہے تو پھر بھی یہی کہنا پڑے گا کہ اس من گھڑت قصے کا تعلق کسی دینی معاملے سے نہیں بلکہ خالص دنیوی معاملے سے ہے جبکہ اسے ان دوراویوں کے علاوہ کسی اور نے ذکر ہی نہیں کیا اور دونوں روایتیں بذات خود موضوع ہیں تو کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وضع کا آغاز نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں سے شروع ہو گیا تھا۔

پھر یہ لوگ مدینہ سے باہر رہتے تھے غالب گمان یہی ہے کہ جس آدمی نے یہ حرکت کی وہ مسلمان بھی نہ ہو بلکہ منافقین میں سے ہو کیونکہ اس نے نبی اکرم ﷺ سے بغیر آپ کی طرف بات منسوب کر کے اپنا فائدہ اٹھایا اور صحابہ کرام سے ایسا محال ہے۔ پھر اس کا نام بھی دونوں روایتوں میں سے کسی میں بھی مذکور نہیں ہے جبکہ صحابہ کرام نے پہچانے تھے اور ان کی عدالت پر امت کا اتفاق ہے۔

حدیث ”من کذب علی متعمداً فلیتبو أمقعه من النار“ کا صحیح پس منظر

اس حدیث کا پس منظر وہ نہیں ہے جسے احمد امین نے بیان کیا ہے بلکہ اس کا صحیح پس منظر وہ ہے جسے امام بخاری اور امام مسلمؒ نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری کے باب ”ما ذکر عن بنی اسرائیل“ میں عبد اللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((بلغوا عنی ولو آية وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج و من کذب علی متعمداً فلیتبو أمقعه من النار)) ”میری طرف سے تمہارے پاس اگر ایک آیت بھی ہو تو اسے دوسروں تک پہنچا دو اور بنی اسرائیل سے روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن یاد رکھو جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں پائے“۔ امام مسلمؒ نے بھی انہی معنوں میں روایت کو ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے۔ حدیث کی دیگر کتابوں میں بھی یہ روایت باختلاف الفاظ موجود ہے صحیحین کی دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی تو تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ ان کی بات انہی سے منسوب کرنا اور میری بات مجھ سے۔ اور جو جان بوجھ کر کسی اور کی بات مجھ سے منسوب کرے گا اس کے لئے اللہ کا عذاب ہے۔

2.2 ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کی رائے

ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری اپنی کتاب ”بحوث فی تاریخ السنة المشرفة“ میں لکھتے ہیں کہ وضع کا آغاز حضرت عثمانؓ کے دور میں زمانہ فتن میں ہوا۔ اس کیلئے انہوں نے اس روایت کو دلیل بنایا ہے۔

یزید بن عمرو المعافری کا کہنا ہے کہ اس نے ابو ثور فہمی سے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ میں حضرت عثمان کے پاس مدینہ گیا تو وہاں عبد الرحمن بن عدیس نے برسر منبر یہ بیان کیا کہ مجھ سے عبد اللہ بن مسعود نے بیان کیا اور انہوں نے اسے نبی اکرم ﷺ سے سنا۔ آپ نے فرمایا ”خبردار عثمان تو عبیدہ سے بھی زیادہ اپنے گھر سے

بے خبر ہے، ابو ثور کہتے ہیں کہ جب میں نے اس کا ذکر حضرت عثمان سے کیا تو انہوں نے فرمایا ”خدا کی قسم ابن عدیس نے جھوٹ بولا ہے۔ انہوں نے ہرگز یہ بات عبداللہ بن مسعودؓ سے نہیں سنی اور نہ ہی عبداللہ بن مسعودؓ نے اسے نبی اکرم ﷺ سے سنا ہے۔“

روایت کی اصل حقیقت

یہ روایت بھی احمد امین کی بیان کردہ سابقہ روایت کی طرح تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اس میں حضرت عثمان کی تنقیص کو ابن عدیس کی طرف منسوب کیا گیا ہے جن کا پورا نام عبدالرحمن بن عدیس ہے جو جلیل القدر صحابہ میں سے تھے۔ حدیبیہ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ شریک تھے۔ اور آپ ﷺ کے دست مبارک پر انہوں نے حضرت عثمانؓ کے لئے بیعت رضوان بھی کی تھی اور وہی اس وفد کے سربراہ تھے جو مصر سے حضرت عثمان سے ملنے آیا تھا۔ ان کی طرف حضرت عثمان کے متعلق اس مقولے کی نسبت سوائے ان پر تہمت لگانے کے کچھ نہیں۔

محدث ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس روایت کو حضرت عثمانؓ کے نقائص بیان کرنے کے لئے گھڑا گیا ہے۔

حافظ ذہبیؒ کا کہنا ہے کہ ابن لہیعہ نے اس جھوٹ کو ابن عدیس کی طرف منسوب کیا ہے۔ امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ ابن عدیس کے اس جھوٹ سے بری ہیں۔ پھر اس روایت کی سند میں ابن ابی الدنیا اور کامل بن طلحہ کے درمیان انقطاع ہے اور انقطاع ایک ایسی خرابی ہے جو کسی روایت کو رد کرنے کے لئے کافی ہے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس روایت کو صرف ابن لہیعہ ہی نے بیان کیا ہے جسے محدثین کی اکثریت نے ضعیف قرار دیا ہے۔

محدث جوزجانی نے ابن لہیعہ کے بارے میں یہ الفاظ کہے ہیں: ”کہ نہ تو اس کی حدیث پر نور ہے اور

نہ اس سے استدلال درست ہے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام کا آپس میں اختلاف ضرور تھا خاص طور پر حضرت عثمان کے آخری دور میں حالات ایسے پیدا ہوئے لیکن ان میں سے کسی نے بھی دوسرے پر جھوٹا الزام نہیں لگایا۔

2.3 ابوشہبہ اور ابوزہو کی رائے

ابوشہبہ اور ابوزہو دونوں عصر حاضر کے جلیل القدر مصری علماء ہیں اور حدیث اور اس سے متعلقہ علوم میں اپنی خدمات کی وجہ سے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ابوشہبہ اپنی کتاب ”الاسرائیلیات، والموضوعات“ میں اس طرف گئے ہیں کہ وضع حدیث کی ابتداء ۴۰ ہجری سے ہوئی جس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ منافقین اسلام اور یہودیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور یوں ابن سبا جو اصلاً یہودی تھا اور اپنی یہودیت کو حب اہل بیت کے پردے میں چھپائے ہوئے تھا اس نے ۴۰ ہجری میں اپنی طرف سے حدیث گھڑ کر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دی جس میں یہ کہا کہ ”ہر نبی کا ایک خلیفہ ہوتا ہے اور میرا خلیفہ علیؑ ہے“ اس کا خیال تھا کہ حضرت علیؑ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی وہ پس پردہ یہی بات کہتا تھا جسے اس نے اب کھل کر کہنا شروع کر دیا۔

ابوزہو نے بھی اپنی کتاب ”الحديث والمحدثون“ میں وضع کی ابتداء کے بارے میں یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اس کی ابتداء ۴۱ھ سے ہوئی۔ ان کی دلیل بھی ابوشہبہ سے ملتی جلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے دور کے آخری ایام میں فتنہ پیدا ہوا اور یوں عبداللہ بن سبا جو یہودی تھا اس کی پیروی کرنے والوں میں سے کسی نے احادیث گھڑ کر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دی اور امام حق کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا وہ تو مظلومی کی حالت میں شہید ہو گئے۔ پھر حضرت علیؑ خلیفہ بنے۔ ان کے اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان صفین کے مقام پر لڑائی ہوئی اور یوں لوگ خوارج، شیعہ اور اہل سنت

میں تقسیم ہو گئے۔ انہی میں سے بعض فرقوں کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کی طرف جھوٹی حدیثیں منسوب کرنے کا آغاز ہوا اور اسی وجہ سے علماء ۴۱ھ کو وضع کے آغاز کا سال قرار دیتے ہیں۔

دونوں کے دلائل کا تجزیہ

ابوشہبہ نے بھی اپنے موقف کی بنیاد ابن سبا کی گھڑی ہوئی حدیث پر رکھی ہے جس میں اس نے نبی اکرم ﷺ کی طرف یہ منسوب کیا کہ آپ نے فرمایا ”ہر نبی کا ایک خلیفہ ہوتا ہے اور میرا خلیفہ علی ہے۔“ جبکہ ابوزہر کا دعویٰ ہے کہ علماء نے ۴۱ھ کو وضع کی ابتداء کا سال قرار دیا اور نہ ہی کسی مشہور عالم کا ذکر کیا ہے لیکن حقیقت میں دونوں کے موقف کی بنیاد ابن جریر طبری کی اس روایت پر ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ ابن سبا یمن کے شہر صنعاء کا رہنے والا ایک یہودی تھا جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسلمان ہوا۔ پھر اس نے اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں گھوم کر لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا۔ حجاز سے اس نے ابتدا کی۔ پھر بصرہ گیا، پھر کوفہ اور پھر شام۔ کوئی بھی اس کی بات ماننے کو تیار نہ ہوا۔ شامیوں نے اسے ملک شام سے نکال دیا وہاں سے وہ مصر پہنچا۔ یہاں اس نے لوگوں سے کہا: ”مجھے اس شخص پر بڑا تعجب ہے جو کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام واپس آئیں گے اور وہ بھی جھوٹا ہے جو کہتا ہے کہ محمد ﷺ لوٹ آئیں گے جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿إِنَّ الدِّينَ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَأْدِكَ إِلَىٰ مَعَادٍ﴾ (سورۃ قصص: ۸۵) ترجمہ: ”جس اللہ نے آپ پر قرآن نازل فرمایا ہے وہ آپ کو دوبارہ پہلی جگہ معاد پر پہنچا دے گا۔“ اس نے کہا: حضرت محمد ﷺ حضرت عیسیٰ سے واپسی کے زیادہ حق دار ہیں اور یوں اس نے لوگوں میں رجعت (واپسی) کے عقیدے کو فروغ دیا اور بات آگے بڑھاتے ہوئے ان سے کہا کہ ایک ہزار نبی آئے ہر نبی کا ایک خلیفہ تھا اور حضرت علیؓ حضرت محمد ﷺ کے خلیفہ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت علیؓ خاتم الاوصیاء۔ جس نے بھی رسول کے اس خلیفہ پر ظلم کیا اور امت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہو حضرت عثمانؓ نے اسے ناحق لیا تھا اس لئے ان کے والیوں کی مخالفت کرو اور انکا امر و نہی کا حکم ماننے سے انکار کر دو۔“

اگر روایت کو بغور دیکھا جائے تو ابن سبا کے افکار و نظریات سب کے سب اس کے اپنے افکار و نظریات

ہیں اس لئے مختلف شہروں کے لوگوں نے انہیں ماننے سے انکار کر دیا یہ بھی اس کا اپنا فلسفہ تھا کہ حضرت علی نبی اکرم ﷺ کے خلیفہ ہیں دراصل کتاب تاریخ طبری میں اس نے اس کی نسبت نبی ﷺ کی طرف نہیں کی اس لئے ابوشہبہ کا دعویٰ دلیل کا محتاج ہے۔

اب رہا ابوزہرہ کا دعویٰ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علیؑ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ہونے والی جنگوں نے مسلمانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ امت کی تقسیم سے یہ لازم نہیں آتا کہ افراد اپنے نبی پر جھوٹ باندھنا شروع کر دیں گے پھر ان کا اختلاف اجتہادی امور میں تھا اور اس دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی کی وجہ سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ جھوٹی حدیث نبی اکرم کی طرف منسوب کر دے کیونکہ وہ اس کی تردید کرنے پر قادر تھے۔

2.4 ڈاکٹر عمر فلاطہ کی رائے

ڈاکٹر عمر فلاطہ اپنی کتاب ”الوضع فی الحدیث و اثره السیء علی الامۃ“ میں لکھتے ہیں کہ: ”وضع حدیث کا آغاز ۴۰ ہجری میں نہیں بلکہ اس کے بہت بعد ہوا۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلی صدی کی آخری تہائی میں اس کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس تہائی میں نبی اکرم ﷺ پر جھوٹ باندھنے کی کوششیں تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ جن کے پیچھے امت کی مختلف فرقوں میں تقسیم اور ان کے آپس کے اختلافات تھے۔ اختلافات کے اس دور نے وضع حدیث کے فتنے کے لئے تمہید کا کام کیا اور آہستہ آہستہ لوگوں نے رسول اکرم ﷺ کی طرف جھوٹی روایتیں بھی منسوب کرنا شروع کر دیں۔ اختلافات کے اس دور میں امت میں درج ذیل خرابیاں پیدا ہوئیں:

- ۱- صحابہ کی عظمت کا احساس کم ہو گیا اور ان کی عیب جو یاں شروع ہو گئیں جیسے حضرت عثمان کی شخصیت میں عیب نکالے جانے لگے۔ ان کے اجتہادی مسائل پر تنقید ہونے لگی۔
- ۲- بعض خود غرض افراد کی طرف سے خلیفہ اور ان کے والیوں کی علانیہ مخالفت ہونے لگی۔

۳- اس کے نتیجے میں خلفاء کی شہادت کے واقعات رونما ہوئے جیسے حضرت عثمانؓ اور ان کے بعد حضرت علیؓ کی شہادت۔

۴- ان دو جلیل القدر خلفاء کے بعد مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

۵- ان فرقوں میں سے بعض کی طرف سے ان خلفاء کی طرف جھوٹ منسوب کیا جانے لگا تا کہ ان کی نسبت سے یہ فرقے لوگوں میں رواج پاسکیں۔

اختلافات کے اس دور میں بھی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی نے کوئی جھوٹی بات گھڑ کر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کی ہو۔ اس قسم کا پہلا واقعہ جسے ابن الجوزی نے اپنی کتاب موضوعات میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابوانس حرانی نے بتایا کہ ابو عبیدہ مختار ثقفی نے محدثین میں سے کسی ایک سے کہا کہ آپ میرے لئے نبی اکرم ﷺ کی طرف سے یہ حدیث گھڑ دیں جس میں یہ مذکور ہو کہ میں (مختار) اس خلیفہ کے بعد خلیفہ ہوں اور اس کی اولاد میں سے کوئی شخص بھی خلیفہ نہیں بن سکتا۔ اسکے عوض تمہارے لئے دس ہزار درہم، ایک چوغہ، ایک سواری اور ایک خادم ہے۔ اس پر اس محدث نے یہ جواب دیا۔ میں نبی ﷺ کی طرف ایسا جھوٹ منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ صحابہ میں سے اگر کسی کی طرف نسبت کر کے ایسا کہلوانا چاہیں تو ممکن ہے۔ مختار نے کہا میں تو صرف نبی اکرم سے منسوب ایسا کلام چاہتا ہوں جس پر محدث نے کہا یاد رکھو اللہ کا عذاب بھی اتنا ہی سخت ہے جتنا بڑا تمہارا یہ فعل مختار نے اس قسم کی حدیث وضع کرنے کے لئے بہت سے افراد سے رجوع کیا تا کہ اس کا مقصد حاصل ہو سکے مگر کوئی بھی اس پر تیار نہ ہوا یہاں تک کہ اس نے محمد بن عمار بن یاسر کو ایسا نہ کرنے کی پاداش میں قتل بھی کر دیا۔

اس قصے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مختار وہ پہلا شخص ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے یا کروانے کی کوشش کی یہ الگ بات ہے کہ کوئی بھی اس کے لئے یہ خدمت سرانجام دینے کو تیار نہیں ہوا۔ یار رہے کہ مختار نے ۶۶ ہجری میں عراق پر قبضہ کیا تھا اور کئی سال شیعان علی کی حمایت میں بنو امیہ سے نبرد آزما رہا۔ اور یہ پہلی صدی کی آخری تہائی تھی۔

خود آزمائی ①

- ۱- لفظ وضع کے لغوی معنی بیان کریں؟
- ۲- موضوع حدیث کو یہ نام کیوں دیا گیا؟
- ۳- احمد امین کے خیال میں وضع کب شروع ہوئی؟
- ۴- کیا احمد امین کی رائے درست ہے؟
- ۵- ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری نے وضع کی ابتداء کب بتائی؟
- ۶- ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کی رائے کو ماننے کا کیا نقصان ہے؟
- ۷- ابو شہبہ کی رائے میں وضع کا آغاز کب ہوا؟
- ۸- ابو شہبہ کی رائے کیوں درست نہیں؟
- ۹- ڈاکٹر عمر فلاتہ کے خیال میں وضع کا آغاز کب ہوا؟
- ۱۰- مختار شفیق نے کس چیز کی کوشش کی؟

③ وضع حدیث کے اسباب و عوامل

3.1 واقعہ حکیم اور اس کے اثرات:

رسول اکرم ﷺ نے دین اسلام کے ذریعے بکھرے ہوئے انسانوں کی شیرازہ بندی کر کے انہیں ایک ملت بنا دیا تھا پھر ان کی ایسی تربیت فرمائی تھی کہ ملت کا ہر فرد دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہمیشہ مستعد نظر آتا تھا۔ مدینہ منورہ کی بستی ایسے ہی لوگوں کا ایک مثالی نمونہ تھی۔ صحابہ کرام کی زندگی ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے جو ان کے آپس کے لئے پیار، ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری کرنے، ان کی بہتری کے لئے سوچنے اور اتحاد یگانگت کی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا انہی اصحاب رسول کی اولاد میں سے بعض افراد ذاتی مصلحتوں کا شکار ہوتے گئے اور ان سے اسلامی تعلیمات کی معرفت کے باوجود بعض ایسے افعال سرزد ہونے لگے جن کے نتائج امت کے حق میں اچھے نہ تھے پھر اسلامی سلطنت بھی دور دور تک پھیل گئی تھی اور دور دراز کے لوگ بھی اس سلطنت کی حکمرانی میں اپنا حق مانگنے لگے تھے۔ خلیفہ وقت کے لئے سب کو راضی کرنا ناممکن تھا جس سے ان کے اور خلیفہ کے مابین غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ بعض لوگوں نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور آخر کار خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے۔

ان کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ بنے۔ ان کے اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگیں ہوئیں انہی جنگوں میں ایک معرکہ صفین ہے جو ۳۷ ہجری میں وقوع پذیر ہوا۔ اسی جنگ کے بعد حضرت علیؓ کی طرف سے ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے عمرو بن العاصؓ کو حکم بنایا گیا اور طے پایا کہ یہ دونوں حکم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق جو فیصلہ کریں وہ فریقین کے لئے واجب التسلیم ہوگا اور جو فریق اس کو ماننے سے انکار کر دے گا حکم اور عام مسلمان اس کے خلاف دوسرے فریق کی مدد کریں گے لیکن اگر یہ فیصلہ کتاب اللہ اور

سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہو یا کسی فریق کی جانب داری پائی جائے تو اس کی پابندی ضروری نہ ہوگی اور ہر فریق اپنا فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہوگا۔

غرض وقت مقررہ پر دونوں حکموں نے جامع مسجد میں فیصلہ سنایا۔ ہزاروں مسلمان اس کے اشتیاق میں جمع تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے عمرو بن العاصؓ سے کہا پہلے تم سناؤ۔ انہوں نے کہا آپ فضل و منقبت میں مجھ سے افضل ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے میں اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ پر یہ جادو چل گیا چنانچہ انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر اپنے فیصلہ کا یوں اعلان کیا۔

”لوگو ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا اس امت کے اتفاق و اتحاد اور اصلاح کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہ آئی کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے خلافت کو شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے۔ عام مسلمان جسے اہل سمجھیں اسے منتخب کر لیں اس لئے میں علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کرتا ہوں۔ آئندہ تم جسے پسند کرو اپنا خلیفہ بناؤ۔“ ان کے بعد عمرو بن العاصؓ نے اپنا فیصلہ یوں سنایا: ”لوگو ابو موسیٰ کا فیصلہ تم نے سن لیا۔ انہوں نے اپنے آدمی کو معزول کر دیا۔ میں بھی اس کو معزول کرتا ہوں لیکن میں اپنے آدمی معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں۔ وہ امیر المؤمنین عثمانؓ کے ولی ہیں اور ان کے قصاص کے طالب ہیں اس لئے وہ ان کی قائم مقامی کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔“ یہ فیصلہ سن کر ابو موسیٰ اشعریؓ چلائے کہ یہ غداری ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس فیصلہ سے حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔

یہ فیصلہ ایسا نامنصفانہ تھا کہ اسے کوئی بھی فریق تسلیم نہیں کر سکتا تھا چنانچہ حضرت علیؓ کے حامیوں نے انہیں اپنا امیر تسلیم کر لیا۔ اور حضرت معاویہؓ کے حامیوں نے انہیں اپنا امیر بنا لیا اور ایک جماعت اس کے خلاف ہو گئی اور اس نے تحکیم کو کفر قرار دے دیا اور یہ جماعت خوارج کے نام سے مشہور ہوئی اور انہوں نے عبداللہ بن وہبؓ راہی کے ہاتھ پر بیعت کر کے حضرت علیؓ اور معاویہؓ دونوں کی مخالفت شروع کر دی۔

واقعہ تحکیم نے امت کو تین بڑے فرقوں میں تقسیم کر دیا جن کی تقسیم کی بنیادی وجہ تو سیاسی اختلاف تھا لیکن رفتہ رفتہ ہر ایک نے دوسرے کی مخالفت میں اپنی طرف سے حدیثیں گھڑ کر آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ

کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیں تاکہ فریق مخالف کو بچا دکھا سکے اور عوام میں اپنی مقبولیت بڑھا سکے۔

3.2 خوارج:

خوارج خارجی کی جمع ہے اور لغوی اعتبار سے خارجی کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو کسی جماعت سے نکل جائے، امام حق کی اطاعت سے انکار کر دے اور اس کی نافرمانی پر اتر آئے۔ اور وہ کسی بھی زمانے کا ہو سکتا ہے۔

اصطلاحی اعتبار سے 'خارجی' اور 'خوارج' ان افراد کو کہا جاتا ہے جنہوں نے واقعہ تحکیم کو سرے سے قبول کرنے ہی سے انکار کر دیا اور اسے کفر قرار دے دیا اور یوں حضرت علی کی اطاعت سے نکل گئے۔ ان کے مشہور عقائد یہ ہیں:

- ۱- حضرت علیؑ نے تحکیم کو قبول کر کے کفر کا ارتکاب کیا۔ ان کا مشہور نعرہ تھا "ان الحکم الا للہ" حکم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ اس نعرے کے متعلق حضرت علیؑ کا مشہور مقولہ ضرب المثل بن چکا ہے۔ "کلمۃ حق اريد بها الباطل" صحیح بات سے غلط مطلب نکال لایا۔
- ۲- خوارج حضرت عثمانؓ، حضرت علیؑ، جنگ جمل میں شریک ہونے والوں اور ان تمام لوگوں سے جنہوں نے تحکیم کو قبول کیا، اپنی برأت (اتعلق ہونے) کا اعلان کرتے ہیں اور اسے تمام عبادات پر ترجیح دیتے ہیں۔
- ۳- ان کے ہاں آپس میں نکاح بھی اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک طرفین اس عقیدے کا اظہار نہ کر دیں۔
- ۴- گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے ہیں۔
- ۵- حضرت علیؑ کے خلاف خروج کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

وضع حدیث میں خوارج کا کردار:

وضع حدیث میں خوارج کے کردار سے متعلق علماء کی دو مختلف آراء ہیں۔

پہلی رائے تو یہ ہے کہ دوسرے فرقوں کی طرح اس فرقے کے جاہل افراد نے اپنے مذہب کی تائید میں احادیث گھڑی ہیں۔

اس رائے کے حامل کا دارمدار محدث ابو محمد رامہرمزی کی کتاب ”المحدث الفاصل بین الراوی والواعی“ کی اس روایت پر ہے جس میں انہوں نے عبدالکریم کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ مجھ سے خوارج کے ایک آدمی نے کہا کہ یہ احادیث رسول دین ہے اس لئے خوب سوچ سمجھ کر انہیں قبول کرو کہ کس قسم کے آدمی سے لے رہے ہو۔ ہم جب کسی بھی کام کا ارادہ کرتے تو اس سے متعلق احادیث گھڑ لیتے۔

اسی طرح کی ایک دوسری روایت محدث رامہرمزی نے مشہور محدث اعمش کے حوالے سے بیان کی ہے انہوں نے کہا کہ میں ایاس بن معاویہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے اس طرح کی روایت بیان کی تو میں نے کہا۔ اس قسم کی روایت کون بیان کرتا ہے؟ تو انہوں نے حروریہ فرقے کے ایک آدمی کا ذکر کیا جس نے اعتراف کیا کہ اس قسم کی روایت میری ہی طرف منسوب ہے میں جب بھی کوئی کام کرنا چاہتا تو اس کے لئے حدیث وضع کر لیتا۔

محدث اعمش کی گفتگو اس بات کی دلیل ہے کہ خوارج چونکہ جھوٹ نہیں بولتے اس لئے انہوں نے اپنی وضع کردہ مرویات کا اعتراف کر لیا اگرچہ جس کا انہوں نے دعویٰ کیا ہے اس کا کبھی ثبوت نہ مل سکا۔

اس لئے اس رائے کے حاملین کا خیال ہے کہ ثبوت کے طور پر ان کی وضع کردہ روایات کا وجود ضروری نہیں ان کا بذات خود اعتراف ہی کافی ہے کہ انہوں نے احادیث گھڑ کر اللہ کے رسول کی طرف منسوب کی ہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ان کا وضع حدیث میں کوئی کردار نہیں ہے کیونکہ تاریخ کے اوراق سے ان کی وضع کردہ روایات کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ یہ رائے ڈاکٹر عجائب الخطیب کی ہے ان کا کہنا ہے کہ چند لوگوں نے خوارج کی طرف وضع حدیث کو منسوب کیا ہے ان کے پاس خوارج کے ایک آدمی کے اعتراف کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس دلیل میں انہیں یہ بھی علم نہیں ہے کہ خوارج کا یہ آدمی کون ہے؟ پھر اس طرح کا اعتراف روافض سے بھی منقول ہے۔ ہو سکتا ہے کسی روای یا کاتب کی غلطی سے روافض کی بات خوارج سے منسوب ہو گئی ہو۔ پھر موضوع احادیث سے متعلقہ کتابوں میں کوئی ایک روایت بھی نہیں ملتی جسے انہوں نے اپنے افکار کی تائید میں گھڑا ہو پھر انہیں اس کی درج ذیل وجوہات کی بنا پر ضرورت بھی نہیں تھی:

- ۱- قرآنی آیات کے ظواہر سے استدلال کرتے ہیں اور سنت سے استدلال کرتے ہی نہیں۔ چنانچہ انہوں نے زانی کی سزا سے رجم کو اس لئے ساقط کر دیا کہ اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔
- ۲- وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے ہیں اور جھوٹ لولنا ان کے ہاں کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔
- ۳- وہ لوگوں سے اپنے افکار کا اعتراف کروانے کے لئے طاقت اور تلوار کا سہارا لیتے ہیں اور لوگوں سے بحث و تمحیص کے قائل ہی نہیں اس لئے انہیں حدیثیں گھڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

3.3 شیعہ:

لفظ شیعہ 'المشایعہ' سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی دوستی اور مددگاری کے ہیں اور شیعہ کا اطلاق ساتھیوں، مدد کرنے والوں اور دوستوں پر ہوتا ہے۔

اصطلاح میں لفظ شیعہ کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں اور آپ ﷺ نے اپنی وصیت کے ذریعے انہیں ہی امانت (خلافت) سونپی،

حضرت علیؑ کی وفات کے بعد خلافت صرف انہی کی اولاد کا حق ہے اور وہ انہی میں رہے گی وہ خود تقیہ کر کے کسی کو دے دیں یا کوئی ظلم کے ذریعہ ان سے لے لے۔

شیعہ کے چند اہم اصول

- ۱- حضرت علیؑ تمام صحابہ یہاں تک کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ سے بھی افضل ہیں۔
- ۲- حضرت علیؑ کی آپ ﷺ کے بعد امامت (خلافت) آپ کی طرف سے بذریعہ وصیت ثابت ہے جس کی نص موجود ہے۔
- ۳- امامت (خلافت) دین کا مستقل رکن ہے۔
- ۴- تمام ائمہ (حضرت علیؑ کے بعد ان کی اولاد سے ہونے والے ائمہ کرام) گناہ صغیرہ و کبیرہ سے پاک یعنی معصوم ہیں۔
- ۵- حضرت علیؑ کی اولاد سے ہونے والے آخری امام (بارہویں امام حسن عسکری) جو غائب ہو گئے تھے پھر وہ دوبارہ ظاہر ہوں گے اور دنیا کو عدل سے بھر دیں گے جبکہ وہ ظلم سے بھر چکی ہو گی۔
- ۶- آپ ﷺ نے شریعت سے متعلق تمام احکام کو حضرت علیؑ کے حوالے کر دیا تھا ان کے بعد ہر امام اپنے بعد آنے والے امام کے حوالے کر دیتا ہے یہ سب بذریعہ تلقین یعنی زبانی طور پر ہوتا ہے تحریری طور سے نہیں چنانچہ شیعہ احادیث رسولؐ سے صرف وہی قبول کرتے ہیں جو ان کے ائمہ کے ذریعے ملے اور جو اس کے مخالف ہو اسے رد کر دیتے ہیں۔

شیعہ کا وضع حدیث میں کردار

- ۱- بعض محققین کا خیال ہے کہ بہت سے دشمنان اسلام شیعہ کی صفوں میں گھس گئے اور اہل بیت کی محبت کے پردے میں انہوں نے اپنے افکار کی اشاعت کے لیے کام کیا اور جب کام نہ بنا تو

انہوں نے حدیثیں گھڑ کر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

۲- بعض جھوٹے اور فاسق لوگوں نے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جب ناکامی دکھائی دی تو بھیس بدل کرائمہ اہل بیت کی خلافت کی دعوت دینے لگے جس کی مثال مختار ثقفی کا کردار گزر چکا ہے اس نے محدثین سے یہ چاہا کہ کوئی ایسی روایت وضع کر دیں جس میں یہ ذکر ہو کہ وہ اس خلیفہ کے بعد خلیفہ ہوں گے۔

۳- چونکہ شیعہ نے امامت کے لیے افضلیت کو شرط قرار دیا ہے اس لیے حضرت علی کے بارے میں صحیح احادیث میں وارد فضائل پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ان کی شان کو زیادہ سے زیادہ اونچا دکھانے کے لیے جھوٹی احادیث نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دیں جیسے ”من اراد أن ينظر إلى آدم في علمه وإلى نوح في تقواه وإلى إبراهيم في حلمه وإلى عيسى في عبادته فليتنظر إلى علي“ جو آدم کا علم، نوح کا تقویٰ، ابراہیم کا حلم اور عیسیٰ کی عبادت دیکھنا چاہے وہ علیؑ کو دیکھ لے۔

۴- شیعہ کے ہاں تمام احکام ائمہ کرام کے ہاں سے صادر ہوتے ہیں اور ان کے پاس بذریعہ تلقین نبی اکرم سے پہنچتے ہیں اس لئے انہوں نے ائمہ کے احکام کے ثبوت کے لئے احادیث وضع کیں۔

۵- انہوں نے حضرت علیؑ کے مخالفین کی شان گھٹانے کے لئے حدیثیں وضع کیں جیسے ”إذا رأيتم معاوية على منبر فاقتلوه“ اگر معاویہ کو منبر رسول پر بیٹھا دیکھو تو اسے قتل کر دو۔

۶- چونکہ شیعہ نبی اکرم ﷺ کے بعد خلافت حضرت علی کا حق اور بعد میں بلا شرکت غیرے ان کی اولاد کا حق گردانتے ہیں اس لئے انہیں اسے ثابت کرنے کیلئے موضوع احادیث کا سہارا لینا پڑا کیونکہ یہ مسئلہ اجماع امت کے خلاف ہے اور تاریخ کے مسلمان کے بھی اہل سنت کے ہاں ان کی بیان کردہ حدیث جس سے وہ خلافت علیؑ ثابت کرتے ہیں موضوع روایت ہے اس کے

الفاظ ہیں ”هذا وصی واخی والخلیفة من بعدی فاسمعوا له واطيعوا“ یہ میرا ہی وصیت کردہ بھائی اور خلیفہ ہے اس کی بات مانو اور اطاعت کرو۔

محدث خلیل کا کہنا ہے کہ شیعہ نے علیؑ اور اہل بیت کے فضائل میں بے شمار حدیثیں وضع کیں۔

3.4 اہل سنت:

شیعہ کے مد مقابل جمہور کی کثرت تھی جو بعد میں اہل سنت کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ وہ جم غفیر تھا جس کے آباء و اجداد نے نبی اکرم ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق کو خلیفہ بنایا۔ پھر حضرت عمر کو، ان کی شہادت کے بعد حضرت عثمان کو، اور پھر ان کی شہادت کے بعد حضرت علیؑ کو۔ ان کا عقیدہ یہ تھا:

۱- اللہ کے رسول کے بعد امت میں سب سے افضل حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں ان کے بعد حضرت عمرؓ کا درجہ ہے۔ پھر حضرت عثمان کا مرتبہ اور چوتھے نمبر پر حضرت علیؓ ہیں۔

۲- خلافت دین کا بنیادی رکن نہیں بلکہ اللہ کے رسول نے اسے امت کے اجتہاد پر چھوڑا ہے وہ اپنے اجتہاد سے جسے چاہے منتخب کر سکتی ہے اور امت کی اکثریت نے اپنے اجتہاد سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اللہ کے رسول کے بعد ان کا خلیفہ مقرر کیا۔

۳- اللہ کے رسول نے اپنے وصال کے بعد خلافت کے لئے بذریعہ وصیت کسی کی تعیین نہیں فرمائی۔

۴- اس سلسلے میں کسی بھی وصیت کا کوئی وجود نہیں اگر ہے تو وہ موضوع روایت ہے۔

۵- صحابہ سب کے سب جنتی اور واجب الاحترام ہیں۔ ان کے لئے قرآن کی شہادت کافی ہے کہ ”اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے“۔

۶- صحابہ سب کے سب عادل ہیں ان میں کسی ایک کی تنقیص (عیب جوئی) بھی مسلمان کو زیب نہیں دیتی۔

۷- چونکہ ان کے آپس کے اختلافات ان کی اجتہادی آراء کی بنا پر تھے۔ اس لئے ان میں ہر ایک

اپنی رائے پر عمل کرنے کا مجاز تھا۔ ہم ان میں کسی کو غلطی کا مرتکب قرار نہیں دے سکتے۔

۸- صحابہؓ سب کے سب اللہ، رسول ﷺ، دین اور امت کے لئے مخلص تھے کسی کے بارے میں ادنیٰ شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

اہل سنت کا وضع میں کردار:

اہل سنت کے بعض جہلانے جب دیکھا کہ ان کے مد مقابل شیعہ حضرت علی اور اہل بیت کے فضائل بڑھ چڑھ کر بیان کرتے ہیں تو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے فضائل میں حدیثیں گھڑنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ان اصحابؓ رسول ﷺ کے فضائل صحیح احادیث میں اس قدر کثرت سے وارد ہیں کہ انہیں موضوع احادیث کے ذریعہ بیان کردہ فضائل کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان کا یہ فعل اتنا ہی قبیح تھا جتنا ان کے مخالفین کا۔

ان کی وضع کردہ احادیث بھی بہت ہیں جیسے یہ حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کو مادہ (مٹی) جس سے ان کی تخلیق ہوئی اور روح دونوں میں فضیلت بخشی۔ اللہ تعالیٰ صرف انہیں ہی اپنی تجلی (دیدار) کراتا ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اپنے بعد ان کی خلافت کو بذریعہ نص بیان فرمایا ہے۔ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کو ان کی اطاعت کی وصیت فرمائی ہے، تاریخ کے ایک دور میں جب بنی امیہ کے حکام نے خطباء کے ذریعے منابر رسول سے حضرت علیؓ پر لغت کروانا شروع کیں تو اسی طبقے نے خلفاء راشدین کے فضائل میں احادیث وضع کیں جیسے ”رسول اللہ نے فرمایا: اے علی! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ ابوبکرؓ کو اپنا مشیر، عثمانؓ کو اپنا ساتھی اور علیؓ کو اپنا معاون بنالوں۔ تم چاروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ام الکتاب (سورہ فاتحہ) میں مجھ سے عہد لیا ہے تم سے صرف متقی مومن ہی محبت کرے گا اور بد بخت منافق تم سے بغض رکھے گا۔ تم میری امت کے خلیفہ ہو۔ میری ذمہ داریوں کو پورا کرنے والے اور امت پر میری طرف سے حجت۔“

انہوں نے شیعہ کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ کی فضیلت میں حدیثیں گھڑیں جیسے یہ حدیث ”امناء صرف تین ہی ہیں: میں، جبریل علیہ السلام اور معاویہؓ۔“

3.5 معزلہ

لفظ معزلہ کے لغوی معنی علیحدہ ہونے والے کے ہیں۔ انہیں اس نام سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ اس فرقے کے بانی واصل بن عطاء نے امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ یہ اپنے آپ کو اصحاب التوسید کہتے ہیں اور ان کا دوسرا نام قدریہ بھی ہے۔ بنو عباس کے دور میں اس فرقے نے بڑی شہرت حاصل کی جب انہوں نے اپنی ہم نوا حکومتی طاقت کے ذریعے اپنے عقائد کو پھیلانے کی کوشش کی تو بڑے بڑے ائمہ ان کے راستے میں رکاوٹ بن گئے اور ان کے عقائد کو عام نہ ہونے دیا۔ جن لوگوں نے ڈٹ کر ان کا اور ان کی ہمنوا حکومتی طاقت کا مقابلہ کیا ان میں سر فہرست نام امام احمد بن حنبل کا ہے جنہیں ان کی مخالفت کی وجہ سے سخت اذیتوں میں مبتلا کیا گیا۔

معزلہ کے عقائد

- ۱۔ انسان اپنے افعال کا خالق ہے۔
- ۲۔ کلام اللہ مخلوق ہے۔
- ۳۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ کیلئے جہنمی ہے۔
- ۴۔ اچھائی اور برائی کے اصولوں کی معرفت عقل کے ذریعہ ممکن ہے۔
- ۵۔ علیؑ، معاویہؓ..... ان کے قبیحین اور اصحاب جمل فاسق ہیں۔ معزلہ نے صفات الہی، قضاء و قدر، رویت باری، اللہ تعالیٰ پر کیا واجب ہے۔ ان سب چیزوں کے بارے میں عقلی بیادوں پر فیصلے دیئے اور اجماع امت کے برعکس موقف اختیار کیا۔

وضع حدیث میں معزلہ کا کردار:

معزلہ نے بقول ابن قتیہ حدیث رسول میں تشکیک کا دروازہ کھولا کیونکہ وہ فقہ حدیث اور الفاظ حدیث کے مدلولات سے جاہل تھے۔

انہوں نے احادیث رسول کو عقلی بنیادوں پر پرکھا اور یوں بہت سی احادیث کو رد کر دیا جیسے یہ حدیث جس میں فرمایا ہے کہ ”اگر کوئی تم میں سے سو کر اٹھے تو اس وقت تک اپنا ہاتھ پانی سے بھرے برتن میں نہ ڈبوئے جب تک اسے تین مرتبہ دھونے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں بسر کی ہے۔“

معتزلہ کا کہنا ہے کہ اگر اس حدیث میں آخری جملہ ”وہ نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری ہے نہ ہوتا تو حدیث قابل قبول تھی۔“

یوں انہوں نے بعض احادیث کا انکار کر کے اس کے مقابلے میں اپنی طرف سے احادیث گھڑ کر اپنے مسائل کو حل کیا اور یہ احادیث موضوع احادیث کا حصہ بن گئیں۔

معتزلہ کے مخالفین نے بھی انہی کی طرح احادیث گھڑ کر ان کے بعض معتقدات کا جواب دیا حالانکہ قرآن اور احادیث صحیحہ میں ان کا جواب موجود تھا۔ مسئلہ خلق قرآن کے رد میں انہوں نے یہ حدیث گھڑی ”زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے سب سوائے ذات باری تعالیٰ مخلوق ہے قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اسی سے شروع ہوا اور اسی طرف لوٹ جائے گا۔ مستقبل میں میری امت سے ایک قوم آئے گی جو کہے گی قرآن بھی مخلوق ہے۔ جس نے ایسا کہا اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا۔ اسی لحاظ سے اس کی عورت کو طلاق ہو گئی اور اس کے لئے جائز نہیں کہ اس کا فرسے زیر سایہ زندگی بسر کرے۔ معتزلہ کے فریق مخالف کے علاوہ دیگر فرقوں نے خوب حدیثیں وضع کی اور اپنے اپنے افکار کی تائید میں انہیں لوگوں میں پھیلا دیا۔ مرجعہ کی وضع کردہ حدیثوں میں ایک مثال یہ حدیث ہے: ”جس طرح شرک کے ساتھ کوئی بھی عمل فائدہ نہیں دے سکتا اسی طرح ایمان لانے کے بعد کوئی بھی عمل (خواہ کتنا ہی برا ہو) نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ چنانچہ جوں جوں فرقے بڑھتے گئے ہر ایک کی طرف سے وضع کردہ احادیث کی وجہ سے موضوع احادیث کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔“

خود آزمائی ②

- ۱- واقعہ تحکیم کب پیش آیا؟
- ۲- حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے حکم کا نام بتائیں؟
- ۳- حضرت علیؓ کے حکم نے کیا اعلان کیا؟
- ۴- حضرت معاویہؓ کے حکم نے کیا حکم سنایا؟
- ۵- تحکیم کے کیا نتائج ظاہر ہوئے؟
- ۶- خارجی کسے کہتے ہیں؟
- ۷- لفظ شیعہ کے لغوی معنی بتائیں؟
- ۸- معتزلہ کو معتزلہ کیوں کہا گیا؟
- ۹- معتزلہ کے قبول حدیث کی بنیاد کیا تھی؟
- ۱۰- کیا اہل سنت نے بھی حدیثیں گھڑیں؟

④ وضع حدیث کے اہداف و مقاصد

وضع کی ابتدا تو مختلف فرقوں کے اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے حدیثیں گھڑنے سے ہوئی تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ فتنہ زیادہ وسیع ہوتا چلا گیا اور اس میں ہر طرح کے لوگ شامل ہو گئے جن کے اپنے اپنے مقاصد تھے اگر ہم غور سے دیکھیں تو درج ذیل مقاصد نمایاں نظر آتے ہیں:

4.1- الحاد اور بے دینی کا فروغ:

اسلام کی آمد سے پہلے جزیرہ عرب کے قرب و جوار میں دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ اسلام نے آ کر ان دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا ان کے حکام نے لوگوں کو غلام بنا رکھا تھا اسلام نے غلامی کو انسان کی ذلت قرار دیا جو بعد میں بالکل ہی ختم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ دوسروں کے حقوق غصب کر کے خود عیش و نشاط کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں اسلام کے بارے میں کینہ و حسد پیدا ہو گیا۔ انہوں نے ظاہری طور پر اپنے آپ کو اسلام کا لبادہ اوڑا لیا اور پس پردہ اپنے سابقہ افکار کی اشاعت کا سوچنے لگے کہ کس طرح اسلام کو ختم کیا جائے۔ انہوں نے امت میں مختلف قسم کے فتنے پیدا کئے تاکہ مسلمان سکھ کا سانس نہ لے سکیں اور اسلام کو بدنام کیا جاسکے۔ اس کے لئے انہوں نے جعلی روایات کے ذریعے بے دینی کو فروغ دینے کی پوری کوشش کی اور ایسی روایات وضع کیں جن کو سننے کے بعد اسلامی عقیدہ خراب ہو یا پھر لوگ اسلام کی تعلیمات کا مذاق اڑائیں۔ ان کی وضع کردہ روایات کی چند مثالیں یہ ہیں۔

۱- ہمارا رب عرفہ کے دن شام کے وقت خاکستری رنگ کے اونٹ پر سوار ہو کر زمین پر اترتا ہے

اور پھر سوار حجاج سے مصافحہ اور چلنے والوں سے معافہ کرتا ہے۔

۲- اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے سینے اور بازوؤں کے بالوں سے پیدا کیا۔

- ۳- جب اللہ تعالیٰ کی آنکھ دکھنے لگی تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔
- ۴- اللہ تعالیٰ نے جب اپنے نفس کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو گھوڑے کو پیدا کیا اور اسے دوڑا دیا اور یوں اس کے پسینے سے اپنے نفس کو پیدا کیا۔
- ۵- اللہ تعالیٰ نے جب حروف کو پیدا کیا تو یہ سجدہ ریز ہو گئے لیکن الف کھڑا ہی رہا۔
- ۶- خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔
- اگر ہر مری نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ من گھڑت حدیثیں اسلامی عقیدے کے بالکل خلاف ہیں اور ان کا دور بے بھی اسلامی عقیدے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام نقائص سے جو ان وضائیں نے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کئے پاک ہے۔ اس طرح کی موضوع احادیث کے ذریعے ان لوگوں نے بے دینی کے فروغ کی کوشش کی۔

4.2 امراء اور ملوک کا قرب:

دنیا میں ہمیشہ ہی دو قسم کے علماء رہے ہیں: علماء حق اور علماء سوء۔ علماء سوء نے ہمیشہ آخرت پر دنیا کو ترجیح دی حالانکہ قرآن و سنت کی تعلیمات آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا حکم دیتی ہیں۔ ہمارے سلف صالحین نے کبھی بھی دنیا کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھا بلکہ جب بھی کڑا وقت آیا۔ انہوں نے حق کے مقابلے میں پیش کئے جانے والے تمام مال و دولت پر لات ماری اور یوں آخرت میں کامیابی کیساتھ دنیا میں بھی اپنا نام تاریخ میں ثبت کر گئے۔

اس کے برعکس رفتہ رفتہ ایسے علماء پیدا ہو گئے جن کا مقصد مال و دولت کو جمع کرنا تھا۔ انہوں نے محدثین کے روپ میں امراء و ملوک کا قرب حاصل کیا۔ ان کو خوش کرنے کے لئے ایسے غلط فتوے دیئے جن میں احادیث اپنی طرف سے گھڑ کر شامل کر دیں یا پھر اصل احادیث میں اضافہ کر کے پیش کر دیا تاکہ امراء اور بادشاہ وقت جن افعال کے مرتکب ہو رہے تھے انہیں شرعی تائید حاصل ہو جائے اور یوں وہ عوام کی نظروں میں

متقی بھی رہیں اور اپنی مرضی کے افعال بھی سرانجام دیتے رہیں۔ چند تاریخی واقعات اس کا واضح ثبوت ہیں:

۱۔ عباسی خلیفہ مہدی نے ایک کبوتر خریدا تھا جو اسے بہت ہی پسند تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ ایک دن وہ اسی کبوتر سے کھیل رہا تھا کہ غیاث بن ابراہیم داخل ہوئے مہدی کو کبوتر سے کھیلتا دیکھ کر انہوں نے فوراً پوری سند کے ساتھ یہ حدیث بیان کر دی۔ ”لا سبق الا فی نصل او خف او حافر او جناح“ شرط کے ساتھ جیت صرف تین چیزوں میں جائز ہے۔

تیر اندازی، اونٹ، دوڑ، گھوڑ دوڑ اور کبوتر اڑانا یہ حدیث سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ کی کتاب الجہاد باب السبق میں موجود ہے اس کے روای ابو ہریرہؓ ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے بھی اپنی مسند میں اسے روایت کیا ہے مگر اس میں لفظ ”جناح“ نہیں ہے اس کا غیاث بن ابراہیم نے اپنی طرف سے اضافہ کر لیا تا کہ بادشاہ خوش ہو کر اسے انعام سے نوازے چنانچہ ایسا ہی ہوا مہدی نے اسے دس ہزار درہم انعام دے دیئے لیکن جب وہ چلے گئے تو کہنے لگا یہ آدمی بڑا جھوٹا ہے۔ میری وجہ سے اس نے جھوٹ گھڑا اور کبوتر کے ذبح کرنے کا حکم دے دیا تا کہ آئندہ انعام نہ دینا پڑے۔

(۲) مہدی ہی کی طرح کا ایک اور واقعہ بھی تاریخ میں مذکور ہے اس کے زمانے میں مقاتل بن سلیمان بلخی بڑی شہرت رکھتے تھے وہ بھی مہدی کا قرب چاہتے تھے۔ مہدی کے وزیر ابو عبد اللہ کا کہنا ہے کہ ایک مجلس میں مہدی نے محمد سے کہا کہ دیکھیں یہ مقاتل مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں۔ عرض کیا آپ فرمائیں۔ مہدی نے کہا یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو میرے لئے حضرت عباس کی شان میں حدیثیں وضع کر دیں گے۔ لیکن میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ تو عباسی خلیفہ کی بات تھی اب چونکہ وہ حکومت پر متمکن تھا اس لئے اسے اس کی ضرورت نہ تھی کیا بعید ہے کہ عباسیوں نے حکومت تک پہنچنے کے لئے موضوع روایات کا پورا پورا سہارا لیا ہو۔

ان سے قبل امویوں کا بھی یہی حال تھا حاشیہ بردار علماء ان کو خوش کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔

اموی خلیفہ عبد الملک جب کھانا کھا چکا تو اسے تربوز پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ کھانے پر اس وقت کے عالم احمد بن یعقوب بن عبد الجبار اموی بھی حاضر تھے۔ انہوں نے فوراً پوری سند کے ساتھ یہ حدیث بیان کر دی کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے تربوز بدن کو دھو دیتا ہے اور ہر قسم کی بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ یہ حدیث موضوع ہے اور اسکی کوئی اصل نہیں اس نے صرف بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے اسے اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر دیا۔

4.3 تحصیل رزق

جب بڑے لوگوں نے بادشاہوں کے قرب کے حصول میں وضع حدیث کا سہارا لیا تو عام لوگوں نے لوگوں کی جیبوں سے پیسہ نکلوانے کے لئے اسے استعمال کیا۔ ان عام لوگوں میں قصہ گو (قصاص) بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ محدثین کی اسناد حدیث یاد کر لیتے اور ان اسناد کے ساتھ اپنی طرف سے واقعات جوڑ کر لوگوں کے مجموعوں میں حاضر ہوتے اور من گھڑت قصے پوری اسناد کے ساتھ جوڑ کر لوگوں کو سنا دیتے لوگ یہ سمجھتے کہ یہ سب اللہ کے رسول ﷺ کے بیان کردہ ہیں اس لئے محبت رسول ﷺ میں ان سناٹے والوں کو خوب مال سے نوازتے۔ اس طرح ان لوگوں نے عوام کی محبت رسول کا خوب استحصال کیا اور اپنی جیبیں بھریں۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ امام احمد بن حنبل اور انکے ساتھی مشہور محدث یحییٰ بن معین نے بغداد کی مسجد رصافہ میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ایک قصہ گو (قصاص) کھڑا ہوا اور اس نے بیان شروع کیا کہ امام احمد اور ابن معین اپنی سند کے ساتھ حضرت انس سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے زبان سے لا الہ الا اللہ کہا تو اسکے کہنے سے اللہ تعالیٰ ہر کلمے کے بدلے ایک پرندہ پیدا کر دیتے ہیں جس کی چونچ سونے کی اور پرمرجان کے ہوتے ہیں۔ اور یوں اس نے بڑا لمبا قصہ بیان کر دیا۔ یحییٰ ابن معین نے امام احمد سے پوچھا کہ یہ قصہ تم نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہر گز نہیں۔ جب قصہ گو فارغ ہوا اور پیسے سمیٹ چکا تو دونوں محدث اس کے پاس آئے۔ ابن معین نے کہا۔ میں ابن معین ہوں اور یہ احمد۔ بتاؤ یہ قصہ تم سے کس نے بیان کیا ہے۔ یہ ہم نے ہر گز نہیں بلکہ کسی اور نے یہ جھوٹ گھڑا ہے۔ اس پر قصہ گو نے کہا کہ پہلے میں سنتا تھا کہ

ابن معین احمق ہے اور اب تو یہ ثابت ہو گیا کہ تم واقعی احمق ہو کیا دنیا میں تمہارے علاوہ کوئی ابن معین اور احمد بن حنبل نہیں ہے جو یہ بیان کر سکے میں نے ایسے ستر احمد بن حنبل نامی اشخاص سے قصے سن کر لکھ دیئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ چلتا بنا اور دونوں امام افسوس کرتے رہ گئے۔

اس طرح کا ایک اور قصہ امام ابو حاتم رازی کے ساتھ پیش آیا۔ وہ رقبہ اور حران کے درمیان ایک شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کی جامع مسجد میں نماز پڑھی۔ انہوں نے دیکھا کہ نماز کے بعد ایک نوجوان کھڑا ہوا۔ اور اس نے بیان شروع کر دیا کہ ہم سے ابو خلیفہ نے بیان کیا ہے اور ابو خلیفہ نے شعبہ سے، انہوں نے قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس کسی نے اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کی تو اس کے لئے یہ ہے اور یہ ہے اور یہ ہے اور اتنا کچھ بیان کر دیا جو انہوں نے نہ سنا اور نہ کبھی پڑھا تھا۔ نوجوان جب فارغ ہوا تو ابو حاتم رازی نے اس سے پوچھا کہ تم کس علاقے کے رہنے والے ہو؟ اس نے جواب دیا بروعد کا رہنے والا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ تم کبھی بصرہ گئے۔ اس نے جواب دیا نہیں۔ پھر پوچھا کہ تم نے کبھی ابو خلیفہ کو دیکھا۔ اس نے جواب دیا نہیں۔ تو اس پر انہوں نے کہا جب تم نے ابو خلیفہ کو دیکھا بھی نہیں اور اس سے ملے بھی نہیں تو اس کے نام سے روایت کیوں کرتے ہو۔ اس پر اس نے جواب دیا ہم جیسے لوگوں کے ساتھ بحث و مباحثہ آپ کی شان کے خلاف ہے میں نے یہ ایک سند یاد کی ہوئی ہے جب بھی کوئی چیز بیان کرنا چاہتا ہوں اس کے ساتھ جوڑ کر بیان کر دیتا ہوں تاکہ لوگ مجھ پر اعتماد کریں۔ یہ کہا اور چلتا بنا اور ابو حاتم رازی دیکھتے رہ گئے۔

امام سیوطی نے اپنی کتاب تحذیر الخواص میں لکھا ہے کہ ایک ایسے ہی قصہ گو نے بغداد میں آیت ﴿عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّخْمُودًا﴾ ”عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا“ کی تفسیر میں یہ بیان کر دیا کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ کے ساتھ عرش پر بیٹھیں گے۔ یہ خبر امام ابن جریر طبری تک پہنچی تو انہوں نے اپنے گھر کے دروازے پر یہ عبارت لکھوا دی ”سبحان من ليس له انيس ولا على عرشه معه جليس“ ”پاک ہے وہ ذات کہ نہ تو اس کا کوئی ساتھی ہے اور نہ کوئی اس کے ساتھ عرش پر بیٹھنے والا۔ اس

مہارت سے غضب ناک ہو کر اہل بغداد نے ان کے گھر پر پتھراؤ کیا اور انہوں نے چھپ کر جان بچائی۔

اس طرح ان قصہ گو لوگوں کے ذریعے بے شمار من گھڑت قصے اور روایات عوام میں پھیل گئیں جن کی نسبت تو رسول اللہ ﷺ کی طرف تھی مگر حقیقت میں آپ ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا تھا اور لوگ انہیں مدتوں تک درست سمجھ رہے ہیں۔

4.4۔ عصبیت:

دین اسلام نے تمام عصبیتوں پر کاری ضرب لگا کر انہیں جڑ سے اکھاڑ دیا تھا جس سے تمام مسلمان ایک ملت واحدہ بن گئے تھے لیکن جوں جوں لوگ تعلیمات نبوت سے غافل ہوتے گئے یہ عصبیتیں پھر ایک ایک کر کے واپس آتی چلی گئیں۔ لوگ پھر سے زبان، رنگ، علاقے، اور نسلی تعصب کا شکار ہو گئے اور انہوں نے ایک دوسرے پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے موضوع احادیث کا سہارا لیا کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے اقوال صحیحہ میں تو اسکی گنجائش نہ تھی۔ لوگوں نے اپنی ضرورت کے لئے احادیث گھڑیں اور انہیں نبی آخر الزمان سے منسوب کر دیا بنی امیہ اور پھر بنی عباس کے دور میں چونکہ اسلامی سلطنت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اس لئے عربوں نے اپنی قومی زبان عربی کو اجاگر کرنے کے لئے حدیثیں گھڑیں جس کی مثال یہ ہے: ”اللہ کے ہاں مغضوب ترین کلام فارسی زبان کا ہے، شیطان خوزی زبان استعمال کرتا ہے، جہنمی کی زبان بخارا کی زبان ہے اور اہل جنت عربی زبان میں گفتگو کریں گے“ ان کے مقابلے میں عجمیوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی اس کے جواب میں انہوں نے بھی حدیث گھڑ کر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دی جو یہ ہے: ”اللہ تعالیٰ جب غصے کی حالت میں ہوتا ہے تو عربی زبان میں وحی نازل کرتا ہے اور جب راضی ہوتا ہے تو فارسی زبان میں وحی نازل کرتا ہے۔“

سفید فام لوگوں نے سیاہ فام لوگوں کی مذمت کے لئے حدیثیں گھڑ لیں جس کی مثال یہ ہے۔ ”جب رسول اللہ کے سامنے سوڈان کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا سوڈانیوں کا ذکر مت کرو ان کا پیٹ اور شرمگاہ بڑوں سیاہ ہے۔“

اسی مفہوم میں ایک اور روایت یوں گھڑی گئی: ”آپ ﷺ نے ایک کھانا دیکھا تو پوچھا یہ کن لوگوں کا کھانا ہے۔ حضرت عباس نے جواب دیا یا رسول اللہ یہ حبشی لوگوں کا کھانا ہے۔ میں ان لوگوں کے کھانے اور لباس میں مدد کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا چچا جان! ایسا ہرگز نہ کریں یہ لوگ وہ ہیں کہ بھوکے ہوں تو چوری کریں اور پیٹ بھرا ہو تو زنا کریں۔“

مختلف شہروں کی فضیلت میں احادیث گھڑی گئیں جیسے بصرہ کی فضیلت میں یہ حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ایک زمین کو جانتا ہوں جسے بصرہ کہا جاتا ہے وہ مسجدوں سے بھر پور ہے تمام دوسرے شہروں کے مقابلے میں اس شہر سے ہر مصیبت دور کر دی جاتی ہے۔“

احمد بن کنانہ شامی نے یہ حدیث گھڑی ”جب ایمان اس زمین سے غائب ہو جائے تو اردن کی زمین میں ملے گا۔“

مختلف فقہی مذاہب کے متبعین نے اپنے اپنے ائمہ کی فضیلت اور دوسرے کے رد میں حدیثیں گھڑیں تاکہ اپنے پیروؤں کی تعداد کو بڑھاسکیں جس کی مثال یہ حدیثیں ہیں۔

۱۔ ”میری امت میں ایک آدمی ہوگا جس کا نام نعمان بن ثابت اور کنیت ابو حنیفہ ہوگی اللہ اس کے ہاتھ پر میرا دین اور سنت جاری کرے گا۔“

۲۔ میری امت میں ایک آدمی ہوگا جسے ابو حنیفہ کہا جائے گا اور وہ میری امت کا سراج ہوگا۔

۳۔ میری امت میں ایک آدمی ہوگا جس کا نام محمد بن ادریس ہوگا اور وہ میری امت کے لئے شیطان سے زیادہ نقصان دہ ہوگا۔

4.5 فقہی آراء کی تقویت:

اسلامی تاریخ میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کا آپس کا علمی اختلاف جو امت کے لئے رحمت تھا زحمت بن گیا۔ یہ وہ دور ہے جس میں ان ائمہ کے متبعین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے

کے لئے آپس میں مناظرے کرنے لگے ان میں ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی کہ عوام کے سامنے دوسرے کو چت کر دیں تاکہ لوگ مخالف کا مذہب ترک کر کے جیتنے والے کا مذہب اختیار کر لیں حالانکہ ائمہ کرام کی تمام آراء دین اسلام کی شرح و تعبیر ہیں ان میں کوئی بھی باطل نہیں ہے ان جمیعین میں سے بعض نے جب اپنے مخالف کے سامنے اس سے قوی دلیل نہ پائی تو حدیث گھڑنے سے بھی گریز نہ کیا تاکہ اگر فریق مخالف حدیث کا وسیع علم نہ رکھتا ہو تو حدیث رسول ﷺ کے احترام میں اس کے لئے خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ رہے اس قسم کی موضوع احادیث کی چند مثالیں یہ ہیں۔

- ۱- ”اگر کپڑے کو درہم کے برابر خون لگ جائے تو اسے دھویا جائے اور نماز کو دہرایا جائے۔“
- ۲- ”مؤمن پر خراج اور عشر جمع نہیں ہو سکتے۔“
- ۳- ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ظاہر کے مطابق حکم دوں چھپے ہوئے معاملات کا اللہ ذمہ دار ہے۔“
- ۴- ”زمین کا زکاۃ اس کا خشک ہو جانا ہے۔“
- ۵- ”ہر قرض جو نفع دے وہ سودی کا رو بار ہے“ ہو سکتا ہے ان میں بعض موضوع احادیث کا مفہوم اسلامی شریعت سے نہ نکلتا ہو لیکن یہ اس لئے موضوع ہیں کہ ان کے الفاظ نبی اکرم ﷺ کے دہن مبارک سے نہیں نکلے بلکہ انہیں لوگوں نے اپنی ضرورت کے مطابق گھڑا ہے۔

4.6 ترغیب و ترہیب:

ترغیب و ترہیب (دین کی طرف راغب کرنے اور اللہ کے عذاب سے ڈرانے) کے لئے احادیث وضع کرنے کا زیادہ کام جاہل زہاد اور صوفیاء کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ وضع حدیث میں یہ لوگ زیادہ خطرناک تھے کیونکہ یہ اپنی دینداری میں مشہور تھے اور لوگ ان کے منہ سے نکلنے والی باتوں پر اعتماد کرتے تھے اور ان کی پھیلائی ہوئی موضوع روایات جلد عوام میں رواج پا جاتی تھیں اور لوگ ان کے بتائے گئے کام اجر و ثواب کی نیت سے کرتے تھے جبکہ یہ زہاد اور صوفیاء بھی وضع حدیث کا کام اجر و ثواب کی نیت سے نیک کام سمجھ کر ہی

کرتے تھے حالانکہ یہ بہت ہی برا کام تھا۔

ان میں سے ایک جماعت نے قرآن مجید کی ہر سورت کی فضیلت میں حدیث گھڑی گویا کہ نبی اکرم ﷺ کے صحیح احادیث میں بیان کردہ فضائل ناکافی ہیں۔ یہ کام کرنے میں سرفہرست ابو عصمہ نوح بن مریم اور میسرہ بن عبد ربہ کا نام ہے۔

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ ابن عمار مروزی سے بیان کیا ہے کہ ابو عصمہ نوح بن مریم سے کہا گیا کہ تمہارے پاس عکرمہ کے ذریعے ابن عباس سے روایت شدہ ہر سورت کی فضیلت میں وارد احادیث کہاں سے آگئیں جبکہ اصحاب کرمہ کے پاس تو یہ نہیں ہیں تو اس نے جواب دیا کہ جب میں نے دیکھا لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے اور وہ معازی ابن اسحاق اور فقہ ابو حنیفہ کو پڑھنے لگے ہیں تو میں نے اللہ کی رضا کے لئے یہ حدیثیں گھڑ کر پھیلائیں۔

جبکہ دوسری جماعت نے مخصوص ایام کے اوقات میں مخصوص نمازوں کے فضائل میں حدیثیں گھڑیں اور ان نمازوں کا اتنا ثواب بتایا کہ وہ فرائض کے اجر و ثواب سے بڑھا ہوا تھا جیسے عاشور کے دن اور رات میں مخصوص نماز اسی طرح پندرہ شعبان کی رات کی نماز، وغیرہ۔

ایک تیسری جماعت نے مختلف اغراض کے لئے نمازوں کو ایجاد کیا اور ان کے ثبوت کے لئے حدیثیں گھڑیں جیسے انسان کے جنت میں اپنی جگہ دیکھنے کے لئے نماز، انسان کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لئے نماز، اور اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھنے کے لئے نماز وغیرہ۔

ابن عدی نے روایت کیا ہے کہ میں نے عبد اللہ نہاوندی سے سنا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے غلام خلیل سے پوچھا کہ خوف خدا پیدا کرنے کے لئے تم جو حدیثیں بیان کرتے ہو وہ تم نے کس محدث سے سنی ہیں تو اس نے جواب دیا۔ یہ تو ہم نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے کے لئے خود وضع کی ہیں۔

4.7 اشیاء کی فروخت:

عام لوگوں نے جب دیکھا کہ جاہل صوفی اگر اس میدان میں کامیاب ہو گئے ہیں تو ہم کیوں پیچھے رہیں چنانچہ مختلف قسم کے افراد نے اپنی اپنی دکان چکانے اور مختلف اشیاء کو لوگوں میں رواج دینے کے لئے حدیثیں گھڑ لیں۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

- ۱- ”جبرائیل علیہ السلام نے مجھے ہریرہ (عربوں کا ایک کھانا) کے کھانے کا حکم دیا ہے تاکہ تہجد کیوقت اٹھنے کے لئے میری کمر مضبوط ہو جائے۔“ حافظ ذہبی کہتے ہیں اسے ہریرہ بیچنے والے ایک دکاندار نے گھڑا۔
- ۲- ”رسول اللہ ﷺ نے کبھی خوشبو کے تھپے کو رو نہیں فرمایا“..... یہ کسی عطار کی گھڑی ہوئی ہے۔
- ۳- ”انگور اور تربوز میری امت کی بہار ہیں“..... یہ کسی پھل بیچنے والے کی وضع کردہ ہے۔
- ۴- ”مسور کی دال کھایا کرو یہ بڑی بابرکت ہے۔ اس سے دل نرم ہوتا ہے اور آنکھیں تر ہوتی ہیں اور اسے ستر انبیاء کی برکت حاصل ہے“..... یہ بھی مسور کی دال بیچنے والے کی بنائی ہوئی ہے۔ کیونکہ مسور کی دال دنیا بھر میں سستا اور نکما کھانا شمار ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل نے جب اللہ تعالیٰ سے اسے طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”کیا تم بہتر چیز کی بجائے ادنیٰ درجے کی چیز لینا چاہتے ہو“۔

4.8 ذاتی اغراض:

بعض لوگوں نے اپنی ذاتی اغراض کے لئے بھی حدیثیں گھڑیں جس کی مثال یہ حدیث ہے جسے سعد بن طریف الاسکانی نے گھڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس کا بیٹا روتا ہوا آیا۔ اس نے پوچھا بیٹا کیوں رو رہے ہو۔ بیٹے نے جواب دیا کہ مجھے استاد نے سزا دی ہے۔ کہنے لگا میں ابھی اسے ذلیل کرتا ہوں اور فوراً حدیث گھڑ لی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”تمہارے بچوں کے اساتذہ تمہارے شریر ترین لوگ ہوں گے ان کے پاس

قیسوں کے لئے شفقت نہ ہوگی اور وہ مساکین پر سخت ہوں گے۔

اسی طرح ابو عبد اللہ بن عطاء ابراہیمی نے اپنی ضرورت کی خاطر یہ حدیث گھڑی کہ ”زکوٰۃ دیا کرو تو اہل علم کو تلاش کر کے انہیں دو کو کیونکہ یہی لوگ سب سے زیادہ نیک اور خدا سے ڈرنے والے ہیں۔“

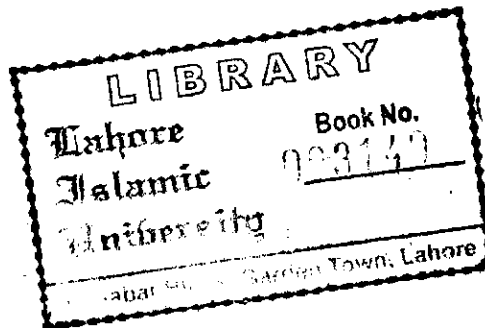
14.9 اظہار علم

بعض لوگوں نے کسی مجلس میں سوال کا جواب دیتے وقت اپنی طرف سے جواب دے کر اسے نبی

اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دیا تاکہ سائل یقین کر لے جس کی مثال یہ قصہ ہے جسے خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ عمر بن مسلم نے بتایا میں عبدالعزیز کے ساتھ ایک مجلس میں حاضر تھا ان سے سوال ہوا کہ مکہ صلح کے ساتھ فتح ہوا یا خونریزی کے ساتھ۔ اس نے جواب دیا کہ خونریزی کے ساتھ سائل نے کہا اس کی کیا دلیل ہے۔ انہوں نے فوراً سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت بیان کر دی کہ انہوں نے بیان فرمایا کہ اصحاب رسول ﷺ میں اختلاف پیدا ہوا کہ مکہ صلح سے فتح ہوا ہے یا خونریزی کے ساتھ۔ تو انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔ خونریزی کے ساتھ۔

ابن مسلم کا کہنا ہے کہ جب ہم وہاں سے نکلے تو میں نے عبدالعزیز سے کہا یہ حدیث تمہارے پاس کہاں سے آئی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ حدیث نہیں ہے میں نے اسے خود گھڑا ہے تاکہ اپنے مقابل کا جواب دے سکوں۔

www.kitabosunnat.com



خود آزمائی ③

- ۱- حروف تجہی کے بارے میں موضوع حدیث بیان کریں؟
- ۲- ملحدوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف کیا عیب منسوب کیا؟
- ۳- بادشاہوں کا قرب حاصل کرنے کی غرض کیا تھی؟
- ۴- مہدی کس کھیل میں مشغول تھا؟
- ۵- مہدی نے غیاث بن ابراہیم کو کتنا انعام دیا؟
- ۶- عبد الملک کے سامنے احمد بن یعقوب نے کیا پیش کیا؟
- ۷- قصہ گو نے ابو حاتم رازی کو کیا جواب دیا؟
- ۸- ابن جریر طبری نے اپنے گھر کے دروازے پر کیا عبارت لکھی؟
- ۹- اہل فارس نے عربوں کے رد میں کون سی حدیث گھڑی؟
- ۱۰- کیا قرآن کی ہر سورت کی فضیلت میں وارد حدیث صحیح ہے؟



قلم سرمد رشید

کتاب عربی و علوم اسلامیہ

علامہ اقبال اور بنیادی اسلامی آباد